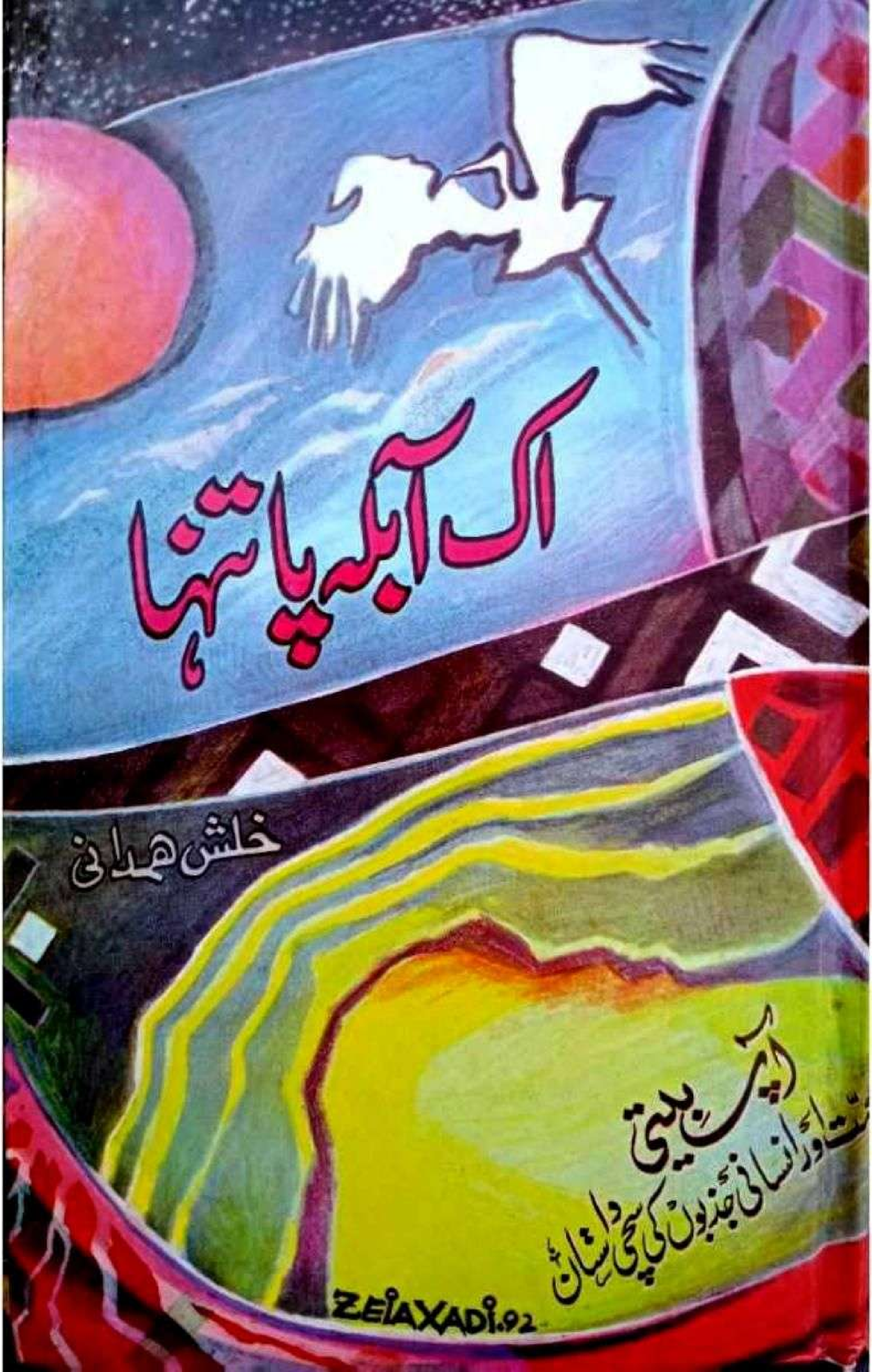


اک آبلہ پا تنہا
خلش ہمدانی
آپ بیتی
ت اور انسانی جذبوں کی سچی داستان
ZEIAXADI.92

خلش ہمدانی کی سادہ، بے لوث، بے تکلف اور بے تصنع فن کاری کو مصلحت کا پردہ ڈالنے کی عادت نہیں۔ اُسے قاری کی خوشنودی سے زیادہ عزیز یہ بات ہے کہ وہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں ہمارے سامنے پیش کرے یہ روپ خواہ کتنا ہی وحشیانہ اور سفاکانہ ہی کیوں نہ ہو۔

خلش ہمدانی کے فن کی بنیاد اخلاص مندی۔ حق پسندی اور حق گوئی پر ہے۔ اُس نے مظلوموں اور مجبوریوں کی وکالت اور سچائی کی راہ پر چلنے والوں کی محبت اور ظالموں، جابروں، استحصال پسندوں اور بد اعمالوں کی ذلت و تحقیر کو اپنا مسلک بنایا ہے۔

پروفیسر سیّد وقار عظیم

## خلش ہمدانی کی دُوسری کتابیں

خُون میں ڈُوبے تو سحر دیکھی ـــــ ناول
روئے دُکھ کا ساگر ـــــ "
تنویر لہو کی ـــــ "
آگ اور خُون کا دریا ـــــ رپورتاژ
بات چھپائے گوری ـــــ ناول
پیاس کا صحرا ـــــ ناول ـ زیرِ طبع

محبّت اور انسانی جذبوں کی سچّی داستان - آپ بیتی

# اک آبلہ پا تنہا

خلش ھمدانی

سنگِ میل پبلی کیشنز
لاہور

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک چوک ریگل دی مال لاہور نمبر ۵۴۰۰۰
فون: ۳۱۲۹۷۷ — ۳۲۳۹۶۳
طابع: نفیس پرنٹرز لاہور [redacted]
بار اول دسمبر ۱۹۹۲ء — 



دندہ شاہ بلاول (چکوال) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دندہ شاہ بلاول، لاوہ اور میانوالی میں حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں افواج پاکستان میں کمیشن لیا۔ اور ۱۹۶۷ء تک فوج سے منسلک رہے۔

۱۹۶۳ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ اس وقت سے لے کر اب تک ڈسٹرکٹ کورٹس اٹک میں پریکٹس کرتے ہیں۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۲ء تک حلقہ ارباب ذوق پشاور کے جنرل سیکرٹری رہے۔

آغا افتخار یوسف زئی

# اِک آبلہ پا تنہا

خلش ہمدانی

ایک ایسی کتاب ہے جو بیک وقت مصنّف کی سوانح حیات — ملٹری ہسٹری، وار ہسٹری اور مصنّف کے آبائی علاقے کی معاشرتی تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک نہایت دلچسپ اور مکمّل ناول بھی ہے اس میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ مصنّف کا اندازِ بیاں اتنا دلچسپ اور دلنشیں ہے کہ کسی جگہ قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور پوری کتاب ایک نشست میں ختم کرنے کی کوشش میں سب کچھ بھُول کر کتاب کے زندہ کرداروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں بڑی دیانتداری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے جسے قاری قدم قدم محسُوس کرتا ہے اردو زبان میں خُود نوشت بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اک آبلہ پا تنہا خلش ہمدانی کی یہ خود نوشت عرصۂ دراز تک یاد رکھی جائیگی اور اسکا شمار اردُو کی بہترین کتابوں میں ہوگا۔

آغا امین حسین
ناشر

جمیل یوسف

اور

آصف مسعود

کے نام

سالٹ رینج میں کوہِ سکیسر کی اونچی چوٹی کے شمال میں دامنِ کوہ سے ذرا ہٹ کر ونہ شاہ بلاول کا قصبہ واقع ہے۔ جسے حضرت سیّد احمد سلطان شاہ بلاول ہمدانیؒ (جو حضرت سید علی ولی ہمدانیؒ کی اولاد سے تھے۔) نے گیارہویں صدی ہجری میں بسایا۔ اس علاقے میں نوّے فیصدی آبادی قوم اعوان کی ہے۔ جو حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں۔ ان کے جدِ امجد حضرتِ قطب شاہ اسلامی فتوحات کے ابتدائی دَور میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ وارد ہند ہوئے تھے۔ قطب شاہ غزنی افواج میں جرنیل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی شادی سلطان محمود غزنوی کے بیٹے غازی مسعود کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

آگے چل کر انہی کی اولاد اعوان قطب شاہی کہلائی۔ جو زیادہ تر علاقہ اعوان کاری (تلہ گنگ)، پنڈدادن خان، سون سکیسر، خوشاب، سرگودہا، میانوالی، چکوال، اٹک اور راولپنڈی کے اضلاع میں آباد ہے ــ صدیاں گذر جانے کے باوجود ان لوگوں کے رسم و رواج، دوستیاں اور دشمنیاں عرب عہدِ جاہلیت کی روایات کی حامل اور آئینہ دار ہیں۔

علاقہ اعوان کاری کے اسی گاؤں (ونہ شاہ بلاول) میں مَیں اکتوبر ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا ونہ شاہ بلاول۔ تلہ گنگ۔ میانوالی شاہراہ پر واقع ہے۔ مَیں دو سال کا تھا کہ میری جوان سال

ماں مجھے زمانے کی صعوبتیں سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئی۔ اپنی ماں کا ایک دھندلا سا خاکہ اب بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں موجود ہے۔ جو میں پہلی نظر میں ہر جواں سال عورت کے خدوخال میں تلاش کرتا ہوں لیکن کسی سے مشابہت نہ پاکر پھر مغموم ہو جاتا ہوں۔

میرا شفیق باپ ہندوستانی فوج میں ملازم تھا جو پہلی جنگ عظیم میں میسوپوٹیمیا، مصر اور فرانس تک متعدد معرکوں میں حصہ لے کر واپس گاؤں آچکا تھا۔ جب ان کی یونٹ کوتل العمارہ کے مورچے میں محصور ہو گئی تو سنگینوں سے لڑی جانے والی ایک دست بدست جنگ میں دادِ شجاعت دکھانے پر انہیں گیلنٹری ایوارڈ (GALLANTRY AWARD) ملا۔ میرے والد جب معرکہ (علاقہ اعوان کاری میں چوپال کو معرکہ کہتے ہیں) پر بیٹھتے تھے تو اکثر ایسی دست بدست جنگ کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں اپنے دوستوں سے کیا کرتے تھے اور پھر اپنی چھاتی سے قمیص اُٹھا کر وہ زخموں کے نشانات بھی دکھایا کرتے تھے، جو انہوں نے اس معرکے میں کھائے تھے۔

میرے والد کچھ عرصے تک گاؤں میں رہے اور پھر پولیس میں ملازم ہو کر ڈیرہ غازی خان چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور پھر مستقل طور پر گاؤں واپس آگئے۔

ہمارا خاندان آباؤ اجداد ہی سے سپاہ پیشہ ہے۔ اس لیے ہر فرد میں ایک سپاہیانہ آن بان ہوتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ میرے والد نے قیام ڈیرہ غازی خاں کے دوران میں بلوچوں کی بہت سی عادات و خصلات بھی اپنالی تھیں۔ مثلاً انہوں نے بلوچوں کی سی گھنی ڈاڑھی اور بڑے بڑے شہ پر (مونچھیں) رکھے ہوئے تھے۔ وہ سر پر ایک بڑی سی پگڑی بلوچ سرداروں کی طرح باندھتے تھے۔ البتہ شلوار کی بجائے اپنی علاقائی روایات کے مطابق ایک بڑی سی چادر باندھتے تھے اور ایک چادر ہمیشہ کندھے پر رکھتے تھے۔ ان کو انگریزی طرز کے بال سخت ناپسند تھے۔ اگرچہ وہ انگریزوں کی فوج میں رہ چکے تھے لیکن پوری انگریز قوم کے سخت مخالف تھے۔ میرا خیال ہے یہ جذبہ ان کو بلوچ قبائل کے نزدیک رہ کر وہاں سے ودیعت ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ شروع میں پہلی

جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں بھرتی ہو کر سلطنت برطانیہ کے استحکام کے لیے کوتل العمارہ کے مورچوں میں اپنے جوان سینے پر گولیاں ہرگز نہ کھاتے۔ میرے والد کو اس محاذ پر لڑتے ہوئے شجاعت و بہادری دکھانے پر بہادری کا ایک تمغہ اور ایک کرچ ملی تھی۔

میری ماں کے مرجانے کے بعد کچھ عرصے تک میری نانی اماں نے ہمارے گھر کے انتظام و انصرام کو سنبھالے رکھا لیکن وہ بھی بیٹی کے غم میں گھُل گھُل کر جلد ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ میری ایک بیوہ پھوپھی تھیں میرے والد ان کو اپنے پاس لے آئے۔ اور کچھ عرصے تک وہ ہمارے گھر کا کام کاج کرتی رہیں۔ میرے ایک سوتیلے بھائی تھے جو عمر میں مجھ سے تقریباً بائیس سال بڑے تھے۔ ان دنوں باہر کہیں ملازمت کر رہے تھے۔ میرے والد نے میرے اس بھائی کی شادی اپنی اسی بیوہ بہن کی بیٹی سے کر دی۔ اس کے بعد میری پھوپھی اپنے بیٹوں کے پاس واپس چلی گئی۔

دلہن نے جلد ہی گھر کا انتظام و انصرام سنبھال لیا اور مجھے ایک سگی ماں کا پیار دیا۔ یہ خاتون رشتہ کے لحاظ سے میری بھاوج تھیں لیکن میں نے انہیں ہمیشہ سگی بہن ہی سمجھا۔ ان کی شفقت اور محبت نے مجھے اپنی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اور اس طرح وقت اپنی رفتار سے گذرتا رہا اور میں زندگی کی منزل پر آگے کی طرف بڑھتا رہا۔

میری عمر پانچ سال کے لگ بھگ ہوگی کہ میرے والد نے مجھے گاؤں کے لوئر مڈل سکول میں پڑھنے کے لیے داخل کرا دیا۔ جب میں سکول میں داخل ہوا تو اس وقت وہاں ہیڈ ماسٹر جناب عبدالرحیم صاحب تھے۔ جن میں اعلیٰ درجے کی تدریسی صلاحیتیں تھیں اور جن کا اثر ان کے شاگرد بڑی آسانی سے قبول کر لیتے تھے۔ موصوف ہمارے گاؤں سے ملحقہ ضلع میانوالی کے ایک گاؤں چکڑالہ کے رہنے والے تھے جو اپنی آخری عمر میں اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے نقل مکانی کر کے ملتان خورد تحصیل تلہ گنگ میں آباد ہو گئے۔

تھے۔ اب تھوڑا عرصہ ہوا ہے موصوف کا انتقال ہو گیا ہے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے وہ میرے ہوتے ہوئے وہاں سے تبدیل ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ ملک محمد خاں صاحب جو موضع ڈھلی تحصیل تلہ گنگ کے رہنے والے تھے۔ تشریف لائے۔ موصوف نہایت شریف اور ایک قابل استاد تھے۔ شاگردوں کے ساتھ نہایت شفقت کا سلوک کرتے تھے اور نہایت محنت سے پڑھاتے تھے۔ جب تک میں ونده شاہ بلاول میں زیر تعلیم رہا وہی ہیڈ ماسٹر رہے۔

O

میں نے لوئر مڈل سکول ونده شاہ بلاول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اینگلو ورنیکلر مڈل سکول لاوہ میں داخلہ لیا۔ لاوہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چھ میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ جب میں نے اس نئے سکول میں داخلہ لیا تو وہاں لالہ سندر لعل جی ہیڈ ماسٹر تھے آپ بی۔ اے۔ بی ٹی (B.A. B.T) تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا عظیم انسان اور اتنا شفیق، ہمدرد اور بڑا استاد نہیں دیکھا۔ موصوف ایک درویش صفت انسان تھے۔ سکول کے اوقات کے بعد وہ آبادی سے دور جنگل میں ایک کٹیا میں رہتے تھے۔ موصوف کے پاس چند کتابیں۔ ایک کمبل۔ ایک دری اور دو تین برتنوں کے علاوہ اور کوئی اثاثہ نہ تھا۔ وہ بھون ضلع چکوال کے رہنے والے تھے۔ وہ انگریزوں کے سخت مخالف اور ایک اعلیٰ پائے کے وطن دوست انسان تھے۔ جو شروع ہی سے بچوں کو وطن کی آزادی انگریزوں سے نفرت، والدین کی اور اپنے سے عمر میں بڑوں کی عزت اور اپنے آپ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ موصوف پڑھائی میں کوتاہی پر بالکل سزا نہ دیتے تھے بلکہ نہایت ہی پیار و محبت سے سمجھا دیتے تھے۔ وہ بچوں کو صرف اخلاقی برائیوں کی پاداش میں بدنی سزا دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا طریقہ کار کچھ یوں ہوتا تھا۔ جیسے کسی فوجی کا کورٹ مارشل ہو اور فیصلہ سنانے کے لیے پوری یونٹ کو اکٹھا کیا گیا ہو۔ اس طرح وہ جملہ طلبا اور اساتذہ کو گراؤنڈ میں جمع کرتے اور زیر عتاب لڑکے کو آگے بلاتے

اس پر جو بھی الزام ہوتا وہ باآوازِ بلند پڑھ کر اس لڑکے کو سناتے اور پھر اسے صفائی کا موقعہ فراہم کرتے۔ جرم ثابت ہونے پر پھر وہ اعلان کرتے کہ اس لڑکے کو اس جرم کی پاداش میں اتنے بیدوں کی سزا دی جاتی ہے۔ موصوف نے اس غرض کے لیے ایک خصوصی بید رکھا ہوا تھا جو رام بھل چپڑاسی پاس ہی لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ اس وقت لالہ جی کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے اور وہ پوری قوت سے مجرم کے ہاتھوں پر بید لگاتے۔

○

موضع لادہ چونکہ ہمارے گاؤں سے چھ میل دور تھا۔ اس لیے گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ میرے والد نے مجھے بھی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا۔ اس وقت میری عمر بمشکل بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ میں کبھی اپنے والد اور بہن سے الگ نہ ہوا تھا۔ اس لیے یہ دوری میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ ہمارے گاؤں کے اس وقت بورڈنگ ہاؤس میں پندرہ بیس لڑکے اور بھی تھے۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے بورڈر سنیچر وار کو چھٹی ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے اتوار گھر پر گذارتے۔ کپڑے دھلواتے۔ خود نہاتے دھوتے اور پھر سوموار کی صبح کو سحری کے وقت گاڑی سے روانہ ہوتے اور طلوعِ آفتاب کے وقت لادہ پہنچ جاتے بورڈنگ ہاؤس میں اپنا سامان از قسم مرونڈا۔ گھی یا اور کوئی کھانے کی چیز وغیرہ رکھتے اور کتابیں لے کر سکول پہنچ جاتے۔ یہ اُن لڑکوں کا معمول تھا۔

مجھے سکول میں داخلہ لیے ابھی پہلا ہی ہفتہ تھا اور میں ابھی تک گھر نہ گیا تھا کہ میرے ساتھ سکول کے اوقات میں ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک محترم اُستاد نے ایک لڑکے محمد انور کو اٹھنی دی کہ وہ ان کے لیے چار آنے کے چلغوزے لے آئے۔ اس نے فوراً ہی ماسٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور چلغوزے لے آیا۔ چلغوزے ماسٹر صاحب کو دیے لیکن جو چار آنے بقایا تھے وہ نہ دیے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ماسٹر صاحب نے بقایا پیسوں کے متعلق پوچھا تو اس نے نہایت

ڈھٹائی سے کہا کہ جناب میں نے تو یہاں میز پر چلغوزوں کے ساتھ ایک چونی رکھ دی تھی اور پھر انور نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ماسٹر صاحب سے کہا
جناب یہ نیا لڑکا بڑا چور ہے۔ یہ آپ کی میز کی طرف گیا تھا۔ اسی نے چونی اُٹھائی ہوگی۔

ماسٹر جی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً ہی اُٹھ کر مجھے گلے سے پکڑ کر دبوچ لیا۔ میں نے لاکھ قسمیں کھائیں۔ قرآن اُٹھائے۔ لیکن ماسٹر صاحب کو میری کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے اور بھی زیادہ غصہ آگیا۔ انہوں نے مجھے اس بُری طرح مارا کہ میری چیخ و پکار سُن کر ماسٹر مولوی محمد رضا صاحب نے اس نیک بخت اُستاد سے میری گلو خلاصی کرائی۔ اس دن ہفتہ کا آخری دن یعنی سنیچر وار تھا مجھے صبح ہی سے دوپہر کی چھٹی کا شدت سے انتظار تھا کہ میں آج گھر جاؤں گا۔ شفیق باپ کو ملوں گا پیاری بہن کو ملوں گا۔ لیکن ماسٹر صاحب چونکہ بورڈنگ ہاؤس کے انچارج تھے۔ اس لیے انہوں نے سزا کے طور پہ مجھے گاؤں جانے کے لیے چھٹی نہ دی۔ اگرچہ اس کے بعد میں کافی عرصے تک سکولوں میں گھسٹتا رہا۔ لیکن سچ پوچھیے تو میری تعلیم اسی دن ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد میرا پڑھنے میں کبھی بھی دل نہ لگا۔ والد صاحب سے ڈرتے ہوئے اس کے بعد بھی پانچ چھ سال تک میں نے تعلیم جاری رکھی اور گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی تک جا پہنچا۔ لیکن میں نے کبھی بھی دل لگا کر نہ پڑھا۔ کلاس روم میں میرا جسم موجود ہوتا تھا۔ لیکن میرا دھیان۔ دل۔ دماغ اور روح کلاس روم سے غیر حاضر رہتے تھے۔ مجھ پر انور نے جو الزام تراشی کی تھی اور جو میری مکمل تباہی کا باعث بنی اس کا ایک چھوٹا سا پس منظر ہے۔ بات یوں تھی کہ جب میں ونده شاہ بلاول میں پڑھتا تھا تو ہمارے حساب کے ایک اُستاد لالہ ہیراج تھے جو موضع لادہ کے رہنے والے تھے۔ وہ روزانہ چھ میل کی مسافت طے کر کے بذریعہ بائیسکل یہاں پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ اور سکول کے اوقات کے بعد واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ لالہ جی ہمیں حساب پڑھا رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک

سکول کا بخت سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شرارت کی اور مَیں نے اُسے زور کا ایک تھپڑ مار دیا۔ اس پر ماسٹر جی نے جو بلیک بورڈ پر لکھ کر ہمیں ایک سوال کا حل بتا رہے تھے، پلٹ کر دیکھا اور لڑکوں سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ بخت سنگھ اُٹھ کر رونے لگ گیا اور اس نے بتایا کہ احمد نے مجھے زور سے تھپڑ مارا ہے۔ اس پر لالہ جی نے مجھے سزا دی۔ دوران سزا انہوں نے غلطی سے مجھے ماں کی گالی دے دی۔ مَیں نے لالہ جی کو کہا کہ آپ مجھے جتنا مارنا چاہیں بے شک ماریں لیکن مجھے ماں کی گالی نہ دیں۔

اب مَیں نے ماسٹر جی سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ان کے پیریڈ کے بعد مَیں نے کمرے سے باہر نکل کر دوسرے لڑکوں کی آنکھ بچا کر ماسٹر جی کے بائیسکل کے ٹائروں پر کار مار مار کر دو تین پنکچر کر دیے۔ سکول کا وقت ختم ہونے کے بعد ماسٹر جی نے سائیکل کو کھینچتے ہوئے چھ میل کی مسافت پیدل طے کی۔ وہ اپنے گھر جا کر پنکچر لگاتے اور پھر دوسرے دن سائیکل پر سوار ہو کر سکول آتے۔ سکول کے اوقات میں مَیں ان کے سائیکل کو پھر پنکچر کر دیتا اور وہ بے چارے روز بڑی تکلیف سے واپس جاتے۔ اب وہ اس تاڑ میں رہنے لگے کہ یہ سائیکل پنکچر کون کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن جب مَیں ٹائر میں پرکار چبھو رہا تھا تو انہوں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور پھر مرغا بنا کر خوب ڈنڈوں سے پٹائی۔ اب میرا ذہن مستقل بغاوت پر اُتر آیا اور مَیں نے ماسٹر جی کو قرار واقعی سزا دینے کی ٹھان لی۔ دو تین دن مَیں اپنے ناپختہ ذہن میں مختلف منصوبے بناتا رہا۔ اور ان پر کسی نہ کسی وجہ سے عمل درآمد کرنا معطل کرتا رہا۔ ایک دن میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ ماسٹر جی سکول کی لائبریری کے انچارج ہیں، کیوں نہ لائبریری سے کتابیں چرائی جائیں تاکہ اس کا خمیازہ ماسٹر جی مالی تاوان کی صورت میں بھگتیں چنانچہ ایک دن رات کو مَیں نے لائبریری والے کمرے کا تالا توڑا اور اندر الماری کی قفل شکنی کر کے دو تین پھیروں میں مَیں تقریباً ایک سو کتابیں گٹھڑیاں باندھ کر لے گیا اور سکول سے دور ایک ویرانے میں ایک گڑھا کھود کر وہ کتابیں مَیں نے وہاں دفن کر دیں۔

دوسرے دن جب صبح میں سکول آیا تو وہاں ایک اچھا خاصا ہنگامہ دیکھا۔ سب لڑکوں کی زبان پر یہی بات تھی کہ لائبریری کی کتابیں چوری ہوگئی ہیں اور تالے ٹوٹے پڑے ہیں۔ کچھ لڑکے اس ہنگامے سے بے نیاز ہو کر ایک چھوٹی گیند کے ساتھ والی بال کھیل رہے تھے۔ ابھی تک کوئی سکول ٹیچر نہ آیا تھا۔ تھوڑی دیر گذری تو ہیڈ ماسٹر ملک محمد خاں صاحب ڈاک خانے کی صندوقچی زور خان سے اٹھوائے آتے ہوئے نظر آئے۔ لڑکوں نے کھیلنا بند کر دیا اور سہم کر کر ایک طرف کو سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جونہی ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے دفتر کے سامنے پہنچے ایک طالب علم شاہ آبادان نے دوڑ کر اُن کو اطلاع دی کہ لائبریری والے کمرے کا تالا ٹوٹا پڑا ہے اور الماری بھی کھلی ہے اور اس سے سب کتابیں غائب ہیں چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ڈاک خانے کی صندوقچی اپنی میز پر رکھوائی اور پگڑی اُتار کر رکھی اور پھر لائبریری والے کمرے کی طرف آئے۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے تو لڑکوں نے دروازے پر جمگھٹا لگا دیا۔ تھوڑی دیر دیکھ بھال کرنے کے بعد وہ باہر آ گئے اور انہوں نے زور خان کو کہا کہ کمرے کی کنڈی لگا دو تاکہ کوئی لڑکا اندر نہ جائے۔ میں اپنے دفتر میں جاتا ہوں۔ جب ماسٹر ہمیراج صاحب آئیں تو اُن کو کہنا کہ میرے پاس تشریف لے آئیں۔

دعا سے تھوڑا پہلے ماسٹر ہمیراج صاحب بھی آ گئے۔ زور خان نے ان کو سب صورتحال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ اس دن اس غیر معمولی واقعہ کی وجہ سے سکول کی فضا بڑی اداس اور بجھی بجھی سی تھی۔ ماسٹر ہمیراج صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر وہ دونو آپس میں باتیں کرتے رہے پھر دونو باہر آ گئے۔ اتنے میں دوسرے اساتذہ بھی آ گئے۔ اور جملہ طلبا سکول کے صحن میں دُعا کے لیے جمع ہو گئے۔ دعا ختم ہوئی تو سب لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ ہم ابھی اپنی کلاس میں بیٹھے ہی تھے کہ سکول کے چپڑاسی نے مجھ سے کہا کہ "تمہیں ہیڈ ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں۔"

یہ بات سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چنانچہ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا

ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں داخل ہوا۔ ان کو سلام کر کے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی خوف ناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

" آگے آؤ۔ "

میں دیوار سے تھوڑا سا آگے ہو کر ان کے میز کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے میرے کان مروڑتے ہوئے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا " کہاں ہیں لائبریری کی کتابیں۔ "

جناب مجھے کیا پتہ ہے۔ میں نے بڑے ہی پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

" ابھی پتہ چل جائے گا کہ کہاں ہیں۔ " اور وہ اُٹھ کر دفتر کے ایک کونے میں پڑا ہوا ایک ڈنڈا جسے سکول کی اصطلاح میں مولا بخش کہتے تھے، اٹھا لائے۔ میں سہم گیا اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے حواس مجتمع کرنے لگا۔

اتنے میں لالہ ہیرا جی نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ ملک صاحب آپ اس بچے کو ماریں نہیں۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آج اس بچے کو سزا دی گئی تو مستقل طور پر یہ ایک عادی مجرم بن جائے گا۔ یہ بچہ بڑا ذہین ہے اور میری جماعت میں ہمیشہ اول آتا ہے۔ مجھ سے ایک دن غلطی ہوئی۔ اس نے کسی وجہ سے بخت سنگھ کو کلاس میں میری موجودگی میں تھپڑ مارا۔ اس جرم کی پاداش میں میں نے اس کو سزا دی تھی۔ اس وقت مجھ سے نادانستہ طور پر یہ غلطی سرزد ہو گئی کہ میں نے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ یہ بچہ بڑا باعزت اور بہادر لڑکا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ماسٹر جی سزا جتنی چاہیں آپ مجھے دے لیں لیکن مجھے ماں کی گالی ہرگز نہ دیں۔ میں بھی غصے میں تھا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے اس کی اور زیادہ پٹائی کی۔ اس وجہ سے یہ بچہ مجھ سے انتقام لینے پر اتر آیا اور اس نے پچھلے دنوں مجھے اچھا خاصا پریشان کیے رکھا ہے اور پھر انھوں نے اپنے سائیکل کے روزانہ پنکچر ہونے کی پوری تفصیل ہیڈ ماسٹر صاحب کو سنائی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے لالہ جی کو کہا۔ " آپ بھی بیٹھ جائیں۔ تھوڑی دیر تک

سوچنے کے بعد وہ کہنے لگے۔ "لالہ جی اس مسئلہ کا پھر کیا علاج ہے؟"
علاج ملک صاحب یہی ہے کہ میں گم شدہ کتابوں کی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔
لیکن آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ اس بچے کو اگر آپ نے اسی طرح تحفظ دیا تو پھر یہ ایک عادی مجرم بن جائے گا۔
نہیں ملک صاحب مجھے یقین واثق ہے کہ اگر اس موقعہ پر اسے بدنی سزا دی گئی تو اس صورت میں اس کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریک ہو جائے گا اور پھر یہ ایک عادی مجرم بن جائے گا۔
لالہ جی۔ سیدھی انگلیوں سے تو گھی نہیں نکلتا۔
آپ کا ارشاد بجا ہے ملک صاحب۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ یہ بچہ دو سال کا تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ باپ غریب کاشت کار ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتا۔ یہ بچہ عمر بھر کے لیے سپائل (Spoil) ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ایک انسان جہالت کی اتھاہ تاریکیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے۔
ٹھیک ہے لالہ جی۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو پھر لائبریری کی کتابیں آپ پوری کر دیں۔
جی ہاں۔ میں کر دوں گا۔ لالہ ہیمراج نے بڑی کشادہ دلی سے یہ بات کی۔
لیکن ایک بات ہے لالہ جی۔ میں ایسے جرائم پیشہ لڑکے کو اپنے سکول میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں اس کا نام آج ہی سکول سے خارج کر دوں گا۔
خدا کے لیے ملک صاحب ایسا نہ کیجئے۔ ساری عمر میری ضمیر مجھے کچوکے لگاتی رہے گی۔
تو آپ کے خیال میں یہ پھر ایسی حرکت نہ کرے گا۔
ملک صاحب یہ پہلے بھی نہ کرتا۔ یہ سب کچھ میری غلطی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور لالہ جی نے اپنی جیب سے بٹوا نکال کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے میز پر

رکھتے ہوئے کہا۔ جناب یہ رقم اب آپ امانت کے طور پر رکھ لیں اور اس رقم سے آپ لائبریری کی گم شدہ کتابیں منگوا لیں۔

ٹھیک ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بٹوا اُٹھا کر رقم گِنی کر اسے جیب میں رکھ لیا اور ماسٹر جی سے کہنے لگے۔ ٹھیک ہے لالہ جی اب آپ جائیں اپنی کلاس لیں۔

مَیں ان دونوں کے پاس کھڑا یہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہا تھا۔ لالہ جی سے آنکھیں چار ہوئیں تو مَیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگ پڑا۔ لالہ جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری مدتوں کی مری ہوئی ماں زندہ ہو گئی ہے اور اُس نے مجھے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا ہے وہی محبت، وہی پیار، ماں کا سا خلوص۔ میرے آنسو تھمے تو لالہ جی نے مجھے چمکارتے ہوئے کہا۔

بیٹا تم کیوں روتے ہو۔ تمہیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

مَیں نے ان دونوں صاحبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جناب لائبریری کی کتابیں مَیں نے چرائی ہیں۔ لالہ جی کا حُسنِ سلوک دیکھ کر مَیں بے حد شرمندہ ہوں آپ میرے ساتھ دو تین لڑکوں کو بھیجیں مَیں وہ سب کتابیں لا کر ابھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔ وہ دونوں حیرت زدہ ہو گئے اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگ گئے۔ جیسے میری بات کا انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے گرجتے ہوئے کہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ مجھے کتابوں کے متعلق کچھ خبر نہیں ہے۔

ٹھیک ہے مَیں نے کہا تھا۔ اگر آپ مجھے سزا دیتے تو مَیں یہ کتابیں ہرگز واپس نہ کرتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔

کیوں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک زہریلے سانپ کی طرح پھنکاریں مارتے ہوئے کہا۔

مَیں چُپ کھڑا رہا۔ وجہ میں خود سمجھتا تھا لیکن دوسروں کو نہ سمجھا سکتا تھا۔

○

لالہ جی اپنے ساتھ دو لڑکوں اور مجھے لے کر میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے وہ جگہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی۔ جہاں میں نے کتابیں دفن کی تھیں وہاں سے تھوڑی سی مٹی ہٹائی تو کتابیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی ایک سو کے لگ بھگ کتابیں ہم نے وہاں سے نکال کر گٹھڑیاں باندھ لیں اور پھر سروں پر اُٹھا کر سکول کی طرف روانہ ہو گئے۔ لالہ سب سے آگے ایک فاتح جرنیل کی طرح سینہ تانے خوش خوش چلے جا رہے تھے۔ ہم سکول پہنچے تو سب اساتذہ اور لڑکے کلاسیں چھوڑ کر کمروں سے باہر نکل آئے اور سب مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے لگ گئے۔

کتابیں ہم نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں لا کر رکھ دیں وہ بھی اس برآمدگی سے خوش ہو گئے اور لالہ جی سے کہنے لگے۔

لالہ جی۔ آپ کی بات ٹھیک نکلی۔ اگر مَیں بھی غلطی کرتا تو یہ لڑکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک عادی مجرم بن جاتا۔ انہوں نے لالہ جی کو لائبریری رجسٹر لانے کو کہا تاکہ کتابیں رجسٹر کے مطابق چیک کر لی جائیں۔

ملک صاحب کتابیں ٹھیک ہی ہوں گی۔ مَیں نے ابھی اگلے دن چیک کی تھیں۔

ویسے احتیاطاً چیک کر لی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

ٹھیک ہے اگر آپ فرماتے ہیں تو کر لیں گے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے منشی محمد زمان صاحب کو بھی بُلا لیا۔

لالہ جی اور منشی جی نے کوئی گھنٹہ بھر تک کتابیں چیک کیں۔ کتابیں بالکل پوری

تھیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور لالہ جی نے تسلی کر لی اور پھر چمکارتے ہوئے مجھے کہا۔
بیٹا آپ جائیں۔ آج چھٹی کریں۔ کل سے باقاعدگی سے سکول آیا کریں۔
میں خوشی خوشی سکول کے اذیت ناک ماحول سے چھٹکارا پاتے ہی بستہ سنبھالتے ہوئے سکول سے گھر کی طرف چل پڑا۔
اس واقعہ کا ذکر محمد انور نے ماسٹر صاحب سے کیا اور ساتھ ہی اپنے مقامی ہونے کے ناطے پردیسی لڑکوں پر اثر انداز ہوتے ہوئے میرے گاؤں کے دو تین لڑکوں سے اس واقعہ کی تصدیق بھی کروا دی۔
ماسٹر جی نے دم لے کر زدو کوب کا دوسرا راؤنڈ شروع کر دیا۔ ہمارے سکول سے بالکل ملحق پولیس سٹیشن تھا۔ میری چیخ و پکار سن کر پولیس کے کچھ سپاہی بھی احتجاجاً وہاں جمع ہو گئے۔ ان سپاہیوں نے شرم شرم کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ان کا شور سن کر ہیڈ ماسٹر لالہ سندر لعل صاحب جن کا دفتر وہاں سے ذرا فاصلے پر تھا، اس طرف آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی ماسٹر صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا۔
ماسٹر صاحب۔ اس معصوم لڑکے کو آپ اس بری طرح کیوں زدو کوب کر رہے ہیں۔
جناب اس نے چوری کی ہے۔
کیا چرایا ہے؟
میری میز سے ایک چونی اٹھالی ہے۔
آپ کو کیسے پتہ چلا۔
اور پھر ماسٹر صاحب اپنی اور انور کی ساری باتیں اور لائبریری کی کتابوں کی چوری کی مفصل تفصیل بتائی۔
ٹھیک ہو گی آپ کی بات ملک صاحب لیکن آپ اس بری طرح اس بچے کو مار رہے ہیں کہ اس کا حلیہ آپ نے بگاڑ دیا ہے۔

لالہ جی آپ کی اس طرفداری سے اس کو شہ ملے گی اور یہ پھر اسی طرح کی حرکات کا ارتکاب کرے گا۔

ملک صاحب مجھے یقین ہے کہ اتنا کم عمر بچہ جو کبھی ماں باپ سے الگ نہ ہوا ہو اس میں اتنی جرأت کیسے آسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ چونی اس بچے نے نہیں چرائی بلکہ محمد انور نے لی ہے۔ اور اگر آپ کو چونی ہی لینا مقصود ہے تو آپ چونی مجھ سے لیں اور پھر لالہ جی نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے چند کھنکھناتے ہوئے سکے نکالے اور ایک چونی الگ کر کے ماسٹر جی کے سامنے میز پر پھینک دی۔

نہیں لالہ جی اس کی ضرورت نہیں۔ ماسٹر صاحب نے کھسیانا سا ہوتے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے چونی لالہ جی کو لوٹا دی اور اپنے اس رویہ پر معذرت کی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب واپس اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔ میں پریشان حال، بال بکھرائے زاروقطار روتا ہوا ٹاٹ پر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ چوری نظروں سے کبھی کبھی ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ لیتا۔ وہ بدستور غصے کی آگ میں جل رہے تھے۔ ان کی غصے سے لال شعلہ بار آنکھیں اب بھی میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں ان اذیت ناک لمحوں کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

O

سکول کی چھٹی ہوئی تو سب لڑکے اور اساتذہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہوسٹل میں رہنے والے لڑکے سکول سے ملحق ہوسٹل کے بلاک میں آئے تاکہ کھانا وغیرہ کھا کر اپنے اپنے گھروں کو وہ بھی روانہ ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد ہم جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ایک لڑکا مجھے بلانے آیا۔

احمد آپ کو سپرنٹنڈنٹ صاحب بلا رہے ہیں۔

مجھ پر ایک بجلی سی گری۔ میں تھکا ماندا، ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ میں نے ان کی خونخوار نظروں میں ایک

عجیب سی وحشت اور انتقامی جذبہ کا تاثر دیکھا۔ میں سلام کر کے ایک طرف کو ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ماسٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے وحشت ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم آج گھر نہیں جاؤ گے۔“

کیوں جی؟

کیوں جی کے بچے۔ مجھے چیلنج کرتا ہے اور پھر اُٹھ کر مجھے بے تحاشا لاتوں مکّوں اور تھپڑوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میری چیخ و پکار سن کر کوئی بھی لڑکا اس طرف کو نہ آیا۔ ماسٹر صاحب مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک کرسی کے پاس لے گئے۔ وہ اس کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھے بالوں سے پکڑے ہوئے وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے منہ پر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ ان کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ نہ جانے اُن کو چوہں کے عظیم مالی نقصان کا غم تھا یا لالہ جی کی سرزنش کا۔ نہ جانے اور کتنی دیر تک میں جہنم کی اس دہکتی آگ میں جلتا رہتا کہ میری آہ و بکا سن کر ہوسٹل کا بوڑھا باورچی چچا قاسم خان بھاگ کر آ گیا اور اس نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی منت سماجت کی۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑے تب جا کر میری گلو خلاصی ہوئی۔ چچا قاسم پھر مجھے اپنے ساتھ کچن کے چھپر میں لے آیا۔ منہ ہاتھ دھلوایا۔ سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور انگلیوں سے میرے اُلجھے ہوئے بالوں کو درست کیا اور پھر مجھے کھانا کھانے کے لیے کہا۔

نہیں چچا مجھے بھوک نہیں ہے۔

بیٹا تھوڑا سا تو کھاؤ۔

نہیں چچا طبیعت نہیں۔

اچھا تمہاری مرضی اور پھر وہ اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گیا۔

ہوسٹل کے سب لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اب وہاں صرف سپرنٹنڈنٹ صاحب، چچا قاسم اور ایک نحیف و نزار سا بے آسرا لڑکا رہ گئے۔ جس کا گاؤں وہاں سے چھ میل دور تھا۔ جس کا شفیق باپ اور پیاری بہن آج اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ دونوں اس سے ملنے کے لیے کتنے بے چین ہوں گے اور وہ شام کو نہ پہنچا تو ان پر کیا گذرے گی۔

دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا تھا۔ لیکن میری دنیا بالکل تہ و بالا تھی۔ ذہن میں ایک عجیب سا خلفشار تھا۔ میں سوچتا مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس ظالمانہ نظام میں میں ہرگز تعلیم نہ حاصل کر سکوں گا۔ "لیکن بھاگ کر جاؤں گا تو کہاں"۔ میں نے دندہ شاہ بلاول اور لاوہ کے علاوہ اور کوئی گاؤں یا شہر نہ دیکھا ہوا تھا۔ لاوہ آئے بھی ابھی میرا پہلا ہفتہ تھا۔ اس لیے ابھی تو میں لاوہ کی گلیوں سے بھی ناواقف تھا۔ جاؤں گا تو کہاں۔؟ ایک حل نہ ہونے والا عقدہ میرے پیش نظر تھا۔ میں چھوٹے سے ذہن کا ایک لاوارث بچہ، بھلا کیسے ان اذیت ناک لمحوں کا مقابلہ کر سکوں گا۔ یہی بات سوچتے سوچتے میں ہوسٹل سے ملحقہ ایک ٹیکری پر آ کر اپنے گاؤں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے دور اُفق پر اپنے گاؤں میں واقع شاہ والی بن (تالاب) کی ٹاہلیاں نظر آئیں میری آنکھیں ایک انتہائی مسرت سے جگمگا اُٹھیں اور میں اپنے سب غم بھول کر اُن ٹاہلیوں کو ہی دیکھتا رہا۔ وہ شاہ محمد رضاؒ دولہا کی بن کی ٹاہلیاں نہ تھیں۔ میری ماں کی ماتا بھری گود تھی جو مجھے زمانے کے سب دکھوں سے چھپا کر اپنی گود میں لیے پیار سے چمکار رہی تھی۔ میں سوچتا ہوں ان ٹاہلیوں سے تھوڑے فاصلے پر ہمارا چھوٹا سا ایک گھر ہے جس میں زمانے کی سب راحتیں اور سکھ میرے لیے ہیں۔ لیکن یہ ہوسٹل تو میرے لیے ایک اذیت خانے سے کم نہ ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں میرا شفیق باپ رہتا ہے۔ میری پیاری بہن رہتی ہے۔ اس بھری دنیا میں یہ دو ہی آدمی ہیں جو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ آج شام کو جب سب لڑکے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے تو میرا باپ اور بہن مجھے نہ پا کر کس قدر رنجیدہ ہوں گے۔ مجھے اپنے غم سے ان کا غم زیادہ۔

ورنی نظر آیا۔ نہ جانے میں کب تک پھٹی پھٹی نظروں سے دور خلاؤں میں اُڑتے ہوئے آوارہ بادلوں کو دیکھتا رہتا کہ چچا قاسم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

او بیٹا کدھر گئے ہو۔

اس کی یہ تجسس بھری آواز سن کر سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔

کیوں چچا۔ انہوں نے چچا قاسم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

جناب اس نئے لڑکے کو آوازیں دے رہا ہوں۔ وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کہیں گھبرا کر بھاگ نہ جائے۔

ہاں ہاں۔ دیکھو چچا اسے۔ اگر وہ بھاگ گیا تو ہم دونو کے لیے مصیبت بن جائے گی۔

جناب میری اس میں کیا غلطی ہے!

نہیں چچا میں تمہاری غلطی کی بات نہیں کرتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ہم دونو کو چھوڑیں گے نہیں۔

میں چچا کی آواز سن کر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ٹیکری سے نیچے اُتر آیا اور چچا کو آواز دی۔ "چچا میں یہاں ہوں۔"

وہاں بیٹا کیا کر رہے تھے۔؟

چچا وہاں بیٹھا اپنے گاؤں میں واقع شاہ والی بن کی ٹاہلیاں دیکھ رہا تھا اور پھر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے۔

چچا میرے دل کی کیفیت بھانپ گیا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ رونے لگ پڑا۔ اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ مجھے ایک گونہ راحت محسوس ہوئی۔ وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے کمرے کی طرف لے چلا۔

چچا آپ مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ میں نے استفسار بھرے لہجے میں پوچھا۔؟

بیٹا سپرنٹینڈنٹ صاحب تمہارا پوچھ رہے تھے۔ اس لیے مَیں نے آوازیں لگائی تھیں۔

نہ چچا مجھے خدا کے لیے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس لے کر نہ جاؤ۔ وہ درندہ صفت انسان مجھے مارے گا۔ اس کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا ہے۔

نہیں مارے گا۔ مَیں ذمہ دار ہوں۔

اور پھر چچا قاسم مجھے سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لے گیا۔ سلام کے بعد کہنے لگا۔

حضور یہ ہے وہ نیا لڑکا۔

کہاں تھا یہ؟ یہ تو ہمارے لیے ایک مستقل عذاب بنتا جا رہا ہے۔ ماسٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

نہیں حضور یہ بات نہیں۔ معصوم بچہ ہے۔ کبھی ماں باپ سے جُدا نہیں ہوا آپ نے اسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ گھر جانے نہیں دیا اور دن میں سکول میں جو کچھ اس کے ساتھ آج بیتی ہے۔ اس وجہ سے بہت ہی اداس اور دل برداشتہ ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا سرکار۔ چچا نے ماسٹر صاحب سے التجا بھرے انداز میں کہا۔

چچا تم اپنے کام سے کام رکھو۔ سرکاری کاموں میں دخل مت دو۔ اگر تم نے اس طرح کی باتیں کیں تو اس حرامزادے کو اناشہ ملے گی اور پھر وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگ گیا۔ مَیں سہم گیا۔ اور سوچنے لگا کہ پہلے کچھ کم درگت بنی ہے جو یہ حضرت ابھی مزید سزا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

○

سورج دُور مغرب میں کوہ ڈھک کی پہاڑیوں میں غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں ہر سُو شفق پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے اپنے بسیروں کو واپس آ رہے تھے۔ چڑیاں سکول اور اس سے ملحقہ ہوسٹل کے درختوں پر بیٹھیں الوداعی گیت گا رہی تھیں۔ فضا

اداس اور بوجھل تھی۔ نہ جانے دنیا کی رنگینیاں کہاں مفقود ہوگئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک روشنی کے کچھ مدھم سے آثار باقی ہیں۔ میں شاہ والی بن کی ٹاہلیوں ہی کو دیکھتا رہوں اور تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو اپنے گاؤں میں پاؤں اور اپنے شفیق باپ اور پیاری بہن کی قربت میں رہوں۔ اور وقتی طور پر ہی سہی۔ لیکن ان اذیت ناک لمحوں کے کچوکوں سے تو کم از کم دور رہوں۔ لیکن بھلا کہاں۔؟

چچا قاسم مجھے سچ مچ کی دکھی اور سوگوار دنیا میں واپس کھینچ لایا تھا۔ جہاں دکھ ہی دکھ ہیں۔ خوشی اور راحت نام کی کوئی شے نہیں۔

میں کیا دیکھتا ہوں کہ سکول کی ہیج (HEDGE) کی اوٹ سے اچانک میرا شفیق باپ نمودار ہوا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پھر جب وہ میرے قریب آگئے تو میں نے آنکھیں ملتے ہوئے یقین کرنا چاہا کہ میں عالم خواب میں ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

میرا شفیق باپ روتے ہوئے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور مجھے دیوانہ وار چومنے لگ گیا۔ میں کافی دیر تک اپنے والد سے چمٹا ہوا کھڑا روتا رہا۔

چچا قاسم میرے والد کو دیکھ کر وہاں آگیا اور اُن سے مصافحہ کیا اور حال احوال دریافت کیا۔

میرے والد نے پیار بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

سب لڑکے آج اپنے اپنے گھروں کو آئے ہیں۔ تم کیوں نہیں آئے۔ میں اور تمہاری بہن آج صبح سے تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ تمہاری بہن تو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے آکر کہتی۔ ”احمد ابھی تک نہیں آیا۔“ اور پھر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ پاکر مایوس ہو جاتی۔ اس نے آج تمہارے لیے صابونی حلوہ بھی بنایا تھا۔ ”تم آج کیوں نہیں آئے میرے بیٹے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک سوالیہ انداز سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔

چچا قاسم نے میرے والد کو سب صورت حال سے آگاہ کیا۔ میرے والد کا رنگ

غصے سے تمتما اٹھا اور ان کا چہرہ تپتے ہوئے کندن کی طرح سرخ ہو گیا۔

نہیں قاسم خانا یہ بات بالکل غلط ہے۔ منشی جی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا کم از کم چور نہیں ہے۔ کہاں ہیں منشی جی میں خود اُن سے بات کرتا ہوں۔

نہیں ملک صاحب۔ آپ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کوئی بات نہ کریں۔ بات اور بگڑ جائے گی۔

بات بگڑ جائے گی! کس لیے بگڑ جائے گی۔ یہ معصوم بچہ نامساعد حالات کے تھپیڑے یونہی سہتا رہے گا۔ نہیں۔ نہیں۔ میں اسے یونہی بے رحم ہاتھوں میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے بات تو کر لینے دو اس سے۔

میرے والد نے غصے سے اونچی اونچی باتیں کیں تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اپنے کمرے کا ہلکا سا دروازہ کھولا اور جھانک کر دیکھا کہ کیا ماجرا ہے۔

چچا قاسم نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے والد کو بتایا کہ وہ ہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ میرے والد آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ان کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو خود باہر آ گئے اور ایک تحکمانہ انداز میں گویا ہوئے:

کیوں بڈھے کیا بات ہے؟

جناب میں اس لڑکے کا باپ ہوں۔ آج گاؤں کے سارے لڑکے اپنے اپنے گھروں کو گئے ہیں۔ میرا بیٹا نہیں آیا تو میں نے گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ آپ نے آج اسے گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں اس کا پتہ کرنے آیا ہوں کہ کیا وجہ ہے وہ کیوں نہیں آیا۔

یہ سُن کر ماسٹر صاحب غصے سے بھرے ہوئے کہنے لگے۔ تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تم بغیر اجازت کے ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں کیوں داخل ہوئے ہو۔

جناب اتنی بڑی بات ہے یہ۔ کیا یہ معصوم بچہ یونہی سسک سسک کر یہاں مر جاتا اور میں اس کا پتہ کرنے کے لیے بھی نہ آتا۔

مرجاتا۔ ایسی اولاد سے تو انسان کی اولاد نہ ہو تو اچھا ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کو یہی کچھ سکھایا ہے کہ یہ دوسروں کی چوریاں کرتا پھرے۔ میرا بس چلتا تو میں اس حرامی پلے کا گلہ گھونٹ دیتا۔

منشی جی زبان سنبھال کر بات کریں۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

او بے وقوف جاہل بڈھے۔ منشی کس کو کہتا ہے ؟ میں تمہیں منشی نظر آتا ہوں ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ ایس۔ وی ٹیچر ہوں۔

ہوں گے جناب۔ لیکن کم از کم آپ کو اس بات کا خیال کرنا چاہیئے کہ میں عمر میں آپ کے والد کے برابر ہوں۔ میرا بڑا بیٹا آپ کی عمر کا ہے۔

ہو گا۔ اس سے تم کوئی معزز آدمی تو نہیں بن گئے۔ میری نظر میں تم ایک گنوار ان پڑھ اور جاہل دیہاتی ہو۔

چچا قاسم میرے والد کو بازو سے پکڑ کر کچن کی طرف لے گیا۔ چارپائی پر بٹھایا۔ حقہ سلگایا اور میرے والد کی طرف نے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

بھائی صاحب آپ ناراض نہ ہوں۔ یہ ماسٹر صاحب نئے نئے آئے ہیں۔ جوان ہیں۔ کافی خود سر ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ آپ نے اپنے بچے کو اگر اس سکول میں پڑھانا ہے تو یہ سب باتیں آپ کو برداشت کرنا پڑیں گی۔ میرا والد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر والد کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ بالو (میں پیار سے اپنے والد کو بالو کہتا تھا۔) میں اس سکول میں اب ہرگز نہیں پڑھوں گا۔

بیٹے سکول میں تو کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ نیک بخت منشی نہ جانے کیوں اپنی ضد پہ اڑا ہوا ہے۔ دیکھو ہیڈ ماسٹر لالہ سندر لعل جی کتنے اچھے آدمی ہیں۔ درویش صفت انسان ہیں۔ مولوی محمد رضا صاحب ہیں اور بھی سب استاد بہت اچھے ہیں۔

نہیں بالو۔ میں اب یہاں نہیں پڑھوں گا۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور پھر

اپنے والد کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔
ٹھیک ہے بیٹے۔ میں ابھی واپس جاتا ہوں۔ تمہاری بہن اکیلی ہوگی۔ میں صبح سورج نکلنے سے پہلے آجاؤں گا۔ تمہارے لیے کھانا اور صابونی حلوہ بھی لیتا آؤں گا۔ اور پھر ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی بات کر دوں گا۔
لیکن بابو اب تو بہت اندھیرا ہو گیا ہے۔ گاؤں یہاں سے بہت دور ہے آپ کیسے جائیں گے۔
چلا جاؤں گا بیٹے۔ میرا گھر واپس جانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ تمہاری بہن پوری رات فکر و اندیشے میں تڑپتی رہے گی۔
میں سسک سسک کر رونے لگ پڑا اور میرے والد بڑی دیر تک کھڑے مجھے چومتے رہے۔ اور میرے سر پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرتے رہے۔
بابو میں بھی آپ کے ساتھ گھر آؤں گا۔ کل تو اتوار ہے سکول میں تو چھٹی ہے۔
ٹھیک ہے بیٹا۔ لیکن یہ ظالم منشی تمہیں نہیں جانے دے گا۔
آپ اُن سے پوچھ تو لیں۔
پوچھنا بے کار ہے بیٹے۔ تم کہتے ہو تو پوچھ لیتا ہوں۔ لیکن مشکل نظر آتا ہے۔
میرے والد سپرنٹنڈنٹ صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ وہ جفا جو انسان یہ سب مناظر اپنے کمرے میں بیٹھا شیشے سے دیکھ رہا تھا میرے والد کو اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دروازہ کھول کر خود ہی باہر نکل آیا۔
کیوں بڈھے۔ مجھے سکھ کا سانس لینے دے گا یا رات گئے تک اسی طرح پریشان کرتا رہے گا۔
نہیں جناب۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔
اب پھر کیا ہو گیا ہے؟
جناب آپ مہربانی فرما کر اجازت دیں تو میں اپنے بیٹے کو گھر لے جاؤں۔ اس کی بہن

شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ سوموار کو صبح سویرے اسے میں خود یہاں آکر چھوڑ جاؤں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔

اگر اپنے بیٹے کو اب لے جاتے ہو تو اسے پھر واپس ہرگز نہ لانا۔ ایسے ناہنجار کی اس ہوسٹل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

میرا والد تھکا ماندہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس آگیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ بیٹا میں نہ کہتا تھا کہ وہ ظالم تمہیں جانے کی اجازت نہ دے گا۔ اب تو ویسے بھی رات پڑ گئی ہے۔ رات یہاں ہی سو کر گذارو صبح سویرے تمہارے جاگنے سے پہلے میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ سارا دن باپ بیٹا اکٹھے رہیں گے۔ میں اپنے بیٹے کو قصہ حاتم طائی سناؤں گا۔ اور پھر اگر موقعہ ملا تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی مل کر اس ضمن میں بات کروں گا۔

میرا والد مجھ سے صبح سویرے ملنے کا وعدہ کر کے واپس چل پڑا۔ میں تھوڑی دور تک اپنے والد کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری مجبوری اور بے چارگی کا اندازہ لگائیے میں اپنے شفیق باپ کے ساتھ اپنی پیاری بہن کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن ایک ظالم انسان کی جھوٹی انا میرے راستے میں حائل تھی۔ نہ جانے اسے ایک معصوم پردیسی بچے پر اس قدر ظلم روا رکھنے میں کیا مزا ملتا تھا۔

میرے والد نے تھوڑی دور جا کر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بے بس انسانوں کی مجبوری۔ میرا باپ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن نہیں لے جا سکتا تھا۔ اب چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ دور مشرق میں سکیسر کے سلسلہ کوہ سے محزوں چاند کسی شرمائی ہوئی، لجائی ہوئی دوشیزہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ میں سوچنے لگا چاند نکل آیا تو میرے والد کو چھ میل کا یہ دشوار گذار سفر پیدل طے کرنا آسان ہو جائے گا۔ ابھی وہ کوئی زیادہ دور نہ گئے ہوں گے۔ کیوں نہ بھاگ کر اپنے والد سے جا ملوں۔ اور صبح ہونے سے پہلے واپس پہنچ جاؤں۔ میں ابھی خیالات کے انہی تانوں بانوں میں الجھا ہوا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے چچا قاسم کو آواز دی

اور تاکید کی۔

چچا اس لڑکے کا خاص خیال رکھنا۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔

نہیں حضور بے چارے نے کہاں بھاگ کر جانا ہے۔ اوہر ہی ہے۔ چچا قاسم نے یہ بات بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہی۔

ماسٹر صاحب تسلی کرنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف واپس چلے گئے۔ اور چچا قاسم برتن مانجھنے لگ گیا اور میں چچا کے قریب پڑی ایک جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھ کر کوہ سکیسر میں واقع ڈھوکوں کے ٹمٹماتے ہوئے دیئوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے وہ دیئے بہت اچھے لگے۔ جیسے دور ستارے کوہ سکیسر کی چوٹی پر جھلملا رہے ہوں۔ چونکہ ہمارا سکول اور اس کا بورڈنگ ہاؤس آبادی سے ذرا ہٹ کر مشرق میں جنگل سے بالکل ملحق تھا۔ اس لیے اندھیرا ہوتے ہی کچن کے نزدیک گیدڑوں کے غول منڈلانا شروع کر دیتے۔ اب وقفے وقفے سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ جس سے وہاں کی فضا اور بھی اداس اور بھیانک ہو گئی تھی۔ چچا نے اُٹھ کر گیدڑوں کو پتھر مار کر بھگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماحول پُر سکون ہو گیا۔ میں چچا کی چارپائی سے اُٹھ کر اندر ہوسٹل کے کمرے میں گیا۔ لالٹین جلائی۔ اور پھر اپنا بستر اور چارپائی باہر نکالی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ چارپائی پر لیٹ گیا پھر کچھ خبر نہیں کہ رات کیسے گذری۔

کسی نے نہایت زور زور سے مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھانا چاہا لیکن میرا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر کروٹ بدل کر کھینچ کر چادر اپنے اُوپر کس لی۔

اٹھو میرے بیٹے۔ اُٹھو۔

یہ تو میرے شفیق باپ کی آواز تھی۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ میرے والد میرے پاس کھڑے ہوئے مجھے جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں کچھ اُٹھا رکھا تھا۔ مجھے یقین نہ آ رہا تھا میرے والد تو ابھی گاؤں گئے تھے۔ اتنی جلدی وہ واپس کیسے آ گئے۔ انہوں نے پیار

سے میری گالیں تھپتھپاتے ہوئے مجھے اُٹھنے کے لیے کہا۔

کیوں بالو آپ گئے نہیں۔ میں نے حیران کن نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

گیا تھا بیٹا۔ ابھی آیا ہوں۔ تمہاری بہن نے تمہارے لیے صابونی حلوہ بھجوایا ہے وہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔

لیکن آپ اتنے سویرے کیسے آگئے۔ ابھی تو اندھیرا ہے۔

نہیں بیٹا اب تو رات ختم گئی ہے۔ (یعنی سحری ہوگئی ہے) میں نماز پڑھتا ہوں، تم اُٹھو وضو کرو اور نماز پڑھو۔ پھر یہ حلوہ چچا قاسم کو دو۔ وہ گرم کر دے گا۔ اسے کہنا اپنے لیے اور منشی جی کے لیے بھی نکال لے۔

ٹھیک ہے بالو۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ میرے والد وہاں سے اُٹھ کر کچن کے نزدیک ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی مسجد میں نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے صابونی حلوہ کا ڈبہ چچا قاسم کو دیا اور اُسے بتایا کہ اسے ہمارے لیے گرم کر دے اور اپنے لیے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لیے اس سے نکال لے چچا قاسم نے ڈبہ کھول کر دیکھا اور ایک نوالہ منہ میں ڈالا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں وضو کر کے نماز پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ ابھی میں اور میرے والد نماز سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے آئے۔ انہوں نے میرے والد کو دیکھا تو آگ بگولا ہو گئے اور کہنے لگے۔

اوئے بڈھے تو ہماری اجازت کے بغیر رات کو بورڈنگ ہاؤس میں کیوں ٹھہرا ہے!

نہیں حضور میں تو ابھی اپنے گاؤں سے آیا ہوں۔ بچے کے لیے کھانا لایا ہوں۔ یہ سُن کر چچا قاسم سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ جناب یہ تو ابھی آیا ہے۔ رات کو تو واپس چلا گیا تھا۔ یہ سُن کر ماسٹر صاحب کا پارہ کچھ کم ہوا اور وہ وضو کرنے کے بعد نماز میں مشغول ہو گئے۔ چچا قاسم حلوہ گرم کر کے لے آیا۔

میں اور میرے والد دونوں کچن کے قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر حلوہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ چچا نے خود بھی حلوہ کھایا اور ماسٹر صاحب کی خدمت میں بھی پیش کیا جو انہوں نے جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے لے لیا۔

آج اتوار کا دن تھا۔ پورا دن میرے والد نے میرے ساتھ گذارا۔ ہم بڑی دیر تک ہوسٹل کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے گھر کی باتیں کرتے رہے۔ میرے والد میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ کہنے لگے۔ کل صبح تو گاؤں کے سب لڑکے واپس آجائیں گے۔ پھر اگلے ہفتے تم بھی اُن کے ساتھ آجانا۔ چند ہی روز کی تو بات ہے۔ ہم دن بھر خوش گپیوں میں مشغول رہے۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ چچا قاسم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے والد کو حقہ کا کش لگوا جاتا۔ تھوڑی دیر وہ اُن سے باتیں کرتا اور پھر کچن کی طرف چلا جاتا۔

سورج اب مغرب میں کوہ ڈھک کی چوٹیوں پر اپنی الوداعی سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا۔ چرواہے اپنے اپنے ریوڑ لیے واپس گاؤں کو آرہے تھے۔ گاؤں میں جا بجا تنوروں کا دھواں اُٹھ رہا تھا میرے والد نے اپنی چادر جھٹک کر کاندھے پر رکھی اور اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے۔

اچھا خدا حافظ میرے بیٹے۔ اور پھر کہنے لگے۔ میں آج بھی کل کی طرح رات گئے دیر سے گھر پہنچوں گا۔ تمہاری بہن انتظار کر رہی ہوگی۔

میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور پھر آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو بہنے لگ گئے۔ میرے والد نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

جوان مرد بنو۔ اتنی چھوٹی سی بات سے گھبرا گئے ہو۔ اب منشی جی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا۔

چچا قاسم نے میرے والد کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا اور میرے والد کو مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

بس ملک صاحب جانے کی تیاری ہو گئی ہے۔ آپ چھوٹے ملک کی کوئی فکر نہ کریں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچہ ہے نا آخر۔ کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں اُداس ہو گیا ہے۔ اگر یہ کل دوسرے لڑکوں کے ساتھ گھر چلا گیا ہوتا تو کل اُن کے ساتھ خوشی خوشی واپس آ جاتا۔ اب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ماسٹر صاحب سے بات کروں گا۔

اور پھر وہ میرے والد کے ساتھ چلتا ہوا ہوسٹل کے بیرونی گیٹ تک گیا۔ وہاں وہ رُک گئے۔ وہاں سے پلٹ کر میرے والد نے میری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں بلک بلک کر رو رہا تھا۔ میرے والد اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے شاید دل پر جبر کرتے ہوئے پھر میری طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔

پرندے قطار اندر قطار اپنے ٹھکانوں کو واپس آ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا ہر ذی نفس دن بھر کی تگ و دو کے بعد شام کو اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتا ہے۔ ایک میں بد قسمت ہوں کہ اس وقت اپنے گھر سے اپنے شفیق باپ اور پیاری بہن سے دور اذیتناک اور ہجر و فراق کے ان لمحوں میں ایک ان دیکھی آگ میں مستقل طور پر جل رہا ہوں۔

اب میرے والد میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ شاہ والی بَن کی ٹاہلیاں بھی اندھیرے میں ڈوب چکی تھیں۔ جانب شمال جس طرف میرا گاؤں تھا، اس طرف اداسی اور ویرانی کا راج تھا۔ ایک بے نام سی افسردگی کے باعث میں بوجھل قدموں سے واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں اپنی مجبوری اور بے بسی کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا اسی طرح طاقتور لوگ کمزوروں پر روزِ ازل ہی سے ظلم ڈھاتے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں بے بس اور مجبور رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کی خواہشوں کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

چچا قاسم کی آواز سے میں چونک پڑا

آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔

نہیں چچا مجھے بھوک نہیں ہے۔

تھوڑا سا ہی کھالو۔

نہیں چچا دل نہیں ہے۔

اچھا تمہاری مرضی اور پھر چچا قاسم اپنے کچن کے کام میں لگ گیا۔ ابھی اس نے ماسٹر صاحب کو بھی کھانا کھلانا تھا۔ دوسرے دن کے لیے سب بورڈر لڑکوں کے لیے راشن وغیرہ تولنا تھا۔

میں کمرے کے اندر آیا اور چارپائی باہر نکالی اور بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر نیند کے مزے لینے لگ گیا۔ اب میں گھر میں تھا میرا شفیق باپ چچا محمد شاہ کے خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ میری رحمدل بہن میرے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ میں بے حد خوش تھا۔ یہاں کوئی سپرنٹنڈنٹ نہ تھا کوئی انور نہ تھا۔ وہی گھر کا جانا پہچانا ماحول تھا۔ لیکن میں تو پوری ایک صدی کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس طویل عرصے میں کچھ بھی تو تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس گھر میں تو صدیاں پلک جھپکتے ہی بیت جاتی ہیں۔ لیکن اگر ہوسٹل میں رہنا پڑ جائے اور وہاں نگرانی پر کوئی جابر اور قاہر سپرنٹنڈنٹ مامور ہو تو وہاں ایک ایک پل صدیوں پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ میرے اس چھوٹے سے کچے گھر میں کوئی جبر کوئی گھٹن نہ تھی۔ میں محلے کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیل رہا تھا۔ شاہ لطف ؒ والی ٹاہلی پر چڑھ کر دوسرے لڑکوں کے ساتھ میں بھی تالاب میں چھلانگیں لگا رہا تھا۔ یکایک مجھے خوفناک چنگھاڑیں سنائی دیں میں سمجھا کہ شاہ لطف ؒ والی ٹاہلی پر جو جن مستقل طور پر رہتا ہے وہ بار بار لڑکوں کا ٹاہلی پر چڑھنے کی وجہ سے غصے میں آگیا ہے۔ کسی نے میری چارپائی کو زور سے ٹھوکر ماری۔ کوئی چنگھاڑ رہا تھا۔

ابھی تک پڑا ہے۔ یہ تیرے اس بڈھے باپ کا گھر تو نہیں ہے۔ یہ بورڈنگ ہاؤس ہے۔ یہاں تو زندگی قواعد و ضوابط کے مطابق گذاری جاتی ہے۔

میں جلدی سے چھلانگ لگا کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا محترم سپرنٹنڈنٹ صاحب آگ بگولا ہوئے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھے جا رہے

تھے۔ میں سہم کر چارپائی کی دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے مسجد کی طرف چلے گئے۔ میں نے بستر لپیٹتے ہوئے جلدی سے چارپائی اُٹھائی اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

نماز سے فارغ ہو کر میں مسجد سے باہر آیا تو چچا قاسم خان نے رات کی بچی ہوئی روٹی اور چنے کی دال مجھے گرم کر کے دی۔ اس زمانے میں چائے کا کوئی رواج نہ تھا۔ گھروں میں ہوتے تو ہم رات کی بچی ہوئی روٹی صبح سویرے دہی کیساتھ کھا کر ناشتہ کرتے اور یہاں بورڈنگ ہاؤس میں یہ دال روٹی بھی غنیمت تھی۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا۔ اپنی سیٹ پر جھاڑو لگایا۔ بستر ٹھیک کیا اور پھر اپنی کتابیں سنبھال کر بستہ اُٹھا کر باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے مجھے اپنے گاؤں کی سمت دیکھنے اور درختوں کے جھنڈ میں شاہ والی بن کی ٹاہلیاں تلاش کرنے میں کیا مزہ ملتا کہ جب بھی مجھے گھر یاد آتا تو میں اُنہیں ٹاہلیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر ایک گونہ اطمینان حاصل کر لیتا۔

○

مشرق میں کوہستان نمک کی دور افتادہ پہاڑیوں سے سورج اب جھانک رہا تھا۔ مشرق سے پھوٹتا ہوا نور کا ایک ریلا دنیا کو منور کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا میرے گاؤں کے میرے ساتھی لڑکے ابھی تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والے ہوں گے۔ مجھے فتح خان، زور خان، شاہ میرا خان اور عطا محمد کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ گاؤں میں وقوع پذیر ہونے والی نئی نئی باتوں سے مجھے آگاہ کریں گے۔ کل دندہ شاہ بلاول اور چکڑالہ والوں کی کبڈی تھی۔ پتہ نہیں کون جیتا ہو گا۔ خدا کرے میرے گاؤں کے جوان جیتے ہوں۔ ہمارے گاؤں کے شیر خان اور محمد یار اعلیٰ درجے کے کھلاڑی تھے۔ جنہوں نے اب تک کسی سے بھی شکست نہ کھائی تھی۔ شاید بھائی فتح خاں میرے گھر سے میرے لیے مرونڈا بھی لے کر

آئے گا۔ جو میں پورا ہفتہ مزے سے کھاؤں گا۔ چونکہ بورڈنگ کا کھانا اچھا نہ ہوتا تھا اس لیے پیٹ بھر کر ہم کھانا نہ کھاتے تھے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بھوک ستانے لگتی تھی۔

اب سکول میں مقامی طلبا آنے شروع ہو گئے تھے۔ میری ان میں کسی کے ساتھ شناسائی نہ تھی۔ اس لیے میں بدستور سہما ہوا ہوسٹل کے برآمدے ہی میں فرش پر بیٹھا رہا اب میں اس انتظار میں تھا کہ میرے گاؤں کے لڑکے آئیں اور میں جلد سے جلد اُن سے ملوں۔ اور گاؤں کے تازہ حالات سے آگاہی حاصل کروں۔

ہمارے گاؤں کے لڑکوں کی پہلی ٹولی آتی ہوئی نظر آئی۔ ان میں فتح خان، جہان خان، غلام قادر اور محمد اکرم تھے۔ میں نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں اُٹھ کر برآمدے سے نیچے آیا اور آہستہ آہستہ ہوسٹل کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ آنے والے لڑکوں میں فتح خان اور جہان خان میرے عزیز تھے۔ میں نے گیٹ پر ان کو خوش آمدید کہا۔ یہ دونوں مجھ سے سینیئر تھے اور آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں نے ان دونوں کی گٹھڑیاں پکڑ لیں اور ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ فتح خان نے بتایا کہ ونده شاہ بلاول والے کبڈی جیت گئے ہیں اور میری بہن مجھے بہت ہی یاد کرتی تھی۔ میری بہن نے میرے لیے چنے کا مرونڈا بھی بھیجا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنا سامان کھولا اور فتح خان نے ایک کپڑے میں بند سا ہوا میرا مرونڈا مجھے دیا۔ اور پھر وہ اپنی اپنی کتابیں سنبھالنے میں مشغول ہو گئے۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری بہن نے میرے ایک پرانے کرتے کی تھیلی بنا کر اس میں مرونڈا ڈال کر اُسے سی دیا تھا۔ میں ایک انجانی خوشی کے احساس سے سرشار کھڑا آنے والے لڑکوں کی بدحواسیاں دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔ میں اپنے سب دُکھ بھول چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بھی ابھی ابھی ان کے ساتھ گاؤں سے آیا ہوں۔ میں نے مرونڈا اپنے بکس میں رکھا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔ اب تقریباً تقریباً ہوسٹل کے سب لڑکے واپس آ چکے تھے۔ سکول میں پہلے کی طرح

چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ رام لعل زور زور سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ میاں محمد کمہار جو سکول اور بورڈنگ ہاؤس کے لیے نالہ ترپی سے پانی لاتا تھا۔ اپنے گدھوں پر پانی لادے ابھی ابھی سکول میں داخل ہوا تھا۔ مقامی لڑکے سکول کے گراؤنڈ میں مختلف ٹولیاں بنا کر گیند سے والی بال کھیل رہے تھے۔ جو کھیل نہیں رہے تھے وہ ایک طرف کو بیٹھے ان کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ ہر بال کے ساتھ اپنے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

دور سے لالہ سُندر لعل صاحب ہیڈ ماسٹر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سکول کے طلبا اور اساتذہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ لالہ جی نہایت ہی شفیق، محنتی اور اعلیٰ درجے کے استاد تھے۔ وہ اپنے طالب علموں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ موصوف مذہب کی قید سے بے نیاز ہوکر ہر ایک سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے ہوسٹل کے سپرٹنڈنٹ صاحب بھی اپنے کمرے سے نمودار ہوئے۔ موصوف خوش شکل، دراز قد اور خوش لباس شخص تھے۔ لیکن مزاج کے بے حد کڑوے تھے۔ تمام لڑکے ان کو دیکھ کر سہم کر ایک طرف کو سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے تمام اساتذہ بھی آ گئے۔ اور پھر گھنٹی بجنی بند ہوگئی سب لڑکے دعا کے لیے گراؤنڈ میں اکٹھے ہو گئے۔ حسب معمول دعا ہوئی اور پھر سب لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔

O

سکول کے یہ معمولات اسی طرح چلتے رہے۔ اب مجھے اس سکول میں داخل ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اب میں ہر ہفتے گھر جاتا تھا۔ اتوار گھر پر گذار کر سوموار کو صبح سویرے مرغ کی پہلی آذان کے ساتھ گاؤں سے دوسرے لڑکوں کے ساتھ چلتا تھا اور مقررہ وقت پر سکول پہنچ جایا کرتا تھا۔

سینئر لڑکے تعلیم مکمل کر کے سکول چھوڑ چکے تھے۔ فتح خان اور جہان خان، فوج میں

بھرتی ہو کر لکھنؤ اور جبل پور جا چکے تھے۔ اب زور خاں اور میں گاؤں کے لڑکوں کے بزعم خود لیڈر بنے ہوئے تھے۔ زور خان عمر میں تو مجھ سے دو تین سال بڑا تھا۔ لیکن کمزور اور نحیف و نزار تھا۔ اس لیے اکثر گاؤں آتے جاتے راستے میں اس کی پٹائی کرتا تھا۔ وہ تھا نہایت چالاک اور عیار گاؤں جا کر کسی نہ کسی بہانے میرے والد کے پاس جھوٹی سچی شکایتیں لگاتا۔ اور لادہ واپس آتے تو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس رونی صورت بنا کر شکایتوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتا۔ شروع شروع میں تو مجھے دونوں جگہوں سے باقاعدگی کے ساتھ سزا ملتی لیکن آخر کار میں نے حالات کے مطابق اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ اب وہ سکیمیں مرتب کرتا تھا اور میں ان پر عمل درآمد کرواتا تھا۔

○

گرمیوں کے دن تھے۔ گاؤں کے سب لڑکے سوموار کی صبح سویرے گاؤں سے لادہ کے لیے روانہ ہوئے۔ گاؤں سے کوئی تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم جب ونڈہ شاہ بلاول اور لادہ کی حد پر پہنچے تو وہاں سڑک کافی ریتلی تھی۔ وہاں دم لینے کے لیے سب لڑکے بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ریت پر بیٹھنے اور اسے ہاتھوں میں لینے سے ایک گونہ راحت سی محسوس ہوئی۔ سب نے اپنی اپنی پوٹلیاں کھول کر مرونڈے یا کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز نکال کر کھانی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر تک مرونڈے کھاتے رہے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔ پھر چچا کی تجویز پر (ہم سب پیار سے زور خان کو چچا کہتے تھے) اپنی اپنی گٹھڑی سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کے ساتھ رکھ دی۔ اور کبڈی کھیلنے لگے۔ اس کھیل میں ایسے مشغول ہوئے کہ وقت کا بالکل احساس ہی نہ ہوا۔ اتنے میں ونڈہ کی سمت سے بابا عطر دکرا اڑا اپنے گدھے پر بیٹھا آتا دکھائی دیا۔ سب ڈر گئے بابا واپس جا کر ہمارے گھروں میں بتا دے گا کہ ہم لوگ آج سکول پڑھنے کے لیے نہیں گئے۔

اتنے میں بابا ہمارے پاس پہنچ گیا اور اپنے گدھے سے اُتر کر اس کی رسی ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

تم لوگ، آج سکول کیوں نہیں گئے۔ سحری کے وقت گاؤں سے چلتے ہو۔ دیکھو اب کیا وقت ہوگیا ہے۔ تم لوگ ابھی تک یہاں آدھے راستے پر ہی کھیل رہے ہو بابا نے مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

بابا آج چھٹی ہوگئی ہے۔ ہم لوگ تو لاوہ پہنچ کر سکول سے لوٹ کر آرہے ہیں۔ میں نے بابا عطر سنگھ کے قریب جاکر نہایت ہی پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

چھٹی کس بات کی ہوگئی ہے۔ بابا نے پوچھا۔

شہنشاہ جارج پنجم کی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ اس خوشی میں چھٹی ہوگئی ہے۔

تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا ہے۔

سکول پہنچے تو رام لعل چپڑاسی سکول کی آرڈر بک لے کر کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آرڈر بک پر اس چھٹی کا آرڈر اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور میں اب اس پر سب ماسٹر صاحبان کے دستخط کروانے کے لیے آیا ہوں۔

بابا عطر سنگھ کو یقین تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ تم بتاؤ جارج پنجم کی بیٹی پیدا ہوئی ہے ٹھیک ہے لیکن اس کا نام بادشاہ صاحب نے کیا رکھا ہے۔

یہ سوال اگرچہ اپنی جگہ پر بے تکا تھا اور اس کا جواب میں نہ دیتا تو اچھا ہوتا لیکن میں نے یونہی بغیر سوچے سمجھے بلا جھجک کہہ دیا

بابا جی بادشاہ کی لڑکی کا نام مسری ہے۔ اور سب لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بابا شرمندہ ہوگیا۔ اور بوکھلا گیا۔ سب لڑکے دیر تک تالیاں بجاتے رہے اور ہنگامہ کرتے رہے۔ بابا تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "چھٹی ہوئی ہے تو تمہاری ہوئی ہے۔ میں تو اپنا سودا سلف جاکر خریدوں۔" اور پھر وہ ہمیں وہاں

ہی چھوڑ کر اپنے گدھے کو ہانکتا ہوا الاوہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر اور وہاں کھیلتے رہے۔ جب تھک گئے تو سڑک کی بڑی بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر سستانے لگ گئے۔ جب سورج سر پر آگیا تو بجائے سکول جانے کے ہم سب کے سب واپس اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں چچا زرخان کی ہدایت پر یہی طے ہوا کہ گھر جا کر یہی بتانا ہے کہ ہم لوگ سکول وقتِ مقررہ پر حاضر ہو گئے تھے لیکن ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اٹک کے دفتر سے تار آگیا تھا کہ شہنشاہ جارج پنجم کی بیٹی پیدا ہوئی ہے اور جس کا نام تبل مسبری رکھا گیا ہے۔ اس خوشی میں پورے ہندوستان میں آج تعلیمی ادارے بند رہیں گے۔ اور ملک میں جشن منائے جائیں گے۔

چنانچہ جب ہم اپنے گاؤں واپس پہنچے تو سورج مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ پیاس کے مارے ہم سب کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے شاہ والی بن (تالاب) آتی ہے۔ بن پر واقع مسجد میں گئے اور خوب مزے سے ٹھنڈا پانی پیا اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں جونہی اپنے دروازے سے اندر داخل ہوا تو میری بہن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

آج تم پھر سکول سے بھاگ کر آگئے ہو نا۔ شام کو ماموں جان آئیں گے تو تمہاری خوب پٹائی کریں گے۔

نہیں باجی! خدا کی قسم چھٹی ہوگئی ہے اور پھر میری بہن مسکرا پڑی جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آرہا ہو۔

میں تھوڑی دیر تک گھر میں بیٹھا رہا۔ اور پھر موقعہ پاتے ہی بھاگ نکلا اور فوراً کھیل کے میدان میں جا پہنچا۔ وہاں کچھ لڑکے پہلے سے کبڈی کھیل رہے تھے اور کچھ گیند بلا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے کھڑا اُن کو دیکھتا رہا اور پھر قمیض اُتار کر شلوار کے پائینچے اُڑس کر کبڈی کھیلنے والوں کے ساتھ میں بھی شامل ہوگیا۔ ابھی ہم کبڈی کھیل ہی رہے تھے کہ میں نے اپنے والد کو آتا دیکھا وہ بیلوں کو ہانکے گھر واپس آرہے تھے۔ جب

ہمارے قریب پہنچے اور ان کی نظر مجھ پر پڑی تو تھوڑی دیر کے لیے وہ کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ دو قدم آگے کو چل کر رُک گئے اور مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ مَیں نے قریب جا کر سلام کیا اور سہم کر کھڑا ہو گیا۔ میرے والد میری نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ میں سکول سے بھاگ کر آیا ہوں۔

کیوں میاں تم آج سکول نہیں گئے۔ میرے والد نے بڑے دھیمے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

بائو گیا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ آج چھٹی ہے۔ پھر ہم سب واپس آ گئے۔

سب لڑکے واپس آ گئے ہیں یا صرف تم ہی آئے ہو۔

نہیں بائو سب آئے ہیں۔

اچھا ٹھیک ہے۔ آؤ گھر چلیں۔ اب دیر ہو گئی ہے۔ قمیض پہن لو۔

اور پھر میں نے دوڑ کر قمیض پہن لی اور والد کے ساتھ بیلوں کے پیچھے پیچھے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں میرے والد نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔

تم سکول سے بھاگ کر تو نہیں آئے۔

نہیں بائو حضرت پیر کی قسم بھاگ کر نہیں آیا ہوں۔ مَیں سب لڑکوں کے ساتھ ہی واپس آیا ہوں۔

میرے والد ہلکا سا مسکرائے۔ نہ جانے انہیں میری اس قسم پر کیوں یقین نہ آ رہا تھا۔ بہن نے بیلوں کو کھرلی پر باندھا۔ ان کے آگے چارہ ڈالا اور اتنے میں میرے والد ہاتھ منہ دھو کر، کپڑے بدل کر، پھالا لے کر لوہار کے پاس اسے ٹھیک کروانے کے لیے چلے گئے۔ اور میں خوش ہو گیا کہ چلو آج تو گلو خلاصی ہوئی۔ مَیں منہ ہاتھ دھو کر شام کے کھانے کی تیاری کرنے لگ گیا۔ مَیں نے کھانا شروع کیا ہی تھا کہ میرے والد میاں محمد لوہار کے گھر سے واپس آ گئے۔ انہوں نے پھالا چُولہانہ (کھلا باورچی خانہ) کی

دیوار پر رکھا اور کسی سے بات کیے بغیر اپنا حقہ تازہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ میری بہن نے ان کو کھانا کھانے کے لیے کہا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کے لہجے میں درشتی نمایاں تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں سوچنے لگا جب وہ کھیتوں سے واپس گھر آئے تھے تو اس وقت تو ان کا موڈ اچھا تھا۔ اب کھانا کھانے کو میرا جی نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ کھاتا رہا۔ میرے والد صحن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پینے لگ گئے۔ ایک بھرپور کش لگایا اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔

کھانا کھا لیا ہے تو اِدھر آؤ میری بات سنو۔

بابو ابھی کھا رہا ہوں۔

جلدی کرو۔ میں تم سے تتّل مسری کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔

یہ سُن کر میرا تو خون ہی خشک ہو گیا۔ میں کوئی جواب دیے بغیر چولہا نہ میں پڑھی پر بیٹھا آہستہ آہستہ کھانا کھاتا رہا۔ میرا تو خوف کے مارے کھانا بھی حلق سے نیچے نہ اُتر رہا تھا۔

جلدی کرو۔ کتنا وقت لگاؤ گے تم کھانا کھانے میں۔ غصے سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

آتا ہوں بابو۔ لیکن مجھے تو ایسی کوئی کہانی نہیں آتی۔

سب لڑکوں کو آج تم نے سکول کیوں نہیں جانے دیا۔ زور خان اور دوسرے لڑکے جو پڑھنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔ ان کو تم نے مارا اور پھر زبردستی روک لیا۔ زور خان نے مجھے سب صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ یہ تتّل مسری کا کردار تمہارا ہی تو تخلیق کردہ ہے۔

والد کی یہ باتیں سُن کر میرا تو خون ہی خشک ہو گیا۔ اگرچہ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ لیکن سکول کی غیر حاضری کو وہ کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور بری طرح زدوکوب کرتے تھے۔ اب آج کی کارکردگی کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ مجھے دل ہی دل میں چچا زور خان پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ دل میں سوچتا اس کم بخت کی کل اچھی

خبر لوں گا۔

میرے والد اُٹھ کر بیلوں کے لیے چارہ لینے مکان کے اندر گئے۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور جلدی سے گھر سے کھسک گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے والد حسب سابق میرے تعاقب میں کھیلنے کی سب متوقع جگہوں پر مجھے تلاش کرنے اور پکڑنے کے لیے آئیں گے۔ اس لیے میں اپنے محلہ سے بہت دور یعنی کم از کم دو تین محلے دور کھیلنے کے لیے چلا گیا۔

O

چاند نکل آیا تھا۔ میدان میں چاند کی خنک اور دودھیا روشنی پھیلتی جا رہی تھی ابھی تک کوئی لڑکا کھیلنے کے لیے وہاں نہیں پہنچا تھا۔ میں اکیلا وہاں بیٹھا کھیلنے کے لیے آنے والے لڑکوں کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر اور دیکھا جب کوئی اور لڑکا نہ آیا تو میں بوجھل قدموں سے مجاوروں والی پٹی کی طرف چل پڑا جہاں مشرقی محلے کے بچے کھیلنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس پٹی میں جانے کے لیے حضرت شاہ سلطان بلاول ؒ ہمدانی کے مزار سے ملحقہ قبرستان سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکا ماندہ بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ قبرستان کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی سے گزر کر مجھے اُس پٹی کی طرف جانا تھا۔ قبرستان کے درمیان میں پگڈنڈی کے بالکل ساتھ ایک جاحل کے درخت کے نیچے میری ماں کی قبر ہے۔ میں اس سے پیشتر کئی بار اپنے والد اور بہن کے ساتھ اپنی ماں کی قبر پہ آ چکا تھا۔ میں ایک دل شکستگی کے عالم میں اپنے غموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے جب اپنی ماں کی قبر کے پاس پہنچا تو کسی انجانے جذبے کے تحت وہاں رُک گیا۔ میں تھوڑی دیر اپنی ماں کی قبر کے سامنے کھڑا قبرستان کے ہولناک سناٹے کے متعلق سوچنے لگ گیا۔ یہ ایک مکمل شہر ہے۔ لیکن ویران اور خاموش شہر۔ جہاں ہر کوئی اپنے اعمالوں کی گٹھڑی لیے محوِ خواب ہے۔ ہمارے ماسٹر مولوی محمد رضا صاحب کہتے ہیں کہ جب کوئی

زندہ آدمی کسی قبر پر جاتا ہے تو صاحب قبر اس کو پہچان لیتا ہے۔ کیا میری ماں بھی اس وقت مجھے دیکھ رہی ہوگی۔ اگر فی الحقیقت مجھے دیکھ رہی ہوگی تو اپنے پیارے بیٹے کو دیکھ کر کس قدر خوش ہو رہی ہوگی۔ میں ماں کی قبر کی طرف منہ کر کے اس کے سینے کے برابر بیٹھ گیا۔ میں تصور ہی تصور میں اپنی ماں سے کہنے لگا

"اے میری پیاری ماں، تو خود تو یہاں آرام سے محو خواب ہے لیکن تجھے کیا پتہ کہ تیرا نحیف و نزار اور کمسن بیٹا راحت کی تلاش میں آج کہاں کہاں مارا مارا پھر رہا ہے اس بھری دنیا میں تیرے بعد اب مجھ سے پیار کرنے والا کوئی ذی روح نہیں ہے۔ اب تو میرا باپ بھی مجھے مارتا ہے۔ آج میں اس سے چھپ کر تیری گود میں پناہ لینے آیا ہوں۔" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اے میری ماں مجھے اب اپنی گود میں چھپا لے۔ دنیا کے غموں سے مجھے بچالے۔ اے میری پیاری امی اب میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔ کیا تو مجھ سے بات نہیں کرے گی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے۔ اے میری ماں یہ دنیا تو دکھوں کا گھر ہے۔ میں یہ سب کچھ تیری مدد کے بغیر کیسے برداشت کر سکوں گا۔ تمہارے چلے آنے کے بعد پہلے تو میرا باپ میرے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ مجھے مٹھائی لا کر دیتا تھا لیکن اب اس کیا تھ ساتھ مجھے مارتا بھی ہے۔ اے ماں دوسرے بچوں کو اگر ان کے باپ مارنے لگیں تو وہ دوڑ کر ماں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن اے ماں میں کس کی ذات میں پناہ تلاش کروں۔ ماں کی مامتا تو مجھے اب کہیں سے نہیں مل سکتی۔ کیا تو ان سب باتوں سے واقف ہے جو کچھ میرے ساتھ بیت رہی ہے تو کیا ان سب باتوں سے آگاہ ہے۔ اگر تو ان سب باتوں سے آگاہ ہے تو اے میری ماں مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لے۔ مجھے اپنی ذات میں پناہ دے دے۔ کیا تو زندہ ہوتی تو تو بھی میری شرارتوں سے تنگ آکر مجھے مارتی۔ تمہارے بعد اس دنیا میں میرا باپ ہی مجھے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے لیکن اے میری ماں وہ بھی اب مجھے مارتا ہے۔ اس بھری دنیا میں مجھے کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔ نہیں امی میں آج یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا۔ بلکہ تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ تو تو مجھے نہیں

مارے گی نا۔

میرا دل رنج و غم کے باعث حزن ہو رہا تھا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے یکایک میں نے محسوس کیا کہ پوری دنیا میں گھور اندھیرا چھاتا جا رہا ہے۔ ستارے ٹوٹ کر آفاق کی لامتناہی وسعتوں میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں اور میں برسوں سے بے آب و گیاہ صحراؤں میں بھٹکنے کے بعد اب ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کی وادی میں آگیا ہوں۔ یہاں امن ہے۔ طمانیت ہے اور ماں کی مامتا بھری گود ہے۔ وہ جامل کا درخت، جس کے نیچے میری ماں ابدی نیند سو رہی تھی۔ چپ چاپ، ایک شرمائی ہوئی حسینہ کی طرح اپنا جسم سمیٹے کھڑا تھا۔ میں اب اپنی ماں سے جُدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اب لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں اپنی صدیوں سے بچھڑی ہوئی ماں کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ علاقہ اعوان کاری کی روایتی قبروں کی طرح میری ماں کی قبر پر بھی چھوٹے چھوٹے گول پتھر اور بجری پڑی ہوئی تھی۔ پاؤں اور سرہانے کی طرف ڈیڑھ دو فٹ کے قریب عمودی شکل میں پتھر نصب تھے۔۔۔۔ میں کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر پہلو کے بل لیٹ گیا۔ اور پھر رُخ قبر کی طرف کرتے ہوئے میں نے اپنا داہنا ہاتھ قبر پر رکھ دیا۔ جیسے سوتے میں کوئی بچہ اپنی ماں کے سینے پر رکھ لے۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کاش میری ماں مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی سی لگی ہوئی تھی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر شہرِ خموشاں میں اس دُکھ بھری دنیا کا پل دو پل کا ایک مسافر تھا۔ اگرچہ میں پتھروں پر لیٹا ہوا تھا لیکن اُن کھُردرے پتھروں پر بھی میں ایک گونہ راحت محسوس کر رہا تھا۔ انجانے میں میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر قبر پر استادہ پتھر کے گرداگرد اپنے ہاتھ حمائل کی شکل میں ڈال دیئے جیسے میں نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال لی ہوں اور پھر اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی اور میں میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔ یہ سچ بات ہے کہ نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے، سولی پر بھی آجاتی ہے۔

ایک سنہری تخت پر نور کے ہالے میں بیٹھی ایک جواں سال حسین و جمیل خاتون مجھے نظر آئی۔ میں اسے حیران کن نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ یہ خد و خال میرے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں محفوظ تھے۔ میں سوچنے لگا یہ کون ہے۔ اس سے پہلے اس خاتون کو میں نے کہاں دیکھا ہے۔ وہ ایک عجیب سے وقار اور تمکنت سے تخت پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اس کے خد و خال کچھ کچھ تو میری ماں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن یہ میری ماں نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ ہوتی تو دوڑ کر مجھ سے لپٹ جاتی اور مجھے اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لیتی۔ اس خاتون میں شہزادیوں کی طرح کا وقار اور تمکنت تھی۔ میں نے اُسے اپنی جانب ملتفت پایا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا کر آسمان کی وسعتوں میں کسی چیز کو دیکھنے لگ جاتی۔ بار بار اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ لیکن یہ کون ہے۔ اسے کس کا انتظار ہے۔ یہ میری ماں تو نہیں ہو سکتی۔ اگر میری ماں ہوتی تو اسے میرے بغیر اور کس کا انتظار ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔ نہ جانے وہ اپنے خدا سے کیا مانگ رہی تھی۔

میں اس خوش کن نظارے میں محو تھا کہ کسی نے قبر کا پتھر میری گرفت سے چھڑا لیا اور مجھے پلٹ کر سیدھا کر دیا۔ پہلے میں قبر پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اپنی ماں کی چھاتی پر سویا ہوا تھا۔ مجھے یہ کس نے خواب راحت سے جگا دیا۔ کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

احمد۔ احمد۔ اُٹھو میرے بیٹے۔

یہ تو میرے باپ کی آواز تھی۔ میں یہ آواز سن کر سہم گیا۔ میرا باپ، مجھے جنت کی وادیوں سے کھینچ کر پھر دکھوں کی اس آماجگاہ میں لے آنا چاہتا تھا۔ میں ابھی اُٹھا نہیں تھا۔ بدستور نوکیلے پتھروں پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سنہری تخت پر بیٹھی ہوئی شہزادی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ میرا باپ مجھے ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ بار بار مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ڈر کے مارے ایک خوفناک چیخ ماری اور پھر سے ماں کی قبر کے ساتھ لگ کر لپٹ گیا۔ اور روتے ہوئے

کہنے لگا۔

اے میری پیاری ماں خدا کے لیے مجھے بھی اپنے ساتھ اپنی قبر میں پناہ دے دے میں اب گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی تھی۔

میرے والد یہ سب کچھ نہ برداشت کر سکے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئے اور بیٹھ کر مجھے چومنا شروع کر دیا۔

لیکن مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ میں دل میں سمجھتا تھا کہ اگر اب والد کے ساتھ یہاں سے گھر چلا گیا تو وہ بُری طرح پٹائی کریں گے۔ نہ جانے اس واقعہ کا میرے والد پر کیا نفسیاتی اثر ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔

اللہ پاک کی قسم ہے احمد اس کے بعد اب میں تمہیں کبھی نہ ماروں گا۔

لیکن میں تو اپنی ماں کی مامتا بھری گود سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ میں چیختے ہوئے پھر اپنی ماں کی قبر کے ساتھ لپٹ گیا۔ اے میری پیاری ماں اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ میرا باپ مجھے تم سے چھین کر لے جانا چاہتا ہے۔ شاید یہاں تو کچھ نہ کہے۔ کہ تم دیکھ رہی ہو لیکن گھر جا کر۔۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں اُمی میں آپ کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ میری پیاری اُمی تم بھی تو کچھ بولو۔ اس جبر و تشدد پر میرے باپ کو تم ہی کچھ سرزنش کرو۔

میرے باپ نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اب میرے خدشات میری نظروں کے سامنے تھے لیکن میرے والد خلافِ توقع بہت ہی پیار اور محبت سے مجھ سے کہنے لگے۔

آج کے بعد میں تم کو ہرگز نہ ماروں گا۔ لیکن ایک بات میری بھی مانو اور وہ یہ کہ سکول سے کبھی غیر حاضر نہیں ہونا اور اپنے سے کم عمر اور کمزور بچوں کو کبھی نہیں مارنا۔

نہیں بابو۔ کبھی نہیں ماروں گا۔ اور سکول بھی باقاعدگی سے جاتا رہوں گا۔

وعدہ کرو کہ تم پھر اپنے ذہن کے نہاں خانوں کسی تسلی سیسری کی تخلیق نہیں

کرو گے۔

مَیں جھینپ گیا اور میرے والد نے ایک قہقہہ لگایا جس سے بوجھل فضا چھٹنے لگی۔

۵

کھانا تو تم نے کھا لیا تھا آؤ اب معرکہ (چوپال) میں چلتے ہیں۔ سب معرکے والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ کئی روز سے مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں کہ احمد کو کہیں کہ وہ ہمیں کوئی نیا قصہ سنائے۔

لیکن بابو۔ قصہ تو سردیوں میں اندر آگ پر چولہے کے گرداگرد بیٹھ کر سننے میں مزہ آتا ہے۔ گرمیوں میں قصہ سنانے میں کچھ مزہ نہیں آتا۔

اور میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے معرکہ نواب خان کی طرف لے گئے۔ جب ہم معرکے کے اندر داخل ہوئے تو نواب خان اور جہان خان نے ہمارے لیے ایک چارپائی خالی کر دی۔ جس پر میرے والد۔ چچا محمد شاہ اور مَیں بیٹھ گئے۔ ہمارے علاقہ میں یہ رواج ہے کہ بڑوں کے ساتھ لڑکے بالے معرکوں میں نہیں بیٹھتے۔ میں ایک واحد ایسا بچہ تھا جسے میرے والد دو سال کی عمر سے جب سے کہ میری والدہ کا انتقال ہوا تھا ہر روز باقاعدگی سے معرکہ میں ساتھ لاتے تھے۔ مَیں جب چھوٹا تھا تو اکثر وہاں سو جاتا تھا۔ واپسی پر میرے والد مجھے سویا ہوا اُٹھا کر گھر لاتے۔ معرکے میں بیٹھنے والے تقریباً سب کے سب قریبی رشتہ دار اور ایک ہی کنبے سے تعلق رکھنے والے افراد تھے

وہ سب کے سب مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ میں جب ذرا بڑا ہوا اور پانچویں جماعت میں پہنچا تو پھر یہ لوگ سردیوں میں اکثر مجھ سے قصہ حاتم طائی سنا کرتے تھے اور خوب محظوظ ہوا کرتے تھے۔ میرے والد کو قصے کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا اس لیے وہ جب بھی میرے بھائی سے ملنے بنوں جایا کرتے تھے تو واپسی پر میرے لیے مصالحہ دار گڑ کے علاوہ قصہ کی کوئی نئی کتاب ضرور ساتھ لاتے تھے۔ اور جب معرکہ نواب خان والوں کو پتہ چل جاتا کہ چچا بنوں سے واپس آ گئے ہیں تو وہ مصالحہ دار

گڑ میں اپنا حصہ لینے کے لیے ہمارے گھر پہنچ جاتے۔ وہ دوران گفتگو کسی نئی کتاب کا پتہ ضرور کرتے۔

جب پہلی دفعہ میرے والد الف لیلیٰ کی داستان لائے تھے تو اس رات معرکہ میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ کوئی ایک سو کے قریب آدمی اس رات وہاں قصہ سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں علاقہ اعوان کاری میں معرکوں کا بہت رواج تھا۔ معرکہ کی خصوصیت کچھ چوپال اور حجرہ سے ملتی جلتی ہیں۔ گاؤں میں ہر قبیلے یا کھاتے پیتے کنبے کا اپنا ایک الگ معرکہ ہوتا۔ جس میں ہر شادی غمی کے موقعہ اکٹھے مل بیٹھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی معرکہ ان کی مجلسی زندگی کا ایک مستقل محور رہتا۔ جس میں کام کاج سے فارغ ہو کر وہ رات کو جمع ہوتے اور ایک دوسرے سے ان کے دُکھ سکھ اور حال احوال سے آگاہی حاصل کرتے۔ ہر قسم کے وہاں سودے ہوتے۔ فصلوں اور بیلوں کے متعلق بڑی تفصیلی گفتگو کرتے اور پھر یہ محفلیں آدھی رات کے قریب ختم ہو جاتیں اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

## ۵

جس معرکہ کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ معرکہ (نواب خان ولد گل نواب خان) تھا میرے والد نے اپنی ذاتی زمین پر اپنے خرچے سے یہ تقریباً ۲۴-۱۹۲۳ء میں تعمیر کروایا تھا یہ معرکہ ایک بڑے سے ہوا دار کمرے پر مشتمل تھا۔ معرکہ کی محفلیں سردیوں میں خوب جمتی تھیں۔ تقریباً دو تہائی کمرے میں کوندر (ایک قسم کا نرم جنگلی گھاس) بچھا دیتے۔ اور اس کے آگے دروازے کے سامنے ایک بڑی سی لکڑی رکھ دیتے جو حد بندی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہاں سب لوگ اپنے جوتے اُتار کر آگے جاتے جب سردیاں شروع ہونے لگتیں تو ہمارے معرکے کے آٹھ دس جوان آدمی جنگل واقع چک نکہ سے تین چار بھار لکڑیوں کے اونٹوں پہ لاد کر لاتے۔ ہمارے اس معرکے کا انچارج میرا

ایک چچازاد بھائی ملک محمد خان تھا۔ جس کا گھر معرکہ سے بالکل قریب تھا۔ جس کی وجہ سے وہ معرکہ کی دیکھ بھال بڑی اچھی طرح سے کرتا تھا۔ ملک صاحب نمبردار بھی تھے اور اکثر سرکاری اہل کار جو دورے پر آتے تو ملک صاحب ان کو اسی معرکے میں ہی ٹھہراتے تھے۔ ملک صاحب نہایت زیرک، معاملہ فہم اور بہادر شخص تھے جب تک وہ زندہ رہے معرکہ نواب خنال خوب آباد رہا۔

معرکہ کے کوٹھے میں جس طرف کوند رکھی ہوئی رہتی۔ اس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا چولہا تھا۔ جو سرِشام ہی سے جلا دیتے تھے اور جب دوسرے لوگ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر سردی سے ٹھٹھرے ہوئے اندر داخل ہوتے تو چولہا ہی کے دہکتے ہوئے انگارے ان کے لیے راحت کا سبب بنتے۔ وہ آگ تاپ کر ہٹ جاتے اور کمبل یا کھیس لپیٹ کر دیوار کے ساتھ ٹک کر بیٹھ جاتے۔

معرکے والے سردیوں کے موسم میں میرے والد سے اکثر تقاضا کرتے کہ چچا احمد کو ساتھ لایا کریں تاکہ وہ ہمیں قصہ سنایا کرے۔ اکثر قصہ سنتے ہوئے صبح ہو جاتی اور کسی کو تھکاوٹ اور نیند کا احساس تک نہ ہوتا۔

○

مَیں سمجھتا ہوں کہ میرے ناول لکھنے کی ابتدا معرکہ نواب خنال سے ہوئی ہے۔ ہم گاؤں کے لوگوں کو کسی کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم میسر نہیں آتی۔ یہی چوپالیں۔ یہی حجرے اور یہی معرکے ہی ہماری درس گاہیں ہوتی ہیں اور انہی لوگوں کی باتیں سن کر ہم عملی زندگی میں اپنے لیے راہیں متعین کرتے ہیں۔

ہمارے اس معرکے میں مستقل آنے والے پچیس تیس آدمی ہمارے اپنے خاندان (قبیلہ نواب خان) کے تھے۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی اکثر آتے تھے۔ ان مستقل ممبران میں ایک بزرگ، چچا فتولی خان تھے۔ منگولوں کے سے خدوخال۔ منگولوں کی طرح ہر وقت کمر باندھے تیار رہتے تھے۔ یہ بزرگ دَف بجانے کے بڑے

رسیا تھے۔ جب رات کو معرکے میں آتے تو اپنا دف بھی ساتھ لاتے اور آتے ہی پہلے چولہے کے پاس بیٹھ کر آگ تاپتے اور پھر پیچھے ہٹ کر اپنا کمبل الگ کر دیتے اور پھر دف بجانا شروع کر دیتے۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ کوئی ساٹھ ستر کے پیٹے میں تھے۔ لیکن جوانوں سے بھی بڑھ کر زندہ دل تھے۔ کبھی کبھار دف بجاتے ہوئے وہ اپنا ایک مخصوص گانا "رادھو" بھی گایا کرتے تھے۔ میں چونکہ کمسن تھا اس لیے گانے کا موضوع اور مفہوم نہ سمجھ سکتا تھا۔ صرف گانے کا نام ہی اب یاد رہ گیا ہے۔ چچا اگرچہ بوڑھے ہو گئے تھے لیکن ان کی آواز بڑی سُریلی اور پرسوز تھی۔ تھک ہار کر جب دَف بجانا ختم کرتے تو پھر دیوار کے ساتھ لگ کر کمبل لپیٹ کر سو جاتے اور پھر تھوڑی دیر میں وہ خراٹے بھرنے لگ جاتے۔ اگر کوئی آدمی باہر سے معرکہ کی کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر سنتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اندر کوئی بوڑھا شیر شیر سویا ہوا ہے۔ ہمارے معرکہ کا ایک مستقل ممبر ہمارے معرکے کا خادم تھا پتہ نہیں اس کا اصل نام کیا تھا۔ البتہ سب معرکے والے اس کو ماما ریلا کہتے تھے۔ وہ نہایت ہی شریف النفس اور کم گو انسان تھا۔ جب بھی کسی سے بات کرتا سر جھکا کر آہستہ سے بات کرتا۔ ذات کا تو وہ میراثی تھا لیکن اپنے اعلیٰ کردار اور نمایاں خصوصیات کی وجہ سے وہ بہت سوں پر بھاری تھا۔ اس کے فرائض میں تھا کہ وہ معرکے میں پینے کے لیے پانی رکھے۔ سرِ شام ہی سے چولہا جلا دے۔ معرکہ کی صفائی ستھرائی کرے۔ دن میں چارپائیاں باہر دھوپ پر لگائے اور پھر شام کو انہیں اندر رکھے۔ ہمارے معرکے کی سب رونقیں چچا فتوتی خان اور ماما ریلا کے دم قدم سے تھیں۔

ماما کو ہر فصل کے موقع پر ہماری برادری ایک مَن پختہ (ساٹھ سیر کا من) غلہ فی گھر کے حساب سے حق خدمت کے طور پر دیتے۔ ہمارے گاؤں میں پانی کی بڑی تکلیف تھی۔ ماما کی بیوی اپنی دو تین رشتہ دار عورتوں کے ساتھ مل کر ہمارے گھروں کے لیے پانی نالہ گمبھیر سے لایا کرتی تھی۔ اس خدمت کے عوض وہ بھی ہر فصل کے موقع پر ایک بوری غلہ فی گھر لیتی۔ اس کے علاوہ ہر سال ماہ چیت میں وہ نئے کپڑے بھی لیتی۔

○

جس زمانے کی مَیں بات کرنے لگا ہوں۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں تک ریڈیو ابھی نہیں پہنچا تھا۔ ہز ماسٹر وائس (HIS MASTER VOICE) کا گراموفون جس کا ایک بڑا سا دھوتورا (لاؤڈ سپیکر) ہوتا اور جو باتیں کرتا اور گانے بھی سناتا تھا۔ اِکا دُکا کہیں کہیں نظر آجاتا۔ ہمارے اتنے بڑے گاؤں میں صرف دو آدمیوں کے پاس اس طرح کا باجہ تھا۔ ایک ملک عبداللہ خان کے پاس جو کوئٹہ پولیس میں ملازم تھا اور دوسرا بابا بھوجن کے پاس۔ بابا بھوجن کی بھی عجیب و غریب شخصیت تھی۔ بابا کا اصلی نام تو ذوالفقار خان تھا لیکن گاؤں کے منچلوں نے ان کا نام بھوجن رکھ دیا۔ بابا ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ چھوٹے سے قد کا بڑا ہی سمارٹ آدمی تھا۔ روزانہ شیو کرتا بڑی بڑی مونچھوں کو باقاعدگی سے خضاب لگاتا اور ان کی نوک پلک خوب سنوارتا کُلاہ پر پگڑی باندھتا۔ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ وہ ہر ایک سے بات اُردو ہی میں کرتا۔ بابا اگرچہ بالکل اَن پڑھ تھا لیکن نہ جانے اُردو بولنا اس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی لہجے میں بات چیت کرتا تھا۔ بابا جب گاؤں چھٹی پر آتا تو اللہ یار حجام اُن کی خاطر مدارت میں لگ جاتا۔ وہی بابا کا کھانا پکاتا۔ کھلاتا اور کپڑے اپنے گھر سے دھلوا کر لاتا۔ یہ اللہ یار نائی بھی ایک نمبر کا مسخرا تھا۔ ایک دن بابا نے اس کو کہا۔

اللہ یار اگر بھوجن بنا لیا ہے تو جلدی سے دو تین چپاتیاں بھی میرے لیے بنا لو۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ اللہ یار بھوجن نہ سمجھ سکا۔ بابا کے بتانے پر اس کی سمجھ میں آیا۔ پھر وہ ہر وقت منہ کے عجیب عجیب زاویے بنا کر مختلف لہجوں میں لفظ بھوجن کی تکرار کرتا رہتا۔ بابا سن کر خوش ہوتا۔ اس کم بخت اللہ یار نے لفظ بھوجن کی اس شدومد سے اور شدت سے تکرار جاری رکھی کہ بابا کی پہچان ہی بھوجن کے نام سے ہونے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بابا کا یہ نام پورے گاؤں میں مشہور ہو گیا۔ شروع شروع میں تو

وہ اسے اپنے نام کے طور پر اپنانے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن اللہ یار ونالی اور اس کے ہمنواؤں کی پیہم کاوش سے آخر کار انہوں نے چپ سادھ لی اور پھر کچھ عرصے کے بعد اسے بخوشی قبول کر لیا۔

بابا اس بڑھاپے میں بھی حسن پرست اور عاشق مزاج تھا۔ اس عمر میں اس نے ایک خوبرو حسینہ پھپی (فتح خاتون) سے شادی کر لی تھی۔ کچھ عرصے تک تو وہ بابا کے ساتھ رہی لیکن پھر ان کو چھوڑ کر چلی گئی۔ پھپی کے چلے جانے کے بعد بابا بڑے اُداس اور مغموم رہنے لگے۔ وہ بڑے درد بھرے انداز اور پُرسوز لہجے میں اکثر یہ گانا گایا کرتے تھے۔

ریڈی نا بی ماہیا
وَت میںڈی توبہ ہک واری اُٹھا مَیں ماہیا

لیکن پھپی نہ مانی اور بابا ہجر و فراق کی ایک دائمی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلگتا رہا۔ یہ ہے بابا کی پُراسرار شخصیت کا مختصر سا پس منظر۔ بابا جب بھی گاؤں چھٹی پر آتا تو ہمارے صحن کے والوں کی خصوصی دعوت پر وہ ایک رات ہمارے صحن کے والوں کو باجہ سنانے کے لیے لاتا۔ بابا کا یہ معمول تھا کہ وہ تمام رات کھڑا ہو کر باجہ بجاتا اور اگر کوئی شعر یا مصرعہ اس کے جی کو اچھا لگتا تو وہ جھومنے لگتا اور ٹہلنا شروع کر دیتا اور اُسی شعر کی تکرار جاری رکھتا۔

بابا کی یہ روٹین تھی کہ وہ جہاں بھی باجا بجاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے نہ بجاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے نہ بجاتا تھا بلکہ پوری رات کے لیے۔ وہ سامعین میں سے کسی کو بھی اُٹھنے نہ دیتا۔ کہتا تھا یہ آداب محفل کے خلاف ہے۔ بابا مریض عشق تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا میں جدھر دیکھتا ہوں مجھے پھپی ہی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

میں جب ہفتہ کو چھٹی کر کے گاؤں آتا اور اگر بابا بھوجن بھی چھٹی پہ آیا ہوا ہوتا تو میں رات کا باجہ سننے کے لیے ضرور جاتا۔ بابا کے پاس نیم کلاسیکی موسیقی کے دو ریکارڈ تھے جو بابا سب سے آخر میں تقریباً سحری کے وقت بجاتا تھا۔ آپ یقین جانیے میں فن موسیقی

سے قطعاً نابلد ہونے کے باوجود یہی دو ریکارڈ سننے کی خاطر پوری رات آنکھوں میں کاٹ دیتا تھا۔ مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ایک دور اُفتادہ دیہات کا کمسن بچہ فنِ موسیقی کی شُد بُد نہ رکھتے ہوئے بھی کس طرح نیم کلاسیکی موسیقی کی گائیکی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی اب تک فنِ موسیقی سے قطعاً نابلد ہوں لیکن آج بھی کلاسیکی اور نیم کلاسیکی گانے سننا پسند کرتا ہوں۔ مجھے کئی دفعہ میرے والد نے سرزنش بھی کی کہ میں ہفتہ میں ایک دن کے لیے گھر آتا ہوں اور پھر رات بھر گھر سے غائب رہتا ہوں۔ میں نے جب اپنے والد کو بتایا کہ میں بابا محبوجن کا باجہ سننے کے لیے جاتا ہوں اور بابا ٹیک بخت میرے پسندیدہ ریکارڈ سب سے آخر میں تقریباً سحری کے وقت لگاتا ہے اور میں وہ ریکارڈ سُن کر ہی گھر آتا ہوں تو میرے والد مسکرا دیے اور کہنے لگے اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں اُستاد سدارنگ کے پاس موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور میں شرما گیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

## ۵

آج شام ہی سے لڑکوں بالوں میں یہ چرچا تھا کہ آج رات کو بابا محبوجن معرکہ نواب خان میں گراموفون بجائے گا۔ چنانچہ مغرب کی نماز کے بعد لوگ وہاں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ میں اپنے والد اور چچا محمد شاہ کے ساتھ جب معرکہ میں پہنچا تو معرکے کی دیواروں پر رکھے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے معرکہ کا صحن حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کئی نوجوان اپنے اپنے گھروں سے چارپائیاں اور پانی کے گھڑے بھی اُٹھا لائے تھے اور اب اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ صحن کے درمیان میں بابا محبوجن ایک چھوٹی سی میز پہ باجہ رکھے پاس ہی ایک موڑھے پہ بیٹھا قینچی کے سگریٹ پی رہا تھا۔ بابا کے سگریٹ پینے کے سٹائل سے بہت نوجوان متاثر نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ جب پاس سگریٹ کا ایک ٹکڑا رہ گیا تو ان میں سے ایک نوجوان نے وہ ٹکڑا بابا سے مانگ لیا اور لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے بابا کے

شائل کو اپنانے کی کوشش کرنے لگ گیا اور ایک عجیب سے احساس برتری میں مبتلا ہو کر حاضرین کو مرعوب کرنے کی خاطر منہ اوپر کو اُٹھا کر سگریٹ کا دھواں ایک مرغولے کی شکل میں باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑے ہی فاتحانہ انداز میں حاضرین کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا۔

عشا کی نماز کے بعد جب معرکے کے سب بزرگ فارغ ہو کر معرکہ میں آ گئے تو چچا محمد شاہ کے کہنے پر بابا بھوجن نے اپنے باجہ کو سیٹ کرنا شروع کر دیا اور ریکارڈوں کو ایک مخصوص ترتیب دی اور پھر تھوڑی دیر کے انہوں نے پہلا ریکارڈ

" ڈاچی والیا موڑ مہار وے "

بجانا شروع کیا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی بابا نے جھومنا شروع کر دیا۔ بابا اب اپنے آپ کو پنوں کے روپ میں دیکھ رہا تھا اور جیسے ان کی سسی پھپتی) ان کو لامتناہی صحراؤں میں بھٹکتی ہوئی آوازیں دے رہی تھی۔ حاضرین نہایت خاموشی اور دلچسپی سے یہ گانے سنتے رہے۔ اور ان سے محظوظ ہوتے رہے۔ آخر کار تقریباً آدھی رات کو معرکہ نواب خان کی یہ دل نواز محفل اختتام پذیر ہوئی اور میں اپنے والد اور چچا محمد شاہ کے ساتھ اپنے گھر کو لوٹ آیا۔ ہم گھر آئے تو میری بہن ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے والد کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگی۔

شکر ہے اللہ کا کہ احمد آ گیا ہے۔ میں تو شام ہی سے بہت فکرمند تھی نہ جانے بے چارہ کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔

مارا مارا کہاں پھرے گا۔ شیطان ہے کھیل کر واپس آ جاتا۔ میرے والد نے لاپرواہی سے کہا۔

نہیں ماموں جان اس طرح بچے گھروں سے بھاگ جاتے ہیں۔

بیٹی یہ بڑا ڈھیٹ ہے۔ یہ نہیں بھاگے گا۔ یہ آپ کو اور مجھے بھگائے گا۔

اور پھر میرے والد نے مجھے بستر لگا دیا اور میں سو گیا۔ میں خوش تھا کہ آج متوقع پٹائی نہیں ہوئی۔ کل میں سکول جا کر چچا زور خاں کی خبر لوں گا۔ تھوڑی ہی دیر میں میری

آنکھ لگ گئی اور میں دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو کر سو گیا۔ اگر میرے والد مجھے جھنجھوڑ کر نہ اُٹھاتے تو نہ جانے میں کب تک یونہی سوتا رہتا۔ میرے والد کہہ رہے تھے۔ اُٹھو روٹی کھا لو دیر ہو گئی ہے۔ لڑکے چلے گئے ہوں گے۔ میں آج تمہیں چھوڑنے کے لیے تمہارے ساتھ لاوہ آؤں گا۔ ساتھ ہی تمہارے استادوں سے بھی کہوں گا کہ کل والی غیر حاضری کے لیے وہ تمہیں سزا نہ دیں۔

میں نے جلدی سے دہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھائی اور اپنے دھلے ہوئے کپڑوں اور مرونڈے کی گٹھڑی اُٹھائی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

والد صاحب نے میری بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بیٹی میں جلدی واپس آجاؤں گا۔ کھانا کھا کر پھر بیلوں کو لے جاؤں گا۔

ہم جلد ہی گھر سے نکل آئے۔ میرے والد نے گٹھڑی مجھ سے لے لی اور مجھ سے کہنے لگے۔ تم خالی ہاتھ تیز تیز قدموں سے میرے ساتھ چلو۔

میں والد صاحب کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلنے لگ گیا۔ جب گاؤں سے نکل کر باہر کھلے کھیتوں میں پہنچے تو میرے والد ہنس کر مجھ سے کہنے لگے۔

بھئی احمد یہ تیتل مسری کا کردار بھی تم نے خوب تراشا ہے۔ لیکن انگریزوں کے ایسے نام تو نہیں ہوتے۔

بابو یہ نام یونہی غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ کوئی سوچ سمجھ کر تھوڑا ہی گھڑا تھا۔

یار احمد ایک بات ہے تم عمر کے میں قصے کہانیاں سناتے سناتے اب اس قابل ہو گئے ہو کہ فوراً ایک کہانی تخلیق کر سکو اور شاید بڑے ہو کر قصہ کہانیوں کی کتابیں بھی لکھنے لگو تو کوئی عجیب بات نہ ہو گی۔

مجھے اس بات کا ابھی تک احساس نہ ہوا تھا کہ میں بھی کوئی لکھ سکتا ہوں۔ میرے والد گاؤں کے سادہ لوح کسان جو انسانی نفسیات سے واقف نہ تھے۔ نہ جانے انہوں نے کیسے اتنی آسانی سے میرا سائیکو انیلسس PSYCHO - ANALYSIS

کرایا تھا کہ میرا یہ بیٹا بڑا ہو کر کہانیاں لکھا کرے گا۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اگر آج میرا بوڑھا باپ ہوتا اور میری لکھی ہوئی کتابیں دیکھتا تو کتنا خوش ہوتا۔

۵

سکول پہنچے تو ابھی تک کلاسیں شروع نہ ہوئی تھیں۔ لڑکے ابھی تک گراؤنڈ میں گیندوں سے والی بال کھیل رہے تھے۔ میرے والد میرے ساتھ ہوسٹل کے بلاک تک آئے اور پھر چچا قاسم کے پاس حقہ کا کش لگانے کے لیے چلے گئے۔ اب وہ پہلے والا سنگدل اور بھنا جو ماسٹر ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ نہ تھا۔

اب میرا شمار ہوسٹل اور سکول کے سینئر لڑکوں میں ہوتا تھا۔ اب میں سکول اور ہوسٹل کی پابندیوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ میں اپنا سامان ہوسٹل میں اپنے کمرے میں رکھ کر باہر آ گیا۔ میرے والد ابھی تک چچا قاسم کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے میں ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اب آپ واپس گاؤں چلے جائیں۔

نہیں میں ہیڈ ماسٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب سے مل کر واپس جاؤں گا۔ کل کی غیر حاضری کے لیے پھر تمہیں وہ سزا نہ دیں۔

نہیں دیتے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں نے بڑے ہی پُر اعتماد لہجے میں اُن سے کہا۔

اگر کسی نے مارا تو تم پھر بھاگ کھڑے ہو گے اور میں اپنا زمینداری کا کام چھوڑ کر تمہیں کہاں تلاش کروں گا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں ان کے ساتھ کچن کے چھپرے باہر نکل آیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب تیار ہو کر سکول جانے کے لیے اپنے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھا تو انہوں نے مجھے آواز دی۔

احمد ادھر آؤ۔

میں بھاگ کر ماسٹر صاحب کے پاس گیا اور ان کو سلام کیا۔

تم کل سکول کیوں نہیں آئے۔

بیمار تھا جناب۔

بیمار تھے۔ وہ حیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ کل تو تم دندہ اور لادہ کی سرحد پر کبڈی کھیل رہے تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے اور دوسرے سب لڑکوں کو بھی تم نے سکول نہیں آنے دیا۔ زور خان سکول آنا چاہتا تھا لیکن تم نے اسے آنے سے روکا اور اُٹھا اسے بُری طرح مارا بھی ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دوسرے لڑکوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس نے رو رو کر مجھے یہ سب رام کہانی سنائی ہے۔ تم وہاں سے ہی سب لڑکوں کو زبردستی واپس گاؤں لے گئے۔ تم نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس ملک میں ایک نئی چھٹی کا بھی اعلان کیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش کھڑے رہے۔

میرے والد نے ان کو دیکھا تو وہ بھی ان کے پاس آ گئے۔

یہ بزرگ کون ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میرے والد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار بھرے لہجے میں پوچھا۔

جناب یہ میرے والد صاحب ہیں۔

اسلام علیکم ملک صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آگے بڑھ کر میرے والد صاحب سے پوچھا۔ فرمائیے ملک صاحب کیسے تشریف لائے ہیں۔

جناب بچے کو چھوڑنے آیا ہوں۔ یہ آتے ہوئے ڈرتا تھا کہ مجھے سزا ملے گی۔ اس لیے میں اس کے ساتھ آیا ہوں۔

ملک صاحب سزا تو اسے ضرور ملے گی۔ یہ خود بھی نہیں آیا اور دوسرے لڑکوں کو بھی روکے رکھا اور انہیں سکول آنے نہیں دیا۔

جناب عالی! آپ کا فرمانا بجا ہے۔ میرا بیٹا تو جو ہے سو ہے۔ یہ دوسرے سب لڑکے بھی اول نمبر کے شیطان ہیں۔ ان کا بھی سکول آنے کو جی نہ کرتا تھا ورنہ کون کسی کو روک سکتا ہے۔

نہیں ملک صاحب۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ احمد نے کئی لڑکوں کو مارا ہے اور

انہیں زبردستی روکے رکھا ۔ بے چارے زور خان کو تو اس نے بُری طرح مارا ہے ۔ وہ آج صبح جب گھر سے واپس آیا تو سیدھا میرے پاس آیا اور زار و قطار روتے ہوئے مجھے سب صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اس نے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کل احمد نے اعلان کیا تھا کہ "آج تِل مِسری کی چھٹی ہے ۔"

میرے والد ہنس پڑے ۔

نہیں ملک صاحب یہ سچ ہے ۔ یہ آپ کا بیٹا ہے ہی بڑا شریر ۔ میں ہیڈ ماسٹر لالہ سندر لعل جی کو سب صورت حال سے آگاہ کر دوں گا ۔ آگے ان کی مرضی جیسے انہوں نے کہا ویسا کریں گے ۔

نہیں ماسٹر صاحب آپ مہربانی سے اسے معاف کر دیں ۔ آئندہ یہ ایسا نہیں کرے گا ۔ میرے والد نے ملتجیانہ انداز میں کہا ۔

O

ہیڈ ماسٹر صاحب اور دیگر اساتذہ گراؤنڈ میں جمع تھے ۔ لڑکے اپنی اپنی کلاس میں کھڑے ہو گئے اور دعا شروع ہو گئی ۔ دعا سے فارغ ہو کر سپرٹنڈنٹ صاحب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئے ۔ لڑکے دعا کے بعد قطاروں میں اپنے اپنے کلاس روم کی طرف چل پڑے ۔ میں برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ کھڑا سب صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا ۔ تھوڑی دیر تک سپرٹنڈنٹ صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کرتے رہے اور پھر انہوں نے دور کھڑے ہوئے میرے والد صاحب کو اشارے سے اپنے پاس بلایا ۔

میرے والد صاحب ان کے قریب آئے اور پھر سلام کر کے ایک طرف کو کھڑے ہو گئے ۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے رام لعل چپڑاسی کو بلایا اور اس سے کہا کہ احمد جماعت ہفتم کو بلا کر لے آؤ ۔ چنانچہ میں سر جھکائے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب کے

پاس آگیا اور ان کو سلام کر کے مودب انداز میں ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

احمد تم اچھے طالب علم ہو۔ بتاؤ کل سکول کیوں نہیں آئے۔ لالہ جی نے بڑے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

سر راستے میں کھیلتے رہے۔ پھر دیر ہو گئی۔ ڈر کے مارے واپس گھر چلے گئے۔

نہیں جناب۔ اس نے دوسرے لڑکوں کو بھی زبردستی روک لیا اور سکول نہ آنے دیا۔ اس نے زور خان کو بُری طرح زدوکوب بھی کیا ہے۔ وہ بے چارہ آج صبح سویرے جونہی گھر سے آیا سامان رکھ کر سیدھا میرے پاس آیا۔ اُس نے زار و قطار روتے ہوئے مجھے سب بات بتائی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے نہایت پُراعتماد لہجے میں یہ بات لالہ جی کو بتائی۔

ماسٹر صاحب آپ نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ زور خان کو آپ اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ نہایت مکار اور عیار لڑکا ہے۔ سب بچے اپنی مرضی سے نہیں آئے ہوں گے۔ وہ احمد کو مفت میں ملوث کر رہے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب صرف تعلیم کے شعبہ ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ وہ بچوں کی نفسیات کے بھی ماہر تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے اس نظریئے سے میری ڈھارس بندھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے والد صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ملک صاحب آپ جائیں۔ احمد کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ البتہ ایک بات میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ احمد کو کہیں کہ یہ تتل مستری کی طرح کے اور کرداروں کی تخلیق نہ کرے اور اپنی تعلیم ہی میں دل لگائے۔

میرے والد ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام کر کے مجھے الگ لے جا کر سمجھاتے بجھاتے رہے اور پھر مجھے تسلی دے کر گاؤں واپس چلے گئے۔ اور میں اپنی کلاس میں چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب مجھے ہوسٹل میں جا کر سزا دیں گے چونکہ لالہ جی نے ان کی ایک بھی نہ سُنی تھی بلکہ ہمہ وقت وہ میری طرف داری کرتے رہے۔ اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ اپنی خفت مٹانے کی خاطر مجھے آڑے ہاتھوں لیں گے۔ پڑھائی ختم ہونے کے

بعد میں ہوسٹل آیا۔ کتابیں رکھیں اور کھانا کھانے لگا۔ عادی مجرموں کی طرح مجھے بھی یہ خطرہ لاحق تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب مجھے کسی وقت بھی بُلا سکتے ہیں۔ میں اپنے حواس مجتمع کر کے ذہنی طور پر اپنے آپ کو آنے والے لمحات کے لیے تیار کر رہا تھا۔

یہ نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب شریف آدمی تھے۔ اس پہلے سپرنٹنڈنٹ کی طرح ظالم، کینہ پرور اور منتقم مزاج نہ تھے۔ جب انہوں نے مجھے شام تک نہ بُلایا تو پھر میری کچھ دلجمعی ہوئی۔ اور میں اطمینان سے اپنے ہوم ورک (HOME WORK) کے متعلق سوچنے میں مصروف ہو گیا۔ کچن کی طرف آتے جاتے میں نے ایک دفعہ زور خان کو دیکھا لیکن وہ ہر بار آنکھیں چُرا کر پہلو بچا کر نکل جاتا۔ ویسے تو میں اس کی پٹائی ضرور کرتا لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کے حسنِ سلوک سے مرعوب ہو کر اور والد صاحب کی ہدایات کے پیشِ نظر میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اب جب بھی گاؤں سے سکول آتے تو وہ نہایت ہوشیاری سے مجھ سے آگے پیچھے نکل جاتا۔ تاکہ میں اس کی پٹائی نہ کر سکوں۔

میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے حسنِ سلوک کی وجہ سے اور والد صاحب کے سمجھانے بجھانے پر پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگ گیا۔

اس واقعہ کے دو تین ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک دن سینچر وار کے روز ہم لوگ چھٹی کر کے اتوار گھروں میں گذارنے کے لیے لاوہ سے ابھی نکلے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ بابا عطر (کرار عطر سنگھ کھتری) اپنی دکان کا سودا سلف اپنے گدھے پر لادے واپس ونده شاہ بلاول کی طرف جا رہا ہے۔ اس وقت بابا کی عمر کوئی ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بابا کی دائیں ٹانگ میں کوئی پیدائشی نقص تھا اس لیے وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ وہ گاؤں سے لاوہ آتے ہوئے اپنے گدھے پر سوار ہو کر آتا اور واپسی پر لدی ہوئی رچھٹے (دو جڑواں بوریاں جو بھیڑ کے بالوں کی بنی ہوتی ہیں) کو پکڑ کر اس کے سہارے گدھے کے ساتھ چلتا رہتا۔

ابھی ہم لاوہ سے نکلے ہی تھے کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے

اپنے دوست شاہراخان کو بلایا اور ہم چپکے چپکے آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ بابا عطرو کی چھپٹ سے گڑ اور ریوڑیاں کیسے اڑائی جائیں۔ آخر یہ طے پایا کہ ہم دونو بابا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ باتوں میں لگا لیں گے۔ پھر یکایک شاہراخان بابا کے گدھے کو چپکے سے چاقو چبھو دے گا۔ اس طرح گدھے کے بدک جانے کا قوی امکان تھا۔ چنانچہ میں بابا سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شاہراخان کو اشارہ کیا۔ اور پھر اس نے چپکے سے بابا کے گدھے کی دم میں چاقو کی نوک چبھو دی۔ گدھا یک لخت جو بدکا تو بابا عطرو کے ہاتھ سے چھپٹ چھوٹ گئی اور وہ گر پڑا۔ اگر میں چھپٹ کو سہارا نہ دیتا تو وہ گر جاتی۔ بابا نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ پگڑی جو دور جا پڑی تھی اٹھائی اور اسے اچھی طرح سے جھاڑا اور پھر اسے سر پر باندھ کر ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اب ہم بابا سے تقریباً پچیس تیس گز آگے نکل گئے تھے۔ بابا نے آوازیں لگانی شروع کر دیں کہ گدھے کو روکو۔ لیکن شاہراخان روکنے کی بجائے اس کی دم کو اور مروڑ دیتا اور گدھا تیز ہو جاتا شاہراخان نے چاقو نکال چھپٹ کی سلائی ایک کونے سے کاٹ دی اور چھپٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر کھانڈ کی ریوڑیوں کی ایک مٹھی بھر کر مجھے دی۔ پھر اپنی دونوں جیبیں بھر لیں۔ اس نے پھر مجھے بلایا اور خود پیچھے ہو لیا۔ میں نے بھی اپنی دونو جیبیں ریوڑیوں سے بھر لیں اور اپنا گھی والا خالی ڈبہ جو میرے ہاتھ میں تھا وہ بھی بھر لیا۔ پیچھے جو لڑکے بابا عطرو کے ساتھ آرہے تھے ان کو بھی ہماری راہزنی کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ وہ بھی باری باری ہمارے پاس آکر، بابا کی آنکھ بچا کر اپنا حصہ وصول کر لیتے اور پھر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں میں شامل ہو جاتے۔

تھوڑی دیر تک، تو بابا ہمیں کوستا رہا۔ اور پھر گالیاں دینے پر اتر آیا۔ سور کے بچو اگر میری کوئی چیز تم لوگوں نے چوری کی تو پولیس سے سب کی الٹی کھال کھچواؤں گا۔ جو لڑکے بابا کے ساتھ آرہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بابا کو شاید اس نئی صورتحال آگاہ کر دیا تھا۔ گاؤں نزدیک آگیا اور میں پیشاب کے بہانے راستے سے ہٹ کر ایک

جھاڑی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب بابا میرے قریب سے گذرا تو للکارتے ہوئے کہنے لگا۔

پولیس ایک ایک کی کھال اُتارے گی۔ میں بھی ایک ایک پیسہ تمہارے والدین سے وصول کروں گا۔

وہ سب جب مجھ سے آگے نکل گئے تو میں اُٹھ کر آہستہ آہستہ ان کے پیچھے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں داخل ہونے تک شاہراخان نے گدھے کو رُکنے نہیں دیا۔ بابا عطرو اپنے مخصوص انداز میں لنگڑاتا ہوا گاؤں کی طرف جارہا تھا۔

میں گھر پہنچا تو میں نے بہن کو ریوڑیاں دیں۔ اس نے پوچھا کہ کہاں سے لی ہیں میں نے اسے بتایا کہ دکان سے خریدی ہیں۔ لیکن وہ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

اتنی ساری ریوڑیوں کے لیے تم نے پیسے کہاں سے لیے ہیں۔

میرے پاس تھے۔

کہاں سے لیے تھے تم نے۔ میرا خیال ہے پھر تم کُرتے کی جیبوں میں دانے (غلہ) چھپاکر لے گئے ہوگے۔

نہیں باجی۔ خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں۔

میں اپنا سامان رکھ کر کھیلنے کے لیے چلا گیا۔ کبڈی بڑے زوروں پر تھی کہ میں نے اپنے والد کے ساتھ بابا عطرو کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

میرے دل نے چاہا کہ بھاگ جاؤں۔ بابا عطرو اور میرے والد دونوں میں سے کوئی بھی مجھے نہ پکڑ سکے گا۔ لیکن کسی انجانے جذبے کے تحت میں ایسا نہ کرسکا۔ والد صاحب نے قریب آکر مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں دوڑ کر ان کے پاس گیا۔ وہ نہایت غصے میں تھے۔ ان کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔

کیوں اوئے بے ایمانا۔ تم نے اور شاہرا نے بابا کی چھٹ کو چاقو سے کاٹ کر اس کا تمام سودا سلف نکال لیا ہے۔

نہیں بابو۔ حضرت پیر کی قسم میں نے نہیں نکالا۔
میرے انکار پر میرے والد نے مجھے اتنے زور کا ایک تھپڑ مارا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔ ابھی اُٹھنے نہ پایا تھا کہ انہوں نے لپک کر مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور پھر لاتوں اور مکوں سے میری اچھی طرح خبر لی۔ سب لڑکوں نے کھیلنا بند کر دیا اور وہ بھی یہ مفت کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔
جب میرے والد اچھی طرح سے میری دُرگت بنا چکے تو بابا عطرو کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔
عطر سنگھا۔ پولیس میں رپورٹ کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ یہ بتائیں، آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے۔
اگر آپ میرا نقصان پورا کر دیں تو ٹھیک ہے پھر مجھے پولیس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔
بھئی آپ بتائیں تو سہی۔ آخر آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے۔
بیس روپے کی کھانڈ کی ریوڑیاں میں نے لی تھیں۔ جن میں اب بہت تھوڑی سی باقی بچی ہیں۔
یہ سب میرے بیٹے نے لی ہیں یا کسی اور نے بھی۔
تمہارے بیٹے اور احمد خان کے بیٹے شاہرا نے۔ یہی دونو میرا گدھا دوڑا کر مجھ سے آگے نکل گئے۔ پھر تمام راستے یہ کم بخت میری ریوڑیاں نکال نکال کر کھاتے آئے اور اپنی جیبیں بھی بھر لیں۔ میں جب تیز چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یہ کم بخت گدھے کو دوڑا کر اور آگے نکل جاتے۔
تم نے شاہرا کے باپ کو بھی بتایا ہے۔
احمد خان ملا نہیں ہے۔ ابھی تک کھیتوں سے واپس ہی نہیں آیا۔
پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کے لیے کیا کریں۔
آپ اور احمد خان میرا نقصان جو تقریباً بیس روپے کے لگ بھگ ہوگا پورا کر

ورنہ پھر مجھے پولیس کے پاس دادرسی کے لیے جانا ہی پڑے گا۔
بابا کہا جو ہے کہ تمہارا نقصان پورا کر دیں گے۔ تم کو خواہ مخواہ پولیس کے پاس جانے کا شوق ہے تو خوشی سے جاؤ۔
نہیں ملک صاحب میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا نقصان پورا ہو جائے تو مجھے پھر پولیس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔
آدھا نقصان میں تمہارا پورا کیے دیتا ہوں۔ باقی آدھے کا تم شاہرا کے والد احمد خان سے مطالبہ کرو۔
بہت اچھا۔ ملک صاحب۔ بابا کے لہجے سے ایک گونہ اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔
تو پھر تم ایسا کرو۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو اور دس روپے کا غلہ آ کر لے جاؤ۔ اور اس بات کو یہیں ختم کرو۔
ٹھیک ہے۔ میں بوریاں اور اپنا گدھا لے کر آتا ہوں۔
بابا عطرو اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور میرے والد مجھے بازو سے پکڑ کر گھر لے آئے۔ میری بہن نے جو یہ صورت حال دیکھی تو سب بات سمجھ گئی۔
میرے والد میری بہن کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ جس دن میں اس بے ایمان کو قبرستان سے پکڑ کر لایا تھا تو میں نے اپنے دل کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اسے کبھی نہیں ماروں گا۔ لیکن یہ تو اب بالکل بے قابو ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب یہ گاؤں میں پڑھتا تھا تو اس نے سکول کی لائبریری سے کتابیں بھی چرائی تھیں۔ اب یہ کم بخت راہزنی کرنے پر بھی اُتر آیا ہے۔ اگر اسے اس مرحلہ پر نہ روکا گیا تو یہ بڑا ہو کر ڈاکو بنے گا۔
نہیں ماموں ابھی معصوم ہے۔ بڑا ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔
خاک ٹھیک ہو گا۔ ہر روز اس کی کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ہوتی ہے سکول نہیں جائے گا۔ اگر سکول گیا تو وہاں کسی نہ کسی لڑکے کو ضرور مارے گا۔

ماموں لڑکے بالے ایسے ہی ہوتے ہیں۔
اگر تم نے بھی اس کی اسی طرح طرفداری کی تو یہ قابو نہیں آئے گا۔
ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اب عطرڈا اپنا گدھا لے کر آگیا۔ گدھے پر خالی چھبٹ رکھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں خالی چھاڑ تھا۔
بابا آگئے ہو۔ میرے والد نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
جی آگیا ہوں۔ ملک صاحب۔
دس روپے کی کتنی گندم ہوگی۔
ملک صاحب گندم کا نرخ ایک روپے کا چار چھاڑ ہے۔ (ایک چھاڑ تین سیر کا ہوتا ہے۔)
ٹھیک ہے آؤ اندر اور غلہ بھر لو۔
بابا نے اطمینان کا سانس لیا اور لنگڑاتا ہوا ہمارے گودام کی طرف چل پڑا۔
میں دوڑ کر بابا عطرڈ کی راہ میں حائل ہوگیا۔ میں تمہیں یہاں سے غلہ نہیں لے جانے دوں گا۔
کیوں؟ بیٹا میں اتنا نقصان تو نہیں برداشت کر سکتا۔ بابا عطرڈ نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔
بابا تمہاری جس قدر ریوڑیاں میں نے لی ہیں۔ وہ سب کی سب جوں کی توں موجود ہیں۔ بے شک تم اپنا مال لے لو۔ میں غلہ تمہیں نہیں لے جانے دوں گا۔ میرے والد کو یہ غلہ گھر تک لانے میں کس قدر محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔
جو ریوڑیاں تم نے کھالی ہیں یا دوسرے لڑکوں میں بانٹ دی ہیں۔ ان کا کیا بنے گا۔
نہیں بابا۔ میں نے کوئی ریوڑیاں نہیں بانٹی۔ انہوں نے خود آپ کی چھبٹ سے نکالی ہیں۔ میں نے تو جس قدر بھی لی ہیں ان میں سے بڑی مشکل سے مٹھی بھر ریوڑیاں میں نے کھائی ہوں گی۔ باقی سب میرے پاس موجود ہیں۔

موجود ہیں۔ کہاں ہیں۔ بابا عطرو نے حیرانگی اور تاسف کا ملا جلا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میرے پاس پڑی ہوئی ہیں۔ میں ابھی لے آتا ہوں

میں اندر گیا اور گھی والا خالی ڈبہ جس میں ریوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اُٹھا لایا۔ ڈبہ اچھا خاصا تھا۔ بابا عطرو کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ اس قدر مالِ غنیمت ان بے راہرو لڑکوں کی دستبرد سے بچا ہوگا۔ اس ڈبے کے علاوہ جو ریوڑیاں میں نے جیبوں میں بھری تھیں وہ بھی کوئی ایک سیر کے قریب ہوں گی۔ میں نے بابا عطرو کے سامنے ایک پرانا سا کپڑا بچھا کر سب ریوڑیاں اس پر اُلٹ دیں۔

بابا کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور میرے والد کی طرف کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔

میرا والد پاس ہی کھڑا غصے اور رنج کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بابا عطرو کو کہا۔

"عطر سنگھا یہ سب اندازاً کتنی ہوں گی۔"

ہوں گی ملک صاحب کوئی دو اڑھائی سیر کے لگ بھگ۔

تمہاری کُل کتنی ریوڑیاں تھیں۔

پانچ سیر تھیں سرکار۔

پانچ سیر تھیں اور دس بارہ لڑکے لوٹ مار کرنے والے تھے۔ احمد کے پاس تو جو تھیں وہ سب کی سب اس نے نکال کر دے دیں۔ اب تم شاہرا خان، نذر خان جہان خان، اکرم اور دوسرے لڑکوں کے والدین کے پاس جاؤ اور ان سے بھی پیسوں کا مطالبہ کرو۔ اُمید ہے تمہیں اس طرح اچھا خاصا منافع ہوگا۔

نہیں ملک صاحب زیادہ مال احمد اور شاہرا نے نکالا ہے۔ میں دیکھتا چلا آرہا تھا۔

آخر دوسروں نے بھی تو کچھ لی ہوں گی۔

ہاں کو ان دونوں نے تھوڑی تھوڑی دی تھیں۔ انہوں نے خود جھپٹ سے نہیں نکالیں۔

میرے والد نے غصے سے چاندی کا ایک روپیہ نکال کر بابا عطرو کی طرف پھینک اور کہنے لگے۔ "بس اب یہ لو اور چلے جاؤ یہاں سے۔ میرے بیٹے نے اس قدر ریوڑیاں تو نہ کھائی ہوں گی۔"

بابا عطرو نے آگے بڑھ کر زمین سے روپیہ اٹھایا اور اُسے بجا کر اور اُلٹ پلٹ کر دیکھا کہ کہیں کھوٹا تو نہیں۔

روپیہ بابا عطرو نے سنبھال کر جیب میں رکھ لیا اور کپڑے پر پڑی ہوئی ریوڑیاں اپنی خالی بوری میں ڈال لیں اور میرے والد کو سلام کر کے واپس اپنی دکان کی طرف چلا گیا۔

O

میرا والد مجھے بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر لے آیا۔ میں اپنے طور پر ڈر رہا تھا کہ اب اچھی خاصی پٹائی ہو گی۔ اندر آ کر میرا والد چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنی گود میں بٹھا کر چومنے لگ گیا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ آئندہ کچھ بھی ہو جائے میں تم کو ہرگز نہ ماروں گا۔ اور پھر میرا والد زار و قطار رونے لگ گیا۔ شاید اسے اپنے گذرے ہوئے زمانے کے دُکھ یاد آ گئے تھے یا میری بے چارگی اور کس مپرسی پر رحم آ گیا تھا۔ وہ مجھے بے تحاشا چومتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرے بیٹے مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں پھر تمہیں کبھی نہ ماروں گا۔"

میں بھی دھاڑیں مارتا ہوا اپنے والد کے ساتھ چمٹ گیا۔ ہم دونوں باپ بیٹا بڑی دیر تک اسی حالت میں بیٹھے روتے رہے۔ اور پھر میرے والد نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنی پگڑی کے پلو سے میرے آنسو پونچھے اور مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگے۔

"بیٹا پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ ایسا کرنے سے پورے خاندان کا نام بدنام ہوگا۔"

نہیں باؤ میں پھر ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا۔ انشاء اللہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقعہ نہ ملے گا۔ آخری بار آپ مجھے معاف کر دیں۔

میرے والد ہلکا سا مسکرائے اور مجھ سے کہنے لگے۔

لیکن خدا کے لیے تیل مسیری کی طرح کا پھر کوئی نیا کردار تخلیق نہ کرنا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی اس دن اس بات کی تاکید کی تھی۔

میں جھینپ گیا اور اُٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

## ۵

میری سکول کی تعلیم جاری رہی۔ لیکن میں کوئی شائننگ۔ سٹوڈنٹ نہ تھا۔ بس وقت گذارنے کے لیے سکول آتا جاتا تھا۔ امتحانی نتائج بھی کوئی حوصلہ افزا نہ ہوتے تھے۔ لیکن نہ جانے لالہ سندر لعل جی کس بنا پر میرے والد کو کہا کرتے تھے۔

"ملک صاحب یہ لڑکا بڑا ذہین ہے۔ لیکن اس کی کوئی نفسیاتی اُلجھن ضرور ہے جسے سلجھائے بغیر یہ عملی زندگی میں آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اس بچے میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی ان صلاحیتوں کو کیسے جلا بخشی جائے تاکہ اس کی پوشیدہ صلاحیتیں اُجاگر ہو کر سامنے آئیں اور یہ ان سے کام لے کر زندگی میں آگے بڑھ کر کوئی مقام حاصل کر سکے۔"

لالہ جی۔ یہ دوسرے بچوں کی طرح کا ایک عام سا بچہ ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ ؟

ملک صاحب۔ آپ تو اس کے والد ہیں۔ آپ اس کی نفسیاتی الجھنیں سلجھانے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

لالہ سندر لعل جی کو نہ جانے ایسی کونسی مخفی صلاحیتیں مجھ میں نظر آتی ہیں جن کو وہ سامنے لانا چاہتے تھے۔ میں اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک سکول میں آسنڈرا لڑکوں کی طرح گھسٹتا رہا۔ لالہ جی میری کوئی نفسیاتی اُلجھن نہ سلجھا سکے۔ لالہ جی کی ذہنی سطح دوسرے سب ماسٹر صاحبان سے بہت بلند تھی۔ ان کا ہر ایک کو دیکھنے اور پرکھنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ لالہ جی راہبوں اور جوگیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ سکول کے اوقاتِ کار کے بعد آبادی سے کافی دور جنگل میں "نالہ ترپی" کے اس پار ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتے تھے۔ ایک دری۔ ایک کھیس۔ دو تین برتن اور چند ایک کتابیں، یہ تھا ان کی زندگی کا کل اثاثہ۔

ایک دفعہ ایک اکڑ خان قسم کے روایتی انسپکٹر آف سکولز۔ سکول کے معائنے کے لیے آئے۔ معائنہ کے بعد قیام کے لیے جب ڈاک بنگلہ پہنچے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چونکہ وہاں ان کے قیام و طعام کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہ تھا۔ اس نے لالہ جی کو پیغام بھیجا کہ بستروں کا انتظام کریں۔ لالہ جی نے اپنا کھیس اور دری چپڑاسی کے ہاتھ صاحب بہادر کو بھجوا دی اور ساتھ ہی کہلوا بھیجا۔

"حضور والا میرے پاس تو صرف یہ دو چیزیں ہیں۔ ان میں سے ایک آپ رکھ لیں۔ دوسری مجھے واپس بھجوا دیں۔"

یہ بات سُن کر صاحب بہادر کا سنگھاسن ڈولنے لگ گیا۔ پتہ نہیں اس نے رات کیسے کاٹی۔ اس کے نتیجے کے طور پر اُس نے لالہ جی کی سالانہ رپورٹ بہت ہی خراب لکھی۔ جس کے باعث لالہ جی کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ اور اس کیساتھ میری نفسیاتی اُلجھنیں بھی جوں کی توں رہیں۔

لالہ جی کو سکول میں پھول اور خوبصورت پودے لگانے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اس زمانے میں پھولوں کے بیج لوناسے پیکٹوں میں پیک ہوئے منگوایا کرتے تھے اور نہ جانے پھل دار درختوں کے پودے وہ کہاں سے منگواتے تھے۔ بہر حال وہ یہ سب کچھ پوری لگن اور تندہی سے سرانجام دیتے۔ ایسے

یہاں ہمارے ایک کرم فرما ٹیچر جناب غلام مرتضیٰ تھے وہ کبھی چھٹیوں کے بعد سکول واپس آتے تو ان کی ہیئت کذائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کھونڈا (بڑا سا سوٹا) اٹھائے ہوئے اونٹ پر سوار ہو کر سکول تشریف لاتے اور جن پودوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب اتنی تندہی اور محنت سے پروان چڑھانے کے لیے دن رات کوشاں رہتے تھے۔ جناب غلام مرتضیٰ صاحب اپنا اونٹ وہاں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے اونٹ کانجی ہاؤس میں دینے کے احکام صادر کیے۔ تو اس پر غلام مرتضیٰ صاحب کھونڈا لے کر ان پر حملہ آور ہونے لگے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جناب مولوی محمد رضا صاحب موجود تھے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ وہ حضرت ہیڈ ماسٹر صاحب کا تیا پانچہ کر دیتے۔ یہ لالہ جی کا ہی دل گردہ تھا کہ وہ ایسے اساتذہ کے ساتھ بھی گذارہ کر لیتے تھے۔ آپ ان کا موازنہ فرمایئے۔ لالہ ہیراج صحیح استاد تھا یا ماسٹر غلام مرتضیٰ!

بہرحال یہ زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں۔ ان کے ساتھ آدمی کو سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے آپ کو لالہ سندر لعل، مولوی محمد رضا صاحب اور لالہ ہیراج کے ساتھ ساتھ ماسٹر غلام مرتضےٰ صاحب جیسے اساتذہ کو بھی برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے آپ کا جی مانے یا نہ مانے۔ کسی نہ کسی صورت میں یہ کڑوی کسیلی گولیاں بھی نگلنا ہی پڑتی ہیں۔

## ۵

لاوہ میں میرا پڑھائی کا آخری سال تھا۔ ایک دن میں بازار کاپی خریدنے جا رہا تھا کہ سامنے سے میں نے ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت میری عمر کوئی چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ لڑکی میرے قریب آ کر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگ گئی۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے گال سہلاتے ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگی۔

تم وہی لڑکے تو نہیں ہو جس نے آج سے تین چار سال پہلے کبڈی کے میلے سے واپس

آتے ہوئے ہماری جگہ سے گھاڑیں (سبز پکے ہوئے چنے جس کے پھل کو بطور سبزی استعمال کیا جاتا ہے اور دیہاتی لوگ ویسے بھی اس کے دانے نکال کر کچے ہی کھاتے ہیں۔) اُکھاڑی تھیں اور مَیں نے اور میری تین چار سہیلیوں نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔

جی ہاں! وہی ہوں۔ صرف پکڑا ہی نہ تھا بلکہ ذلیل و رسوا بھی کیا تھا۔ وہ لڑکی مُسکرا گئی۔ اس وقت اس کی عمر کوئی بیس سال کے لگ بھگ ہو گی اور میری چودہ سال کے قریب۔ اگرچہ اس وقت میرا جنسی شعور بیدار نہ ہوا تھا لیکن مَیں سمجھتا تھا کہ اس لڑکی کو اپنے حسن و جوانی اور نسوانیت کا بھرپور احساس ہے۔

اس لڑکی نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا اس کا پس منظر یوں ہے کہ تین چار سال قبل جب کہ مَیں اپنے گاؤں میں پڑھتا تھا تو ایک روز کبڈی کا ایک بڑا میلہ دیکھنے کے لیے مَیں موضع چکی گیا۔ یہ موضع لاوہ سے دو میل جانب غرب واقع ہے۔ کبڈی کا مقابلہ بڑے بڑے نامور کھلاڑیوں کے درمیان تھا۔ جن میں ہاتھی خاں شکی مروت والے اور محمد خان بلوچ بھی تھے۔ ان دونوں حضرات کا نام اس وقت کبڈی کی دنیا میں سرِفہرست تھا۔ مَیں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کبڈی دیکھنے کے لیے گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ وہ جگہ ہمارے گاؤں سے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر ہو گی۔ غروبِ آفتاب سے تھوڑا پہلے کبڈی کا یہ مقابلہ اختتام پذیر ہوا۔ چونکہ وقت کم تھا اور لوگوں کو دور دراز کے مقامات پر پہنچنا تھا۔ اس لیے جوان سال آدمیوں نے تو بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تیز تیز قدموں سے چلنے لگ گئے۔ مَیں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔ کوئی ایک میل کا سفر طے کیا ہو گا کہ مَیں تھک گیا اور ان کا ساتھ نہ دے سکا اور اُن سے پیچھے رہ گیا۔ مَیں نے صبح کا ناشتہ کیا تھا اور نہ ہی دوپہر کا کھانا کھایا تھا اس لیے مجھے بھوک بُری طرح ستا رہی تھی۔ اسی حالت میں چلتے چلتے میرا گذر ایک ایسے کھیت سے ہوا جس میں چنے کی فصل لہلہا رہی تھی۔ مَیں نے ارد گرد آگے پیچھے دیکھا مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے تھوڑے سے چنے (گھاڑیں) اکھیڑ لیے اور چلتے ہوئے ان سے دانے نکال کر کھانے لگا۔ مَیں بے خبر اپنے خیال میں چلا جا رہا تھا کہ کیا دیکھتا

ہوں کہ ایک بند کی اوٹ سے یکایک چار پانچ الھڑ اور جوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ میں ان کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے آواز دی۔

رُک کیوں گئے ہو اب ہم تمہیں چنے اکھیڑنے کا مزہ چکھاتی ہیں۔

میں نے یہ سُنا تو چنے پھینک دیے اور اُلٹے قدموں بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ جوان سال اور طاقتور لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے میرے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ ریتلی زمین تھی۔ میں ویسے بھی تھکا ماندہ تھا۔ کوئی زیادہ دور تک بھاگ نہ سکا کہ انہوں نے میرا گھیراؤ کر کے مجھے پکڑ لیا اور مجھے بند کی اوٹ میں کہ جہاں وہ بیٹھی تھیں وہاں لے گئیں۔ وہاں پانی کا ایک گھڑا اور ایک چرخہ رکھا تھا۔ ان کے علاوہ ان کے سامنے کی گٹھڑیاں بھی وہاں پڑی ہوئی تھیں (فصلوں کے اندر جو جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ اُن کو خواتین نکال کر اکٹھا کرتی ہیں۔ جسے چارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے علاقے میں اسے ساوا کہتے ہیں۔) ان منچلی لڑکیوں نے مجھے درمیان میں بٹھا لیا اور میری باز پرس کرنے لگیں۔ میں جب ان کو جواب دینے میں تاخیر کرتا تو یہ لڑکیاں مجھے چانٹے مارنے لگ جاتیں۔ میرا روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔ ان لڑکیوں کو مجھ پر ذرا برابر بھی ترس نہ آیا۔ ان لڑکیوں میں ظاہری طور پر جو اُن کی لیڈر رہتی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

ان لڑکیوں میں کس کے ساتھ تمہاری شادی کریں۔ اپنے لیے ایک لڑکی پسند کر لو۔

یہ سُن کر میں اور زیادہ رونے لگ گیا۔ اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

یہ لڑکی جو آج مجھے ملی تھی۔ ان لڑکیوں میں سب سے کم عمر تھی اور شکل و صورت میں سب سے ممتاز تھی۔ ان لڑکیوں نے متفقہ طور پر اس لڑکی سے میری شادی رچانے کی ٹھانی۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ لڑکی بھی شرما گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں زار و قطار روئے جا رہا تھا اور وہ لڑکیاں میری بے بسی پر خوشی سے تالیاں بجا رہی تھیں۔ آخر کار اُن ستم ظریف لڑکیوں نے اس لڑکی کے

ساتھ میری شادی کر دی اور اس کے بعد شادی کے تمام مراحل طے کرنے کے لیے وہ مجھے ہر قسم کی ضروری ہدایات دیتی رہیں۔ اتنے میں ملحقہ کھیت میں ایک آدمی ساوانکالنے کے لیے آگیا اور اس طرح ان شوخ و شنگ لڑکیوں کی ستم رانیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ بڑی لڑکی کے حکم کی تعمیل میں اس نام نہاد دلہن نے میرا منہ دھلوایا۔ پھر مجھے ایک پراٹھا اور دو روڑیاں گڑ کی دیں۔ اور پھر اس بڑی لڑکی کی ہدایت پر وہ دلہن مجھے سڑک تک چھوڑنے آئی۔ جو وہاں سے دور نہ تھی لیکن ایستادہ فصلوں کی وجہ سے مجھے دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ سڑک کچی تھی جو لازوہ سے میرے گاؤں کو جاتی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے سمجھایا کہ سیدھا اسی سڑک پر چلے جانا آخر کار تم اپنے گاؤں پہنچ جاؤ گے۔ اس جگہ سے میرا گاؤں کوئی چار میل کے فاصلے پر تھا سورج اب بالکل غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں سوچتا کہ ایسے میں میں کیوں کر پہنچ سکوں گا۔ عشا کی آذانیں ہو رہی تھیں کہ میں گاؤں جا پہنچا۔ میرے والد بڑے پریشان تھے۔ چاندنی رات میں مجھے آتے ہوئے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی۔

اور آج میں ابھی تک اسی لڑکی کے ساتھ گلی میں کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ اب وہ لڑکی بھرپور جوان اور ایک خوبرو حسینہ تھی۔ ایک کم سن لڑکے کے ساتھ یوں گلی میں کھڑے ہوئے بات کرنا کوئی معیوب بات نہ تھی۔ اس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ کی لڑکیوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔

آپ بھی تو ان کے ساتھ تھیں۔

تھی۔ لیکن بات سب صابی کی چلتی تھی۔

صابی کون ہے۔

وہ بڑی لڑکی جس نے تمہارے ساتھ میری جھوٹ موٹ کی شادی رچائی تھی۔

وہ سب لڑکیاں اب تو کئی بچوں کی مائیں ہوں گی۔

ہاں۔ان دنوں ہی صابی کی شادی ہوگئی تھی۔ اس کے اب دو بچے بھی ہیں۔
دوسری بھی دو لڑ بیاہی گئی ہیں۔ ایک ایک بچہ ان کا بھی ہے۔

تمہارے کتنے بچے ہیں۔

یہ سن کر وہ شرما گئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا شرم وحیا تھا جیسے میں نے اس کی آنکھوں میں پہلے دن دیکھا تھا۔

میری شادی تو ابھی تک نہیں ہوئی۔

کیوں

میرا ہونے والا شوہر ابھی کمسن ہے۔

تو کیا تم ایک کمسن بچے کے ساتھ شادی کرو گی۔ وہ چھوٹا ہو گا۔ تم عین عالم شباب میں ہو۔ یہ شادی کچھ جچے گی نہیں۔

مَیں تو اُس وقت بھی جوان تھی۔ جس دن صابی نے جھوٹ موٹ کی میری شادی تمہارے ساتھ رچائی تھی۔

لیکن وہ تو ایک مذاق تھا۔ محض اُن شوخ و شنگ لڑکیوں نے تفریح طبع کے لیے ایسا کیا تھا۔

جو کچھ بھی تھا۔ آخر شادی ہی تو تھی۔ ان سب لڑکیوں نے تو پورے گاؤں میں میری شادی کا چرچا کر دیا تھا۔ میرے ماں باپ یہ سُن کر بہت ناراض ہوئے لیکن جب اُن کو صحیح صورت حال کا پتہ چلا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ اس لڑکی نے آگے پیچھے پلٹ کر گلی کا ایک جائزہ لیا۔ اور بڑے ہی معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

مَیں نے اس دن ہی دل کی گہرائیوں میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہی شادی کروں گی۔

لیکن محترمہ!۔ آپ نے آج سے تین چار سال پہلے مجھے دیکھا تھا۔ اس وقت مَیں دس سال کے لگ بھگ ہوں گا اور اب میری عمر تیرہ چودہ سال ہوگی۔ مَیں تو اب اسی

طرح کا ایک کمسن اور ناسمجھ بچہ ہوں۔ ابھی تک سکول میں زیر تعلیم ہوں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس دن کی طرح اب پھر تم کوئی نیا کھیل رچانا چاہتی ہو۔

نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ اور اگر کی تو تمہارے ساتھ ہی کروں گی۔ اور پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ اس سے راستے میں ایک عورت نے پوچھا۔

زرینہ یہ لڑکا کون ہے۔

خالہ یہ ہمارا دور کا رشتہ دار ہے۔

وہ مطمئن ہو گئی اور اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔

زرینہ کے گھر میں اس وقت اور کوئی آدمی نہ تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اور باپ باہر کھیتوں میں گئے ہوئے تھے۔ اس کا گھر کوئی زیادہ دور نہ تھا۔ اس نے مجھے باہر صحن میں چارپائی پر بٹھایا اور خود میرے سامنے پیڑھی پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگ گئی۔ وہ ابھی ابھی بھٹی سے دانے بھنا کر لائی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی چھکوری میں چنے کے گرم گرم بھنے ہوئے دانے ڈالے اور گڑ کی دو تین روڑیاں ڈال کر چھکوری میری طرف بڑھا دی۔ وہ مجھ سے بڑے ہی پیار اور محبت سے باتیں کرتی رہی۔ وہ کہنے لگی۔

جو سلوک ان شریر لڑکیوں نے اس روز تمہارے ساتھ کیا۔ ان کے شرمناک رویے سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔

وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی جو بناؤ سنگھار اور آرائش و زیبائش سے بے نیاز تھی لیکن اس کے باوجود وہ تھی بلا کی حسین۔ میرا بھی اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مجھے کالج سے جلد ہوسٹل لوٹنا تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو سپرنٹنڈنٹ صاحب باز پرس کریں گے۔ میں نے اس سے اجازت لی اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے بازار کی طرف چلا گیا۔

اب میرا یہ روز کا معمول بن گیا کہ جب لڑکے شام کو کھیلوں کے لیے سکول کی طرف

جاتے تو میں چپکے سے زرینہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے میری پذیرائی کرتی اور کھانے کے لیے اپنی بساط کے مطابق اچھی اچھی چیزیں دیتی۔ کچھ دنوں تک میں اُس سے باقاعدگی سے ملتا رہا۔ اس نے اپنی ماں کو بھی اب بتادیا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کو صابی اور دوسری لڑکیوں نے پکڑ کر مارا تھا۔ ہماری ملاقاتوں میں کسی قسم کی جنسی آلودگی کا کوئی امکانی پہلو نہ تھا۔ اس لیے کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ کچھ دنوں تک تو ہماری یہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ آخر کار زرینہ کی باتوں سے مجھے یہ عندیہ ملا کہ وہ مجھ سے اپنے کسی دوست کو خط لکھوانا چاہتی ہے جو دُور کہیں ہندوستانی فوج میں ملازم تھا۔ نیز وہ ان خطوط کا جواب بھی میرے نام اور پتہ پر منگوانا چاہتی تھی اور ساتھ ہی مجھ سے کہنے لگی کہ میری ان باتوں کا کسی کو کانوں کان علم بھی نہ ہو۔ میں نے شروع میں تو اسے دو تین دفعہ خط لکھ دیے اور ان کے جواب بھی میرے نام آئے۔ ان خطوط کی آمد پر میرے ساتھی لڑکے خصوصاً زور خان اور شاہرا خان کو شک گذرنے لگا اور وہ دبے دبے الفاظ میں کہنے لگے۔ بھئی یہ خطوط کا سلسلہ کیسے شروع ہوگیا ہے۔ بھلا یہ خط ہمیں بھی تو دکھاؤ آخر یہ خط تمہیں لکھتا کون ہے اُن کے اس رویئے سے مجھے یہ خدشہ لاحق ہوگیا کہ اگر کسی دن میری عدم موجودگی میں ڈاکیہ سے ان میں سے کسی نے خط وصول کر لیا تو بڑی رسوائی ہوگی۔ ان خطوط میں کہیں بھی تو زرینہ کا نام نہ لکھا ہوتا تھا حالانکہ خطوط کے تمام تر مندرجات اسی کے لیے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر اس طرح کے خطوط پکڑے گئے اور لالہ سندر لعل کو دکھائے گئے تو وہ مجھے ذلیل و رسوا کر کے سکول سے نکال دیں گے اور اس سے میرے علاوہ میرے والد اور خاندان بھر کے لوگوں کی رسوائی ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ میں اب زرینہ کا آلہ کار ہرگز نہ بنوں گا۔ وہ مجھے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے اگر یہ سب باتیں میرے والد کو پتہ چل گئیں تو بہت بُرا ہوگا۔

زرینہ کے دوست کا نام شیر خان تھا۔ میں نے اپنے طور پر زرینہ کی طرف سے شیر خان کو ایک خط لکھا کہ جس لڑکے کی معرفت وہ ڈاک منگوایا کرتی تھی وہ چند دنوں تک سکول

چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس لیے میں اب آپ کو اتنا جلدی خط نہ لکھ سکوں گی۔ آپ خط کا جواب فی الحال ارسال نہ کریں۔ میں ڈاک کی ترسیل کی کوئی اور ترکیب نکالتی ہوں آپ ہر طرح سے اطمینان رکھیں۔

میں نے اس مضمون کا خط اپنی طرف سے لکھ کر ڈاک کے حوالے کر دیا۔ اس کے فوراً بعد شیر خان کا خط آیا۔ میرا خیال ہے وہ بھی پڑھا ہوا نہ تھا۔ اپنے کسی ساتھی سپاہی سے وہ بھی خط لکھوایا کرتا تھا۔ میں نے وہ خط پڑھ کر جلا دیا۔ میں گذشتہ ایک ہفتے سے زرینہ سے نہ ملا تھا۔ نہ جانے اس پر کیا گذر رہی ہوگی۔ اب میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ گاؤں سے لڑکوں کے ساتھ آتا تھا۔ ہوسٹل سے سکول بھی ساتھی لڑکوں کے ساتھ ہی آتا جاتا۔ اس عرصے میں دو تین دفعہ میں نے زرینہ کو گھڑا اٹھائے ہوئے گذرتے دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی رہتی تھیں۔ لیکن مجھ میں اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ تھی۔ جوں جوں دن گذرتے گئے۔ زرینہ کی بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب میں اسے اکثر سکول کو جانے والی راہ پر منڈلاتے ہوئے دیکھتا۔ لیکن میں چونکہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے بات کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ میں اپنی جگہ پر نادم و پشیمان تھا۔ ایک دن میں سب ساتھیوں کے ہمراہ سکول جا رہا تھا کہ میں نے گلی کے موڑ پر زرینہ کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دیتی تھی۔ جب ہم اس کے قریب سے گذرنے لگے تو وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

احمد! ذرا بات۔ تو سنو۔

میں نے سنی ان سنی کر دی اور اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ زور خان مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

اوئے احمد، تم کو ماسی (خالہ) بُلا رہی ہے۔

زور خان کی یہ بات مجھے بے حد ناگوار گذری۔ میں نے اسے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ ابھی اس کی صحیح پٹائی نہیں ہوئی تھی کہ شاہراخان اور فتح خان نے اُسے چھڑا لیا۔ اور وہ روتا ہوا واپس ہوسٹل کی طرف چلا گیا۔ شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب سے شکایت

کرنے کے لیے گیا ہوگا۔ لیکن مجھ سے کسی نے اس کے متعلق باز پرس نہ کی۔ عام حالات میں اگر وہ یہ بات کہتا تو میں اس کی بات کا کوئی نوٹس تک نہ لیتا۔ لیکن میں نے محض اس وجہ سے کہ میں زرینہ کو فیس (FACE) نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے اصل مسئلہ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے یہ حرکت کی۔

میں نے شیر خان کو جو خط لکھا تھا اُسے اب تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ زرینہ جس آگ میں جل رہی تھی اس کی تپش میں بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں میں نے زرینہ کو موقعہ ہی نہ دیا کہ مجھ سے تنہائی میں کوئی بات کر سکے۔ میں چاہتا تھا کہ میں اور زرینہ دو اچھے دوستوں کی طرح ہنسی خوشی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ہماری راہیں الگ الگ ہیں اور ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ تو مجھ سے شیر خان کو خط لکھوا کر ایک گونہ تسکین حاصل کر لیتی تھی۔ لیکن میں سوچتا میں خواہ مخواہ کرتوں کی دلالی میں اپنا منہ کیوں کالا کیے جا رہا ہوں۔ لیکن میں اب سمجھتا ہوں کہ اس کے حسن و جمال اور قربت سے میں بھی شاید تسکین پاتا تھا۔ بہرحال ہماری یہ ملاقاتیں آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھتی رہیں۔ کوئی ایک ماہ کے بعد ایک دن میں نے زرینہ کو سرِ راہ دیکھا وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جب میرے قریب آئی تو ایک لمحہ کے لیے رُک گئی۔ اس نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دو موتیوں کے قطرے اس کی گلابی گالوں پر ڈھلک آئے۔ میں بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے پہلو بچا کر دوسری گلی کی طرف مڑ گیا اور جلدی ہی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

## ۵

آٹھویں جماعت کا نتیجہ نکلا تو میں پاس ہو گیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی طرف سے اور دوسرے اساتذہ کی طرف سے کامیاب ہونے والے طلبا کو مبارکباد دی۔ میں جب اس سکول میں داخل ہوا تھا تو بہت غمگین اور رنجیدہ خاطر تھا۔ اور آج وہی سکول

چھوڑنے پر اس طرح کا رنج اور دُکھ ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوں گے تو شاید پھر عمر بھر ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

دوسرے دن ہم اپنا اپنا سامان اُٹھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جاتے وقت زرینہ کو ملنے اور ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل کے نہاں خانوں میں جاگزیں ہو گئی۔

میرے والد میری کامیابی کا سُن کر بے حد خوش ہوئے اور پھر وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں کو عملی شکل دینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ میرے بڑے بھائی ان دنوں بنوں پولیس میں ملازم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ والد صاحب مجھے مشن ہائی سکول بنوں میں داخل کرائیں۔ وہ کہتے تھے کہ اس سکول میں دوسرے سکولوں کی نسبت پڑھائی اچھی ہے۔ پھر قیام و طعام کا بھی کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ لیکن میرے والد نہ ملانے۔ انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ مجھے گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی میں داخل کرائیں گے۔ میرے والد صاحب اگرچہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے لیکن دنیاوی معاملات میں بڑے ماہر اور جہاندیدہ آدمی تھے۔ میرے بھائی سے کہنے لگے۔

احمد بڑا زود رنج ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتا ہے۔ اگر تم نے کبھی تھوڑی سی سختی روا رکھی تو فوراً اس کے دل میں یہ بات آجائے گی کہ یہ میرا سوتیلا بھائی ہے اس لیے مجھ پر سختی کرتا ہے اور پھر اس کے اور تمہارے درمیان نفرت کی ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہو جائے گی جسے تم دونوں بھائی عمر بھر نہ پاٹ سکو گے۔ ویسے بھی سوتیلے بھائیوں کی دشمنی مثالی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد تم دونوں بھائی ایک دوسرے سے دست و گریباں رہو۔

بات معقول تھی۔ میرے بھائی نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری عمر پندرہ سال کے لگ بھگ ہو گی جب میرے والد مجھے میانوالی داخلے کے لیے لے گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ بھائی صاحب ہر ماہ مجھے دس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجا کریں گے اور فوجی وظیفے کی رقم جو دو روپے ماہوار تھی اور ہر چھ ماہ کے بعد سکول کے ہیڈ ماسٹر کی وساطت سے

ملا کرتی تھی۔ وہ بھی میں رکھ لیا کروں گا۔ اس زمانے میں یہ رقم خاصی معقول رقم تھی۔ ان دس روپوں سے میں ہوسٹل کی فیس اور کھانے کا خرچہ ساڑھے سات روپے دے کر پھر بھی میرے پاس اڑھائی روپے بچ جاتے تھے۔ جس سے سب اخراجات اچھی طرح سے پورے ہو جاتے تھے۔ اُس وقت سولہ سیر روپے کی گندم، چوبیس سیر چنے اور سوا سیر خالص گھی ایک روپے کا ملتا تھا۔ ان دنوں ڈالڈا گھی اور چائے کا استعمال گاؤں کے لوگ نہ کرتے تھے۔

میانوالی میرے گاؤں ونڈہ شاہ بلاول سے تیس میل کے فاصلے پر جانب غرب دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ ان دنوں یہ پختہ سڑک جو ڈھک سے تلہ گنگ اور راولپنڈی کو جاتی ہے نہ تھی۔ میانوالی سے کوہ ڈھک تک پختہ سڑک تھی۔ کوہِ ڈھک کے دامن میں جانب غرب ایک چھبیل (سبیل) جو کسی نیک طینت ہندو نے جاری کر رکھی تھی۔ یہ جگہ موسیٰ خیل سے کوئی چار میل کے فاصلے پر جانب شرق تھی۔ یہاں پر اُسی ہندو نے ایک تالاب اور سرائے بھی تعمیر کروا رکھی تھی۔ وہاں سایہ دار درختوں کا بھی ایک جھنڈ تھا۔ جن کے نیچے تھکے ماندے مسافر آ کر دم لیتے اور پھر تازہ دم ہو کر وہاں سے اپنی اپنی منزل کو رواں دواں ہو جاتے۔

میانوالی کا اس وقت کا گورنمنٹ ہائی سکول موجودہ گرلز ڈگری کالج کے احاطے میں تھا۔ سکول سے بالکل ملحق جیل نما ایک ہوسٹل تھا جس کا ایک ہی صدر دروازہ تھا جو رات کو دس بجے چوکیدار بند کر دیتا تھا۔ اندر سے ہوسٹل بڑا وسیع تھا۔ تقریباً ایک سو لڑکوں کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ اس زمانے میں پچاس ساٹھ میل کے اندر اور کوئی ہائی سکول نہ تھا۔ پورے میانوالی ضلع میں کوئی کالج نہ تھا۔ نزدیک ترین کالج کیمبل پور (موجودہ اٹک) یا شاہ پور صدر تھا۔ اس زمانے میں کالج کی تعلیم کم حیثیت لوگوں کے بچے حاصل نہ کر سکتے تھے۔ میانوالی سے کیمبل پور اور شاہ پور صدر، میرا خیال ہے دونوں سو میل سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر ہوں گے۔ اس زمانے میں سڑکیں نہ تھیں۔ لوگ ریل کے ذریعے ہی ایک جگہ آتے جاتے تھے۔ جہاں ریل نہ تھی لوگ طویل سفر پیدل اور گھوڑوں وغیرہ پر

ملے کرتے تھے۔

مَیں جس دن میانوالی سکول میں داخل ہوا۔ اس دن مَیں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ریل گاڑی دیکھی تھی۔ ریل کی پٹڑی ہمارے سکول کے بالکل برابر ہی سے گذرتی تھی۔ مَیں نے جب ریل گاڑی دیکھی تو میری حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی اس دن میرے والد مجھے بازار لے گئے اور میرے لیے کپڑوں کے دو نئے جوڑے اور ایک جوڑا چمکتے دمکتے ہوئے سیاہ رنگ کے فلیکس کے بوٹ خریدے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس سے پہلے مَیں گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح مقامی جولاہوں کا بُنا ہوا کپڑا ہی پہنتا تھا۔ جسے میری بہن گھر پر ہاتھ سے سیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس کا لیبی مشینوں کا بُنا ہوا کپڑا کوئی ملازم پیشہ آدمی یا کوئی بڑا ہی امیر کبیر آدمی پہنتا تھا ورنہ سب لوگ کھڈی کا بُنا ہوا کپڑا ہی پہنتے تھے۔ ہٹی سے خریدا ہوا غیر ملکی کپڑا اس زمانے میں امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ مَیں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے والد نے اتنے پیسے کہاں سے لیے ہوں گے۔ حالانکہ اُن دنوں اچھا کپڑا دو اڑھائی آنے گز ہی ملا کرتا تھا۔ اور درزی کی سلائی چار آنے جوڑا ہوا کرتی تھی۔ مَیں نے حیرت سے والد سے پوچھ ہی لیا۔

بابو! آپ نے اتنے سارے پیسے کہاں سے لیے ہیں۔

بیٹا تمہیں ہائی سکول میں داخل کرانا تھا تو پیسوں کا انتظام تو کرنا ہی تھا۔

بابو۔ یہ پیسے کہاں سے آئے ہیں۔

بیٹے مَیں نے گائے بیچی ہے۔

کتنے میں۔

چالیس روپے میں۔

بابو اتنے پیسے تو میرے داخلے پر خرچ نہ ہوں گے۔

نہیں بیٹا۔ ہو جائیں گے۔ کچھ پیسے تمہیں بھی تو دے کر جاؤں گا۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ تمہارا بھائی تو اگلی یکم تاریخ کو تنخواہ ملنے پر ہی تمہیں پیسے بھیج سکے گا۔ تب تک تم کیا

کرو گے۔ دوسرے ساتھیوں کا منہ دیکھتے رہو گے۔

بازار سے میرے والد نے مجھے چار آنے کی مٹھائی خرید دی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس طرح کی مٹھائی نہ کھائی تھی۔ گڑ کھاتا تھا یا بہت ہوا تو بابا عطرو کی دکان سے کھانڈ کی ریوڑیاں خرید لیں۔ ایسے موقع پر میں اکثر بہن کی آنکھ بچا کر اندر سے دانے (غلہ) چھپا کر لے جاتا تھا اور اس سے ریوڑیاں خرید کر کھاتا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا یہ شہر میں رہنے والے لوگ کتنے امیر کبیر ہیں۔ غیر ملکی کپڑا زیب تن کرتے ہیں۔ انواع اقسام کی مٹھائیاں کھاتے ہیں اور ریل کی سواری کرتے ہیں۔

والد صاحب مجھے سکول میں داخل کروا کر ظہر کی نماز پڑھ کر ٹانگے پر بیٹھ کر گاؤں واپس چلے گئے۔ میانوالی سے چھپیل تک اٹھارہ میل کی مسافت تھی۔ اس سفر کے ٹانگے والا چار آنے فی سواری لیا کرتا تھا۔ وہاں سے گاؤں تک کا بارہ میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ جس آدمی کے پاس سامان ہوتا وہ موسیٰ خیل میں ٹانگے سے اُتر جاتا اور پھر وہاں سے اپنے لیے اونٹ یا خچر کرائے پر لیتا اور ان پر سامان لاد کر اپنی منزل مقصود کے لیے روانہ ہو جاتا۔

اس دن والد کے چلے جانے کے بعد میں بہت ہی غمگین اور اُداس تھا۔ مجھے اپنی بہن اور زرینہ بہت یاد آ رہی تھیں۔ زرینہ سوچتی ہو گی۔ آتے وقت میں اس سے ملا بھی نہیں۔ یہ سوچ کر میں اور بھی اُداس ہو گیا۔ اس سوچ میں ڈوبا ہوا میں ہوسٹل کے اندر اپنے کمرے میں آ کر اپنا سامان ٹھیک کرنے لگ گیا۔ میرے گاؤں کے دو تین لڑکے مجھ سے پہلے وہاں پڑھتے تھے اور ہوسٹل ہی میں قیام پذیر تھے۔ ان کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ میں سوچنے لگا ان سے گاؤں کے متعلق گاؤں کے لوگوں سے متعلق گپ شپ رہیگی۔ میں ابھی سامان ٹھیک کر ہی رہا تھا کہ میرے گاؤں کا ایک ساتھی طالب علم غلام قادر وہاں آ گیا۔ میں نے سامان کی سیٹنگ بند کر دی۔ اور اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اس نے مجھے سکول اور ہوسٹل کے متعلق چند باتیں بتائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب بڑے سخت اور رعب دار قسم

کے آدمی ہیں۔ اگر کوئی معمولی سی غلطی بھی ہو جائے تو بڑی سخت سزا دیتے ہیں۔ میں یہ سُن کر سہم گیا۔ مجھے لادہ والے سپرنٹنڈنٹ صاحب یاد آ گئے۔ جنہوں نے پہلے ہفتے ہی مجھے گھر جانے کی اجازت نہ دی تھی۔ میں سوچا کہ محکمہ تعلیم والوں کی یہ عجیب روایت ہے کہ وہ نہایت سخت گیر قسم کے آدمی کو سپرنٹنڈنٹ مقرر کرتے ہیں۔ غلام قادر نے مجھے بتایا کہ کھانا یہاں اچھا نہیں ملتا۔ چنے کی اُبلی ہوئی دال اور دو تندور کی روٹیاں ملتی ہیں۔ سب لڑکوں نے اپنا اپنا گھی رکھا ہوا ہے۔ وہ صبح شام دال کو خود ہی تڑکا لگا لیتے ہیں۔

لیکن میرے پاس تو گھی نہیں ہے۔ میں نے غلام قادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کوئی حرج نہیں۔ میرے پاس جو ہے۔ جب یہ ختم ہو گیا تو تم لے آنا۔

وہاں سکول اور ہوسٹل میں تقریباً نوے فیصدی مقامی لڑکوں کی تعداد تھی۔ گورنمنٹ ہائی سکول میں کوئی ایک آدھ ہندو یا سکھ لڑکا داخل ہوتا تھا۔ ورنہ سب غیر مسلم طلبا رام موہن رائے ہائی سکول میں داخلہ لیتے تھے۔ جو ریلوے اسٹیشن کے بالکل بالمقابل جانب مشرق واقع تھا۔ تقسیم برصغیر کے بعد جب غیر مسلم ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے تو اس سکول کی عمارت میں گورنمنٹ ہائی سکول فار بوائز منتقل کر دیا گیا اور گورنمنٹ ہائی سکول کی عمارت میں گرلز ڈگری کالج منتقل ہو گیا۔

میں نے میانوالی کے لوگوں میں ایک خاص بات دیکھی ہے کہ جہاں کہیں ان کی تعداد زیادہ ہو تو یہ اقلیت میں ہونے والے افراد کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ انہیں گھٹیا سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہوسٹل کا بھی یہی حال تھا۔ دسویں کلاس میں پڑھنے والے طالب علم باریش قسم کے بزرگ نظر آتے تھے۔ وہ مقامی ہونے کے باعث دور دراز کے لڑکوں پہ رُعب جما کر انہیں اپنی ماتحتی میں رکھتے تھے۔ بلکہ اُن سے چھوٹی موٹی بیگار بھی لیتے تھے۔ مثلاً ان کی چارپائی اندر باہر رکھنا۔ کمروں میں اُن کی چارپائیوں کے نیچے سے جھاڑو وغیرہ دینا۔ یا اُن کے لیے کچن سے کھانا لانا یا اُن کو پانی پلانا وغیرہ۔

چونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہوسٹل کے اندر نہ رہتے تھے۔ کیونکہ ان کا کوارٹر ہوسٹل سے ذرا ہٹ کر تھوڑی دور تھا۔ اس لیے ہوسٹل میں انہی بڑے لڑکوں (بارلیش بزرگوں) کا راج تھا۔ کوئی چھوٹا لڑکا اگر ان کی حکم عدولی کرتا یا کام میں کوتاہی کرتا تو وہ اسے پکڑ کر خوب مارتے تھے۔ کوئی لڑکا سپرنٹنڈنٹ صاحب یا ہیڈ ماسٹر سے اُن کی شکایت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا لادہ کے ہوسٹل میں تو میں بھی ایک چھوٹا سا چوہدری تھا۔ لیکن شاید یہاں اب کمین یا معین بن کر رہنا پڑے گا۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بعض اوقات بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ایک نے مجھے ہوسٹل کے بڑے فرعون نے کان پکڑوا کر بُری طرح مارا۔ قصور میرا یہ تھا کہ پردیسی لڑکے باری باری سے اُن مقامی (بزرگ) لڑکوں کی خدمت بجا لاتے تھے۔ میں نے اپنے لیے مقررہ دن پر ان کی چارپائیاں باہر صحن میں نہ نکالی تھیں۔ پڑھائی میں پہلے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس کڑی سزا کے بعد رہی سہی دلچسپی بھی جاتی رہی۔ اور مجھ پر اب اکثر وہ کیفیت طاری رہنے لگی۔ جس دن لادہ میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے مارا تھا اور پھر مجھے سنیچر کے دن چھٹی ہونے پر گھر نہ جانے دیا تھا۔ لادہ سے تو میں شاہ والی بن کی ٹاہلیاں دیکھ کر ہی ایک گونہ سکون حاصل کر لیتا تھا لیکن یہاں سے تو کوہِ سکیسر بھی نظر نہ آتا تھا۔ میں پژمردہ اور پُرملال رہنے لگا۔ اس زمانے میں ہمارے علاقے کے سب لوگوں کی آمد و رفت میانوالی کے راستے ہی ہوتی تھی۔ میں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات میں ریلوے سٹیشن پر ضرور جاتا تھا تاکہ دیکھوں کہ میرے گاؤں کا کوئی آدمی چھٹی تو نہیں آیا۔ میں گاؤں کے آدمیوں سے مل کر بہت خوش ہوتا تھا۔ گاؤں سے چھٹی گذار کر واپس آنے والوں کے ساتھ دن کا بقیہ حصہ تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں گذارتا تھا۔ اور پھر ہوسٹل بند ہونے سے پہلے واپس پہنچ جاتا تھا۔ کبھی کبھار گاؤں سے آنے والے لوگوں کے ساتھ کھانا کھا لیتا اور کبھی ہوسٹل میں غلام قادر کا رکھا ہوا کھانا واپس آ کر کھاتا۔

میں اب ہوسٹل کے اُن بڑے لڑکوں کے سامنے نہ آتا تھا۔ اس لیے پھر کبھی بھی

میری پٹائی کا موقع انہیں نہ ملا۔ میں ایک سال تک گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی میں پڑھتا رہا۔ اس ایک سال کے عرصے میں صرف ایک مقامی طالب علم محمد ایوب خان نُطفَ نیازی میرا دوست بنا۔ نیازی صاحب۔ گورا نکھرا سوا رنگ مردانہ حُسن کا ایک مکمل نمونہ۔ میانوالی کے نواح میں مہر خان والا کے ایک متمول نیازی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد الحاج خان محمد خان صاحب کو جب میں نے دیکھا تو موصوف اس وقت کوئی ساٹھ ستر کے پیٹے میں تھے۔ گوری رنگت، دراز قد، سر پر پٹے اور خشخاسی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ ایوب خان کے دوستوں کو بھی بالکل اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ ایوب خان مجھ سے ایک کلاس سینئر تھا۔ اس لیے ہم دونوں نے سکول تقریباً اکٹھا ہی چھوڑا۔ نیازی صاحب فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اب سُنا ہے کہ موصوف بحیثیت کپتان ریٹائرڈ ہو کر میانوالی واپس آ گئے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کے بعد سے اب تک نیازی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ان کی شرافت اور خلوص نے جو اَن مٹ نقوش میرے ذہن پر چھوڑے ہیں ان کی وجہ سے نیازی صاحب اب بھی میرے سامنے چلتے پھرتے مجھے نظر آتے ہیں۔ میانوالی کے قیام کی کوئی یاد ایسی نہیں ہے جسے میں حسین سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھوں۔ البتہ میانوالی کی تلخ یادیں اتنی ہیں کہ میں باوجود کوشش کے بھی انہیں اب تک نہیں بھلا سکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں سکول میں ابتدائی تعلیم صحیح خطوط پر نہ حاصل کر سکا اور یہ کمی آخر تک میرے لیے سوہانِ رُوح بنی رہی۔ میں مڈل میں تھا۔ تو حساب جیومیٹری میں تقریباً صفر ہی تھا۔ پھر جب میانوالی پہنچا تو حساب، الجبرا اور جیومیٹری جو اس زمانے میں انگریزی میں پڑھاتے تھے۔ ان مضامین کے اساتذہ گھنٹہ بھر تک مغز ماری کرتے رہتے لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔ جوں توں کر کے ایک سال میانوالی میں گذارا۔ نویں جماعت کا سالانہ امتحان ہوا تو میں بُری طرح فیل ہوا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد بغیر والد صاحب کی اجازت کے اپنا بوریا بستر باندھ کر گاؤں واپس آ گیا۔ والد دیکھ کر بہت ناراض ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے۔

پڑھتا تو نہیں ہے۔ زمینداری تم سے ہوتی نہیں۔ آخر کار تم کر دگے کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم زندگی بھر یونہی دھکے کھاتے رہو گے۔

میں ان کے سامنے ندامت کے باعث سر جھکائے کھڑا تھا کہ وہ کہنے لگے۔

اب جب سکول کی تعلیم تم نے ختم کر دی ہے تو بہتر ہے کہ حافظ محمد خان صاحب کے درس میں داخل ہو جاؤ اور قرآن شریف پڑھ لو۔

ٹھیک ہے بالو جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے حامی بھر لی۔

○

دو تین دن کے بعد میرے والد مجھے بڑے حضرت صاحب کی مسجد جہاں حافظ محمد خان صاحب قرآن کریم پڑھایا کرتے تھے لے گئے۔ حافظ صاحب میرے والد کے دوست تھے۔ میں نے پہلی دفعہ درس کا ماحول دیکھا۔ کوئی ایک سو کے قریب لڑکے جن میں زیادہ تعداد پردیسی لڑکوں کی تھی جو مسجد سے ملحق ایک بڑے سے کوٹھے میں قیام پذیر تھے۔ فرش پر گھاس بچھا ہوا تھا اور ان کی گدڑیاں لپٹی ہوئیں ایک طرف کو دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی پڑھائی کے بعد اپنے اُس رہائشی کوٹھے میں چلے جاتے تھے۔ حافظ صاحب میرے والد کو اُٹھ کر ملے اور اپنے ساتھ مُصلے پر بٹھایا۔ میں اپنے والد کی اوٹ میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ حافظ صاحب نے میرے والد سے آنے کا سبب پوچھا۔

ملک صاحب کیسے تشریف لائے ہیں۔

حافظ صاحب میرا یہ چھوٹا بیٹا میانوالی پڑھتا تھا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر گاؤں واپس آ گیا ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ یہ کچھ پڑھ جائے لیکن کم بخت پڑھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اس نے سکول جانا ختم کر دیا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اسے اب آپ کی مسجد میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے چھوڑ دوں۔

ملک صاحب یہ حفظ تو نہیں کر سکے گا۔ ناظرہ ہی پڑھ لے تو یہ بھی بہت ہے۔

کیوں حفظ کیوں نہ کر سکے گا۔ میرے والد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
وہ اس لیے ملک صاحب کہ عام طور پر پانچ چھ سال کی عمر سے بچے قرآن حفظ کرنا شروع کرتے ہیں۔
اس کی بھی کوئی زیادہ عمر نہیں۔
یہ تو مجھے بڑا لگتا ہے۔ اس کی کتنی عمر ہوگی۔ حافظ صاحب نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
کوئی پندرہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔
بہتر ہے ملک صاحب آپ اسے ناظرہ ہی پڑھنے دیں۔ اتنا کچھ بھی یہ کر لے تو یہ بھی اس کے لیے بہت ہوگا۔
جیسے آپ کی مرضی۔
اور پھر میرے والد مجھے حافظ کے سپرد کر کے گھر واپس چلے گئے اور میں ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ درس کا عجب ماحول تھا۔ دو قطاروں میں لڑکے حافظ صاحب کے سامنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر لڑکا پورے جوش و خروش سے اپنا سبق یاد کر رہا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ باری باری سے چار چار لڑکے حافظ صاحب کے سامنے دو زانو ہو کر اور ہاتھ پیٹ پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور پھر اپنا اپنا سبق انہیں زبانی سناتے۔ وہ اس تیز رفتاری سے پڑھتے کہ عام آدمی کو کچھ بھی سمجھ نہ آتا کہیں کہیں حافظ صاحب انہیں ٹوک دیتے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور پھر پیچھے سے پڑھتے ہوئے غلطی کو درست کر لیتے اور پھر اسی روانی سے پڑھنا شروع کر دیتے۔ سبق سنا لینے کے بعد حافظ صاحب انہیں ہدایت کرتے کہ وہ اگلا رکوع یاد کریں۔ جن لڑکوں نے سبق یاد نہ کیا ہوتا حافظ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ایک بہت لمبی سی چھمک (چھڑی) سے اس کی تواضع کرتے اور پھر دوبارہ اچھی طرح یاد کرنے کی ہدایت دیتے۔

اس پورے درس میں ناظرہ پڑھنے والا کوئی ایک آدھ لڑکا ہی تھا۔ سب لڑکے اپنے

اپنے نمبر پر آتے اور حافظ صاحب کو سبق سناتے اور اگلا سبق لے کر واپس اپنی جگہ پر جاکر اپنا سبق یاد کرنا شروع کر دیتے۔

درس میں جتنے بھی لڑکے پڑھتے تھے میں نے کسی کے سر پر بال نہ دیکھے۔ سب کے سر منڈے ہوئے تھے یا خشخاشی بال تھے۔ صبح کی نماز کے بعد جب سورج ذرا اوپر کو آجاتا تو وہ لڑکے جنہیں مقامی لوگ طالب کہتے تھے، دو دو کی ٹولیوں میں کم از کم آٹھ دس لڑکے وظیفہ لینے کے لیے گاؤں میں چلے جاتے۔ ہر ایک کے پاس ایک کٹا ہوا کنستر ہوتا تھا۔ جسے اوپر سے پکڑنے کے لیے ایک تار لگا ہوا ہوتا تھا۔ یہ طالب ہر دروازے پر جاکر صدا لگاتے۔ "وظیفہ دو جی" ایک روٹی یا آدھی روٹی گھر کی کوئی بڑی بوڑھی لاکر انہیں دروازے پر آکر دیتی۔ اور وہ اسے اپنے ٹین میں ڈال لیتے۔ اس روٹی کو ان طالبوں کی زبان میں "وظیفہ" کہا جاتا۔ ہر ٹولی میں ایک بڑا لڑکا اور ایک چھوٹا لڑکا ہوتا۔ یہ ٹولیاں تقریباً دس بجے کے قریب واپس آجاتیں۔ انہوں نے ایک بڑا سا برتن لسی کے لیے بھی اٹھایا ہوا ہوتا تھا۔ جن گھروں میں لسی وافر مقدار میں ہوتی یہ وظیفے کے ساتھ لسی بھی وہاں سے لیتے۔ اسی طرح شام کو دال ترکاری بھی مانگتے تھے۔ مائیں بہنیں ایک ایک چمچ ترکاری کا اس برتن میں ڈال دیتیں۔ گدا پر جانے والے یہ بچے مغرب کی نماز کے بعد واپس آجاتے اور پھر سب لڑکے آمنے سامنے دو قطاروں میں بیٹھ جاتے اور گدا کا لایا ہوا کھانا کھاتے۔ درس میں ایک سینئر لڑکا حافظ جی کی عدم موجودگی میں ان میں نظم و ضبط بحال رکھتا۔

ہمارے گاؤں میں پینے کے پانی کا اس زمانے میں ایک بڑا مسئلہ تھا۔ نالہ گمبھیر سے جو گاؤں سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا وہاں سے سر پر اٹھا کر لاتے تھے۔ اس درس کا یہ معمول تھا کہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد تقریباً دس لڑکے گھڑے اپنے سروں پر اٹھائے پانی بھرنے کے لیے نالہ گمبھیر پر جاتے۔ پانی بھر لانے کے بعد وہ اپنا سبق یاد کرتے۔ جمعہ والے دن چھٹی ہوتی۔ اکثر لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ جو نہ جا سکتے وہ نالہ پر نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے چلے جاتے۔ انہیں کھانے پینے کا کسی طرح کا

کوئی غم نہ ہوتا۔ ہر چیز انہیں درس میں مل جاتی تھی۔ پہلے دن جب میرے والد مجھے درس میں چھوڑ کر گئے تو میں لڑکوں کے پیچھے دبک کر بیٹھا رہا۔ حافظ جب دوسرے طالب علموں سے فارغ ہوئے تو مجھے بلایا۔ اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ میں عام طریقے سے بیٹھا انہوں نے مجھے بتایا کہ بیٹا مسجد میں ہمیشہ دوزانو ہو کر بیٹھا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سر سے پگڑی اتار دو۔ میں نے پگڑی اتاری تو وہ میرے بڑے بڑے انگریزی طرز کے بال دیکھ کر کہنے لگے۔

بیٹا یہ بال آج ہی منڈوا دو یا باریک مشین سے خشخاشی بنوالو۔

حافظ صاحب منڈا ہوا سر ٹنڈ، تو بہت برا لگتا ہے۔ میں نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے فوراً ان کے منہ پر کہہ دیا۔

گفتار ہے بیٹا۔ دوسری بات جو تمہیں کرنا پڑے گی۔ کل سے ایک ماہ تک تالاب گمبھیر سے ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کر لانا ہوگا۔ صبح منہ اندھیرے جانا تاکہ پڑھائی میں ہرج واقع نہ ہو اور وقت پر واپس پہنچ سکو۔

حافظ صاحب میں تو کبھی بھی گمبھیر سے پانی نہیں لایا۔ ہمارے گھر میں ہمارا پانی ایک مراثی بھرتا ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا وہ ایک ماہ تک روزانہ پانی کا ایک گھڑا یہاں لا کر چھوڑ جایا کرے گا۔

نہیں بیٹا۔ درس میں تو جتنے بھی لڑکے پڑھتے ہیں۔ وہ سب کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔

حافظ صاحب اور جو بھی کام ہوا میں کر دیا کروں گا۔ لیکن اتنی دور سے پانی لانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ مجھ سے تو یہ کام نہ ہو سکے گا۔

اور کیا کام کرو گے۔ پردیسی لڑکوں کے ساتھ وظیفہ لینے ہر دروازے پر جایا کرو گے۔

میں کیوں جاؤں گا۔ جو یہ روٹی کھاتے ہیں وہی "گدا" کے لیے جائیں۔

تو پھر تمہیں تو یہاں کی کوئی بھی ریت پسند نہیں ...... انہوں نے تھوڑے توقف

کے بعد کچھ سوچتے ہوئے مجھ سے کہا۔
اچھا فی الحال تم بال بالکل کٹوا دو۔ سر بالکل روڈا ر خشخاشی ، کروا کر آؤ پھر دیکھیں گے۔

لیکن حافظ صاحب بالوں کے ہونے یا نہ ہونے سے قرآن کریم کی تعلیم کا کیا تعلق ہے۔

ہے بیٹے۔ اس درس میں ہم قرآن کریم پڑھانے کے علاوہ انہیں ضبط نفس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ جب تک تمہاری یہ " میں " نہیں مرے گی تم صحیح ورہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

حافظ صاحب یہی " میں " اقبال کی خودی ہے۔ جسے زندہ رکھنے اور اس کے تدریجی ارتقاء کے لیے علامہ صاحب نے بہت زور دیا ہے۔ انسان کی خودی مر جائے تو پھر تو وہ ایک بے جان لاشے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

بیٹے بحث مت کرو۔ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ اس پر فوراً عمل کرو۔

حافظ صاحب ان سب باتوں پر تو عمل کرنا میرے لیے بے حد مشکل ہے۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ ہو سکے گا۔

یہ سب کچھ مشکل ہے۔ تم سے نہ ہو سکے گا! حافظ صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنی چھمک مجھے مارنے کے لیے اُٹھائی۔

خبردار حافظ صاحب اگر چھمک ماری تو بہت بُرا پیش آؤں گا۔ میں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

انہوں نے چھمک نیچے رکھ دی اور مجھ سے کہنے لگے۔ بیٹا تم واپس گھر چلے جاؤ تمہاری کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔ تم قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے۔ یہاں تو ہم قرآن شریف بعد میں پڑھاتے ہیں پہلے آدمی کی " میں " مارتے ہیں۔ تم میرے دوست کے بیٹے ہو۔ میں چاہتا تھا کہ تم پڑھ جاؤ۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم نہیں پڑھ سکتے۔ " جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ "

میں نے اُٹھ کر کپڑے جھاڑے اور پھر درس سے باہر نکل آیا۔ جب میں درس سے باہر آ رہا تھا تو سب لڑکے مجھے نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں درس سے اُٹھ کر سیدھا گھر آیا۔ ابھی میرے والد باہر کھیتوں میں کام پر نہیں گئے تھے۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔

ابھی تو چھٹی کا وقت نہیں ہوا۔ تم پہلے کیوں آ گئے ہو۔

میں نے اپنے والد کو جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ وہ چُپ رہے۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ بابو جی آپ دیکھیں۔ میں سر پر اُسترا کیسے پھروا سکتا ہوں۔ پھر گھیر سے روزانہ ایک گھڑا پانی کا کیسے لا سکتا ہوں۔ میں نے حافظ صاحب کو بتا دیا تھا کہ ہمارا نوکر روزانہ ایک گھڑا پانی کا باقاعدگی سے چھوڑ جایا کرے گا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ بابو آپ ہی بتائیں میں ان طالبوں کے ساتھ وظیفہ لینے کے لیے ایک ایک دروازے پر کیسے گدا کے لیے جا سکتا ہوں۔ نہیں بابو یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ میرے والد نے کوئی بات نہ کی۔ ان کے چہرے سے ایک عجیب سی ناخوشگواری کے آثار مترشح تھے اور پھر وہ مجھ سے بات کیے بغیر چُپ چاپ بیلوں کو لے کر باہر کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

۵

میں تھوڑی دیر تک گھر میں بیٹھا رہا۔ پھر "معرکہ نواب خان" کی طرف چلا گیا۔ وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ معرکہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ رات کو تو یہاں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ کتنی دلچسپ اور روح پرور محفلیں جمتی ہیں۔ اور اس کے یہاں ہُو کا عالم ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اس دوران میں کوئی آدمی بھی اس طرف کو نہ آیا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر باہر کھیتوں میں گئے ہوئے تھے۔ دنیا میں میں ہی صرف ایک ایسا آدمی تھا۔ جسے کوئی کام۔ کوئی جگہ کوئی مقام راس نہ آتا تھا۔ میں سوچتا تھا۔ اس بھری دنیا میں تو ہر آدمی کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ کام ہی سے تو عزت ہے

آدمی کی۔ مَیں بھی اب جوان ہوگیا ہوں۔ میری عمر پندرہ سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مجھے بھی نوکری نہ کوئی کام کرنا چاہیے۔ لیکن کیا کام کروں۔ مجھے توکوئی کام کرنا بھی نہیں آتا۔ مجھے والد کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا چاہیے۔ وہ بوڑھے آدمی ہیں مجھے ان کی مدد کرنا چاہیے جو تھوڑا بہت مجھ سے ہوسکتا ہے اتنا تو میں کروں۔ یونہی نکما پھرنے سے تو کام نہیں بنے گا۔ دن میں کوئی لڑکا بھی تو کھیلنے کے لیے نہیں ملتا۔ سب لڑکے پڑھنے کے لیے سکول جاتے ہیں۔ جو سکول میں نہیں پڑھتے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ مَیں کم ازکم اتنا تو کرسکتا ہوں کہ جب والد صاحب ہل چلانا ختم کریں تو مَیں بیلوں کو چرا سکتا ہوں۔ ان کے لیے چارہ کاٹ سکتا ہوں۔ شام کو انہیں پانی پلانے کے لیے نالہ گمبھیر پر لے جاسکتا ہوں۔ اگر اتنا کچھ بھی کرلوں تو میرے والد اور بہن کو بڑی سہولت ہو جائے گی۔ مَیں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ کل سے باقاعدگی کے ساتھ والد صاحب کا کام کاج میں ہاتھ بٹاؤں گا۔ یہ سوچ کر مَیں گھر واپس آگیا۔ بہن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

تم جلدی سے کھانا کھالو۔ مَیں نے ماموں جان کی روٹی لے جانی ہے۔ پھر اس کے بعد بیلوں کے لیے چارہ کاٹنا ہوگا۔

یہ کام باجی مَیں کردیا کروں گا۔ مَیں نے نہایت وثوق سے یہ بات کہی۔

تم وقت پر کھانا ہی کھالو تو میرے لیے تمہاری یہی مدد کافی ہے۔ تاکہ مجھے تمہارا انتظار نہ کرنا پڑے۔

باجی مجھے آپ کھانا دیں۔ مَیں کھانا کھاکر ابا جی کے لیے کھانا لے جاؤں گا۔ پھر اُدھر سے ہی چارہ بھی کاٹ لاؤں گا۔

تم سے چارہ نہیں کاٹا جائے گا۔ کبھی زمینداری کا کام تو تم نے کیا ہی نہیں۔ تمہارے لیے چارہ کاٹنا مشکل ہوگا۔ ہاتھ پر درانتی لگ جائے گی۔

نہیں لگتی۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد مَیں والد کے لیے کھانا لے کر چکبندی (ایک قطعہ زمین کا نام) چلا گیا۔ میرے والد نے مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ والد نے بیلوں کی جوڑی کو بیری

کے درخت کے نیچے لاکر کھڑا کر دیا اور مشکیزہ سے پانی لے کر ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ انہوں نے ممو سے پوچھا۔

تمہاری بہن چارہ لینے کب جائے گی۔

اب تک چلی گئی ہوگی۔ وہ تو مجھے آپ کے لیے روٹی بھی نہیں لانے دیتی تھی۔ کہتی تھی میں خود لے کر جاؤں گی۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں والد صاحب کو روٹی دے کر چارہ کاٹنے چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ کہتی تھی۔ تم چارہ نہیں کاٹ سکو گے۔ کیوں بابو چارہ کاٹنا اتنا مشکل ہے۔

نہیں بیٹا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن جس آدمی نے کام نہ کیا ہو۔ اس کے لیے مشکل کام ہے۔ نئے آدمی اکثر درانتی سے اپنا ہاتھ کاٹ لیتے ہیں۔ تم آسان کام کر دیا کرو۔ تمہاری اتنی مدد بھی ہمارے لیے بہت ہے۔

ٹھیک ہے بابو۔ آپ ہل چلانا ختم کریں گے تو میں بیلوں کو چرانے کے لیے لے جاؤں گا۔ اور پھر شام کو پانی پلانے کے لیے گمبھیر پر لے جاؤں گا۔

ہاں بیٹے تھوڑا تھوڑا کام باقاعدگی سے کرو گے تو تمہیں محنت کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔

اب میرے فرائض میں یہ دو کام شامل ہو گئے تھے۔ ایک صبح دس بجے کے قریب والد کو کھیتوں میں کھانا لاکر دینا اور دوسرا شام کو بیلوں کو پانی پلانے کے لیے نالہ پر لے کر جانا۔ دن بھر مزے سے کھیلتا تھا۔ گاؤں میں فارغ لڑکے کم ہی ملتے ہیں کچھ سکول چلے جاتے ہیں۔ جو سکول نہیں جاتے وہ والدین کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔

شام کو غروب آفتاب کے قریب کائی لڑکے کھیلنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے پھر بھی دن میں کوئی ایک آدھ آوارہ یا سکول سے بھاگا ہوا لڑکا مجھے کھیلنے کے لیے مل ہی جاتا۔ اس طرح میں نے پانچ چھ مہینے مستقل گاؤں میں گذارے۔ اگر آدمی کی مصروفیت نہ ہو تو وقت ہی نہیں کٹتا۔

## ۵

اکتوبر ۱۹۴۳ء کا آخری ہفتہ تھا۔ میرے بڑے بھائی دو ماہ کی رخصت پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑے حلیم، خاموش اور شریف الطبع آدمی ہیں۔ ایک دن میں اپنے ایک ہم عمر عزیز کے ساتھ اخروٹ کھیل رہا تھا کہ میرے بھائی بھی ہمارا کھیل دیکھنے کے لیے پاس ہی آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ میرا عزیز بار بار میری زیادتی پر احتجاج کرتا اور رونی صورت بنا کر میرے بھائی کی طرف دادرسی کے لیے دیکھنے لگ جاتا۔ ایک دفعہ جب میں نے واضح طور پر اس کے ساتھ زیادتی کی تو میرے بھائی مجھ سے کہنے لگے۔

کھیلتے ہو تو ایمانداری کے ساتھ کھیلو۔ میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کے ساتھ سراسر زیادتی کر رہے ہو۔

آپ کون ہوتے ہیں مداخلت کرنے والے۔ میں نے نہایت ہی گستاخانہ انداز میں کہا۔

ہوش کے ناخن لو۔ تمہیں بات کرنی بھی نہیں آتی۔ میرے بھائی نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے سرزنش کے انداز میں کہا۔

میں نے نہایت ہی بدتمیزی اور بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور بھائی کو پیچھے کی طرف سے زور کا ایک دھکا دے دیا۔ ان کے پیچھے کھرلی تھی وہ اس میں گر گئے۔ دور کھڑے میرے والد یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ادھر ہی سے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

آج تم نے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ آج بڑے بھائی کو دھکا دیا ہے۔ کل ان کو مارے گا۔ اگلے دن میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گا۔ میں نے اپنے دل میں یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے آئندہ تمہیں ماروں گا نہیں۔ لیکن آج تو تم نے شرافت کی تمام حدیں پھلانگ لی ہیں۔ اور پھر وہ چھمک لے کر میری طرف تیز تیز قدموں

سے چلنے لگے۔ میں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ راہ فرار اختیار کروں۔ چنانچہ ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتا ہوا اُن کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ وہ تھوڑی دور تک تو میرے پیچھے بھاگے لیکن بوڑھے آدمی تھے مجھے کہاں پکڑ سکتے تھے۔ میں جن کپڑوں میں تھا انہی میں سیدھا لاوہ جا پہنچا۔ رات ہوسٹل میں اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ بسر کی۔ وہاں اسی رات پتہ چلا کہ صبح ڈاک بنگلہ میں فوج کے لیے بھرتی ہو رہی ہے۔ میں نے بھی دل میں تہیہ کر لیا کہ میں بھی صبح بھرتی ہونے کے لیے ڈاک بنگلہ میں جاؤں گا۔

رات دس بجے کے بعد سب لڑکے پڑھنا ختم کر کے اپنے اپنے بستروں پر سو گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد چاروں طرف سے خراٹوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں نہ جانے مجھے کیوں نیند نہ آ رہی تھی۔ میں سوچتا میں بھی کتنا بدبخت انسان ہوں۔ والدہ بھائی اور بہن کو کبھی کوئی سکھ نہیں دیا۔ میرے والد بے چارے اس بڑھاپے میں بھی کھیتوں ین باقاعدگی سے کام کرتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ میں خود تو تعلیم حاصل نہیں کر سکا، یکن میرا مصمم ارادہ ہے کہ میں احمد کو بی۔ اے تک ضرور پڑھاؤں گا۔ میں نے زندگی ے ہر مرحلہ پر والد کو مایوس کیا ہے۔ گاؤں میں ہر روز کوئی نہ کوئی میرے والد سے میری شکایت ضرور کرتا ہے کہ احمد بچوں کو مارتا ہے۔ کراڑوں (ہندو، سکھ دوکاندار) سے زبردستی چیزیں چھین لیتا تھا۔ لوگوں کی بکریاں باہر چر رہی ہوں تو ان کو پکڑ کر ان کا دودھ پی لیتا ہے گھر سے بہن کی آنکھ بچا کر کُرتے کے نیچے دانے (غلہ) چُرا کر لے جاتا ہے۔ ابھی اگلے دن بخش نائی سے اس کے بلارے کے آٹھ دس بٹیرے چھین لیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر روز لوگ میری زیادتیوں کی شکائتیں میرے والد سے کرتے۔ وہ بے چارے شرمسار ہو کر فریادیوں سے میری ان زیادتیوں کے لیے معذرت کرتے۔ میں سوچتا اور تو کوئی لڑکا ایسا نہیں کرتا۔ میری زیادتیوں کی وجہ سے گاؤں کے لوگ میرے والد کو کتنا شرمسار کرتے ہیں۔ میرے والد کا جگری دوست محمد شاہ اکثر میرے والد سے کہا کرتے تھے۔

ملک صاحب آپ کے اس بیٹے کو اللہ پاک سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق دے ای

کے لچھن مجھے کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ جیل کی دیوار پر چل رہا ہے۔ پتہ نہیں کب اندر گرتا ہے
محمد شاہ پیرا۔ میرے اس بیٹے کی ماں نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں یہ نیک بخت آگے چل کر کیا بنے گا۔ پڑھ یہ نہیں سکا۔ کسی قسم کی لیاقت اس میں نہیں۔ اسے زندگی گذارنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ مَیں نے اس کی شادی کر کے بے حد غلطی کی ہے۔

مَیں تو ملک صاحب آپ کو کہتا تھا کہ ابھی اس کی شادی نہ کریں۔ اس کی عمر بھی کوئی پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اتنی چھوٹی عمر میں شادی نہیں کرنی چاہیئے۔

بس پیرا! کچھ گھریلو اور خاندانی حالات و واقعات ایسے تھے کہ مجھے مجبوراً چھوٹی عمر میں اس کی شادی کرنی پڑی۔

## ۵

نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی کہ خیالات کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دوسرے دن صبح سویرے چچا قاسم خان کی آواز پر مَیں بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ جاگا۔ سب لڑکے سکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ میں اکیلا اپنی چارپائی پر بیٹھا اپنی نئی زندگی کے متعلق سوچتا رہا۔ جب سب لڑکے سکول کی طرف روانہ ہوئے تو میں بھی تھکے ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ ڈاک بنگلہ کو جانے کے لیے سکول کے بالکل قریب سے راستہ گذرتا ہے۔ لاوہ کا ڈاک بنگلہ نالی ترپی کے اُس پار آبادی سے دور واقع ہے۔ مَیں اُن لڑکوں کے ساتھ جب کھوپرسر کے پاس پہنچا تو مَیں نے زرینہ کو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ گھڑا اُٹھائے ہوئے دیکھا۔ وہ سب نالہ ترپی پر پانی بھرنے کے لیے جا رہی تھیں۔ پہلے کی نسبت اب زرینہ کی صحت بہتر تھی۔ مجھے دیکھ کر حیرانگی کے عالم میں اس پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے دوسری عورتوں اور میرے ساتھی لڑکوں کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے بلا ہی لیا۔

احمد ۔ احمد ۔ ادھر آؤ۔

میں بوجھل قدموں سے شکستہ دلی کے عالم میں چلتا ہوا اس کے پاس گیا۔ ان عورتوں اور لڑکوں نے کوئی نوٹس نہ لیا اور وہ آگے کو نکل گئے۔

تم یہاں کب آئے ہو۔ زرینہ نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

رات کو۔

رات کو بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے تھے؟

جی ہاں۔

ہمارے گھر آجاتے۔

ایک ہی بات ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں بھی ان ساتھی لڑکوں نے میری اچھی طرح دیکھ بھال کی ہے۔

آؤ میرے ساتھ ہمارے گھر چلو۔ میں تمہیں ناشتہ کراؤں گی اور پھر بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کریں گے۔

نہیں مہربانی۔ آج ڈاک بنگلہ میں فوجی بھرتی ہے۔ میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے لاوہ آیا ہوں۔

میانوالی سے آئے ہو۔

جی نہیں۔ گاؤں سے آیا ہوں۔

مجھے تو کسی نے بتایا تھا کہ تم نے میانوالی کے کسی بڑے سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔

لیا تھا۔ لیکن اب میں پڑھائی ختم کر کے مستقل طور پر گاؤں واپس آگیا ہوں۔

گاؤں میں کیا کرتے ہو۔ پڑھتے تو اچھا تھا۔

کوئی خاص کام نہیں کرتا۔ والد صاحب کو ان کے کام میں تھوڑی مدد کرتا ہوں۔

اب تو تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔ اس نے بڑی کومل نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

لا وہ سکول چھوڑے ہوئے بھی تو مجھے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ اس عمر میں لڑکے جلدی جلدی بڑے ہوتے ہیں۔

وہ ہنس پڑی اور میں جھینپ گیا کہ شاید میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ ابھی میں وہاں کھڑا زرینہ سے باتیں کر رہا تھا کہ دور دراز کے گاؤں سے بھرتی کے لیے آنے والے لوگ جوق در جوق بنگلہ کی طرف رواں دواں نظر آئے۔

یہ سب لوگ بھی شاید بھرتی کے لیے جا رہے ہیں۔ زرینہ نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرا خیال ہے بھرتی کے لیے ہی جا رہے ہیں۔ چونکہ یہ باتیں بھی تو بھرتی کی کرتے جا رہے ہیں۔

کپڑے تو صاف پہن کر آتے۔ تم نے تو کبھی میلے کپڑے نہیں پہنے۔ اس نے میرے میلے کپڑوں کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

کھیتوں سے آیا تھا۔ بیلوں کو گھر چھوڑا اور پھر سیدھا ادھر چلا آیا۔

ابھی بہت وقت ہے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ ہمارے گھر نہا کر نئے کپڑے پہن کر چلے جانا۔

کپڑے تم کہاں سے لو گی۔ تمہارے ابا کے کپڑے تو پرانی وضع کے ہوں گے وہ تو میں نہیں پہن سکتا۔

نہیں میں ابا کے کپڑے تمہیں تھوڑا ہی دینے لگی ہوں۔

تو کیا اپنے کپڑے دو گی مجھے۔

اور وہ ہنس پڑی۔ جناب نہیں میں آپ کو شیر خان کا نیا جوڑا نکال کر دوں گی۔

کون شیر خان۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ ہلکا سا مسکرائی اور پھر آہستہ آہستہ نپے تلے انداز میں مجھ سے کہنے لگی۔

احمد۔ اچھے لڑکے تم شیر خان کو نہیں جانتے۔ تم ہی نے تو ہماری شادی کروائی ہے۔

یَں نے ۔ میَں نے ایک گونہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جناب وہی شیر خان جس کو آپ میری طرف سے خط لکھا کرتے تھے ۔ بہر حال کہانی کا اختتامیہ تم نے اچھا نہیں لکھا۔

میَں شرما گیا اس کا اشارہ میرے اس آخری خط کی طرف تھا ۔ جس میں میَں نے شیر خان کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔

کیا تم نے فی الواقع شیر خان سے شادی کر لی ہے ۔

کیا کرتی ۔ تمہارا کون انتظار کرتا ۔

لیکن میَں نے تو آپ کو انتظار کرنے کے لیے نہیں کہا تھا ۔ میَں آپ کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا تھا ۔ عمر کا یہ تضاد ، اس خلیج کو کون پاٹ سکتا ہے ۔

احمد میَں نے بھی یہی سوچ کر شیر خان کے ساتھ شادی کر لی ہے ۔

پہل تمہاری طرف سے ہوئی یا شیر خان کی طرف سے ۔

تمہارا خط ملنے پر وہ بہت پریشان ہو گیا ۔ فوراً رخصت پر گاؤں آیا ۔ اس نے آتے ہی تمہارا پتہ کیا تو اسے پتہ چلا کہ تم میانوالی چلے گئے ہو ۔ اس لیے اس نے مجھ سے سرِ راہ ملنے کی کوشش کی ۔ ملاقات پر ہم دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ وہ اپنے والدین کے ذریعے میرے ماں باپ سے میرا رشتہ پوچھے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کی چھٹی ہی میں ہماری شادی ہو گئی ۔ اور اب میَں اپنے نئے گھر میں رہتی ہوں ۔ شیر خان چھٹی گذار کر واپس اپنی نوکری پر چلا گیا ہے ۔

کیسی شکل و صورت ہے اس کی ۔ میَں نے معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے اسے کہا۔

وہ شرما گئی ۔ اور پھر آہستہ سے کہا ۔ " بالکل تمہاری طرح "

زری کی ساس گھڑا اُٹھائے ہوئے گھر کی طرف سے آتی ہوئی نظر آئی ۔ زری نے مجھے بتایا کہ میری ساس آ رہی ہے ۔ تم بھرتی کے بعد واپسی پر ہمارے گھر آنا ۔ وہ سامنے میرا گھر ہے ۔ اس نے ایک خوبصورت گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ۔

زری بیٹی تم ابھی تک یہاں ہی کھڑی ہو ...... کون ہے یہ لڑکا ۔ اس کی ساس نے

بڑے ہی متجسسانہ انداز میں پوچھا۔

اماں یہ ہمارا دور کا رشتہ دار ہے۔

لیکن میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔

اس کے والدین وندہ شاہ بلاول میں رہتے ہیں۔ یہ میانوالی پڑھتا ہے۔ آج بھرتی کے لیے آیا ہے اور شیر خان کا مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

شیر خان کو یہ جانتا ہے۔

ہاں جانتا ہے۔ کافی عرصے تک یہاں مڈل سکول میں پڑھتا رہا ہے۔

اور پھر زرینہ پانی بھرنے کے لیے اپنی ساس کے ساتھ نالہ ترپی کی طرف چل پڑی میں اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بوجھل قدموں سے ڈاک بنگلہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ زرینہ اور اس کی ساس نے بھی چونکہ اسی طرف جانا تھا۔ اس لیے وہ اسی راستے پر میرے آگے آگے چلی جا رہی تھیں۔ زرینہ تھوڑی دیر کے بعد پلٹ کر مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا لیتی میں سوچتا خدا کرے ہم قیامت تک اسی راہ پہ چلتے رہیں اور نالہ ترپی اور ڈاک بنگلہ کبھی نہ آئیں۔ لیکن نالے کو تو آنا تھا سو آ ہی گیا۔ اور وہ دونوں راستے سے ذرا ہٹ کر بہتے پانی سے گھڑے بھرنے لگ گئیں اور میں شکستہ دلی کے عالم میں نالہ کے اس پار ڈاک بنگلہ میں جا پہنچا۔ وہاں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کھڑے تھے۔ علاقے کے طرہ باز قسم کے چودھری اور ملک بغیر استری کے میلی میلی شیروانیاں پہنے اپنے اپنے رنگروٹوں کے جھرمٹ میں کھڑے تھے۔ بھرتی کرنے والا عملہ ڈاک بنگلہ میں برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں ایک انگریز تھا باقی سب ہندوستانی تھے۔ میں بھی لوگوں کے جم غفیر میں شامل ہو گیا۔ اتنے میں جمعدار احمد خان جو لاوہ کے رہنے والے تھے اور بھرتی کے لیے رنگروٹ مہیا کیا کرتے تھے بڑی کروفر سے چلتے ہوئے آئے اور دور ہی سے اس انگریز افسر کو فوجی انداز میں سیلوٹ کیا۔ انگریز افسر ڈاک بنگلہ سے نکل کر نیچے لان میں آ گئے۔ جمعدار صاحب نے اعلان کیا۔

جو لوگ بھرتی ہونا چاہتے ہیں۔ کپڑے اتار کر صاحب بہادر کے سامنے ایک قطار میں

کھڑے ہو جائیں۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے کپڑے اُتار کر اپنے ہمراہ آنے والے ساتھیوں کو دے دیے۔ مَیں نے اپنی پگڑی اور چپل قمیص میں باندھ کر میدان کے کنارے ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں رکھ دیے اور خود بھرتی ہونے والوں کی قطار میں جا کھڑا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھرتی ہونے کے لیے آنے والوں کی تین چار قطاریں بن گئیں۔ مجھے جس قطار میں جگہ ملی تھی وہ سب لاوارثوں کی قطار تھی۔ سب فری لانسر تھے۔ انگریز افسر لنگڑا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنگ عظیم اول میں وہ شدید زخمی ہوا جس کے باعث اس کی ٹانگ مستقل طور پر ناکارہ ہو گئی تھی۔ وہ انگریز افسر ان چودھریوں اور ملکوں کے لائے ہوئے رنگروٹوں کی قطاروں کی طرف چلا گیا۔ وہ ہر آدمی کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ مراعات یافتہ اُمیدوار تقریباً ایک سو کے قریب تھے۔ جن میں سے صاحب بہادر نے حکومت انگلشیہ کے استحکام اور اس کی مضبوطی کے لیے سینوں پر گولیاں کھانے کے لیے صرف بیس رنگروٹوں کا انتخاب کرنا تھا۔ ان سو آدمیوں میں سے پہلی چھانٹی میں اس نے تقریباً پندرہ بیس آدمیوں کو نکال دیا۔ اور انہیں کہا کہ کپڑے پہن لو۔ وہ قطار کے آخری سرے پر پہنچ کر پھر واپس آ کر نئے سرے سے ماہر قصائی کی طرح ان کے گوشت پوست کا اندازہ لگانا شروع کر دیتے۔ وہ طرے باز چودھری اور ملک کھسیانے سے ہو کر آگے بڑھ کر اس گورے ٹامی سے کہتے۔

۱۔ حضور اس کا باپ سرکار بہادر کے لیے لڑتے ہوئے فرانس میں کام آیا تھا۔
۲۔ حضور اس رنگروٹ کا باپ، ترکوں کے ساتھ لڑتا ہوا مستقل طور پر معذور ہو گیا تھا
۳۔ حضور یہ رنگروٹ تو بڑا خاندانی ہے۔ ان کے خاندان کی بڑی خدمات ہیں۔ حضور والا۔ جس فوج نے خانہ کعبہ پر گولی چلائی تھی۔ اس جوان کا باپ اس حملہ آور فوج میں لڑتے ہوئے کام آیا تھا۔ حضور اس کا پہلا حق ہے۔ ایک طرّہ باز نے ایک نحیف و نزار سے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ انگریز میجر اس رنگروٹ کے سامنے رُک گیا۔ اُسے اچھی طرح سے دیکھا۔ اس

انگریز میجر کے ساتھ ایک آدمی رنگروٹوں کا قد اور چھاتی ماپنے کے لیے فیتہ اور ایک بڑی سی سٹک اُٹھائے ہوئے تھے۔ انگریز میجر نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس آدمی نے لپک اس کی چھاتی اور قد ناپا اور فوراً میکانکی انداز میں بول اُٹھا۔ چھاتی اٹھائیس، تیس۔ قد پانچ فٹ پانچ انچ سر۔ وہ انگریز افسر اس طرہ باز کی طرف بڑے ہی معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

ویل جماوار صاب۔ آپ کا رنگروٹ بوت چوٹا ہے۔

حجور۔ سرکار کا راشن کھائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن صاب اِدہر بہت اچھا جوان لوگ ملتا ہے۔ ہم ایک دم اچھا جوان لوگ مانگتا ہے۔

وہ چودہری کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا فوجی انداز میں سلام کر کے پیچھے کو ہٹ گیا۔ اس انگریز افسر نے حسب سابق پھر دوسری قطاروں میں چھانٹی شروع کر دی۔ جس قطار میں مَیں کھڑا اتفاق الواقعہ یہ لاوارثوں کی قطار تھی۔ کوئی بھی سرکاری اہل کار ایک دفعہ بھی اس جانب نہ آیا۔ ہم سب ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی دو گھنٹے تک بھرتی والی اس ٹیم نے کام کیا جمعدار احمد خان نے اعلان کیا کہ

"صاحب بہادر اب ایک گھنٹہ کھانے کی چھٹی کریں گے۔ سب لوگ آرام سے دُور جا کر بیٹھ جائیں۔"

وہ انگریز میجر ہندوستانی ڈاکٹر کی معیت میں ڈاک بنگلہ کے اندر چلا گیا اور عملے کے باقی آدمی ملازمین کے کوارٹروں کی طرف کھانا کھانے چلے گئے۔ جو لوگ دور کے مقامات سے آئے تھے ان میں سے اکثر کے پاس کپڑے میں بندھی ہوئی روٹی تھی۔ وہ گڑ کے ساتھ روٹی کھانے میں مصروف تھے۔ بہت سے لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ وہ ان لوگوں سے ہٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ بھرتی کے طریقۂ کار پر بحث کر رہے تھے۔ کچھ ان چودہریوں کے رویّے سے نالاں

تھے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی تھی۔ کیا وہاں کھانے کا کوئی انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ ہوسٹل اور زرینہ کا گھر وہاں سے دور تھا۔ میں سوچتا میں ایک گھنٹے میں تو واپس نہ آسکوں گا۔ اگرچہ بھرتی ہو جانے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ لیکن یوں چھوڑ کر چلے جانے کو بھی جی نہ کرتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ گورا صاحب نمودار ہوا۔ ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ تھا۔ ملازمین کے کوارٹروں کی طرف سے باقی بھرتی والا عملہ بھی جلد جلد واپس آگیا اور پھر بھرتی ہونے والے اور بھرتی کرنے والے سب ہی تازہ دم ہو کر ایک نئی لگن کے ساتھ اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگ گئے۔ پھر پہلے کی طرح سب لوگ قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ حسب سابق وہ انگریز افسر انہی مراعات یافتہ رنگروٹوں کی چھان پھٹک میں مصروف ہو گیا۔ ان لوگوں کی قطار ہمارے آگے تھی۔ وہ انگریز میجر جب میرے بالکل سامنے والی لائن میں آیا تو میں لائن توڑ کر باہر نکل آیا اور میں نے زور سے انگریزی میں کہا (HELL WITH IT) یعنی بھاڑ میں جائے یہ بھرتی اور جس طرف میں نے کپڑے رکھے تھے۔ اس طرف چل پڑا۔ سب لوگ میری اس جراٗت رندانہ پر چیں برچیں ہوئے۔ ایک طرہ باز چودھری اسی گورے ٹامی کو خوش کرنے کے لیے دوڑ کر پکڑتے ہوتے مجھے کہنے لگا۔

"سرکار بہادر کے متعلق یہ بات تم نے کیوں کی ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات"

پتہ نہیں میری اس بات کو اُس نے کیا معنی پہنائے۔ اس انگریز نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مبذول کر دی۔ وہ چودھری مجھے بازو سے پکڑ کر اس انگریز میجر کے پاس لے گیا۔ اس انگریز نے سر سے پاؤں تک مجھے ایک نظر دیکھا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

تم اتنا سخت بات کیوں بولا۔

اس لیے کہ میں کئی دن سے اذیت کے جہنم میں جل رہا ہوں۔ ہم لوگ کب سے اس بھرتی والے دن کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دن آیا تو مجھے اور محبوب جیسے اور لوگوں کو آپ نے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ آپ ان طرہ بازوں کے رنگروٹوں ہی کو صرف بھرتی

کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم سے کس لحاظ سے اچھے ہیں۔

تم بھرتی کے لیے آیا ہے۔

بھرتی کے لیے نہیں تو کیا تماشہ دیکھنے آیا ہوں۔

لیکن تمہاری تو عمر کم ہے۔ تم کیسے بھرتی ہو سکتا ہے۔

ان چودھریوں کے لائے ہوئے رنگروٹوں کے ساتھ آپ میرا مقابلہ کروالیں۔

کس چیز کا مقابلہ کروالوں۔

دوڑ میں۔ کشتی میں۔ کبڈی میں۔ پڑھائی میں۔ اگر میں ان سے کسی ایک بات میں کم ہوا تو آپ بے شک مجھے بھرتی نہ کریں۔

تم کتنا پڑھا ہوا ہے۔

جناب میں دسویں جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی میں پڑھتا ہوں میں نے رعب گانٹھتے ہوئے کہا۔

اپنی تعلیم مکمل کرلو۔ پھر بھرتی ہو جانا۔

بی۔ اے کر لینے کے بعد بھی جب فوج میں ہی بھرتی ہونا ہے تو آج ہی کیوں نہ ہو جاؤں۔ SOONER THE BETTER

یہ انگریزی تم نے کہاں سے سیکھی ہے۔ اس نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

سکول ہی سے سیکھی ہے۔

یہ دو جملے انگریزی کے ہمارے ہیڈ ماسٹر لالہ سندر لعل جی اکثر بولا کرتے تھے۔ اس لیے سب لڑکے ان کے معنی اور ان کے استعمال کے موقع محل سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ وہ انگریز میری باتیں سن کر مرعوب ہو گیا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر وہ اپنے بیٹھنے والی جگہ پر ساتھ لے گیا۔ مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر میرے ساتھ انگریزی میں دو چار باتیں کیں۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ فی الواقعہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں تو اس نے ڈاکٹر کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

DOC, HE IS MY RECRUIT

PLEASE EXAMINE HIM.

سر۔ دوسرے اُمیدواروں کے ساتھ اس کی چیک اپ بھی کر لوں گا۔

او۔ نو۔ ڈاکٹر۔ یہ میرا ریکروٹ ہے۔ اسے آپ فوراً دیکھیں۔

ڈاکٹر نے میرا قد۔ چھاتی۔ آنکھیں۔ ناک اور گلہ دیکھا۔ پھر جنرل فٹ نس۔ (GENERAL FITNESS) دیکھی اور پھر اسٹیتھیسکوپ میری چھاتی اور پیٹھ پر لگا کر مجھے کھانسنے اور لمبے سانس لینے کی ہدایت کی۔ مکمل طور پر ڈاکٹری معائنہ کر چکنے کے بعد وہ اس انگریز میجر سے کہنے لگا۔

سر۔ ویسے تو ٹھیک ہے۔ چھاتی تھوڑی سی کم ہے اور ظاہری طور پر اس کی عمر بھی کچھ کم دکھائی دیتی ہے۔

او۔ نو۔ نو۔ ڈاکٹر۔ (HE IS QUITE FIT)

ڈاکٹر نے لال رنگ کی پنسل سے میری چھاتی پر فٹ (FIT) لکھ دیا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں سامنے بیٹھے ہوئے کلرک کے پاس اپنے کاغذات مکمل کرواؤں۔ سب لوگ رشک اور حسد کے ملے جُلے جذبات سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ اس کلرک نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور میرے کاغذات کی تکمیل میں لگ گیا۔

اس کلرک نے مجھ سے میرا تعلیمی سرٹیفکیٹ پوچھا۔

جناب سرٹیفکیٹ تو میرے پاس نہیں ہے۔ میں ابھی زیرِ تعلیم ہوں۔ سکول سے فارغ نہیں ہوا۔ وہ میری اس بات سے مطمئن ہو گیا اور میرے کاغذات مکمل کرنے شروع کر دیے۔

رنگروٹوں کے دو گھنٹے کے کڑے انتخاب کے بعد مزید پندرہ لڑکے بھرتی کیے گئے۔ وہ سب اکٹھے اس کلرک کے پاس اپنے کاغذات کی تکمیل کے لیے آ گئے۔ ان پندرہ لڑکوں میں میرا جاننے والا کوئی لڑکا نہ تھا۔ میں نے اس سے پہلے اُن میں سے کبھی کسی کو دیکھا تک نہ تھا۔ اس کلرک نے میرے کاغذات مکمل کر لیے تو مجھے کہنے لگا کہ آپ

کپڑے پہن لیں اور پھر میجر صاحب کو جا کر رپورٹ کریں۔

## ۵

سورج بڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اب پہلے کی نسبت ہوا میں خنکی پھیلتی جا رہی تھی۔ دُور پہاڑی ڈھلوان سے چرواہے اب اپنے ریوڑ ہانکے نیچے کو اُتر رہے تھے۔ پرندے ڈاک بنگلہ کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ مجھے اب ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے جس جگہ کپڑے رکھے تھے اس طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جب میں نے دیکھا کہ میرے کپڑوں کی گٹھڑی وہاں موجود نہیں ہے۔ میں نے ان پتھروں کے آگے پیچھے چکر لگا کر اچھی طرح کپڑے تلاش کیے۔ لیکن میرے کپڑے وہاں سے چوری ہو گئے تھے۔ میں اب ایک عجیب سی پریشانی میں مبتلا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ شام ہو رہی ہے۔ سورج غروب ہونے کے بالکل قریب ہے۔ میں نے صرف شلوار پہنی ہوئی تھی۔ ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا اس حالت میں ہوسٹل تک یا زرینہ کے گھر تک بھی تو نہیں جا سکتا۔

اب ڈاک بنگلہ کے لان میں صرف بھرتی شدہ لڑکے اور ان کے چند لواحقین رہ گئے تھے۔ باقی سب لوگ وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تھے۔ میرے ساتھ کوئی آدمی بھی نہ تھا۔ میں سوچنے لگا اب کیا کروں۔ اتنے میں بھرتی شدہ سب لڑکوں کو اس انگریز میجر نے اپنے پاس بلایا۔ بھرتی ہونے کی چٹھی ریلوے پاس اور پانچ روپے فی کس کے حساب سے سفر خرچ دیا اور کہا کہ تم لوگ آج کی تاریخ سے بھرتی ہو گئے ہو۔ کل صبح سویرے اپنے اپنے ٹریننگ سنٹرز کو روانہ ہو جاؤ۔ مجھے جو کاغذات دیے گئے۔ ان سے مجھے پتہ چلا کہ مجھے انڈین سگنل کور میں بھرتی کیا گیا ہے۔ اور مجھے جبل پور جانا ہے۔ جغرافیہ پڑھتے ہوئے میں نے جبل پور کا نام سُن رکھا تھا لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ جبل پور ہے کہاں۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو مجھے درپیش تھا۔ وہ تھا تن ڈھانپنے کا مسئلہ۔

خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور سورج اب بالکل غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ایک آدمی سے میں نے چادر مانگ کر جسم ڈھانپا تاکہ سردی نہ لگ جائے اور کہیں عملی زندگی کے پہلے ہی روز بیمار نہ پڑ جاؤں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ غلام نبی عرف بنسیا ڈاک بنگلہ کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ غلام نبی سے میری کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ محض اس قدر شناسائی تھی کہ میں اپنے دوست، ملک محمد الطاف کے ساتھ کبھی کبھی ان کے معرکے (چوپال) پر جاتا تھا تو غلام نبی وہاں اکثر مجھے بیٹھا ہوا ملتا۔ غلام نبی بھرتی ہو جانے والے آدمیوں کے پاس رک گیا اور اُن سے بات چیت کرنے لگ گیا۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میری ہیئت کذائی دیکھ کر وہ ہنستا ہوا میرے قریب آگیا اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

ملک صاحب آپ نے یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے۔ اور یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے غلام نبی کو سب صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان وجوہات کی وجہ سے اب گھر بھی واپس نہیں جا سکتا۔ عجیب مخمصے میں پڑا ہوں کہ اب کیا کروں۔

یہ تو کوئی اتنی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ یہ چادر جو تم نے اوڑھی ہوئی ہے۔ جس آدمی کی ہے اسے واپس کر دو۔ اور یہ لو میری چادر میرے گھر سے واپس آنے تک یہ اوڑھ کر بیٹھو میں ابھی تمہارے لیے گھر سے کپڑے لے کر آتا ہوں۔

میں نے غلام نبی کی دی ہوئی چادر اوڑھ لی۔ میری جان میں کچھ جان آئی۔ غلام نبی میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ وہ وہاں سے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گاؤں کی طرف واپس چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈاک بنگلہ میں جو لوگ موجود تھے وہ باری باری میرے پاس آئے اور اظہارِ ہمدردی کیا چوری کرنے والے کو لعن طعن کرتے اور کوستے ہوئے واپس اپنی جگہ پر چلے جاتے۔

میں یخ بستہ ہوا سے بچنے کی خاطر چادر اوڑھ کر بدستور پتھروں کی اوٹ میں بیٹھا غلام نبی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں سوچتا کہ اگر کپڑے مل جائیں تو رات ہوسٹل میں دوستوں کے ساتھ بسر کروں گا پھر صبح سویرے میانوالی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ دن میانوالی ہوسٹل میں دوستوں کے پاس رہوں گا۔ شام کو سات بجے ماڑی انڈس سے آنے والی گاڑی پر بیٹھ کر لاہور

چلا جاؤں گا۔

اب سب بھرتی شدہ رنگروٹ اور ان کے ساتھی ڈاک بنگلہ سے جا چکے تھے۔ دُور کوہ ڈھک کے اونچے نیلے پہاڑوں میں سورج ڈوب چکا تھا۔ بھرتی کا عملہ بدستور ڈاک بنگلہ میں موجود تھا۔ لیکن اب ان کا ہمارے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ اتنے میں میں نے دُور سے غلام نبی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھائے میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

لیجیے ملک صاحب میں آپ کے لیے کپڑے لے آیا ہوں۔

بہت شکریہ آپ کا۔ اگر اس مرحلہ پر آپ میری مدد کو نہ پہنچتے تو میں بہت ہی ذلیل اور رسوا ہوتا۔ آپ نے میری دستگیری کر کے مجھے عمر بھر کے لیے غلام بنا لیا ہے۔

کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ملک صاحب۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ آپ، ہمارے ملک صاحب کے دوست اور ہم جماعت ہیں۔ میں یہ فرض ادا نہ کرتا تو اور کون کرتا۔

اچھا آپ اب یہ کپڑے پہن لیں پھر میں آپ کو ملک محمد الطاف خان کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ آپ انہیں کے پاس رہیں گے یا کہیں اور۔

لالہ۔ میں ہوسٹل میں اپنے پُرانے ساتھیوں کے پاس رہوں گا۔ رات بھر گپ شپ کریں گے۔ صبح میں میانوالی چلا جاؤں گا۔

غلام نبی مجھے ہوسٹل تک چھوڑنے آیا۔ جب میں ہوسٹل میں پہنچا تو کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ سب لڑکے کھانا وغیرہ کھا کر اپنے اپنے بستروں میں بیٹھے لالٹین کی روشنی میں اپنا اپنا سکول کا کام کر رہے تھے۔ مجھے انہوں نے دیکھا تو سب نے مل کر ایک نعرہ لگایا۔ شور سن کر سپرنٹنڈنٹ ماسٹر امیر خان صاحب آ گئے۔ انہوں نے ہلڑبازی کا سبب پوچھا تو اکرم نے بتایا۔

جناب ہمارے دیرینہ ساتھی اور عزیز دوست احمد صاحب فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں اور کل صبح اپنی نئی منزل۔ جبل پور کے لیے عازم سفر ہوں گے۔

ماسٹر صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے ناصحانہ انداز میں کہا۔
نیک بخت آدمی میانوالی میں اپنی تعلیم جاری رکھتے۔ فوج کی نوکری میں کیا رکھا ہے۔ زندگی بھر نوکری کرو گے تو مشکل سے حوالدار کے عہدے تک ترقی کر سکو گے اور پھر بوڑھے ہو کر معمولی سی پنشن لے کر گھر لوٹ آؤ گے۔ پڑھتے تو اچھا تھا۔ تمہارے والد تو کہتے تھے کہ میں خود نہیں پڑھا لیکن اس بچے کو ضرور بی۔اے تک تعلیم دلواؤں گا۔ کیا تم والد کی اجازت سے فوج میں بھرتی ہونے ہو۔
جی نہیں۔ میں نے پڑھائی اب ختم کر دی تھی۔ گھر میں نکما تو نہیں رہا جا سکتا۔ آخر کوئی نہ کوئی کام تو مجھے کرنا ہی ہو گا۔
اچھا تمہاری مرضی۔ اور پھر ماسٹر صاحب نے اکرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اکرم چچا قاسم سے احمد کے لیے کھانا لے آؤ۔
اور پھر اکرم میرے لیے بچا کھچا کھانا لے آیا۔ وہ کھانا مجھے بے حد لذیذ لگا۔ اس نعمت غیر مترقبہ کو پا کر میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ان دوستوں کے ساتھ تھوڑی دیر تک گپ شپ کرتا رہا اور پھر رات کو دس بجے کے قریب دوسرے لڑکوں کے ساتھ میں بھی سو گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ میرے ساتھی ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ مجھے نیند آ گئی اور میں میٹھی نیند کے مزے لینے لگ گیا۔ پتہ نہیں وہ لڑکے کب سوئے البتہ صبح سویرے ان کے شور کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میرے گاؤں کے ایک لڑکے نے مجھے آ کر بتایا کہ تمہارے والد صاحب اور بھائی باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں یہ سن کر حیران ہو گیا۔ جلدی جلدی اُٹھا۔ ہوسٹل سے باہر آ کر دیکھا تو فی الواقعہ وہ دونوں ایک چارپائی پر ہوسٹل کے باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ چارپائی انہوں نے شاید ساتھ والے گھر سے مستعار لی تھی۔ میں جلدی سے دوڑ کر وہاں پہنچا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں روتا ہوا اپنے والد کے ساتھ چمٹ گیا۔ میرے والد میرے دل جمعی کے لیے مجھے حوصلہ دیتے رہے۔ میں والد صاحب سے مل کر پھر بھائی سے گلے ملا۔ وہ بھی میری طرح دھاڑیں مارتے ہوئے رونے

لگ پڑے۔ میرا خیال ہے ان کو بھی اس متوقع جدائی کا بڑا رنج تھا۔ والد نے مجھے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نیک بخت ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں لگا ہوا اپنے اپنے ٹھکانوں میں رہائش پذیر ہے۔ ایک تو بدبخت ہے کہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ کہیں بھی جی لگا کر ٹکتا نہیں۔ اتنا بڑا اقدام تو نے اُٹھایا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تو دلجمعی سے فوج میں رہ کر ملازمت نہیں کر سکے گا۔ فوج کی ملازمت بہت مشکل ہوتی ہے۔ تم نے تو آج تک کوئی کام اپنے ہاتھ سے کیا ہی نہیں۔ وہاں تو بڑا سخت کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ گھر والی بات تو نہیں کہ ایک کام میں دل نہیں لگا تو اُسے چھوڑ دیا۔ یہ فوج کی نوکری تو اپنی مقررہ میعاد تک ہر حالت میں کرنا ہی پڑتی ہے۔ اگر اس ملازمت کی بجاآوری میں ذرا بھر بھی کوتاہی ہو تو بڑی سخت ملتی ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ تم فوج سے بھاگ جاؤ۔ اور پولیس تمہارے تعاقب میں لگی رہے۔ اب اگر تم یہاں سے بھاگے تو پھر زندگی بھر اور کوئی کام نہ کر سکو گے۔

نہیں بابو۔ آپ انشاء اللہ تعالےٰ دیکھیں گے کہ میں کس طرح ڈٹ کر اانگر وی ٹ کرتا ہوں۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تمہارے کپڑے کس نے چوری کیے ہیں۔!

مجھے تو شام کو جب سب کام ختم ہو گیا اور کپڑے پہننے کا حکم ملا تو تب پتہ چلا۔

خدا بھلا کرے عبداللہ شاہ کا اس نے یہاں سے جاتے ہی فوراً ہمارے گھر آ کر مجھے بتایا کہ احمد بھرتی ہو گیا ہے اور کسی نے اس کے کپڑے چرا لیے ہیں۔

بابو یہ کپڑے میرے ایک جاننے والے شخص نے لا کر دیے ہیں۔ اگر وہ یہ کپڑے لا کر نہ دیتا تو میرا بُرا حال ہوتا۔

بیٹا یہ کپڑے کس نے لا کر دیے ہیں۔

بابو اس کا نام غلام نبی ہے۔

غلام نبی کون ہے۔ اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔
بابو میرے دوست ہیں ناملک الطاف۔ ان کے معرکے کا آدمی ہے۔ وہ اتفاقاً اس وقت ڈاک بنگلہ کی طرف آگیا اُسے جب پتہ چلا کہ میرے کپڑے کسی نے چرا لیے ہیں تو اس نے یہ کپڑے مجھے گھر سے لا کر دیے ہیں۔ دیکھیں بابو۔ نئی زری چپل۔ نئی شلوار اور قمیض اور دیکھیں سر پہ باندھنے والی لنگی کتنی اچھی ہے۔
بھئی خدا بھلا کرے اس کا۔ بیٹے یہ کپڑے اب تم اُتار دو اور اپنے کپڑے پہن لو۔ اور پھر میرے والد نے ٹین کا صندوق کھول کر مجھے چپل اور کپڑے نکال کر دیے اور پھر غلام نبی کا پتہ مجھ سے پوچھا کہ میں گھر واپس جانے سے پہلے یہ کپڑے شکریے کے ساتھ اس کو واپس کر دوں گا اور پھر میرے والد نے وہ کپڑے بمع چپل کے لپیٹ کر الگ رکھ دیے۔
میرے والد نے جب صندوق کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس میں میرا سب سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جلدی میں راتوں رات میری بہن نے کچھ کھانے کے لیے مٹھائی بھی بنا کر رکھ دی تھی۔ میرے والد میرا مکمل بستر بھی لائے تھے۔ جو ایک دری میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میرے والد نے مجھے دس روپے زادِ راہ کے طور پر بھی دیے۔ میں نے ان کو بتایا کہ مجھے سرکاری طور پر پانچ روپے سفر خرچ ملا ہے۔ لیکن میرے والد نے بتایا کہ تمہیں تقریباً ایک ماہ کے بعد تنخواہ ملے گی۔ تب تک کیا کرو گے۔ چنانچہ میں نے ان کے کہنے پر وہ دس روپے بھی رکھ لیے۔ میرے والد نے لاری اڈے پر چلنے کے لیے کہا۔ میں نے والد صاحب کو کہا کہ میں ہوسٹل جا کر دوستوں، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور چچا قاسم سے مل آؤں۔ ان سے اجازت لے کر میں اُن سے ملنے ہوسٹل کے اندر چلا گیا۔
ان سے فارغ ہو کر ہم تینوں لاری اڈے کی طرف چل پڑے۔ ان دنوں ایک ہندو لالہ منشی رام ایک پرانی اور خستہ حال سی لاری لالہ موسے میانوالی تک چلایا کرتا تھا۔ لاری کے اندر لکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ چڑھنے اور اترنے کا راستہ بھی پچھلی طرف

سے تھا۔ ایک روپیہ میانوالی کا کرایہ لگتا تھا۔ لاوہ سے چھبیل تک سڑک نہایت خراب اور خستہ حال تھی۔ سڑک کچی تھی اس میں جا بجا گڑھے تھے۔ اس کچی سڑک پر جا بجا رکاوٹیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ یہ تیس میل کا فاصلہ کوئی اڑھائی گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ چونکہ ایک ہی لاری چلتی تھی۔ اس لیے اس میں سیٹ کا ملنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا۔

ہم جب اڈے پر پہنچے تو میں نے زرینہ کو بھی وہاں ایک دیوار کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ شاید اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں بھرتی ہو گیا ہوں۔ اور صبح سویرے میانوالی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے جب میرے ساتھ دو آدمیوں کو دیکھا تو وہ اداس ہو گئی اور اس کا چہرہ ایک انجانے خوف کے باعث زرد پڑ گیا۔ وہ جاتے سمے کوئی بات بھی تو مجھ سے نہ کر سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ میں کوئی چیز بھی اٹھا رکھی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہ سمجھ گئی ہو گی کہ میرے ساتھ آنے والے میرے والد اور بھائی ہیں۔ اس لیے ان کی موجودگی میں وہ مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ ہمارے تعلق کا اگرچہ کوئی قابل اعتراض پہلو نہ تھا لیکن اس کا تو مجھے اور زرینہ کو پتہ تھا۔ کسی تیسرے آدمی کو تو اس بات کا علم نہ تھا۔ وہ بائیس چوبیس سال کی بھرپور جوان اور خوبرو حسینہ اور میں ایک دبلا پتلا نحیف و نزار سا لڑکا جس کی عمر اس وقت کوئی سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور ہمدردی تک ہی محدود تھے۔

لاری روانہ ہوئی تو اس نے دوپٹہ درست کرنے کے بہانے مجھے آخری بار سلام کیا اور میں ڈوبتے دل اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے غمگساروں کو غمزدہ چھوڑ کر ایک نئی اور انجانی دنیا کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں لاری گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اڈا پر آئے ہوئے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس وقت مجھے پوری دنیا غم اور اداسی میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چلتے ہوئے جب آخری بار میں نے زرینہ کی طرف دیکھا تو اس کی نرم اور سہل مسکراہٹ میں ایک چبھن نہایت واضح تھی ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود بھی میں آج تک اس کی آنکھوں کے سحر کو نہیں

بھول سکا اس کی سنجیدہ اور مغموم آنکھوں میں محبت کے دو دیئے جل رہے تھے۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں ایک خاموش التجا اور وہی ابدی سوال تھا جو ان نازک گھڑیوں میں زبان پر نہیں آتا۔ بلکہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ہر آنسو میں جھلک اٹھتا ہے۔ وہی ابدی سوال میں نے زرینہ کی آنکھوں میں جھلکتا ہوا دیکھا۔ یہ وہ نازک لمحے ہوتے ہیں جب انسان کی ساری قوت گویائی نگاہوں میں سمٹ آتی ہے۔

لاری گاؤں کی آبادی سے نکل کر کھلے کھیتوں میں آ گئی۔ آج اکتوبر کی تیس تاریخ تھی۔ لیکن بارش نہ ہونے کے باعث کھیت سوکھے اور ویران پڑے ہوئے تھے۔ میں لاری میں ایسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ جہاں سے لادہ کی پوری آبادی واضح طور پر نظر آتی تھی۔ اب لاری اس جگہ کے قریب سے گذر رہی تھی جہاں سے آج سے تقریباً چھ سات سال پہلے کبڈی سے واپسی پر گاؤں کی اُن الہڑ دوشیزاؤں نے میرا گھیراؤ کر کے مجھے پکڑا تھا۔ بالکل وہی جگہ۔ وہی برلبا بند لیکن کمی تھی تو اُن وحشی ہرنیوں کی کمی تھی۔ جن میں وہ آہوئے تاتار۔ وہ جھیل کی طرح گہری اور نیلی آنکھوں والی حسین لڑکی جس کی ان زندہ دل حسیناؤں نے وقتی طور پر میرے ساتھ شادی رچا کر ایک طرح کی ذہنی آسودگی حاصل کی تھی۔ اور غموں اور دکھوں کی ماری ہوئی وہ لڑکی اس لمحے بھر کے کھیل کو ایک ابدی حقیقت سمجھتے ہوئے مدتوں اُسے اپنے سینے میں چھپائے رہی۔ میں سوچتا جا رہا تھا کہ اس بے چاری کے بھی کتنے غم ہوں گے۔ جن کا اظہار وہ میرے بغیر اور کسی پر نہیں کر سکتی۔ آج وہ اکیلی اپنی اس آگ میں جل رہی ہوگی۔ میں آتے سمے اُس سے مل بھی تو نہیں سکا۔ اب وہ گھر پہنچ گئی ہوگی۔ اس کی ساس نے اگر اس سے پوچھ لیا کہ صبح سویرے تو کہاں گئی تھی اور اتنی دیر کیوں لگائی ہے۔ تو بے چاری کے پاس کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ یہ ساس قسم کی عورتیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔

مجھے بھرتی ہو کر جبل پور جانے کی کوئی خوشی نہ تھی البتہ لادہ اور دندہ شاہ بلاول چھوڑنے کا غم ضرور تھا۔ میں سوچنے لگا میرے والد ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ مجھ میں جم کر کام کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ ابھی چند دن پہلے تک تو یہاں میرا رہنے کو

جی نہ کرتا تھا۔ اب جو یہاں سے بلھر جانے کا موقعہ ملا ہے تو اب زری یہ راستے میں حائل نظر آتی ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ عمر میں تم سے آٹھ۔ دس سال بڑی ہے۔ پھر اب تم خود بھی تو ایک شادی شدہ آدمی ہو۔ اب تم دونوں کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ یہ حقیقت سمجھتے ہوئے بھی تم ایک انجانی آگ میں پیہم جلتے رہنے کے متمنی ہو۔ لیکن دل پر کس کا قابو ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے تو اسے نکال کر باہر نہیں پھینک سکتا۔ ممکن ہے وقت کی طوالت اس زخم پر کوئی پھاہا رکھ سکے۔ نئے نئے اور تازہ زخموں پر تو مرہم پٹی کرتے وقت بھی بڑا درد ہوتا ہے۔

سینما کی متحرک تصویروں کی طرح میرے سامنے ایک مووی چل رہی تھی۔ جس کا سلسلہ بس کے ایک جھٹکے اور بے ہنگم سی ایک آواز کے ساتھ منقطع ہو گیا۔ کوہِ ڈھک کی دشوار گذار چڑھائی پر اب لاری چڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ جب میں میانوالی میں پڑھتا تھا تو اسی مقام سے آخری بار پلٹ کر مشرق کو منہ کر کے تھوڑی دیر افق پر نظریں جمائے اپنے گاؤں کی شاہ والی بن کی ٹاہلیاں دیکھا کرتا تھا۔ ان ٹاہلیوں کے علاوہ آج میں لاوہ کی بلند و بالا سہ منزلہ عمارات کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ جو زری اور میری چاہت کی نشانی تھیں۔ جس طرح وقت کسی کے لیے نہیں رُکتا۔ اسی طرح یہ پھٹیچر لاری بھی ہچکولے کھاتی ہوئی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی۔ میں دل میں سوچنے لگا۔ خدا کرے یہ ہنگم لاری انہی قدموں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُک جائے اور سب لوگ لاری سے اتر کر ان چٹانوں پر بیٹھ جائیں۔ اور میں پہاڑ کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر دُور اُفق پر نظریں جمائے لاوہ کی بلند و بالا عمارتوں اور شاہ والی بن کی ٹاہلیوں کو ہی دیکھتا رہوں۔ لیکن لاری تو ہچکولے کھاتی ہوئی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی۔ خدا نا کرے اسی لاری کا یہ تو چڑھائی چڑھ کر اب نشیب کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ مشرق کا حسین منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دنیا میں چاروں طرف گھور اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ لیکن اس لاری کے مسافروں پر تو اس اندھیرے کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ تو اسی طرح خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں سوچنے لگا ان کے دل

مستقبل کو پالینے کی خوش آئند روشنی کی اُمید سے منور ہیں۔ انہوں نے کبھی کوئی چوٹ
نہیں کھائی۔ میں چونکہ تاریک رات کا مسافر ہوں۔ اس لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا پھر
رہا ہوں۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ سنبھل جاتا ہوں۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ اس
مسلسل تاریکی سے میں باہر نہ آسکوں گا اور پھر بالکل ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا۔ لیکن اب
بھی تو میرے اندر کا انسان ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں بھی ان تاریکیوں
میں تحلیل ہو جاؤں گا۔ اور غیر مرئی تاریکی کے ساتھ فضا کی لامحدود وسعتوں میں ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا۔

لاری ایک خوفناک دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔ پہاڑ کو اب عبور کر کے لاری چھبیل
پر واقع سرائے کے سامنے کھڑی تھی۔ لوگ اُتر کر باہر چہل قدمی کرنے لگ گئے۔
میں بدستور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ کسی سے بات کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ کچھ لوگ
سرائے میں واقع درختوں کے جھنڈ کے نیچے بیٹھے لمبے لمبے سگریٹ کے کش لگا کر
مرغولے بنا رہے تھے۔ لاری کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا سواریوں سے وصول کی
ہوئی کرائے کی رقم گننے میں مشغول تھا۔ کلینر لاری کا بونٹ کھول کر ریڈی ایٹر میں
تازہ پانی ڈال رہا تھا تاکہ چڑھائی کی وجہ سے جو انجن گرم ہو چکا ہے وہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے
تاکہ لاری کو باقی ماندہ سفر میں سہولت ہو۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ریسٹ کے بعد
سواریاں لاری میں بیٹھنا شروع ہو گئیں اور پھر تھوڑی دیر کے بعد لاری میانوالی کے
لیے روانہ ہو گئی۔ میانوالی وہاں سے پندرہ میل دُور جانب غرب تھا۔

چھبیل سے آگے اب سڑک پختہ تھی۔ اس لیے خیال تھا کہ بقایا سفر جلد کٹ جائے
گا۔ کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب لاری میانوالی ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی۔ سب
لوگ اپنا اپنا سامان اُٹھا کر مختلف اطراف میں بکھر گئے۔ میرے ساتھ جو اور لڑکے
بھرتی ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اپنا سامان اُٹھا کر ملحقہ تھرڈ کلاس کے
ویٹنگ روم میں چلیں۔ سب اس بات پر متفق ہو گئے۔ اور ہم اپنا سامان اُٹھا کر
تھرڈ کلاس کے بڑے شیڈ میں چلے گئے۔ اس میں جا بجا لکڑی کے بڑے مضبوط

بلنچ جو ڈرشش میں گڑے ہوئے تھے ایستادہ تھے۔ سب لڑکے قریب کے درختوں یا بنچوں پر اکٹھے ہی بیٹھ گئے۔ اور لاری کی کارکردگی پر تبصرہ کرنے لگے۔ ان سب کا خیال تھا کہ لاری نے بھی کمال کیا ہے۔ اتنے ڈھیر سارے آدمیوں اور ان کے سامان کو اُٹھا کر یہ لاری ڈھاک کی دشوار گذار چڑھائی سے چڑھ گئی۔ ایک دو منچلے سگریٹ کی ڈبیاں لے آئے اور اب سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لگا کر منہ اُوپر کر کے دھواں فضا میں بکھیر رہے تھے۔ میں نے اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ انھوں نے زندگی میں پہلی بار سگریٹ کو چھوا ہے۔

میں سوچنے لگا یہ تمباکو تو مضرِ صحت ہوتا ہے۔ یہ اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کو خرید کر کس خندہ پیشانی سے اسے گلے لگا رہے ہیں۔ شاید وہ سگریٹ کو امارت کی نشانی سمجھتے تھے۔ مجھے شروع ہی سے تمباکو نوشی سے ایک گونہ نفرت رہی ہے۔ گھر میں میرے والد حقہ پیتے تھے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے میں نے اس سے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اور اب تک اسے ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ بھرتی شدہ وہ سب لڑکے ہمارے ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان میں کوئی خاص پڑھا لکھا لڑکا نہ تھا۔ میں نے انگریز میجر کے پاس بڑہانکی تھی کہ میں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ اب ان لڑکوں پر بھی میں انگریزی سکول کی پڑھائی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ میں نے ان کو بتایا کہ گورنمنٹ ہائی سکول یہاں سے تھوڑی دور ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہاں چلیں گے۔

میں چاہتا بھی تھا کہ اپنے پُرانے ساتھیوں سے جا کر ملاقات کروں۔ ان لڑکوں میں کوئی بھی جبل پور جانے والا نہ تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں انڈین آرمی کے مختلف ٹریننگ سینٹرز میں جانا تھا۔ میری طرح ان کو بھی اپنے روٹ کا پتہ نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے یہ ارادہ کیا کہ ریلوے ٹکٹ گھر کے باہر برآمدے میں جو ہندوستان بھر کے ریلوے لائنوں کے نقشہ جات اور چارٹ لگے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر پہلے اپنے راستے کا تعین کروں گا۔ پھر دوسرے لڑکوں کی راہنمائی کے لیے چارٹوں اور نقشوں کی چھان پھٹک کروں گا۔ میں نے ان لڑکوں کو کہا کہ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں ذرا سٹیشن ماسٹر سے مل کر متعلقہ معلومات حاصل کر لوں۔ میں سٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ملحقہ

برآمدے میں ریلوے ٹائم ٹیبل اور نقشہ جات دیکھتا رہا۔ ایک الگ بورڈ پر آنے والی گاڑیوں کے اوقات درج تھے۔ پہلے میں نے اپنے سفر کے متعلق معلومات اکٹھا کرنا شروع کیں سات بجے شام کو مارٹن انڈس سے آنے والی گاڑی پر ہم سب کو سوار ہونا تھا۔ یہ گاڑی صبح تقریباً سات بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچتی ہے اور پھر لاہور سے تھوڑی دیر کے بعد دہلی جانے والی گاڑی مل جاتی ہے جو رات کو دہلی پہنچتی ہے۔ تین گھنٹے دہلی ریلوے سٹیشن پر قیام کرنا ہوگا۔ دوسری صبح بمبئی جانے والی گاڑی پر سوار ہو کر بینا ریلوے سٹیشن پر شام کو پہنچنا تھا۔ جبل پور جانے کے لیے گاڑی وہاں سے ملتی ہے جو دوسری صبح نو بجے کے قریب جبل پور پہنچ جاتی ہے۔

لاہور اور دہلی کا قیام تو اچھا رہا۔ خوب گھوم پھر کر تفریح کی۔ میں نے پہلی بار ریل کا باقاعدہ سفر اختیار کیا تھا اور اتنے مشہور تاریخی نوعیت کے شہر پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ورنہ اب تک تو ان کے تذکرے تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں ہی پڑھتے چلے آئے تھے۔ لاہور اور دہلی کی سیر سے طبیعت بہت ہی ہشاش بشاش ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے غموں سے چھٹکارا پا کر ان کے نظاروں ہی میں محو رہا۔

سفر کی جملہ معلومات فراہم ہو جانے کے بعد مجھے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اب موٹی موٹی باتیں تو اپنے سفر کے متعلق پتہ چل گئی تھیں۔ باقی مطلوبہ معلومات ساتھ ساتھ ریلوے کے متعلقہ عملہ سے پوچھتا جاؤں گا۔ میں نے سٹیشن ماسٹر کے دفتر کا رُخ کیا۔ سلام کے بعد میں نے ان سے عرض کی۔

جناب ہم کوئی سولہ فوجی رنگروٹ ہیں جنہوں نے ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں جانا ہے۔ ان کے ریلوے وارنٹ از راہ کرم بنوا دیں۔

بیٹا ابھی تو بڑا ٹائم ہے۔ گاڑی شام کو آتی ہے۔ آپ چار بجے کے لگ بھگ آجائیں۔ متعلقہ کلرک اس وقت آئے گا تو میں اسے کہہ دوں گا۔

بہت شکریہ آپ کا۔ میں سلام کر کے ان کے دفتر سے باہر آگیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا۔ میں نے ان

کو بتا دیا کہ آپ لوگ اگر بازار کی سیر وغیرہ کرنا چاہتے ہیں تو بے شک چکر لگا آئیں۔ لیکن چار بجے سے پہلے واپس آ جائیں۔ تاکہ ریلوے وارنٹ تبدیل کروا کر ٹکٹ حاصل کر سکیں۔ کچھ لڑکوں نے کھانا کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں ان سب کو لے کر سٹیشن سے بالکل ملحق بازار نانبائیاں میں لے گیا۔

میانوالی میں اس زمانے میں ایک عجیب رواج تھا کہ جو شخص بھی کھانا کھانے کے لیے ان کے پاس آتا تو نانبائی اس کو آگ جلانے کی ہدایت کرتا۔ ایک بڑا سا توا چولہے پر رکھا ہوا ہوتا۔ اس کے نیچے گاہک وہاں قریب ہی رکھی ہوئی کاہی (ایک قسم کی گھاس) کی گٹھڑ سے تھوڑا تھوڑا نکال کر چولہے کے نیچے جلاتا اور نانبائی صاحب چپاتیاں پکاتے جاتے۔ میرے ساتھی سب کے سب دیہاتی تھے۔ تقریباً سب پہلی مرتبہ میانوالی آئے تھے۔ اس لیے وہ بازار میں بڑے شوق سے ہر چیز کو دیکھنے لگ جاتے۔ میانوالی کا ایک ہی لمبا سا بازار ہے۔ ناواقف آدمی کے بھی کھو جانے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ میں نے ساتھیوں سے اجازت طلب کی۔ تاکہ میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہوسٹل کے دیرینہ ساتھیوں کو مل آؤں۔ میں ہوسٹل پہنچا تو میرے وہ پرانے ساتھی سب سکول سے واپس آ چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ کی اور پھر میں واپس ریلوے سٹیشن آ گیا۔ ان سب دوستوں نے شام کو ریلوے سٹیشن پر آنے کا وعدہ کیا۔

اس زمانے میں میانوالی کا رواج تھا کہ تقریباً ہر فارغ شخص سات بجے شام کو آنے جانے والی گاڑیوں کے اوقات میں ریلوے سٹیشن کا چکر ضرور لگاتا۔ ریلوے سٹیشن میانوالی کے مین بازار سے بالکل متصل ہے۔ اس لیے خصوصی طور پر شام کو میانوالی ریلوے سٹیشن پر بڑی چہل پہل ہوتی۔ واپس آ کر میں نے سب ساتھیوں کے ریلوے وارنٹ اکٹھے کیے اور انہیں تبدیل کروانے کے لیے سٹیشن ماسٹر کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے کرسی پر بٹھایا اور پھر ایک چپڑاسی کو بھیج کر اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کو اپنے پاس بلایا۔ وہ تشریف لائے۔ تو سٹیشن ماسٹر صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ کچھ نئے لڑکے فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے ہیں۔ یہ دیہاتی سادہ لوح لڑکے ہیں۔ عدم واقفیت کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ آپ مہربانی سے ان کے ریلوے وارنٹ لے جائیں اور پھر ان کو وقت بتا دیں یا اس وقت اگر آپ کے دفتر سے ٹکٹ وصول کر لیں گے۔ سب اگر اکٹھے وہاں چلے گئے تو مفت میں جمگھٹا لگ جائے گا۔ اس نے سٹیشن ماسٹر صاحب کو بتا دیا کہ تھوڑی دیر کے بعد یہ صاحب آکر سب کے ٹکٹ لے جائیں اور پھر سب ووچر (VOUCHER) لے کر اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔ اور میں ان کو سلام کر کے اپنے ساتھیوں کے پاس تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں واپس آگیا۔ میرے ساتھی لڑکوں میں سے چند ایک نے انبالہ چھاؤنی، دو نے فتح گڑھ، تین نے میرٹھ اور باقی سب نے لکھنؤ جانا تھا۔ جبل پور میں اکیلا جانے والا تھا۔

میں نے ہر ایک پارٹی لیڈر کو ان کے روٹ اور ٹرینوں وغیرہ کے متعلق پوری معلومات فراہم کردیں اور ساتھ ہی انہیں ہدایت کی کہ چھ بجے تک کھانے سے فارغ ہو جائیں تاکہ ساڑھے چھ بجے کے قریب اپنا سامان اٹھا کر پلیٹ فارم پر پہنچ جائیں۔

میں تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے مجھے سولہ ٹکٹ گن کر دیے جو میں نے واپس آکر سب کو اکٹھا کر کے فرداً فرداً چیک کرنے کے بعد ان میں تقسیم کر دیے۔ اب ہم اپنا اپنا سفر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد باری باری سے سب لڑکے کھانا کھانے کے لیے بازار چلے گئے۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہم اپنا اپنا سامان اٹھا کر پلیٹ فارم پر آگئے۔ ریلوے سٹیشن پر گیس کی دلفریب روشنیاں بڑا خوشنما منظر پیش کر رہی تھیں۔ اب میانوالی کے لوگ بڑی تعداد میں پلیٹ فارم پر چکر لگانے کے لیے آچکے تھے۔ یہ لوگ پلیٹ فارم کا ٹکٹ نہ لیتے تھے۔ یہاں ملتان سے راولپنڈی جانے والی گاڑی اور ماڑی انڈس سے لاہور جانے والی گاڑی کا آپس میں کراس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میانوالی کا ریلوے سٹیشن کسی بہت بڑے شہر کے بازار کا منظر پیش کرتا۔ تفریح کے لیے آنے والے لوگوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو خیرباد کہنے والے بھی کچھ لوگ آتے۔

آج میرے ہوسٹل کے پرانے ساتھی کافی تعداد میں مجھے الوداع کرنے ریلوے سٹیشن آئے ہوئے تھے۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب دونوں گاڑیوں کے سگنل ہو گئے اور پھر ہر آدمی کی نگاہیں دور افق پر دیے کی طرح ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی تلاش میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اٹھ جاتیں۔ پہلے ماڑی انڈس سے لاہور جانے والی گاڑی آئی۔ عام طور پر اس میں سیٹوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہمیں بھی آسانی سے سیٹیں مل گئیں۔ اور ہم اپنا اپنا بستر کھول کر ایک ایک بینچ پر قابض ہو گئے۔ اس ڈبے میں کوئی چالیس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی لیکن ہم سولہ آدمیوں نے ہی اس پر قبضہ جما لیا اور پھر کسی اور کو گاڑی میں نہیں گھسنے دیا۔ فوجی حضرات کو میں نے عام طور پر دیکھا ہے کہ یہ اگر چند آدمی اکٹھے ہو کر سفر کر رہے ہوں تو پھر دوسرے لوگوں کو ڈبے کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیتے۔

میں اپنا سامان ایک سیٹ پر رکھ کر نیچے آ کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دوستوں سے گپ شپ میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں راولپنڈی جانے والی گاڑی بھی کُندیاں کی جانب سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ جب وہ گاڑی پہنچ گئی تو ہماری گاڑی نے وسل دے دی۔ اس زمانے میں بلکہ اب تک برانچ لائنوں پر بہت ہی سست رفتار گاڑیاں چلا کرتی ہیں۔ میانوالی سے لاہور دو سو میل کے لگ بھگ ہو گا۔ شام کو سات بجے چل کر صبح تقریباً سات بجے یہ گاڑی لاہور پہنچتی تھی۔ گاڑیاں میانوالی سے چلی تو کُندیاں تک تو سب لڑکے بڑے ذوق و شوق سے کھڑکیوں سے باہر نہ جانے اندھیرے میں کیا دیکھتے رہے۔ میانوالی کی نسبت کُندیاں بڑا اسٹیشن ہے جنکشن ہونے کی وجہ سے ہماری گاڑی کافی دیر تک وہاں رُکی رہی۔ کچھ نئے مسافروں نے ہمارے ڈبے پر بھی یلغار کی کوشش کی لیکن کسی کی دال نہ گلی۔ اور وہ ہمیں دل ہی دل میں کوستے ہوئے دوسرے ڈبوں کی طرف چلے گئے۔ ہماری گاڑی جب کُندیاں ریلوے سٹیشن سے چلی تو لڑکوں نے اٹھ کر گانا اور ناچنا شروع کر دیا۔ شاید وہ اپنے مستقبل کو پا لینے کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔

میں حسرت و یاس کی تصویر بنا ان کی اس عارضی خوشی سے بے نیاز زری کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ آج وہ بے چاری بھی پریشان ہوگی۔ نہ جانے اس وقت وہ کیا کر رہی ہوگی۔ میرا بھائی، بہن اور رباب یہ سب لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔ پتہ نہیں ان میں سے کوئی مجھے بھی یاد کر رہا ہوگا۔ یا نہیں۔ ابھی سب کے جدائی کے زخم تازہ ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ یہ لوگ بھی مجھے بھول جائیں گے۔

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کیا زری بھی مجھے اتنی جلدی بھول جائے گی۔

لیکن زری تمہاری کیا لگتی ہے۔ تم سے اس کو محض ہمدردی ہے۔ جیسے کوئی نیک دل آدمی کسی مجبور اور مستحق پر ترس کھا کر اسے کچھ دے دے۔

لیکن وہ صبح سویرے لاری اڈا پر دیکھنے کیوں آئی تھی۔

شاید اس لیے کہ تمہاری ماں مر چکی ہے اور تمہیں دنیا میں آج تک کسی عورت نے پیار نہیں دیا۔ جس میں ماں کی مامتا کی گرمی ہو۔ خلوص ہو۔ مجھے اس کے اس جذبے کی قدر کرنا چاہیے۔ تم اسے دوسرا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرے اور اس کے تعلقات کبھی ایک جوان مرد اور جوان عورت کے تعلقات کی طرح نہیں رہے کہ جن میں ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی پچھتاوا ہو۔ ہم جب بھی ملتے ہیں تو دو محبت کرنے والے پُرخلوص دوستوں کی طرح۔ جو زندگی کے ہر مشکل وقت میں ایک دوسرے کی راہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کی بھرپور جوانی پورے چاند کی رات کی طرح ہیجان انگیز ہے۔ لیکن ہم نے کبھی بھی شوریدہ جذبات کو یوں بے لگام نہیں چھوڑا۔ اگر ان شوریدہ اور سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر انہیں سکون کی گود میں سُلا دیتے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ پھر یہ پنپنے اور خوشگوار ہونے کی بجائے آہستہ آہستہ دم توڑ دیتے اور پھر ایک دوسرے کے لیے مر مٹنے کی خواہش بھی معدوم

ہو جاتی اور ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دُور ہو جاتے۔

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رُکی۔ میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کوئی بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ ایک وینڈر نے بتایا کہ یہ سرگودھا ہے۔ مرکری لائٹیں۔ خوشنما سٹیشن۔ آدھی رات گذر چکی تھی اس لیے ریلوے سٹیشن پر کوئی خاص رونق نہ تھی۔ ابھی لاہور یہاں سے خاصا دور تھا۔ اس لیے مَیں سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور پھر جلد ہی سو گیا۔

## ۵

گاڑیوں کے مسلسل شور اور ہجوم کی افراتفری کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باقی اب تک اپنے اپنے بستروں پر رضائیاں لپیٹے میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے مَیں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر ایک نظر دیکھا تو لاہور جنکشن کا بورڈ نظر آیا۔ میں نے اپنے سب ساتھیوں کو جگایا اور ہم سب نے عجلت میں اپنا اپنا سامان سمیٹا اور گاڑی سے اُتر کر نیچے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پل کے نیچے پلیٹ فارم پر اپنا سامان رکھ کر ہم اپنا لائحہ عمل سوچنے لگ گئے۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ سامان اُٹھا کر تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ڈیرہ جمایا جائے۔ اور پھر دن بھر لاہور کی سیر کی جائے اور رات کو دہلی کی گاڑی میں سوار ہو کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ لاہور کا بہت بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ میانوالی جیسے تو بیسوں سٹیشن اس میں سما جائیں۔ صفائی بھی بہت تھی بہت اعلیٰ درجے کے پلیٹ فارم تھے۔ ہمیں جا بجا چائے کی دکانیں نظر آئیں۔ میں سوچنے لگا ان دکانوں پر اتنے لوگ چائے پینے کے لیے کہاں سے آتے ہوں گے۔ ہمارا اتنا بڑا گاؤں ہے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں آدمی رہتے ہیں۔ گنے چنے دو چار آدمیوں کے علاوہ اور کوئی بھی وہاں چائے نہیں پیتا۔ ہم لوگ چونکہ سب کے سب دیہاتی ماحول کے پروردہ تھے۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو بھی چائے سے کوئی رغبت نہ تھی۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر مختلف پلیٹ فارموں پر پھرتے رہے۔ آنے جانے والی گاڑیوں اور ان

کے سازوں کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ دو تین ٹکٹ کلکٹروں نے ہم لوگوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ دیہاتی لڑکے بغیر ٹکٹ کے ہوں گے جو لاہور کوئی میلہ وغیرہ دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن میرے بتانے پر وہ مطمئن ہو گئے اور مسکراتے ہوئے ایک نمبر پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک ہم وہاں ہی پھرتے رہے۔ پھر میں نے انکوائری سے دہلی رات کو جانے والی کسی موزوں گاڑی کے متعلق انکوائری کی۔ ایک گاڑی شام کو سات بجے جاتی تھی اور دوسری رات کو ڈیڑھ بجے۔ دوستوں کے باہم مشورے سے یہ طے ہوا کہ شام والی گاڑی سے چلا جائے چنانچہ ہم دو لڑکوں کو سامان کی رکھوالی کے لیے ویٹنگ روم میں چھوڑ کر ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئے۔ باہر نکلے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آدمیوں کا بے پناہ ہجوم جہاں تک نظر جاتی تھی ٹانگے ہی ٹانگے نظر آتے تھے۔ کچھ آدمی سرخ رنگ کی وردیاں پہنے اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ہم نو لکھا بازار میں آئے۔ وہاں کھانا کھایا اور پھر میں ان دوستوں کو لے کر انارکلی بازار میں آ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں گھومے پھرے اور پھر داتا صاحب کے سلام کے لیے ان کے مزار مقدس کی طرف چلے گئے۔ وہاں بھی آدمیوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ حضرت کے مزار پر حاضری دینے کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے شاہی مسجد کی طرف چلے گئے۔ مسجد دیکھی اور شاہی قلعہ دیکھا۔ مسلمانوں کی عظمت کی یادگاریں۔ شیش محل صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے اس کے مکین ابھی باہر سے واپس آ جائیں گے۔ ہم نے کبھی اپنے خواب و خیال میں بھی اتنی پرشکوہ عمارت نہ دیکھی تھی۔ ہم لوگ تو مٹی کے کچے گھروندوں ہی میں نسل در نسل رہتے چلے آ رہے ہیں۔ دھوئیں سے اٹے ہوئے کالے چھت جن میں ہم اپنی زندگی کا حسن برباد کر دیتے ہیں۔

میرے ساتھیوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں شیش محل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس محل میں بھی تو کوئی آدمی رہتے رہے ہوں گے۔ کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ انسان۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک ہی بڑے سے کوٹھے میں ایک طرف خود رہتے ہیں۔ سامان اور غلہ وغیرہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کوٹھے میں اپنے مال مویشی باندھتے ہیں اور ان کا چارہ۔ ٹانڈے اور بھوسہ وغیرہ رکھتے ہیں ان مکینوں پر پر کس قدر اللہ کی رحمت تھی۔ اتنے خوب صورت محلات میں رہتے تھے۔ حسین و جمیل عورتوں کی قربت ان کو نصیب تھی۔

میں سوچنے لگا کہ ایک ہم ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے اپنی زندگیاں کثرتِ کار سے تباہ کر لی ہیں۔ ہم کتنی محنت کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں کیا حاصل ہوا ہے۔ افلاس، بھوک اور بیماری۔

یہ لعنتیں ہمارا اخلاق بگاڑ رہی ہیں۔ ہمیں چوری سکھاتی ہیں۔ ہم اپنی اسی غربت کی وجہ سے خانوں، ملکوں اور پولیس کے تابع رہنے پر مجبور ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان اونچے ایوانوں کو کہ جن کی تعمیر ہمارے آباؤ اجداد کی ہڈیوں پر کی گئی ہے جلا دوں اور اونچے اونچے سرخ شعلے اس ظالم دنیا کو بھی اپنی پیٹ میں لے لیں اور آخر کار یہ جل کر بھسم ہو جائیں۔

شیش محل دیکھنے کے بعد ہم نے دیوانِ عام اور دیوانِ خاص دیکھے۔ لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ شاہی مسجد، شاہی قلعہ اور انار کلی بازار کے علاوہ لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اور شالا مار باغ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ایک گائیڈ سے پوچھا کہ یہ دونوں جگہیں ہم نے دیکھنی ہیں۔ یہ نزدیک کونسی جگہ ہے۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے قریب ہی شاہدرہ میں جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ راستے میں دریائے راوی اور آگے نورجہاں کا مقبرہ بھی ہے وہ بھی دیکھتے جانا۔

مقبرہ ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین پر واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے۔ اندر خوب صورت درخت ہیں۔ پھولوں کی روشیں۔ فوارے اور

نرم نرم گھاس کے خوشنما لان دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے اس وقت وہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ تھیں۔ کالج کی لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ہوئیں ہمارے قریب سے گذر جاتیں۔ میں نے ان سب کو غور سے دیکھا۔ ان میں کوئی زری نہ تھی۔

جہانگیر کے مقبرے کے باہر جانب غرب آصف خاں کا مقبرہ ہے۔ جو زمانے کی دستبرد سے نہیں بچ سکا۔ جابجا سے پلستر اکھڑا ہوا اور اینٹیں شکستہ حالت میں تھیں۔ اب اس میں جنگلی کبوتر اور ابابیلیں کثرت سے رہتی تھیں۔ ہم نے واپسی پر نور جہاں کا مقبرہ دیکھا اور پھر تھوڑی دیر کے لیے دریا میں کشتی پر بیٹھ کر سیر کی۔ اور پھر وہاں سے سیدھے واپس ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ کھانا کھا کر پھر شالامار دیکھنے جائیں گے۔ لیکن سب لڑکوں نے متفقہ طور کہا کہ اب بہت تھک گئے ہیں لہٰذا اب آرام کریں گے۔

کھانا کھانے کے ہم اپنے ٹھکانے پر آ گئے اور پھر وہ لڑکے جو سامان کی دیکھ بھال پر مامور تھے ان کو چھٹی دی اور ساتھ ہی ان کو تاکید کی کہ وہ چھ بجے شام تک ہر صورت میں واپس آ جائیں۔ تھرڈ کلاس کے مسافر خانوں میں ہر جگہ ہر وقت بھیڑ ہوتی ہے۔ پانچ آدمی سامان اٹھا کر آئے تو دس اپنی نئی منزل کو روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ مسافر خانہ میں فرش پر بستر لگا کر لیٹ گئے۔ اس شور و شغب کے عالم میں نیند بھلا کہاں آتی ہے۔ تھوڑی دیر تک لیٹے رہے پھر اٹھ کر پلیٹ فارم پر گھومنے چلے گئے۔ ہندوستان کے ہر علاقے کے مسافر وہاں پر موجود تھے۔ ہر آدمی اپنے مخصوص علاقائی لباس سے پہچانا جاتا تھا۔

شام کو چھ بجے ہم لوگ باری باری ریلوے سٹیشن سے باہر کھانا کھانے کے لیے جانا شروع ہو گئے۔ ہمارے دو ساتھی جو انارکلی دیکھنے اور داتا صاحب سلام کے لیے گئے تھے وہ بھی واپس آ چکے تھے۔ سب لڑکوں نے کھانا کھایا تو تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم لوگوں نے اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ تقریباً پونے سات بجے

کے لگ بھگ ہم اپنا اپنا سامان اُٹھا کر پلیٹ فارم نمبر ایک کی طرف جہاں سے کہ دہلی والی گاڑی چلتی تھی، اس جانب روانہ ہو گئے۔ وہاں گاڑی پہلے سے کھڑی تھی۔ کافی بھیڑ تھی۔ ہم نے تقریباً سب ڈبوں میں جھانک کر دیکھا۔ کسی میں مزید گنجائش نہ تھی۔ ہم سب ساتھی کسی ایک ڈبے میں اکٹھے نہ بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ دو دو تین تین کر کے بڑی کوشش اور مشکل سے ہم مختلف ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ میں نے چکر لگا کر یہ یقین کر لیا کہ سب دوستوں کو جگہ مل گئی ہے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ سب ساتھی بیٹھ گئے ہیں تو میں بھی بمشکل ایک ڈبے میں داخل ہو کر اپنے لیے جگہ حاصل کر سکا۔ جہاں مجھے بیٹھنے کی جگہ ملی وہاں میرے بالکل سامنے ایک نوجوان سکھ اور ایک خوبرو حسینہ ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ قرائن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی نوبیاہتا جوڑا ہے۔ اس سکھ کی عمر کوئی چوبیس پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی اور وہ مہ رُخ کوئی سترہ اٹھارہ سال کی ہو گی۔ وہ دونوں پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی باتوں سے چلا کہ وہ سیالکوٹ سے آ رہے ہیں اور ان کو بھی دہلی ہی جانا ہے۔

وہ سکھ اس لڑکی سے بعض اوقات بڑا ہی فحش اور لچر مذاق کرتا اور وہ بیچاری میری طرف دیکھ کر شرما جاتی۔ وہ کسی کسی وقت اُس سردار صاحب سے ناراض ہو کر روٹھ جاتی اور گھونگھٹ نکال کر منہ دوسری طرف کر لیتی۔ سردار صاحب منت سماجت کرتے لیکن وہ اُسے دق کرنے کی خاطر اس سے نہ بولتی۔ اور پھر سردار جی ایک بڑی موٹی سی گالی دے کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور مجھے یوں لگتا جیسے بہار مسکرا اُٹھی ہو۔ اس کی مسکراہٹ میں مجھے قوسِ قزح کے سب رنگ جھلملاتے ہوئے نظر آتے۔

میں سوچتا اس دنیا کا سب حسن عورت اور پھولوں کے وجود کے وجود سے ہے۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو یہ دنیا کتنی بے کیف ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے اس دنیا کی تکمیل عورت کی تخلیق سے کی ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو یہ اتنی وسیع و عریض دنیا کتنی بے کیف اور کس قدر سونی ہوتی۔

مجھے اس لڑکی اور زرینہ میں بہت سی باتیں مشترک نظر آئیں۔ یا شاید یہ ہو کہ سب خوبصورت عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ میں سردار جی کی آنکھ بچا کر چوری نظر سے اس لڑکی کو دیکھ لیتا۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میری حیات پُرالم کے خزاں رسیدہ چمن میں نکہتوں کے کارواں اور رنگ و نور کے طوفان منڈلا رہے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں سردار جی میری ان دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ میری وارفتگی پر کبھی کبھی ہلکا سا مسکرا بھی دیتے۔

سردار صاحب نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کیا

اُوئے منڈیا۔ اے کڑی تینوں چنگی لگدی اے۔

سردار جی یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔

پھر بھی بتا تو سہی۔

حضور والا! ہر خوبصورت عورت ہر غیر مرد کو اچھی لگتی ہے۔ میں نے بھی اُسے تڑ کی بڑ کی جواب دیا۔

اوئے پریم کورے۔ اے منڈا بھی تیرے عاشقاں وچوں ہے گا۔

پریم کور اور میں ہم دونو یہ بات سُن کر شرما گئے۔

## ۵

میرے ساتھی لڑکے میرے اس ذہنی خلفشار سے قطعاً بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اب پریم کور سیتل سنگھ کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ سردار جی اس کے خزانۂ حُسن پر سانپ بن کر بیٹھے پہرہ دے رہے تھے۔ اگرچہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایسا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی سفر مرد کسی غیر عورت کو چھیڑ لے۔ لیکن پھر بھی سردار جی بہت محتاط تھے۔ سردار جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تم کہاں جاؤ گے۔

جبل پور۔

وہاں کیا کرتے ہو۔

فوج میں بھرتی ہو کر جا رہا ہوں۔

تم تو بہت چھوٹے ہو۔ بھرتی کیسے ہو گئے ہو۔

نہیں سردار جی۔ میری عمر سولہ سال ہے اور میں میٹرک میں پڑھتا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے میری شادی ہوئی ہے۔

تم شادی شدہ ہو۔ جب ہی تو تو میری سردارنی کو تاڑ رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

نہیں سردار جی آپ کی یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ماشاءاللہ آپ کی سردارنی کافی خوبصورت۔ صحت مند اور جوان ہے۔ ہر آدمی کی نظریں ان کی طرف بے محابا اٹھ جاتی ہیں۔

اور سردار خوش ہو کر چپ ہو گیا۔

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ سردار صاحب آپ کہاں جائیں گے۔

دہلی۔

وہاں کیا کام کرتے ہیں۔؟

میں والسرائے صاحب کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔

شادی کب ہوئی ہے۔

چند روز پہلے۔

اتنی جلدی اسے ساتھ بھی لیے جا رہے ہو۔

وہ جواب میں ہلکا سا مسکرا پڑا۔

رات بھر میں اور سردار جی جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ کافی دلچسپ آدمی تھا۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ والسرائے کے دفتر میں چھوٹا سا افسر تھا۔ رات بھر وہ مجھے اپنے معاشقوں کی جھوٹی سچی کہانیاں سناتا رہا۔ جب پریم کور پہلو بدلتی

تو وہ اُسے تھپک کر سلا دیتا۔ شاید وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ پریم کور شادی سے قبل اُس کے معاشقوں سے آگاہی حاصل کرے۔

سردار صاحب آپ کی سردارنی کو آپ کے ان معاشقوں کا اگر پتہ چل جائے تو پھر کیا ہوگا!

کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں اسے اس قدر بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ جس قدر کہ آپ کے ہاں سمجھا جاتا ہے۔

اس کی کیا وجہ ہے؟

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنس پر اتنی کڑی پابندی نہیں ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو بھی جائے تو کوئی اسے اتنا بُرا نہیں سمجھتا۔

سردار صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات پوچھوں۔

ہاں۔ ہاں۔ ضرور پوچھو۔

سردار صاحب میں نے سُنا ہے کہ سکھوں میں اگر ایک بھائی شادی کر لے تو دوسرے بھائی بھی اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس عمل کو آپ کے ہاں قطعاً بُرا نہیں سمجھا جاتا۔

بُرا تو جانتے ہیں۔ لیکن اس قدر بھی نہیں کہ میں اب اپنے بھائی کو اس جرم کی پاداش میں قتل ہی کر دوں۔ ویسے میں چاہتا یہ ہوں کہ پریم کور میری بیوی بن کر رہے کسی دوسرے کی نہیں۔ اسی لیے تو میں شادی کے فوراً بعد اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔

تو آپ لوگوں کی یہ عورتیں اپنے خاوندوں کے سوا دوسروں کو دھتکار کیوں نہیں دیتیں۔

بھئی بات دراصل یہ ہے کہ سب کو ایک ہی گھر میں رہنا ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتیں کہ گھر کی فضا خراب ہو اور گھر ایک مستقل اذیت خانہ بن جائے۔

گاڑی اب دہلی کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ دور افق سے نور کی کرنیں لاوے کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔ پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر خوراک کی تلاش میں قطار اندر قطار اُڑے جا رہے تھے۔ کام پر جانے والے مزدور بڑی عجلت میں اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ گاڑی آہستہ ہوتے ہوتے ریلوے سٹیشن سے دور ہی رُک گئی اور مسلسل لمبی لمبی سیٹیاں بجا رہی تھی۔ بہت سے لوگ گاڑی سے اُتر کر مختلف اطراف میں چلے جا رہے تھے۔ کچھ ریلوے کے سپاہی اور ٹکٹ کلکٹر ان کے تعاقب میں گئے۔ لیکن بے سود وہ بھاگ کر ان کے پنجے سے بہت دور نکل گئے۔ اور وہ شرمندہ ہو کر ناکام لوٹ آئے۔ تقریباً پانچ منٹ تک گاڑی ریلوے سٹیشن سے باہر ہی کھڑی رہی۔ آخر کار گارڈ نے ایک لمبی وسل دی۔ میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا۔ اب سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔ جو لوگ گاڑی سے نیچے اُتر کر حالات کا جائزہ لے رہے تھے وہ بھاگ بھاگ کر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے گئے۔ مسافروں نے اپنا اپنا سامان سمیٹنا اور باندھنا شروع کر دیا۔

سردار جی نے اپنی بیوی سے کہا۔

پریم کورے یہ لڑکا اگر تمہیں اچھا لگتا ہے تو اسے بھی ساتھ لے چلو۔

وہ کچھ نہ بولی۔ صرف ہلکا سا مسکرا دی اور پھر معنی خیز نظروں سے سیتل سنگھ کو دیکھنے لگ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بڑی ستیلا تھی۔

لوگ ایک افراتفری کے عالم میں اپنا اپنا سامان اُٹھائے پلیٹ فارم بھاگے چلے جا رہے تھے۔ میں نے اپنا سامان اُٹھا کر نیچے پلیٹ فارم پر رکھا اور ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سب اپنا اپنا مختصر سامان اُٹھائے میرے پاس آ گئے۔ لاہور سے دہلی تک کا سفر اب اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اب اس کے بعد ہم لوگوں نے مختلف اطراف کو اپنے نئے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ ان کو تو پھر بھی دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں جانا تھا۔ صرف میں اکیلا تھا جسے انجانے نگروں کا یہ کڑا سفر اکیلا ہی طے کرنا تھا۔ لاہور سے دہلی تک کا یہ سفر تو پریم کور کے مسحور کن حسن کی جلوہ پاشیوں

سے فیضیاب ہوتے ہوئے بخیر و خوبی کٹا۔ اب اس کے بعد کا سفر کافی اذیت ناک دکھائی دیتا تھا۔

آج کا پورا دن میں نے دہلی ریلوے سٹیشن پر گذارنا تھا۔ اب کوئی ساتھی بھی نہ تھا کہ ایک سامان کے پاس بیٹھتا اور دوسرا آگے پیچھے جا سکتا۔

میں سوچتا بغیر ساتھیوں کے یہ اذیت ناک لمحے کیوں کر کٹیں گے۔

مجھے جبل پور براستہ بیسا کھٹی جانا تھا۔ وہاں کے لیے گاڑی شام کو چلنی تھی۔ میرے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آج کا دن میرے ساتھ ہی گذاریں گے۔ نہ جانے پھر کب ملاقات ہوگی۔ وہ کہنے لگے آپ کو ہم بیسا کھٹی والی گاڑی پر سوار کر کے ہی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے وہ لمحے غنیمت جانے جو دوستوں کی معیت میں کٹیں گے۔ سب نے متفقہ طور پر یہ پروگرام بنایا کہ آج جی بھر کر پوری دہلی کی سیر کریں گے۔ چنانچہ ہم اپنا اپنا سامان اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر آئے۔ اور تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں آکر ڈیرہ جمایا۔ ہمارے قریب ہی کالے بھجنگ ہندوستانیوں کی ایک برات ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ ان کی نیم برہنہ عورتوں کو دیکھ کر مجھے تو متلی ہونے لگی۔ میں سمجھتا ہوں عورت کا سب حسن ہی اس کی ستر پوشی میں ہے۔ ان نیم برہنہ عورتوں کے دودھ پیتے بچے اگرچہ زندگی کا امرت پی رہے تھے۔ لیکن دیکھنے والوں کو کچھ اچھا تاثر نہ ملتا۔ ان عورتوں کو اپنی نیم برہنگی کا کوئی احساس نہ تھا۔ پاؤں سے ننگی۔ ایک مختصر سی ساڑھی سے انہوں نے اپنا بدن ڈھانپنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ جس میں وہ ناکام رہی تھیں اور جا بجا سے ان کے اعضا جھانکتے ہوئے نظر آتے اور ان کی یہ نیم برہنگی بے راہ رو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

ویٹنگ روم کے اس بڑے سے شیڈ میں ایک طرف ہم نے اپنا سامان رکھ دیا اور اپنے اپنے بندھے ہوئے بستروں پہ بیٹھ کر ہم اپنا دن بھر کا پروگرام وضع کرنے میں لگ گئے۔ ان براتیوں میں سے چند نوجوان ہم سے تھوڑی دُور ہٹ کر جمگھٹا اور

ڈھولی بجا کر ایک عجیب سا گانا گا رہے تھے جس کو ہم نہ سمجھ سکتے تھے۔ ان کے بڑے بوڑھے ان کے قریب ہی سلفائی رہے تھے اور ان نوجوانوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ اس بارات میں کوئی دو سو کے قریب آدمی ہوں گے۔ جن میں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب عورتیں تھیں۔ جوان بھی تھیں۔ بوڑھی بھی تھیں۔ لیکن ان میں کوئی جاذب نظر نہ تھی۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر دوبارہ ان کو دیکھنے کو جی نہ کرتا تھا۔

ان باراتیوں کی دھما چوکڑی کوئی گھنٹہ بھر رہی ہو گی کہ اچانک انہوں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ہاؤ ہو کے عالم میں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ سٹیشن سے دور جانے کا پروگرام بنایا لیکن دوستوں نے دور جانے کی بجائے صرف چاندنی چوک تک ہی چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ہم کوئی گھنٹہ بھر تک چاندنی چوک کی سیر کرتے رہے اور پھر کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب ویٹنگ روم میں واپس آ گئے۔ چھابڑی والوں سے کھانے کے لیے کچھ لیا۔ وہ سبز بڑے بڑے پتوں پر آلو اور چھولوں کی بھجیا ڈال کر دیتے اور ایک ایک آنے میں پوڑی دیتے۔ بہت ہی چھوٹی اور ہلکی پوڑیاں تھیں۔ میرا خیال ہے ہمارے پنجاب کے دیہاتی بھائی اگر چالیس پچاس پوڑیاں بھی کھا لیں تو پھر بھی ان کا پیٹ نہ بھرے گا۔ بہر حال ہم نے ایک ایک روپے میں یہ کھانا کھایا۔ وقتی طور پر سیری ہو گئی۔

ہم واپس ویٹنگ روم میں آ کر اپنا اپنا بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ اور اپنے علاقے کی بیلوں اور کبڈی کی باتیں کرتے رہے۔ میں ان دوستوں کا بے حد مشکور تھا جنہوں نے محض میری سہولت اور دلجوئی کے لیے اپنا اپنا سفر ملتوی کیا تھا۔ میں نے پھر آخری بار ان کو ان کے سفر کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔ میں سوچتا یہ قلیل سا وقت بھی غنیمت ہے جو اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب الگ ہوں گے تو پھر شاید زندگی بھر نہ مل سکیں گے۔

مجھے بمبئی جانے والی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ گاڑی نے چھ بجے شام روانہ ہونا تھا۔ اس لیے سب لڑکوں نے کافی پہلے کھانا کھالیا۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے وہ میرا سامان اُٹھاکر متعلقہ پلیٹ فارم پر آگئے۔ گاڑی دہلی ہی سے چلتی تھی اس لیے جگہ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو گاڑی پہلے سے وہاں کھڑی تھی۔ کچھ آدمی ڈبوں میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے بھی میرا سامان ایک خالی ڈبے کی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور ہم سب اس ڈبے کے باہر پلیٹ فارم پر کھڑے خوش گپیوں میں محو ہو گئے۔ سب ساتھیوں کو مجھ سے بچھڑنے کا بہت غم تھا۔ مجھے بھی ان سے الگ ہونے کا افسوس تھا۔ میں ان سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ میں سوچتا ہر لمحے اب غم بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی عزیز۔ کوئی نہ کوئی دوست۔ کوئی نہ کوئی غمگسار بچھڑتا چلا جارہا ہے۔ اور سب مجھے حوادث کے تھپیڑے سہنے کے لیے ایک ایک کرکے چھوڑتے جارہے ہیں سب سے پہلی جدائی ماں کی مرگِ ناگہانی تھی۔ پھر شفیق باپ۔ پیارے بھائی اور بہن سے الگ ہوا۔ پھر ظالم زمانے نے زرینہ کو مجھ سے چھین لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ ساتھی میرا دل بہلا دیتے تھے۔ اب یہ بھی مجھ سے الگ ہوکر اپنی اپنی راہ لیں گے۔ اور میں انجانی منزلوں کا راہی سب سے الگ ہوکر، سب سے بچھڑ کر ایک بہتر مستقبل کو پالینے کی آرزو میں انجانے نگروں کی راہ لوں گا۔ ہم چند روز تک ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے پھر آہستہ آہستہ یہ خوشگوار یادیں بھی ماضی کے دھندلکوں میں کھو جائیں گی۔

اب ہر لمحہ پلیٹ فارم کی گہما گہمی بڑھتی جارہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں کا بے پناہ رش ہو گیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ اپنی سیٹ بستر بچھا کر بیٹھ جائیں۔ ہم باہر کھڑکی سے آپ کے ساتھ باتیں کرتے رہیں گے۔ کتنے اچھے ساتھی تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم سب ایک ہی سفر میں اکٹھے جاتے تو ٹریننگ کا عرصہ ہنسی خوشی گزر جاتا۔ بچھڑنے کی گھڑی آپہنچی۔ گاڑی نے وسل دی تو سب ساتھی

باری باری زار و قطار روتے ہوئے مجھ سے گلے ملتے۔ میں سوچتا ہر ایک کو اپنے غم اور دکھ یاد آرہے ہیں۔ اُن لڑکوں نے بڑے خلوص اور محبت کا مظاہرہ کیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ وہ تھوڑی دُور تک گاڑی کے ساتھ چلتے گئے اور پھر گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ سب رُک گئے۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال لیا۔ جب تک ہم ایک دوسرے کو نظر آتے رہے۔ ہاتھ ہلا ہلا کر وِشش (WISH) کرتے رہے۔ اور پھر محبتوں کا یہ سلسلہ آہستہ آہستہ منقطع ہو گیا۔ گاڑی اب پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور ایک اچٹتی سی نظر ڈبے کے اندر مسافروں پر ڈالی۔ سب سہمے ہوئے بے رونق چہرے ایک دوسرے کو بے معنی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ کوئی خوبصورت یا خوش لباس آدمی مجھے نظر نہ آیا وہی کالے کالے سے مریل اور نحیف و نزار سے آدمی، جن میں سے اکثر ایک دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ بہت ہی کم لوگوں کے جسم پر میں نے کوئی کُرتا دیکھا۔

دہلی سے جنوب کی سمت جائیں تو موسم سرد نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے ان میں سے اکثر لباس کے معاملے میں بے نیاز تھے۔ ان میں اکثر آدمی بیڑی پی رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ وقت کاٹنے کے لیے آپس میں خوش گپیاں کیوں نہیں کرتے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ان کے اپنے مسائل تھے۔ وہ چپ سادھے اور بیڑی پیتے ہوئے یونہی بے مقصد نظروں سے دُور خلاؤں میں گھورے جا رہے تھے۔ میں بھی چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھا گذرے ہوئے حالات و واقعات کا جائزہ لینے لگ گیا۔ میں نے اپنی گذشتہ سولہ سالہ زندگی پر ایک نظر دوڑائی۔ مجھے ماضی میں اپنا کوئی بھی قدم سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت صحیح راہوں پر اُٹھتا ہوا نظر نہ آیا۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کی تھی۔ جس طرف حالات نے ہانک دیا۔ اسی طرف چل پڑے نہ اپنے کسی نفع کا خیال نہ نقصان کی کوئی پرواہ۔ میں نے سوچا یہ تو کوئی زندگی نہ ہوئی۔

باپ چاہتا تھا میں دل لگا کر پڑھوں اور بی۔ اے تک تعلیم حاصل کروں۔

پڑھائی میں نے چھوڑ دی۔
مسجد میں قرآن کریم پڑھنے کے لیے گیا اسے چھوڑ کر آگیا۔
باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔
آخر باپ کو کون سا سکھ دیا ہے۔

لوگوں کی اولاد ہوتی ہے وہ بڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے۔ میں باپ کو کوئی سکھ دینے کی بجائے اُلٹا دُکھ ہی دیتا آیا ہوں۔ کیا میں اس لیے پیدا ہوا ہوں کہ کسی کی بات نہ مانوں۔ سیدھے راستے پر نہ چلوں۔ یہ تو بالکل حیوانوں کی سی زندگی ہے۔ میں نے دل میں عہد کیا کہ میں آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا۔ جس سے میرے باپ دادا کا نام بدنام ہو۔

میں سوچتا ہیڈ ماسٹر لالہ سندر لال جی جو میری نفسیاتی اُلجھنوں کی بات کرتے تھے۔ شاید انہی نفسیاتی الجھنوں نے ہی مجھے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ اور میں اُس حصار سے باہر آکر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ اپنی کمزوریاں کیسے نظر آتی ہیں۔ میں سوچتا میں دو سال کا بچہ تھا کہ ماں مر گئی۔ ماں کے پیار سے محروم ہو گیا۔ یہ خلا اب تک میری زندگی میں جوں کا توں ہے۔ ایسے بچے کی زندگی میں بہت سی نفسیاتی اُلجھنیں اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے بچے ضدی ہو جاتے ہیں۔ خود سر ہو جاتے ہیں۔ کسی نے اگر ذرا سی سختی سے بات کی تو وہ بغاوت پر اُتر آتے ہیں۔

## ۵

گاڑی ایک خوفناک دھچکے کے ساتھ ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رُک گئی۔ دو آدمی ہمارے ڈبے میں سوار ہوئے۔ وہ میرے ساتھ کی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
بھائی صاحب ابھی بیسا کتنی دور ہے۔
جھوُر۔ اپن کو کوسوں کا تو پتہ نہیں۔ پر صبح آٹھ بجے یہ گاڑی وہاں جا پہنچے گی۔

میرے پاس گھڑی نہ تھی اس لیے وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ ان میں سے ایک سے میں نے پوچھا۔

بھیا کیا ٹائم ہو گا۔

حضور یہ گاڑی دو بجے آتی ہے۔ سٹیشن کا ہوا بولت تھا (بابو بولتا تھا) کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے تو سرکار تین بجے کا سمے ہو گا۔

ابھی بینا کافی دور تھا۔ میں پھر سے اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ اور نئے سرے سے خیالات کے تانے بانے میں کھو گیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ ڈبے میں اس قدر آدمی بیٹھے ہوئے تھے لیکن سب گم سم۔ اگر ہمارے علاقے کے اتنے آدمی ہوتے تو مختلف ٹولیوں میں بیٹھے گپیں ہانک رہے ہوتے۔ یا ماہیا گا رہے ہوتے۔ میں سوچتا ان لوگوں میں تو کوئی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ میں سو گیا۔ گاڑی بینا پہنچی تو میری آنکھ کھلی۔ میں جلدی سے اٹھا اور اپنا سامان باندھا اور نیچے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ ریلوے کے ایک اہلکار سے میں نے کہا۔

جناب میں نے جبل پور جانا ہے۔

ضرور جائیے۔

وہ تو جناب میں جاؤں گا ہی۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جبل پور کو گاڑی کب جائے گی۔

اطمینان سے ویٹنگ روم میں جا کر آرام کیجیے۔ گاڑی رات کو دس بجے جاتی ہے۔

جبل پور کب پہنچتی ہے۔

بھیا صبح سات بجے کے قریب جبل پور پہنچ جاؤ گے۔ میرا خیال ہے۔ پہلی دفعہ آئے ہو۔ اس لیے اتنے فکر مند دکھائی دیتے ہو۔

جی ہاں۔ پہلی دفعہ۔ میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

اس اہلکار نے بڑی سنگدلی اور ایک دوسرے اہلکار کے ساتھ ٹی۔ سٹال کی طرف

چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھا رہا۔ جب گاڑی روانہ ہوگئی تو تھوڑی ہی دیر میں کا سٹیشن بالکل ویران ہوگیا۔ اب بہت ہی کم آدمی مجھے پلیٹ فارم پر نظر آرہے تھے۔ میں سامان اُٹھا کر تھرڈ کلاس کے مسافر خانہ میں چلا گیا۔ اس میں ایک بدنما سی بتی ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے باوجود وہاں اندھیرا تھا۔ اتنے بڑے شیڈ میں کل پانچ چھ آدمی ڈیرہ ڈالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی اپنا بستر ایک بینچ پر بچھا لیا اور لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ چاروں طرف سے مچھروں نے یلغار کر دی وہاں لیٹنا دوبھر ہوگیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ تنگ آکر چادر میں منہ سر لپیٹ کر سوگیا۔ اس مسافر خانہ میں کوئی شور کوئی ہنگامہ وغیرہ نہ تھا۔ میں اطمینان سے سویا رہا۔ سورج کافی اُوپر آگیا تھا کہ میں اُٹھا۔ قریب کے ایک نل پر جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر کچھ کھانے کی چیزیں خوانچہ والے سے لے کر کھائیں۔ وہ دن بڑی مشکل سے کاٹا۔ رات کو ساڑھے نو بجے ایک ٹرین آئی۔ مسافر خانہ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے مجھے بتایا کہ یہ ٹرین جبل پور جائے گی۔ چنانچہ میں اپنا سامان اُٹھا کر اس گاڑی میں سوار ہوگیا۔ جگہ آسانی سے مل گئی۔ اور رات بھر ایک سیٹ پر آرام سے سویا رہا۔ صبح سورج طلوع ہو رہا تھا کہ گاڑی جبل پور کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی۔ کافی بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ وہاں خوب چہل پہل تھی۔ میں نے بستر کندھے پر اُٹھایا اور صندوق کو ہاتھ میں لٹکا کر سٹیشن سے باہر آگیا۔ وہاں عجیب قسم کے تانگے کھڑے تھے۔ بوسیدہ تانگے۔ مریل گھوڑے۔ ایک نحیف و نزار سا آدمی لپک کر میرے پاس آیا۔

مجور اکیہ (یکہ) چاہیئے۔

اکیہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے حیرت اور استعجاب کے عالم میں اس سے پوچھا۔

مجور۔ سواری، سواری۔

کیسی سواری۔

اس نے ان تانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

ہاں۔ میں نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔

اُس نے لپک کر میرا سامان اُٹھا کر اپنے اکیے میں رکھ لیا اور پھر مزید سواریوں کا انتظار کرنے لگ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کی سواریاں پوری ہو گئیں اور وہ سٹیشن کے احاطے سے نکل کر باہر کشادہ سڑک پر آگیا۔ گھوڑا کمزور تھا۔ وہ کوچوان اس کو بار بار چابک مارتا اور بہت ہی فحش قسم کی گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ کل چار سواریاں اس کے ٹانگے میں بیٹھی تھیں۔ جن میں دو راستے میں صدر بازار کے قریب اُتر گئیں۔ اب ہم دو آدمی رہ گئے تھے۔ ٹانگہ کچھ ہلکا ہوا تو اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ صدر بازار سے تھوڑا آگے جا کر وہ دوسرا آدمی بھی اُتر گیا۔ اب میں اکیلا اس ٹانگے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹانگے والے مجھے ٹانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

حضور۔ آپ کو سنٹر میں کس جگہ پر اتاروں۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

بھیا! میں تو نیا آدمی ہوں مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ سگنل ٹریننگ سنٹر میں جانا ہے۔

آپ نئے بھرتی ہو کر آئے ہیں۔

جی ہاں۔

اچھا یہ آگے سڑک کے موڑ پر "سی" کمپنی ہے۔ میں وہاں سے پوچھ لیتا ہوں کہ نئے رنگروٹ آج کل کس کمپنی میں جا رہے ہیں۔

اس نے ٹانگہ سڑک کے کنارے ایک آم کے درخت کے نیچے روک لیا۔ مجھے بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور خود اُتر کر سپاہیوں کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر ایک آدمی اس کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ کوچوان نے میرا سامان اُتار دیا۔ میں نے اسے چار آنے دیئے۔ وہ خوش ہو کر سلام کر کے اپنے ٹانگے میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ آنے والا شخص ایک لمبا تڑنگا وجیہہ نوجوان تھا۔ سلام دعا کے بعد مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنا تعارف کرایا۔

میرا نام ملک سردار خان ہے۔ میں چکڑالہ ضلع میانوالی کا رہنے والا ہوں۔ چند دن ہوئے ہیں ملٹری ٹریننگ ختم کی ہے۔ اس سامنے والی بیرک میں ہی رہتا ہوں۔ آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

جناب میرا نام احمد ہے۔ میں ونده شاہ بلاول ضلع کیمبل پور کا رہنے والا ہوں۔

آپ کے والد صاحب کا کیا نام ہے۔

آپ ہمارے گاؤں کے لوگوں کو جانتے ہیں

بالکل میں جانتا ہوں۔ بھئی میں ونده شاہ بلاول کے کافی لوگوں کو جانتا ہوں۔ آپ بتائیں تو سہی۔

میرے والد صاحب کا نام ملک شاہ جہان ہے۔

وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ میں چچا شاہ جہان صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کے بالکل ملحق موضع دربڑ میں میرے ننھیال رہتے ہیں۔ میں جب گاؤں میں تھا تو نورو قصائی کے ساتھ بٹیروں کی پالیاں لڑانے کے لیے ونده شریف جایا کرتا تھا۔ میں نے کبھی آپ کو وہاں دیکھا نہیں ہے۔

میں گاؤں میں کم ہی رہا ہوں۔ تعلیم کے سلسلے میں لاوہ اور میانوالی میں رہا ہوں۔

ملک سردار خان نے میرا بستر اٹھایا۔ میں بکس اٹھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ مجھے اپنی بیرک میں لے گیا۔ اتوار کا دن تھا اس لیے سب سپاہیوں نے اپنی چارپائیاں اور دوسرا سب سامان باہر نکالا ہوا تھا اور بیرک کو دھو کر اس کی صفائی کر رہے تھے۔ چارپائیاں جا بجا آم کے درختوں کے سائے میں پڑی ہوئی تھیں۔ جبل پور کے ایریا میں زیادہ تر آم اور جامن کے درخت ہوتے ہیں۔ اکا دکا اور بھی کوئی درخت کہیں کہیں دکھائی دے جاتا ہے۔

فوج میں میں نے دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی نیا آدمی آئے تو سب لوگ اس کو باری باری ملنے کے لیے آتے ہیں۔ جس آدمی سے سب سے پہلے اس نو وارد کی ملاقات

ہوتا ہے وہ میزبانی کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اس زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ آنے جانے والوں اور مہمانوں کی خاطر تواضع دودھ اور جلیبیوں سے کی جاتی تھی۔ ان دنوں مٹھائی آٹھ آنے سیر ہوا کرتی تھی۔ ہر چیز خالص ہوا کرتی تھی۔ حلوائی مٹھائیاں دیسی گھی کی بنایا کرتے تھے۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر وہاں آم کے درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایک سردار خان کا سکاؤٹ فیلو غلام فرید جو ضلع میانوالی کا رہنے والا تھا، آگیا اور پھر انہوں نے چارپائیاں اور دوسرا سامان اندر رکھا۔ اور پھر وہ کھانا کھانے کی تیاریاں کرنے لگ گئے۔ ان کی بیرک کے ساتھ ملحق ہی لنگر تھا۔ سپاہی اپنا اپنا مگ اور پلیٹ لے کر لنگر سے کھانا لے رہے تھے۔ اور پھر بیرک کے برآمدے میں بڑے بڑے میز اور بینچ پڑے ہوئے تھے ان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے کھانا کھانے کے بعد لنگر کے نل پر اپنی پلیٹ دھو کر وہ اپنی بیرک میں واپس چلے جاتے۔

تقریباً ظہر کے وقت تک میں سردار خان اور غلام فرید کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر سردار خان نے مجھ سے کہا۔ آپ کو "ڈی" کمپنی میں رپورٹ کرنا ہے۔ اب چلیں میں آپ کو وہاں چھوڑ کر آتا ہوں۔ ڈی کمپنی بالکل ہمارے ساتھ ہے۔ میں وقتاً فوقتاً آپ کی خیریت پتہ کرتا رہوں گا۔ اور پھر سردار خان اور غلام فرید میرا سامان اٹھا کر ڈی کمپنی کی طرف چل پڑے۔ وہاں جا کر سردار خان نے کمپنی حوالدار میجر کا پتہ کیا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ حوالدار میجر اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حوالدار اور حوالدار میجر بیرکوں کے سرے پر واقع چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتے تھے۔

سردار خان مجھے حوالدار میجر میر باز خان کے پاس لے گیا۔ ہم تینوں اس کے کمرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ سردار خان نے اندر جا کر اُن کو بتایا۔

سر یہ لڑکا میرا عزیز ہے۔ نیا بھرتی ہو کر آیا ہے۔

حوالدار میجر نے مجھے سر سے پاؤں تک قصائی کے سے انداز میں دیکھا اور پھر سردار خان سے پوچھنے لگا۔

سردار خان یہ تمہارا گرائیں (گاؤں کا) ہے۔

جی ہاں۔

یہ تو مجھے بنگالی معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو اس کے بال تو بالکل بنگالیوں کی طرح ہیں

جناب بال اس کے بڑے ضرور ہیں لیکن یہ بنگالی نہیں ہے۔

اور پھر حوالدار میجر نے ایک آدمی کو آواز دی۔

ایک رنگروٹ دوڑ کر اُن کے پاس آگیا۔

جاؤ اردلی۔ این۔ سی۔ او۔ لانس نائیک شاہ محمد کو بلا لاؤ۔

بہت اچھا سر۔

شاہ محمد ایک دراز قد اور وجیہہ آدمی تھا۔ وہ آیا تو حوالدار میجر میر باز خاں نے اسے کہا۔

شاہ محمد اس لڑکے کو لے جاؤ اور پینتیس نمبر سکاڈ کمانڈر کے حوالے کر آؤ اور اس کو کہو کہ اس کے لیے چارپائی، بستر اور کھانے وغیرہ کا فوراً انتظام کرو اور اس کے بعد اسے باربر شاپ میں لے جانا اور اس کے بال خشخاشی بنوانا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے حوالدار میجر سے کہا۔ جناب میں بال تو ہرگز نہ کٹواؤں گا۔ چاہے مجھے نوکری ہی کیوں نہ چھوڑنی پڑے۔

حوالدار میجر نے ایک زناٹے سے تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگ گئے۔

ابھی تو فوج میں نیا نیا آیا ہے۔ اس طرح کی حجت بازی یہاں نہیں چلے گی۔ اس نے لال بھبھوکا ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

کہاں کے رہنے والے ہو۔

کیمبل پور کا۔

کچھ پڑھے ہوئے بھی ہو۔

جی ہاں۔

کتنے۔

میٹرک تک پڑھا ہوں۔

اسی لیے تمہارا دماغ خراب ہے۔

ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا اور پھر سردار خان اور غلام فرید کو جانے کے لیے کہا۔ وہ چلے گئے تو وہ شاہ محمد سے کہنے لگا۔

حوالدار رانجھا سنگھ جوان کا سکواڈ کمانڈر ہے اس کو کہنا ذرا اس لڑکے کی اکڑ خانی دور کرے۔

جناب میری کیا اکڑ خانی ہے۔ غریب آدمی ہوں۔ نوکری کرنے آیا ہوں۔

چپ رہو۔ زبان مت کھولو۔ یہاں فوج کا یہ دستور نہیں ہے۔ تم تھوڑا پڑھ گئے ہو تو اسی لیے زیادہ باتیں بناتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے دل میں سوچا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میرے والد صاحب ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ یہ نوکری کرنا تو میرے لیے مشکل ہو گا۔ اور تو جو کچھ بھی ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ دستور زباں بندی۔ اسے برداشت کرنا میرے لیے بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔

ابھی تو ابتدا ہے۔
دیکھیے آگے کیا کیا ہوتا ہے۔

شاہ محمد نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "چلو، اُٹھاؤ اپنا سامان۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ بستر کندھے پر اُٹھایا اور بکس ہاتھ میں پکڑا اور شاہ محمد کیساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے اسی طرح کے ایک چھوٹے سے کمرے کے برآمدے میں لے آیا۔ اس کمرے کے باہر مکین کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

حوالدار رانجھا سنگھ
انچارج سکواڈ نمبر ۳۵

شاہ محمد نے اندر جا کر حوالدار رانجھا سنگھ کو رام۔ رام (یہ ہندوؤں کو سلام کرنے

کا طریقہ تھا۔)

رام رام بھیا۔ کہو شاہ محمد کیسے آنا ہو۔

سر ایک نیا رنگروٹ آیا ہے۔ حوالدار میجر نے کہا ہے کہ اسے آپ کے پاس چھوڑ آؤں اور انہوں نے اس کے متعلق کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔

کیا ہدایات دی ہیں۔ ان کا گرائیں ہوگا۔ یہی کہا ہوگا کہ ذرا اس کا خیال رکھیں

نہیں سر

تو پھر کیا ہدایات دی ہیں۔

سر انہوں نے کہا ہے کہ یہ لڑکا بڑا اکڑ خان ہے۔ اس کی اکڑ خانی ذرا ٹھیک کریں۔ اسے ضروری سامان اشو کروا کر اسے فوراً شاپ میں لے جائیں اور اس کا سر منڈوا دیں۔

حوالدار رانجھا سنگھ اپنے کمرے سے باہر برآمدے میں آ گیا۔ وہ سکھ نہ تھا۔ خلافِ توقع ڈوگرہ نکلا (ڈوگرے کانگڑہ اور جموں کے علاقے کی مارشل ریس کے ہندوؤں کو کہتے ہیں۔)

وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

اوئے شاہ محمد! تمہیں اور حوالدار میجر کو اس چھوٹے سے لڑکے میں کیا اکڑ خانی نظر آتی ہے۔

سر میٹرک پڑھا ہوا ہے۔ بڑا حجت باز ہے۔

کیا حجت کی ہے۔

سر حوالدار میجر نے کہا کہ اسے باربر شاپ لے جا کر اس کے بال خشخاشی بنوا لو۔ تو یہ کہنے لگا کہ میں بال تو ہرگز نہ کٹواؤں گا۔

بس اتنی سی بات ہوئی ہے۔

جی ہاں۔

اچھا آپ جائیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شاہ محمد اپنی سکاڈ کے کسی

لڑکے کو آپ میرے پاس بھیج دیں۔

شاہ محمد کے چلے جانے کے بعد حوالدار رانجھا سنگھ میری طرف متوجہ ہوا۔

بیٹا تم کس ضلع کے رہنے والے ہو۔

سر! میں کیمبل پور کا ہوں۔

اوہو تو جبھی تو ان کو اچھا نہیں لگتا۔ راولپنڈی کے لوگوں کے بغیر اور ضلعوں کے لوگ ان کو اچھے نہیں لگتے۔ یہ ان لوگوں کی بڑی کمزوری ہے۔

بال آپ تھوڑے چھوٹے کروالیں۔ رانجھا سنگھ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

ٹھیک ہے سر۔ کروالوں گا۔

رات کو صوبیدار میجر صاحب آپ کو سنٹرل رول کال میں دیکھیں گے۔ اس لیے بال تھوڑے چھوٹے کروالیں۔ پھر بڑے ہو جائیں گے پھر تم رکھ لینا۔ کوئی تمہیں کٹوانے کے لیے نہیں کہے گا۔

بہت اچھا سر۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

پینتیس سکواڈ کا ایک لڑکا آگیا۔

رانجھا سنگھ نے اس سے کہا۔

شیر محمد! اس لڑکے کو بیرک میں لے جاؤ۔ اس کے لیے چارپائی اور بکس کا انتظام کرو۔ دو دن تک اسے کھانا اپنے ساتھ کھلانا۔

شیر محمد مجھے بیرک میں لے آیا۔ کوارٹر ماسٹر سے مجھے چارپائی اور بکس اشو کروایا۔ میں نے اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کیا۔ بستر کھول کر چارپائی پر لگا دیا۔ اور اس کے بعد شیر محمد مجھے باربر شاپ میں لے گیا۔ حجام جن لڑکوں کے بال کاٹ چکا تھا۔ میں نے انہیں بڑے غور سے دیکھا۔ اس نے نہایت بے ہودہ اور بدنما طریقے سے بال کاٹے تھے۔ میں نے دل میں سوچا اس سے تو آدمی کی شکل ہی بگڑ جاتی ہے۔ جب میری باری آئی تو شیر محمد نے حجام کو بتایا کہ حوالدار رانجھا سنگھ نے کہا ہے کہ اس لڑکے کے بال کچھ چھوٹے کر دو۔

حجام نے شیر محمد کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر لکڑی کی ایک واہیات سی کرسی پر بٹھا دیا اور ایک نہایت ہی غلیظ بالوں سے اٹا ہوا، کپڑا میرے ارد گرد لپیٹ کر ایک مشین سے اپنی کارکردگی دکھانے میں مصروف ہو گیا۔ میرے خوشنما اور شوق سے رکھے ہوئے بال میرے سامنے اس کپڑے پر گر رہے تھے۔ اور میں خاموشی سے ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے دو تین منٹ لگائے ہوں گے کہ مجھے فارغ ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا۔

ایک ٹوٹا ہوا سستی شیشہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ اُسے میں نے اُٹھایا اور اس میں میں نے اپنے آپ کو ایک نظر دیکھا۔ پہلی نظر میں تو میں اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکا۔ تھہر درویش بر جانِ درویش۔ میں شیر محمد کے ساتھ واپس اپنی بیرک میں آ گیا۔

شیر محمد نے مجھ سے کہا کہ نہا لو تا کہ جو بال وغیرہ کٹنے کے بعد سر میں اٹکے ہوئے ہوں وہ نہانے سے نکل جائیں۔

بھائی شیر محمد کہیں سے گرم پانی مل جائے گا۔

وہ ہنس پڑا۔ نیک بخت آدمی یہاں کوئی ہماری ماں تو نہیں بیٹھی کہ پانی گرم کر دے گی۔ یہاں سب لوگ اسی تازے پانی سے نہاتے ہیں۔ شروع شروع میں ٹھنڈ لگتی ہے، تھوڑی دیر میں آدمی بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سردی وردی سب غائب۔ چلو ہمت کرو۔ اُس نے مجھے اپنا تولیہ اور صابن لا کر دیا۔ اور میرے ساتھ غسل خانے تک گیا۔ یہ غسل خانے بھی گاؤں کی مسجد کے غسل خانوں کی طرح تھے ان کے آگے کوئی دروازہ نہ تھا۔ شیر محمد نے مجھے بتایا کہ رسی بندھی ہوئی ہے اس پر کپڑے اُتار کر ڈال دینا۔ خود بخود پردہ بن جائے گا۔ چلو جلدی سے نہا لو۔ چونکہ کھانے کا اور پھر رول کال کا وقت ہو رہا ہے اور آپ کو رول کال کے بعد سنٹرل رول کال پر بھی جانا ہوگا۔ چونکہ آج آپ کو صوبیدار میجر صاحب دیکھیں گے۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے اُتارے اور حسب ہدایات ان کو رسی پر ڈال کر میں

نے نل کو کھولا۔ جسم پر پانی کی پھوار پڑی تو مجھے یوں لگا جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہے۔ میں نل کے نیچے سے نکل آیا۔ پانی بہت ہی ٹھنڈا تھا۔ شیر محمد نے دور کھڑے ہوئے مجھے ہدایت دی کہ نل کو تھوڑی دیر کے لیے کھلا رکھو۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی گرم آنے لگ جائے گا۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن پانی بدستور ٹھنڈا ہی تھا۔ چاروناچار ٹھنڈے پانی سے ہی نہانا پڑا۔ میں نہا کر کپڑے پہن کر باہر آیا تو شیر محمد میرا بدستور انتظار کر رہا تھا۔

نہا لیا۔ شیر محمد نے پوچھا۔

جی ہاں۔

پانی ٹھنڈا تو نہیں لگا۔

سخت ٹھنڈا۔

نیک بخت آدمی اب حالات کے مطابق گذارا کرو۔ ہم بھی جب پہلے آئے تھے تو ہمیں بھی ایسا ہی لگا۔ اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔

شیر محمد مجھے واپس بیرک میں لے آیا۔ سر پر لگانے کے لیے تیل دیا۔ میں تیل لگا چکا تو اس نے کنگھی اور شیشہ اپنے بکس سے نکال کر مجھے دیا۔ جلدی جلدی کنگھی کی اور پھر شیر محمد کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے لنگر کی طرف چل پڑا۔ میرا کھانا کھانے کے لیے بالکل جی نہ کرتا تھا۔ لیکن مجبوراً روٹین پوری کرنا پڑی۔ میں نے صبح بھی دیکھا تھا اور اب بھی یہ نوٹ کیا کہ کھانا ہمارے ہوسٹل سے بدرجہا بہتر تھا۔ آج گوشت پکا ہوا تھا۔ شیر محمد دو پلیٹوں میں سالن لے آیا۔ میز پر رکھ کر پھر چپاتیاں لینے کے لیے چلا گیا۔ گرم گرم چپاتیاں دیکھ کر میری بھی کھانا کھانے کے لیے رغبت پیدا ہوئی۔

اس زمانے میں فوج میں چھوٹا گوشت یعنی مٹن (MUTTON) ہی استعمال ہوتا تھا اگرچہ وہ اچھی کوالٹی کا نہیں ہوتا تھا۔

ہم کھانا کھا کر واپس اپنی بیرک میں آ گئے اور پھر رول کال کی تیاری میں

مصروف ہو گئے۔ ہمارا اسکواڈ پنجابی مسلمانوں اور سکھوں پر مشتمل تھا۔ انڈین سگنل کور میں پچاس فیصدی پنجابی مسلمان۔ پچیس فیصدی سکھ اور ڈوگرے۔ دس فیصدی مدراسی اور باقی پندرہ فیصدی پورے ہندوستان کے چنیدہ رنگروٹ۔

انڈین سگنل کور میں سندھی۔ بلوچی اور پٹھان بھرتی ہوتے تھے۔ پنجابیوں میں بھی صرف اعوان، راجپوت، لڑانے اور جاٹ ہی بھرتی ہو سکتے تھے۔ سادات کو انگریزی فوج میں بھرتی نہ کرتے تھے۔ موجودہ آزاد کشمیر اور ہزارہ کے مسلمان پنجابی مسلمانوں کے کوٹے میں بھرتی کیے جاتے تھے۔

## ۵

تقریباً مغرب کی نماز کے بعد رول کال کی وسل بجی۔ تمام رنگروٹ اپنے اپنے اسکواڈوں میں جا کر شامل ہو گئے۔ اسکواڈ کمانڈروں نے سب رنگروٹوں کی حاضری لگائی اور پھر کمپنی حوالدار میجر نے سب سے رپورٹ لی اور پھر دوسرے دن کے لیے احکامات وغیرہ پڑھ کر سنائے گئے اور پھر رول کال ختم ہو گئی۔

سنٹرل رول کال پر جانے والوں کو حوالدار میجر نے اپنے پاس بلایا۔ حوالدار رانجھا سنگھ مجھے لے کر حوالدار میجر کے پاس گیا۔ نئے بھرتی ہو کر آنے والے رنگروٹوں کو سنٹرل رول کال میں صوبیدار میجر کے سامنے پیش کیا جاتا۔

سب کمپنیوں کے حوالدار میجر اپنے اپنے آدمیوں کو وی۔ سی۔ اوز کلب کے پاس لے آئے۔ یہاں سنٹرل رول کال ہوتی تھی۔ اس کلب میں شام کو سنٹر کے تمام سردار صاحبان (V. C. Os) اکٹھا ہوتے تھے۔ اور صوبیدار میجر کو اپنی دن بھر کی کارگزاری سے آگاہ کرتے۔

سب کمپنیوں کے حوالدار میجروں نے بٹالین حوالدار میجر کو رپورٹ دی۔ جس نے کلب کے اندر جا کر صوبیدار میجر کو بتایا کہ سر سنٹرل رول کال پریڈ تیار ہے۔ ایک لحیم شحیم بڈھا سا آدمی باہر آیا۔ وہ ہر ایک آدمی سے بات چیت کرتا ہوا میرے پاس پہنچا۔

بٹالین حوالدار میجر سے پوچھنے لگا۔ کریم بیگ یہ لڑکا کون ہے۔

سر یہ نیا رنگروٹ ہے۔

یہ تو کم عمر ہے اور جسمانی طور پر بھی بہت کمزور ہے۔

تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ صوبیدار میجر نے مجھ سے پوچھا۔

جناب میں کیمبل پور کا رہنے والا ہوں۔

کچھ پڑھے ہوئے بھی ہو۔

جناب میں میٹرک تک پڑھا ہوں۔

پھر ادھر کیا لینے آئے ہو۔ اس نے درشتی سے کہا۔ اتنے پڑھے لکھے لڑکوں کی ہمیں فوج میں ضرورت نہیں ہے۔

جناب ضرورت نہیں ہے تو میں گھر واپس چلا جاؤں گا۔

زبان بند رکھو۔ پڑھے لکھے لوگوں کی یہی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ یاد رکھو۔ سینئر کے سامنے فوج میں بولنا منع ہے۔

جناب آپ نے مجھ سے جو کچھ پوچھا ہے میں نے اس کا جواب ہی دیا ہے۔ کوئی فالتو اور بیجا بات تو نہیں کی۔

خاموش رہو بدتمیز۔ صوبیدار میجر نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میرے سکواڈ کمانڈر کو بلا کر کہا۔ "راکھجا سنگھ کل اسے دفتر لے آؤ۔"

میں کمانڈنگ صاحب (کمانڈنٹ) سے کہہ کر کل ہی اسے ڈسچارج کروا دوں گا۔ ایسے زبان دراز لڑکوں کی وجہ سے دوسروں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ فوج میں دو چار جماعت پڑھا ہوا آدمی ہی کامیاب رہتا ہے۔ یہ پڑھاکو (تعلیم یافتہ) یہاں نہیں چل سکتے۔ ان کو آرڈر دو تو یہ بحث مباحثہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ فوج میں پڑھے ہوئے بالکل نہیں ہونے چاہئیں۔

سنٹرل رول کال ختم ہو گئی اور حوالدار راکھجا سنگھ مجھے واپس اپنی بیرک میں لے آیا۔ میں وہاں آیا تو میں نے سب رنگروٹوں کو اپنی وردی کی صفائی میں مصروف

پایا۔ اس زمانے میں بڑی بے ہودہ سی وردی ہوا کرتی تھی۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں گرم فلینل (فلالین) کی قمیص۔ جانگیہ اور بوٹ پٹی۔ گرمیوں میں بھی گرم پٹیاں گھٹنوں سے لے کر ٹخنوں تک باندھی جاتی تھیں۔ سر پر ایک نہایت ہی وزنی بدنما سی پگڑی۔ یہ پگڑی خاکی کلاہ پر تہ در تہ باندھی جاتی تھی۔ یہ پگڑی باندھنی بہت مشکل ہوتی تھی۔ پوری کمپنی میں کل دو چار آدمی ہی یہ پگڑی باندھ سکتے تھے۔

سب رنگروٹ اپنی اپنی وردی ٹھیک کر کے اپنے انچارج سے ملاحظہ کرواتے اگر اس میں کوئی کمی ہوتی تو وہ دوبارہ اس کی نوک پلک سنوارتے۔ رات دس بجے کے بگل کی آواز کے ساتھ سب رنگروٹ اپنے اپنے بستروں پر مچھر دانی کے اندر سو جاتے۔ کمرہ کمانڈر چیک کر کے بیرک کمانڈر کو "سب اچھا" کی رپورٹ دیتا اور پھر وہ کمپنی حوالدار میجر کو رپورٹ دیتا۔

اس روٹین کے مطابق ۲ نومبر ۱۹۳۷ء کا دن خرابیٔ بسیار کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ میں سوچتا میں نے پڑھنا ترک کر کے بہت ہی برا کیا ہے۔ میرے والد سچ ہی کہتے تھے کہ تم فوج میں نوکری نہیں کر سکو گے۔ فی الواقعہ فوج میں نوکری کرنا بہت مشکل تھا۔ میں سوچتا اب اگر کل مجھے فوج سے ڈسچارج کر دیا گیا تو گاؤں میں میرے والد بلکہ پورے خاندان کی بڑی سبکی ہوگی۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ اسی ادھیڑ بن میں میری آنکھ لگ گئی اور میں میٹھی نیند سو گیا۔ ابھی میں میٹھے اور سہانے سپنے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

"اٹھو چار بج گئے ہیں۔"

میں حیران ہو گیا کہ ابھی تو میں سویا ہوں۔ اتنی جلدی چار کیسے بج گئے ہیں۔ مجھے بھی کمرہ کمانڈر نے دوسرے رنگروٹوں کے ساتھ جگا دیا تھا حالانکہ میری قسمت کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ یہ سروس بے حد مشکل تھی۔ لیکن میں اسے محض بے عزتی کی وجہ سے نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ شیر محمد مجھے اپنے ساتھ رفع حاجت کے لیے لیٹرینوں میں لے گیا۔ ہر کمپنی کی الگ الگ لیٹرینیں تھیں۔ اس زمانے میں انڈین ریکس

کی بیرکوں ۔ لنگر خانوں اور لیٹرینوں میں بجلی نہ ہوا کرتی تھی ۔ بیس آدمی کے ایک کمرے میں دو لالٹین ہوتیں ۔ میں اور شیر محمد باہر نکلے تو ہر طرف اندھیرے کا راج تھا ۔ دُور دُور تک کہیں روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ جاتے ہوئے راستے میں شیر محمد نے مجھے سمجھایا کہ فوجی لیٹرینیں بہت گندی ہوتی ہیں ۔ ہمیشہ لیٹرین جاتے ہوئے ماچس ساتھ رکھا کرنا ۔ جب لیٹرین میں داخل ہونے لگو تو ماچس جلا کر روشنی کر لیا کریں ۔ شیر محمد کے پاس ماچس تھی ۔

لیٹرینوں کے باہر قطاریں لگی ہوئی تھیں ۔ وہاں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا ایک لیٹرین خالی ہوئی ، تو میں ماچس جلا کر اندر چلا گیا ۔ لیٹرین اتنی گندی تھی کہ بدبو کی وجہ سے مجھے متلی ہونے لگ گئی اور پھر مجھے قے شروع ہو گئی ۔ شیر محمد جلد فارغ ہو کر باہر آ گیا اور مجھے باہر ہی سے کہنے لگا ۔

اپنا منہ سر تولیے سے لپیٹ لو ورنہ یہ تعفن تمہیں نہ بیٹھنے دے گا

میں نے اپنا منہ اور سر لپیٹ لیا اور جلدی سے فارغ ہو کر باہر آ گیا ۔

یار شیر محمد ان لیٹرینوں کو صاف کوئی نہیں کرتا ۔

کرتے ہیں لیکن تین چار سو آدمیوں کے لیے یہ بیس لیٹرینیں ہیں ۔

ہم دونوں واپس بیرک میں آ گئے ۔ شیر محمد نے صابن اور تولیہ لیا اور مجھ سے کہنے لگا چلو بھئی نہانے کے لیے ۔

نیک بخت آدمی کل شام کو تو میں نہایا ہوں ۔ کیوں مجھے سردی سے مارتے ہو ۔ میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا ۔

بھئی یہاں تو دن میں دو بار ورنہ ایک دفعہ تو ضرور صابن سے نہانا پڑتا ہے ۔

یار شیر محمد یہ تو بہت مشکل ہے ۔

احمد تم مجھے یہ بتاؤ یہاں کوئی کام تمہیں آسان بھی نظر آتا ہے ۔

نہیں سرکار ۔ یہاں کا تو خدا ہی نرالا ہے ۔ میں سوچتا ہوں کہ اس ماحول میں میں کیسے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر سکوں گا ۔

مشکل ہی نظر آتا ہے۔ پڑھے ہوئے لڑکوں کو اسی لیے فوج میں بھرتی نہیں کرتے۔ چونکہ وہ اس طرح کی زندگی کو اپنا نہیں سکتے۔ اور آخر کار سزائیں کاٹتے کاٹتے کورٹ مارشل کروا کر سول جیل چلے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی فوج سے گلوخلاصی ہوتی ہے۔

لیکن شیر محمد اگر میں فوج میں رہ گیا اور مجھے آج ڈسچارج نہ کر دیا گیا تو آپ دیکھیں گے کہ میں کس طرح ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتا ہوں۔ اور کوشش کروں گا کہ ماحول کو سازگار بنا لوں۔

○

سب رنگروٹ جب پریڈ کے لیے چلے گئے تو مجھے حوالدار رانجھا سنگھ بٹالین آفس لے گیا۔ ابھی تک میرے سروس کے کاغذات وغیرہ نہ بنے تھے ڈاکٹری نہ ہوئی تھی۔ کٹ (KIT) وغیرہ اشو نہ ہوئی تھی۔ کبھی کسی رنگروٹ کے ساتھ ایسا سلوک روا نہ رکھا گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں جن رنگروٹوں کو ڈاکٹر ان فٹ (UN - FIT) کر دیتا ان کو فوراً ڈسچارج کر دیا جاتا۔ ایسا کبھی نہ ہوتا تھا کہ میڈیکل گراونڈز کے بغیر پہلے ہی دن کسی نئے رنگروٹ کو اَن فٹ قرار دے کر ڈسچارج کر دیا جائے۔

بٹالین آفس میں سٹاف پریڈ دس بجے ہوتی تھی۔ لیکن اس میں شرکت کے لیے آنے والے ساڑھے نو ہی پہنچ جاتے تھے۔ رانجھا سنگھ نے مجھے صوبیدار میجر کے دفتر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ سب لوگ فوجی وردی پہنے ہوئے تھے صرف میں ایک ایسا آدمی تھا جس نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حوالدار رانجھا سنگھ نے اندر جا کر بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ کو رپورٹ دی کہ میں اس نئے رنگروٹ کو لے آیا ہوں۔

لیکن صوبیدار میجر صاحب تو رات کو بیمار ہو گئے ہیں آج ڈیوٹی پر نہیں آئیں گے۔

کریم بیگ نے تحمل مزاجی سے جواب دیا۔
سر تو اسے میں واپس لے جاؤں۔
نہیں ٹھہریں۔ آج سٹاف پریڈ کروانے کے لیے صوبیدار گلاب خان صاحب آئیں گے۔ میں ان سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گا۔
بہت اچھا سر۔ اور رانجھا سنگھ وہاں کریم بیگ کے دفتر ہی میں بیٹھ گیا۔
میں برآمدے میں ملازموں کی طرح کھڑا تھا۔ اُدھر سے ہر گذرنے والا آدمی مجھے غور سے دیکھتا اور گذر جاتا۔ بٹالین آفس میں زیادہ گورے بطور کلرک کام کرتے تھے۔
ایک گورا میرے پاس سے گذرا تو یونہی گذرتے گذرتے بے ساختہ طور پر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
ہیلو جانی (HELLO JOHNNY) کیا حال ہے۔
نائس تھینک یو (NICE THANK YOU) ٹھیک ہوں۔ شکریہ
میں نے اس گورے کو فی البدیہہ جواب دیا۔
وہ گورا سارجنٹ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اور مجھ سے پوچھنے لگا۔
آپ کون ہیں۔
سر میں نیا رنگروٹ ہوں۔ کل ہی بھرتی ہو کر آیا ہوں۔
تم نے وردی کیوں نہیں پہنی۔
سر میں شام ہی کو آیا ہوں۔ ابھی وردی اشو نہیں ہوئی۔
یہاں کیوں آئے ہو۔
حسب دستور رات کو مجھے سنٹرل رول کال میں کمپنی والے لے گئے۔ وہاں صوبیدار میجر صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اسی وقت کہہ دیا کہ میں کل کرنل صاحب سے کہہ کر تمہیں ڈسچارج کروا دوں گا۔ فوج کو تمہارے جیسے پڑھے ہوئے

محبت بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے اچھے اور وفادار سپاہی ثابت ہوتے رہیں۔

او۔ نو " ہ ہا۔ ہ " سارجنٹ کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا اور وہ بجائے اپنے دفتر میں جانے کے ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے کے باہر بورڈ لگا ہوا تھا۔

کیپٹن۔ ڈی۔ ڈبلیو۔ آر۔ بیرج۔ ایڈجوٹنٹ۔

تھوڑی دیر میں وہ گورا سارجنٹ باہر آیا اور مجھے ساتھ لیکر اندر چلا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا ایک بہت ہی وجیہہ آدمی وردی پہنے ایک بڑی سی میز کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے سارجنٹ کو اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس انگریز نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن سارجنٹ نے اس سے کہا۔

سَر یہ لڑکا بہت اچھی انگریزی جانتا ہے۔ آپ بے شک اس کے ساتھ انگلش میں بات چیت کریں۔

تم انگریزی جانتے ہو۔ اس انگریز افسر نے مجھ سے پوچھا۔

سَر جانتا ہوں۔ مَیں نے انگریزی میں جواب دیا۔

تم مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ۔

مَیں نے اُس کو سنٹر میں پہنچنے سے لے کر اب تک کی پوری داستان نہایت شستہ انگریزی میں سنائی۔ جب مَیں نے اس کو بتایا کہ مَیں فوجی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد جنگ عظیم میں میسوپوٹیمیا اور فرانس کے محاذوں پر دادِ شجاعت دے چکے ہیں۔ اور ان کے پاس بہت سے میڈل بھی ہیں۔ تو وہ بہت متاثر ہوا۔ مَیں نے اس کو بتایا کہ کل شام کو مجھے آتے ہی حوالدار میجر میر باز خان نے محض اس بات پر مارا ہے کہ مَیں نے اس کو کہا تھا کہ میرے خوب صورت بال ہیں مَیں انہیں نہیں کٹوانا چاہتا۔ اور پھر رات کو صوبیدار میجر صاحب کو مَیں نے ان کی باتوں کا جواب

دیا۔ ان کو میرا لہجہ اور لا جک (LOGIC) پسند نہ آئی اور انہوں نے مجھے سختی سے جھڑک دیا اور کہنے لگے تم کو میں کل کرنل صاحب سے کہہ کر ڈسچارج کروا دوں گا۔ فوج میں اتنے پڑھے لکھے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے جو اپنے سے ہر سینئر کی بات کو دلائل دے کر ٹھکرانے کی کوشش کریں۔

تم نوکری کرنا چاہتے ہو یا ڈسچارج جانا چاہتے ہو۔ اس انگریز افسر نے مجھ سے پوچھا۔

سر۔ اگر میں ڈسچارج چلا گیا تو پورے علاقے میں میرے والد کی بہت بدنامی ہو گی۔ اگر آپ مجھے نوکری میں رکھ لیں تو میں محنت سے اور ایمانداری سے سروس کروں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ ان پنڈتوں کے ہر جائز حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔ وہ دونوں پنڈتوں کی اصطلاح پر ہنس پڑے۔ اس انگریز افسر نے گھنٹی بجائی تو سٹیک آرڈرلی جھٹ سے اندر آ گیا۔

صوبیدار میجر، ہیڈ کلرک اور بٹالین حوالدار میجر کو بلا کر لے آؤ۔ کیپٹن بیرج نے اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔ سٹیک آرڈرلی کے چلے جانے کے بعد اس نے سارجنٹ سے کہا۔

آپ اپنے دفتر میں جا کر کام کریں۔ میں اس لڑکے سے ڈیل (DEAL) کرتا کیپٹن بیرج صاحب نے مجھے ہدایت دی کہ جو کوئی بھی اندر آئے تم اٹھنا نہیں۔ بلکہ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی رہنا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں صاحبان اندر آ گئے اور انہوں نے کیپٹن صاحب کو فوجی انداز میں سیلوٹ کیا۔

کیپٹن صاحب نے صوبیدار گلاب خان صاحب سے پوچھا۔ صاحب صوبیدار میجر صاحب کہاں ہیں۔

جناب وہ آج بیمار ہیں۔

ان کی جگہ آپ سٹاف پریڈ کے لیے آئے ہیں۔

جناب عالی۔

کیپٹن صاحب نے صوبیدار گلاب خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
صاحب یہ کیمبل پور کا ضلع صوبہ پنجاب میں ہے۔
جی حضور! پنجاب میں ہے۔
اس ضلع میں اعوان زیادہ ہیں۔
جی جناب۔
کیا یہ اعوان مارشل قوم کے لوگ ہیں۔
جی جناب۔ پنجاب بھر میں یہ "اعلیٰ درجے کی مارشل ریس ہے"
آپ کیمبل پور کے ہیں۔
نہیں جناب عالی۔ میں ضلع راولپنڈی کا رہنے والا ہوں۔
اچھا۔ صاحب آپ یہ بتائیں یہ کیمبل پور کا سپاہی کیسا ہوتا ہے۔
جناب عالی۔ تلہ گنگ تحصیل کے اعوان اول نمبر کے سپاہی ہوتے ہیں۔
تلہ گنگ کی کوئی خاص بات ہے۔
جناب عالی! تلہ گنگ ہی قوم اعوان کا گڑھ ہے۔ اسے علاقہ "اعوان کاری" کہتے ہیں۔
ادھر ہی سے پھر اعوان دوسرے علاقوں میں گئے۔
اس لڑکے کو آپ جانتے ہیں۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہیں۔
نہیں جناب آج پہلی دفعہ اسے دیکھ رہا ہوں۔
پھر ایڈجوٹنٹ نے بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
ویل کریم بیگ آپ اس کو جانتے ہیں۔
جانتا ہوں حضور یہ نیا رنگروٹ ہے۔ نیا بھرتی ہو کر آیا۔ کل شام ہی کو سنٹر میں پہنچا ہے۔ رات کو سنٹرل رول کال میں آیا تھا۔
کیا بات ہوئی رات کو۔ سچ سچ بتاؤ
کریم بیگ نے گذشتہ رات سنٹرل رول کال میں پیش آنے والی سب روئیداد

سے کیپٹن صاحب کو آگاہ کیا۔

ایڈجوٹنٹ جب غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔ او۔ نو۔ یہ ڈسچارج نہیں جائے گا ہم کو پڑھے لکھے آدمیوں کی بھی ضرورت ہے۔

لیکن حضور یہ ڈسپلنگ (ڈسپلن) کے خلاف بات ہو گی۔ صوبیدار میجر صاحب نے جو بات کی ہے وہی ہونا چاہیئے۔

او۔ نو۔ صوبیدار صاب۔ صوبیدار میجر صاب سے ہم بات کرے گا۔ ہم کمانڈنٹ صاب کو بھی سب بات بولے گا۔

بہت اچھا حضور۔ لیکن ایک بات ہے حضور۔ اس جوان کو سیدھا آپ کے پاس نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ سٹاف پریڈ کے موقعہ پر اپنی عرض رپورٹ کر سکتا تھا۔

نہیں صوبیدار صاب یہ خود ہمارے پاس نہیں آیا۔ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں کھڑا ہوا ہے۔ ایک بات میں آپ سب کو بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جوان کو (انگریز سولجر کو جوان کہتے تھے۔) اس وجہ سے کوئی عہدیدار یا کوئی دوسرا با اختیار آدمی تنگ نہ کرے کہ یہ میرے پاس ڈائریکٹ آپ لوگوں کے خلاف شکایت لے کر آیا ہے۔ سب لوگوں کا برتاؤ اس کے ساتھ اچھا ہونا چاہیئے۔ یہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ ہم سب کو علم کی قدر کرنا چاہیئے۔

بہت اچھا حضور۔ میں صوبیدار میجر صاحب کو بھی یہ بات بتا دوں گا۔

ایڈجوٹنٹ نے ان سب کو اپنے دفتر سے باہر جانے کے لیے کہا۔ جب وہ چلے گئے تو وہ مجھ سے کہنے لگے۔ اب میرا خیال ہے۔ یہ سب مل کر بھی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ میں اپنے طور پر تمہارے روزمرہ کے حالات و واقعات کا پتہ کرتا رہوں گا۔ اب تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ میں کبھی کبھار خود تم سے پریڈ گراؤنڈ میں مل لیا کروں گا۔ تم بھی اپنے طور پر یہ کوشش کرنا کہ تمہاری طرف سے ڈسپلن کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو۔ اپنا کام محنت سے کرنا۔ اپنے سے سینئر

لوگوں کا حکم ماننا۔ آج کے بعد کوئی آدمی تمہارے ساتھ زیادتی نہ کر سکے گا۔ تم بھی اپنے آپ میں قوت برداشت پیدا کرنا۔ ملٹری ٹریننگ۔ (رنگروٹی) کے بعد میں تمہیں کلرک بنا دوں گا۔ اور پھر تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔" اچھا جاؤ۔"

میں نے ایڈجوٹنٹ کو سلام کیا اور اس کے دفتر سے باہر آگیا۔

باہر وہ سب قصائی میری تاک میں کھڑے ہوئے تھے۔ کریم بیگ نے حوالدار رانجھا سنگھ کو بلا کر کہا۔

رانجھا سنگھ اس لڑکے کو لے جاؤ۔ اس کی ڈاکٹری وغیرہ کراؤ۔ کٹ اور دوسرا ضروری سامان اسے اشوع کراؤ اور پھر سکواڈ میں اسے شامل کر لو۔ یہ ٹریننگ کرے گا۔

بہت اچھا۔ سر۔

رانجھا سنگھ مجھے اپنی بیرک میں واپس لے آیا۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ناشتہ وغیرہ سپاہیوں کو نہ ملا کرتا تھا۔ اس لیے دس بجے کھانا ملا کرتا تھا۔ اس زمانے سے اب تک میں نے فوج میں یہ دستور دیکھا ہے کہ دوپہر کے کھانے میں دال اور چپاتی اور شام گوشت روٹی ہوتی ہے۔

رانجھا سنگھ نے لنگر کمانڈر کو آواز دے کر کہا۔ اس لڑکے کو جلدی کھانا کھلا دو۔ اس نے مجھے لنگر کے سامنے برآمدے میں پڑے ہوئے میز اور بینچ جن پر سب سپاہی بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر باورچی حسین خان کو کہا۔

حسین خان اس لڑکے کو گرم گرم کھانا لا کر دو۔

بہت اچھا سر۔

میں کھانا کھا چکا تو حوالدار رانجھا سنگھ مجھے سنٹر کے ایم۔ آئی۔ روم ڈاکٹری کے لیے لے آیا۔ ڈاکٹر ہندوستانی تھا۔ وہ ابھی تک سنٹر کی سِک رپورٹ (SICK REPORT) دیکھ رہا تھا۔ اس سے فارغ ہوا تو حوالدار رانجھا سنگھ نے

اندر جاکر اس سے کچھ بات کی اور پھر ایک کمپاؤنڈر نے مجھے اندر بلالیا۔ اور کپڑے اتارنے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر نے میرا سرسری سا ڈاکٹری معائنہ کیا اور مجھے میڈیکلی فٹ کردیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو راستجبا سنگھ نے مجھے کمپنی دفتر لے آیا۔ وہاں میری میڈیکل فٹ نیس رپورٹ دی۔ اور مجھے حوالدار میجر کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔ وہاں حوالدار میجر میر باز خان تھا جس نے کل مجھے مارا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو میں کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے مجھ سے نہایت ہی شائستگی سے باتیں کیں۔ اور پھر کمپنی کے سردار صاحب (V.C.O) کو بتانے لگا۔

سر وہ رنگروٹ آ گیا ہے۔ جس کے متعلق ایڈجوٹینٹ صاحب نے کمپنی کمانڈر صاحب کو ٹیلی فون کیا ہے۔

اچھا اسے لے آؤ میرے پاس۔ کمپنی سردار نے جواباً کہا۔

حوالدار میجر مجھے اس کے سامنے لے گیا۔ وہ ایک سکھ سردار تھا۔ جو بڑی بارعب اور پر ہیبت شخصیت کا مالک تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

" بیٹا فوج میں شکایتیں کرنے والے آدمی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ "

سر میں نے تو کسی کی کوئی شکایت نہیں کی۔ میں نے بغیر کسی جھجک کے یہ جواب دیا۔

یہ بٹالین آفس میں آج کیا قصہ ہوا ہے۔

سر آپ یقین کریں میں نے کسی کی کوئی شکایت نہیں کی۔ اس انگریز صاحب نے وہاں سے گذرتے ہوئے خود ہی مجھ سے باتیں کرنا شروع کردیں اور پھر باتوں ہی باتوں میں اس پر ان سب باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔

وہ سکھ سردار مجھے انگریز کمپنی کمانڈر کے سامنے پیش کرنے کے لیے اندر لے گیا۔ اس انگریز افسر نے میرے ساتھ بڑی ہی مختصر سی گفتگو انگریزی زبان میں کی۔ اور پھر صوبیدار جوگندر سنگھ مجھے باہر لے آیا۔ اور کمپنی کلرک کو میرا سروس ریکارڈ تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس نے میرے کاغذات مکمل کرنے کے بعد مجھے جانے کے لیے

کہا۔ حوالدار میجر میر باز خان نے لانس نائیک شاہ محمد کو میرے ساتھ کوارٹر ماسٹر سٹورز میں بھیجا۔ وہاں سے مجھے سروس کٹ اشوع ہوئی۔ جسے میں نے کٹ بیگ میں پیک کر لیا اور اٹھا کر بیرک میں لے آیا۔ حوالدار رانجھا سنگھ نے میری پوری کٹ نکلوا کر ایک ایک آئیٹم چیک کی اور تسلی ہو جانے پر مجھے کہا کہ کٹ اپنے کٹ بکس میں بند کر کے تالا لگا دو۔

رانجھا سنگھ نے شاہ محمد کو کہا کہ کھیلوں کے پیریڈ میں اس لڑکے کو وردی پہننے کا طریقہ بتانا اور پھر اس کی پریکٹس کروانا۔

فوج میں صبح پریڈ پر جانے سے پہلے ہر سپاہی ایک مخصوص فوجی انداز میں اپنی چارپائی پر اپنا فوجی بستر مثلاً کمبل۔ مچھر دانی اور دری وغیرہ کو لے آؤٹ (LAY OUT) کرتے ہیں۔

شاہ محمد مجھے اپنے ساتھ بیرک میں لے آیا۔ ہمارے سکواڈ میں آدھے مسلمان تھے اور آدھے سکھ۔ ابھی سکواڈ مکمل نہ ہوا تھا۔ ایک سکواڈ میں کم از کم پچیس تیس رنگروٹ ہوتے تھے۔ شاہ محمد نے میری کٹ نکلوائی اور ہر آئیٹم کا عمومی استعمال مجھے بتایا۔ شاہ محمد نے مجھے وردی پہننے کے لیے کہا۔ اس نے ایک گرم قمیص ایک نیکر (جانگیہ) بنیان، گرم جرابیں۔ بوٹ اینکل (بڑے بوٹ) اور پگڑی نکال کر الگ کر لی۔ باقی کٹ بند کرنے کے لیے کہا۔

شاہ محمد کی ہدایت پر میں نے وردی پہن لی۔ اچھا بھلا آدمی بھی اگر وہ وردی پہن لیتا تو اس کی شخصیت عجیب مضحکہ خیز دکھائی دیتی۔ پتلی پتلی سی ٹانگیں۔ دبلا پتلا جسم۔ جانگیہ گھٹنوں سے نیچے تک۔ اس گرم قمیص میں میرے جیسے دو آدمیوں کے سما جانے کی گنجائش تھی۔ نہایت ہی بے تکے اور وزنی بوٹ۔ سر پر پگڑی اتنی بوجھل کہ مستقل طور پر سر کو اٹھا کر رکھنا تقریباً ناممکن۔ اس پگڑی کو قاعدے قانون کے مطابق باندھنا سب سے مشکل تربیتی مرحلہ۔ یہ پگڑی ہر کوئی نہ باندھ سکتا تھا۔ سنٹر میں گنے چنے آدمی تھے جو یونیفارم کی یہ پگڑی کلاہ پر باندھتے تھے۔ پگڑی کے

ساتھ کورکلر کی جھالر بھی لگتی تھی۔

میں سوچنے لگا پھر اگلا مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل۔ نہ جانے ان مشکلات کی انتہا کہاں جاکر ہو گی۔ میں نے اب دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں یہ ملازمت خود نہ چھوڑوں گا۔

جب شاہ محمد مجھے تین چار بار وردی پہنانے کی مشق کروا چکا تو اس نے کہا کہ کل تم یہی وردی پہن کر سکاڈ کے ساتھ گراؤنڈ میں جاؤ۔ پھر پرسوں تمہاری وردی ٹیلر سے فٹ ہو کر آ جائے گی وہ پہن لینا اور اسے فٹنگ کے لیے دے دینا۔

۵

دوسرے دن ریوالی ہونے پر چار بجے میں بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیدار ہوا۔ سنٹر کے قیام کے مشکل ترین اور ناقابل برداشت مرحلے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے تاریکی میں ڈوبی ہوئی، متعفن لیٹرینوں سے ابتدا کرتے ہیں۔ جن سے وہاں کے رہنے والوں کو مفر نہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی کے نل رچاہے گرمیاں ہو یا سردیاں) سے غسل کرنا۔ نہانے کے بعد اپنا بیڈ ٹھیک کرنا۔ اور آخر میں وردی پہن کر باہر فالن ہونے کے لیے تیار کھڑا رہنا۔ صبح چار بجے سے رات کے دس بجے تک ایک منٹ کی بھی فرصت نصیب نہ تھی۔ کولہو کے بیل کی طرح دن بھر جتے رہو۔

جب پریڈ بینڈ کی دھن پر پریڈ گراؤنڈ کی طرف مارچ کرتی۔ تو نئے رنگروٹ جن کو ان کے ساتھ مارچ کرنا نہ آتا تھا پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اور نہایت بے ہودہ اور مضحکہ خیز انداز میں بازو ہلاتے ہوئے پرانے رنگروٹوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جاتے۔

گراؤنڈ میں روزمرہ کے دستور کے مطابق پریڈ فالن ہوتی اور سکاڈ کمانڈر

بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ کو اپنی اپنی رپورٹ دیتے اور پھر وہ جمعدار ایڈجوٹنٹ کرم الٰہی صاحب کو پلٹ کر سب پریڈ کو اٹن شن کر کے رپورٹ دیتے - وہ دونوں مل کر ہر کاد کا باری باری معائنہ کرتے اور پھر کیپٹن بیرج صاحب (ایڈجوٹنٹ) کی آمد کے لیے چشم براہ ہو جاتے - ایڈجوٹنٹ دُور سفید گھوڑے پر سوار کھڑا بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا اور پھر مقررہ وقت پر پریڈ گراؤنڈ میں آ جاتا - جمعدار ایڈجوٹنٹ ان کو رپورٹ دیتے -

" جناب عالی ! پریڈ آپ کے ملاحظے کے لیے تیار ہے - "

ایڈجوٹنٹ گھوڑے پر سوار ہو کر تمام سکاوڈز کا ملاحظہ کرتے اور پھر واپس اپنی جگہ پر جا کر زور دار آواز میں کہتے -

" پریڈ مارچ آف "

اس کے ساتھ ہی رنگروٹوں کی سکھلائی شروع ہو جاتی - یہ روز کا معمول تھا - سکواڈ کمانڈر نئے آنے والے رنگروٹوں کو اپنے جونیئر عہدیداروں کے حوالے کر دیتے جو ان کو لے کر گراؤنڈ کے دوسرے سرے پر پہنچ جاتے اور نئے آنے والے رنگروٹوں کو ڈرل کی تربیت دینے میں مصروف ہو جاتے -

لیفٹ - رائٹ - ہالٹ - کوئیک مارچ - اباوٹ ٹرن کی رٹ دن بھر سنتے رہتے - نئے رنگروٹوں کے لیے سب سے مشکل کام آپس میں قدم ملا کر چلنا تھا - لیکن مسلسل مشق سے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا - اور ہم تقریباً دو ہفتے میں اس قابل ہو گئے کہ پرانے رنگروٹوں کے ساتھ بینڈ کی دلنواز دھنوں پر مارچ کر سکیں -

رنگروٹوں کے لیے چھ ماہ کی ملٹری ٹریننگ ہوتی ہے - اس میں ڈرل - پی ٹی ہتھیاروں کی سکھلائی اور ان سے فائرنگ کرنا شامل تھا - دو گھنٹے کی ٹریننگ کے بعد ہمیں ساڑھے دس بجے گراؤنڈ سے واپس لے آتے اور پھر گیارہ بجے ایجوکیشنل سکول میں پڑھائی کے لیے لے جاتے - جب سنٹر سکول میں ہماری کلاسیں شروع ہوئیں تو دوسرے سب رنگروٹوں سے میرا تعلیمی معیار بہتر تھا - اس لیے میں اب

ان میں بزعم خود چودہری بن بیٹھا۔

آرمی ایجوکیشنل کی کلاسیں، رومن اُردو۔ انگلش اور میپ ریڈنگ کے لیے ایک بجے تک ہوتیں۔ ساڑھے دس بجے پریڈ گراؤنڈ سے واپس آکر کھانا کھاتے اور پھر گیارہ بجے سکول پہنچ جاتے۔ سب رنگروٹ کو دن میں ایک دفعہ ایک پاؤنڈ دودھ روزانہ ملا کرتا تھا۔ جس کے لیے ہر ماہ ہماری تنخواہ سے پانچ کاٹ لیے جاتے تھے۔

کھانا اچھا ہوتا تھا۔ لڑکے ورزش کرتے تھے۔ روزانہ دودھ پیتے تھے اس لیے پانچ چھ ماہ ہی میں ان کی صحت اچھی ہو جاتی تھی۔

○

چھ ماہ گزر گئے اور ہم سب نے رنگروٹی پاس کر لی۔ اس کے بعد اب ٹیکنیکل ٹریننگ شروع ہونا تھا۔ اس زمانے میں انڈین رنگروں کو اوپریٹر ڈزیول (شیشہ/جھنڈی کا کام) اور لائن مین وغیرہ بنایا کرتے تھے۔ وائرلیس اوپریٹر اور دوسرا ٹیکنیکل کام گورے کرتے تھے۔

رنگروٹی پاس کرنے کے بعد حسب وعدہ ایڈجوٹنٹ کیپٹن بیرج صاحب نے مجھے کلرک بنا دیا۔ اور میری پوسٹنگ "بی" کمپنی کے دفتر میں ہو گئی۔

اس زمانے میں فوجی لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف علاقائی تعصب بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ایک ضلع کا آدمی دوسرے ضلع کے آدمیوں کو پسند نہ کرتا تھا۔ ہر آدمی چاہتا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں (گرائیوں) کے ساتھ رہے۔ انڈین سگنل کور میں جو پچاس فیصدی پنجابی مسلمان تھے۔ وہ زیادہ تر راولپنڈی۔ جہلم اور گجرات کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ اگرچہ دوسرے اضلاع کے لوگ بھی ہوتے تھے لیکن قلیل تعداد میں۔ ہمارے پنجابی مسلمان سردار (وائسرائے کمیشنڈ آفیسر) زیادہ تر ان تینوں اضلاع کے ہی ہوتے تھے۔ میں جب "بی" کمپنی میں پوسٹ ہو کر گیا تو وہاں

سیڈ کلرک راولپنڈی کے ایک صاحب تھے۔ میری پوسٹنگ کو انہوں نے قطعاً ناپسند فرمایا۔ وہ مجھے کام سکھانے میں بغض سے کام لیتے۔ شروع میں مجھے ڈسپیچ کلرک لگا دیا۔ میں سارا دن ڈاک وصول کرتا اور باہر ڈسپیچ کرتا رہتا۔ اگر کبھی میں نے اُن سے کسی کام کے متعلق پوچھنا چاہا۔ تو اول تو وہ سیدھے منہ بات نہ کرتے اور اگر میں زیادہ منت سماجت کرتا تو مصروفیت کا بہانہ کرکے مجھے ٹال دیتے۔ اس طرح میری کوئی کلیریکل ٹریننگ نہ ہو سکی اور میں اسی طرح دن کاٹتا رہا۔ ایک سال کے بعد امتحان ہونا تھا۔ وہ امتحان جب تک اس پروفیشن میں شامل ہونے والا آدمی پاس نہ کرتا۔ اسے بطور کلرک کنفرم نہ کرتے تھے۔ میں نے ابھی تک وہ امتحان پاس نہ کیا تھا۔ اس لیے کنفرم نہ ہوا تھا۔

۵

ایک دن شام کو میں صدر بازار گیا۔ وہاں ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ میں نے سُنا کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس جو اس وقت آل انڈین کانگرس کے صدر تھے کل جبل پور شہر کی سٹی گراؤنڈ میں عوام سے خطاب کریں گے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ میں نے سبھاش چندر بوس کا نام لالہ سُندر لعل جی ہیڈ ماسٹر اینگلو ورنیکلر مڈل سکول لاوہ سے سُن رکھا تھا۔ لالہ جی ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہی ایک آدمی ہے جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکتا ہے۔ میں نے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے نیتاجی کی تقریر کے متعلق سُنا تو میں نے دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ میں اُن کی یہ تقریر سننے کے لیے ضرور جاؤں گا۔ میں نے ان آدمیوں سے جلسے کے صحیح وقت کا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ جلسہ کل شام کو ہوگا۔ میں اپنی بیرک میں واپس آ گیا۔ میں دل ہی دل میں بے حد خوش تھا کہ کل میں نیتاجی کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ اُن کی پُرمغز باتیں سنوں گا۔ اس وقت تک مجھے اس بات کا پتہ نہ تھا کہ فوجی لوگوں کو اس طرح کے سیاسی جلسوں میں

شرکت نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ایسا کرنا ڈسپلن کی سراسر خلاف ورزی ہے۔

اس سے پہلے میں ایک دفعہ اپنے سکواڈ کے لڑکوں کے ساتھ حوالدار رانجھا سنگھ کی کمان میں شہر کچھ سامان خریدنے گیا تھا۔ صرف اتنا پتہ تھا کہ صدر بازار سے آگے ریلوے پل سے گذر کر آگے جبل پور کا شہر آتا تھا۔ میں نے سی گراؤنڈ نہ دیکھی تھی۔ میں سوچنے لگا یہ کون سی مشکل بات ہے۔ شہر پہنچ گیا تو سی گراؤنڈ کا بھی پتہ چل جائے گا میں نے واپس آ کر کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے دن دفتر سے واپس آ کر میں نے وردی اُتاری اور پرائیویٹ کپڑے پہن لیے۔ ایک دو ساتھیوں نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے۔ لیکن میں نے ان کو ٹال دیا۔ میں موقعہ کی تاڑ میں لگا رہا۔ جونہی حالات سازگار دیکھے۔ لائنوں سے نکل کر صدر بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ فوج کا یہ دستور ہے کہ پاس (اجازت نامہ) کے بغیر کوئی فوجی اپنی یونٹ لائینز سے باہر نہیں جا سکتا اور خاص کر سویلین آبادی کا رُخ تو بالکل نہیں کر سکتا۔

چار بجے شام کھیلیں ہوتی تھیں۔ میں چونکہ کلرک تھا اس لیے دفتر جانے کا بہانہ بنا کر اکثر کھیلوں پہ نہ جاتا تھا۔ اس ضمن میں کبھی کسی نے باز پرس نہ کی۔

صدر بازار ہمارے سنٹر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ شہر جانے کے لیے تانگہ صدر بازار سے ملتا تھا۔ میں صدر سے شہر جانے کے لیے ایک تانگے پر سوار ہو گیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھے ہوئے ایک مقامی آدمی سے پوچھا۔

بھیا! یہ سی گراؤنڈ شہر میں کس جگہ واقع ہے۔

حجور۔ یہ ریل کے پل سے تھوڑے آگے جا کر سڑک کے باجو (بازو) میں ہے۔

اس نے یہ باتیں کرتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا جیسے وہ کوئی پولیس آفیسر ہو اور میں مشتبہ ملزم ہوں۔ اس نے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بنڈل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیں حجور بیڑی پئیں۔"

نہیں بھیا۔ شکریہ۔ میں تمباکو نہیں پیتا۔

حجور آپ کانگرس کے جلسے میں شرکت کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔

ہاں بھیا۔ مَیں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

حجور۔ کیا آپ سرکار بہادر کی فوج میں ملازم ہیں۔

جی ہاں۔

حجور۔ فوجی لوگوں کو تو کانگرس کے جلسوں میں جانے کی اجازت نہیں۔

کیوں بھیا۔

اس لیے بابو کہ کانگرس والے انگریزوں کو ہندوستان سے جبردستی (زبردستی) نکالنے کی باتیں کرتے ہیں۔ سرکار بہادر ایک دم اُن کے خلاف ہے۔

بھیا مجھے کون جانتا ہے مَیں ایک کونے میں کھڑا ہو کر نیتاجی کی باتیں سنوں گا اور پھر واپس آ جاؤں گا۔

نہ بابو نہ۔ ایسا مت کرنا۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے اور آرمی انٹیلی جینس والے وہاں ہوں گے۔ ایک ایک آدمی ان کی نظر میں ہوتا ہے۔

بھیا۔ میرے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوا کہ مَیں فوجی ہوں۔ مَیں نے تیقن آمیز لہجے میں کہا۔

لکھا ہوا ہے حجور۔ فوجی آدمی ہزاروں کے مجمعے میں بھی پہچانا جاتا ہے۔

کیوں بھیا۔ فوجیوں کو اس طرح کے جلسوں میں کیوں نہیں جانے دیتے۔

اس لیے حجور کہ فوجی لوگ ان سیاسی لوگوں کی باتیں سُن سُن کر ان کے دل و دماغ میں بھی بغاوت کے جذبات و خیالات جنم نہ لے لیں۔ اور وہ سرکار کے خلاف نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

اب تو بھیا مَیں آ گیا ہوں۔ واپس نہیں جا سکتا۔

سرکار۔ آپ کی مرضی۔ عمر میں بڑا ہونے کے ناطے میں اپنا یہ فرض سمجھتا تھا کہ آپ کو نیک و بد بتا دوں۔ آگے اس پر عمل درآمد کرنا آپ کا کام ہے۔

شکریہ بھیا۔ اور پھر تانگہ سی گراؤنڈ کے قریب پہنچ گیا۔

سی گراؤنڈ میں انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا۔ ہر

طرف ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سامنے ایک نہایت ہی شاندار پنڈال بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ ابھی جلسہ شروع ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں پنڈال کے قریب ایک دری پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے پہلی دفعہ کسی سیاسی جماعت کا جلسہ دیکھا تھا۔ پنڈال خوب سجا ہوا تھا۔ پولیس بڑی تعداد میں جلسہ گاہ میں متعین تھی۔ بینڈ والے خوبصورت وردی پہنے اپنے ڈھول تاشے اُٹھائے کھڑے تھے۔

انتظامیہ نے اعلان کیا۔ حاضرین! نیتاجی بس اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں سے گذارش ہے کہ جب وہ جلسہ گاہ میں داخل ہوں تو آپ اُن کے استقبال کے لیے اپنی اپنی جگہوں پر اُٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر تشریف لائیں گے۔ ہر آدمی کو اپنی اپنی جگہ پر وہ واضح طور پر نظر آ ہوئے گے اور پھر بینڈ کی مسحور کن دھنیں شروع ہو گئیں۔ اب لوگوں کی نگاہیں سڑک کی جانب لگی ہوئی رہتیں۔

نیتاجی کی سواری آ رہی تھی۔ گھوڑ سواروں کا ایک دستہ ان کی سواری کے آگے آگے چلا آ رہا تھا۔ جونہی ان کی سواری جلسہ گاہ کے قریب پہنچی لوگ اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ایک عجیب سے جوش و خروش سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ میں نے پہلی دفعہ ہاتھی کو یوں آزاد دیکھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے ایک دفعہ ایک ہاتھی کو میانوالی کے مقام پر ایک سرکس کمپنی میں پابہ جولاں دیکھا تھا۔ وہ ہاتھی اپنے مالکوں کے اشارے پر مختلف قسم کے کرتب دکھاتا تھا۔

ہاتھی کی سواری کی ایک الگ ہی شان تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے اکبر اعظم اپنے مصاحبین کے جلو میں شاہی دربار میں آ رہا ہے۔ نیتاجی بھی اکبر اعظم سے کچھ کم نہ تھے۔ اکبر نے ایک وسیع و عریض ملک پر حکومت کی تھی۔ نیتاجی ایک بے تاج بادشاہ کروڑوں بھوکے ننگے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے۔

نیتا جی ہاتھی سے اُتر کر سٹیج پر آئے تو کافی دیر تک جلسہ گاہ تالیوں اور پُرعقیدت نعروں سے گونجتی رہی۔ لاؤڈ سپیکر پر حاضرین سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنی اپنی نشستوں پر اطمینان سے بیٹھ جائیں اور اس عظیم رہنما کی بصیرت افروز باتیں سنیں۔ میں نے چاروں طرف مجمعے پر نظر دوڑائی مجھے کوئی بھی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ ابھی نیتا جی کی تقریر شروع نہ ہوئی تھی کہ میں نے پولیس والوں کے ساتھ سگنل ٹریننگ سنٹر کی رجمنٹل پولیس کے حوالدار نواب خان کو سویلین ڈریس میں جلسہ گاہ کی طرف آتا ہوا دیکھا۔ سنٹر میں حوالدار نواب خان کی شہرت اچھی نہ تھی۔ یہ بڑا ہی سخت اور ظالم آدمی تھا۔ یہ ایک ٹانگ سے معمولی سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس لیے سنٹر میں سب لوگ اس کو نواب لنگڑا کہتے تھے۔ وہ اگر کسی آدمی کو معمولی سے جرم میں بھی پکڑ لیتا تو ہرگز نہ بخشتا تھا۔ چارج شیٹ تک نوبت ضرور پہنچتی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا تو میں نے دل میں سوچا یہ اتنے آدمیوں میں مجھے کہاں پہچان سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں اطمینان سے سر نیچے کیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کانگرس کے والنٹیر جو جلسہ گاہ میں انتظامی امور پر متعین تھا آدمیوں کو پھلانگتا ہوا میرے پاس آ پہنچا۔ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے نواب لنگڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

بابو آپ کو وہ مونچھوں والا آدمی جو پولیس والوں کے ساتھ کھڑا ہے بُلا رہا ہے۔

نیتا جی کی تقریر سُن کر اس کے پاس جاؤں گا۔ میں نے بجھے تلے انداز میں اس سے کہا۔

والنٹیر واپس چلا گیا اور اُسے جا کر بتایا۔ وہ پولیس والوں کی معیت میں وہاں ہی کھڑا رہا۔ میں نے ایک نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا تو اُس نے اشاروں ہی اشاروں میں مجھ سے کہا۔

سیدھی طرح آجاؤ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے تحقیر آمیز نظروں سے ضرور دیکھا۔ نیتا جی کی تقریر شروع ہوگئی۔ انہوں نے تاریخی حوالوں سے انگریزوں کی ہندوستان میں آمد۔ تجارتی سفر اور پھر اپنی ریشہ دوانیوں سے ہندوستان پر قبضہ کرنے تک کا سب پس منظر بڑی وضاحت سے حاضرین کو بتایا۔ انہوں نے کہا یہ سب کچھ ہمارے باہمی نفاق کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ وہ بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔

ساتھیو! آپ لوگ زیادہ سے زیادہ کانگریس کے جھنڈے تلے جمع ہوں۔ یہی ایک سیاسی جماعت ہے جو ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا سکتی ہے۔ اگر ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو جائیں تو انگریز بہادر کو ہمیں سوراج (آزادی) دینا ہی پڑے گا۔ یہ دیش ہمارا ہے۔ اس ملک کے مالک ہم ہیں۔ اس ملک میں پیدا ہونے والا سونا یہ لٹیرے یہ غاصب ہم سے چھین کر ولایت لے جاتے ہیں اور ہمارے بچے بھوک سے بلک بلک کر مر جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے خون پسینے کی کمائی تو ہمارے بچوں کے کام آئے۔ یہ ظالم اور ڈاکو تو ہمارے ان معصوم بچوں کے منہ سے آخری نوالہ بھی چھین لیتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب ان مکاروں اور حیلہ بازوں کا جادو زیادہ دیر تک نہ چل سکے گا۔ دنیا میں جو ایک اضطراب اور ہیجانی کیفیت ہے میں سمجھتا ہوں اب ان کو جلد یا بدیر ہندوستان سے نکلنا ہی پڑے گا۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ ایکتا اور بھائی چارے کے ذریعے اپنے آپ کو متحد اور مضبوط بنائیں۔ اور یک جان ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔

نیتا جی ایک بڑے جوشیلے اور شعلہ بیاں مقرر تھے۔ سامعین ان کی تقریر سے مسحور ہو کر خاموشی سے ان کی بصیرت افروز باتیں سنتے رہے تھے۔ نواب لنگڑا ایک ماہر شکاری کی طرح میری تاک میں کھڑا تھا کہ جونہی جلسہ ختم ہو تو وہ مجھے دبوچ لے میں نے بھی دل میں ٹھان لی تھی کہ جونہی جلسہ ختم ہوا میں انسانوں کے اس انبوہ کثیر

میں مل جاؤں گا۔ پھر نواب لنگڑے کے فرشتے بھی مجھے نہ پکڑ سکیں گے

## ۵

جلسہ ختم ہو گیا اور حاضرین کا ایک جم غفیر سٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ نیتاجی کو قریب سے دیکھے۔ میں ان آدمیوں سے پہلو بچاتا ہوا سڑک کی طرف نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے تب پتہ چلا کہ مجھے پولیس کے دو سپاہیوں نے روک کر بازو سے پکڑ لیا اور پھر انہوں نے نواب لنگڑے کو جو دور کھڑا تھا اشارہ کیا اور وہ فوراً وہاں پہنچ گیا۔ نواب خان بڑا تنومند اور قوی ہیکل جوان تھا۔ مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے ایک ایسا زور کا جھٹکا مارا کہ میں گرتے گرتے بچا۔ اس کے اس معاندانہ رویے سے مجھے غصہ آ گیا۔

خبردار نواب خان۔ اگر ایسی بے ہودہ حرکت کی تو میں بُرا پیش آؤں گا۔ میں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

خوب۔ چور اُلٹا کوتوال کو ڈانٹے۔ اس نے مجھے کان سے پکڑ کر دھمکاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے کان چھڑاتے ہوئے اسے ایک زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے پولیس والوں کو آواز دی۔ وہ مسلسل سیٹیاں بجائے جا رہے تھے۔ میں بھاگ کر وہاں سے نکل گیا۔ سڑک کی بجائے میں ایک پگڈنڈی سے ہوتا ہوا صدر بازار کی جانب جا رہا تھا۔ جب میں ایپا تھیٹر کے قریب سے بڑی سڑک پر پہنچا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا حوالدار نواب خان ایک ملٹری پولیس والے گورے سارجنٹ کے پیچھے اس کے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا میرے قریب آ کر رکا۔

نواب خان نے اس سارجنٹ کو کہا۔ سر یہ ہے وہ بدمعاش سپاہی۔

گورے سارجنٹ نے ایک بڑے ہی تحکمانہ انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔ یُو کالا آدمی۔"

میں سڑک سے اُتر کر نیچے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کے موٹر سائیکل موڑنے اور سٹارٹ کرنے تک میں جبل پور کے صدر بازار رہائشی علاقے میں دوڑ کر جا چھپا۔ وہاں دو تین گلیوں میں اُلٹا سیدھا مڑنے کے بعد میں ایک ویران سے محلے میں جا پہنچا۔ اب مجھے یقین تھا کہ گورا سارجنٹ اور نواب لنگڑا مجھے تلاش نہ کر سکیں گے۔ وہاں میں تھوڑی دیر تک تنگ و تاریک گلیوں میں پھرتا رہا۔ مرد باہر کام پر گئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی اکا دکا مرد نظر آ جاتا۔ زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی اس وقت وہاں موجود تھی۔ میں جب مسلسل کچھ دیر کے لیے ان گلیوں میں پھرتا رہا تو محلے کی بڑی بوڑھیوں نے دروازوں سے جھانکتے ہوئے مجھے شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک بڑی بی نے تیوریاں کی بوچھار میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

بابو تو بھی پھیرا اِدھر کا ہے کو گھومت ہے۔

اماں میں راستہ بھول گیا ہوں۔

نہ بھیا یہ بات نہ مانت ہوں۔ کان کھول کر سُن لو۔ یہ سریف (شریف) لوگوں کا محلہ ہے۔ اِدھر چھوکری دوکری نہ ملت ہے۔

اماں! میں چھوکری کی تلاش میں نہیں آیا۔ آپ یقین جانیں کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔

تم کدھر کو جاوت ہو۔

اماں میں نے چھاؤنی کی طرف جانا ہے۔

نہ بھیا تُمری بات کا یقین نہ آوت ہے۔ یہ چھاؤنی والا خان لوگ تو جب بھی اِدھر کو آوت ہیں۔ لونڈیا کی تلاش میں آوت ہیں۔

اماں آپ مجھے چھاؤنی جانے کا راستہ ہی بتا دیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔

ہاں بٹیا سیدھے ہاتھ چلے جاؤ۔ یہ باجو (بازو) ہی میں تو سڑک ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے گلی کا موڑ کاٹا تو مجھے سڑک سامنے دکھائی دی۔ اب ہلکا ہلکا سا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں تھوڑی دیر میں اپنی بیرکس میں پہنچ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب تک لنگر بھی بند ہو چکا ہوگا اور مجھے کہیں سے کھانا بھی نہ مل سکے گا میں کسی ساتھی سے یہ کہہ کر بھی تو نہیں آیا تھا کہ وہ میرے لیے کھانا لے کر رکھ لے۔ فوج کے نچلے طبقے کا طریقۂ کار ہے کہ اگر کوئی ساتھی آگے پیچھے کام پر یا کسی ڈیوٹی پر گیا ہوتا تو اس کے ساتھی اس کے لیے لنگر سے کھانا لے کر رکھ لیتے ہیں۔ اور اگر گرمیوں کے دن ہوں تو اس کی چارپائی باہر نکال کر اس پر بستر اور مچھر دانی لگا دیتے ہیں۔ صدر سے ہماری بیرکس کچھ زیادہ دور نہ تھیں۔ میں تیز رفتاری سے چلتا ہوا جب اپنی بیرک میں پہنچا تو ابھی اکا دکا سپاہی کھانا کھا کر لنگر کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنی کٹ بکس سے پلیٹ اور مگ نکالا اور لنگر کا رخ کیا۔ وہاں مجھے کوئی ہل چل نہ نظر آئی۔ حالات جوں کے توں تھے۔ میرا خیال تھا کہ میری غیر حاضری کا اگر حوالدار میجر کو پتہ ہوتا تو میرے ساتھی اس کے متعلق بتا دیتے۔ میں نے اطمینان سے کھانا لیا اور ٹیبل پر بیٹھا کھا رہا تھا کہ نواب لنگڑا ہمارے حوالدار میجر اور بیرک کے انچارج کو لے کر وہاں آ گیا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئے۔

نواب لنگڑے نے حوالدار میجر کو کہا۔

سر۔ بالکل سو فیصدی یہی لڑکا تھا۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

تم نے اسے وہاں ہی موقعہ پر کیوں قابو نہیں کیا۔ حوالدار میجر نے نواب لنگڑے کو سرزنش کے انداز میں کہا۔

قابو تو کر لیتا لیکن یہ بہت ہوشیار لڑکا ہے۔ مجھے دیکھ کر فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔

اس بات کی گواہی کون دے گا۔

بریگیڈ ملٹری پولیس کا سارجنٹ فلر۔

سارجنٹ فلر کہاں تھا۔ حوالدار میجر نے استفسار بھرے لہجے میں پوچھا۔

جہاں کانگرس کے صدر نے تقریر کی اس سے تھوڑی دور ہٹ کر وہ گورے

سپاہیوں کو لیے کھڑا تھا۔

بابو بات سنو۔ حوالدار میجر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ (فوج میں کلرک کو بابو کہتے ہیں۔)

سر میں کھانا کھالوں۔ حاضر ہوتا ہوں۔

ہاں۔ ہاں۔ آرام سے کھالو۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔

نواب لنگڑے کو حوالدار میجر کا یہ معاندانہ رویہ پسند نہ آیا۔ حوالدار میجر نے جو بات چیت کی تھی۔ حوالدار نواب خان کے لیے وہ کوئی حوصلہ افزا نہ تھی۔ وہ دل برداشتہ ہو کر واپس چلا گیا۔ حوالدار میجر نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رکا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد حوالدار میجر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اپنے ایمان سے سچ سچ بات بتاؤ۔ "تم کہاں گئے ہوئے تھے۔"

سر میں کچھ دیکھنے شہر گیا تھا۔ سٹی گراؤنڈ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ میں نے وہاں ایک انبوہِ کثیر دیکھا۔ میں سمجھا شاید سرکس کا کوئی تماشہ وغیرہ ہو رہا ہے۔ میں بھی اُدھر کو مڑ گیا۔ وہاں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس وہاں تقریر کرنے والے ہیں۔ چنانچہ میں وہاں رک گیا اور پھر جلد ہی نیتاجی بھی وہاں آگئے۔ اور میں ان کی تقریر سننے کے لیے وہاں ٹھہر گیا۔

یہ تو بہت برا ہوا بابو۔ ایسی بات ہے تو تمہیں جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم صاف انکار کر دو۔ اور اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں تو کہیں بھی نہیں گیا۔

سر میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں۔ اب جو بھی نتائج ہوں گے ان کو بسر و چشم بھگتوں گا۔

یار بابو۔ ہمیں بھی تو ساتھ مروائے گا۔ ہم نے تمہیں گیمز پریڈ اور رول کال پر غیر حاضر ظاہر نہیں کیا۔ میں بھی تمہارے ساتھ اتنا ہی قصور وار ہوں۔

میں نے کھانے سے فارغ ہو کر اپنی پلیٹ دھوئی اور پھر اپنی بیرک کی طرف چلا گیا۔

اپنا بستر ٹھیک کیا اور پھر کینٹین پر ریڈیو سننے کے لیے چلا گیا۔ اس زمانے میں کسی آدمی کے پاس ریڈیو نہ ہوتا تھا۔ پوری یونٹ میں انڈین ریکس کے لیے ایک ریڈیو یونٹ کینٹین پر رکھا ہوا ہوتا تھا جو ایک عہدے دار کی تحویل میں ہوتا جو اسے تالا لگا کر رکھتا۔ ایک مقررہ ریڈیو سٹیشن کے علاوہ اور کوئی دوسرا اسٹیشن سننے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یوں تو کینٹین، سانگ رام اینڈ کمپنی کی ملکیت تھی۔ لیکن یہاں مینجر ہمارے قریب کے ایک گاؤں موضع ڈھیر مونڈ کے لالہ ہربنس جی تھے۔ ان کے ساتھ ان کا ایک عزیز شانتی سروپ جو تھوہا محرم خان کا رہنے والا تھا کام کرتا تھا۔ میں فرصت کے اوقات میں کینٹین پر ریڈیو سنتا یا ان دونوں کے ساتھ گپ شپ لگایا کرتا تھا۔ لالہ ہربنس لعل نہایت ہی شریف النفس اور ہمدرد انسان تھا۔ لالہ جی عمر میں مجھ سے خاصے بڑے تھے۔ البتہ شانتی سروپ کچھ زیادہ عمر کا نہ تھا۔ اکثر کوتاہیوں اور غلطیوں پر لالہ جی مجھے سمجھاتے رہتے تھے۔ لیکن یہ لڑکپن کا زمانہ کوئی خاص سود و زیاں کا قائل نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے دل و دماغ دونوں میں سے دل ہی کو راہنما بناتا ہے اور سوچ اور عقل و دانش کو آئندہ پر اٹھا رکھتا ہے۔ میں بیٹھا شانتی سروپ کے ساتھ ونده اور تھوہا کی باتیں کر رہا تھا کہ رجمنٹل پولیس کا ایک سپاہی آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

بابو جی آپ کو حوالدار نواب خان بلا رہا ہے۔

کہاں ہے۔ نوابا۔

دی۔ سی۔ اوز (V.C.O.S) کلب کے پاس کھڑا ہے۔

اور وہاں کون ہے۔

بٹالین حوالدار میجر کریم اور صوبیدار میجر صاحب کھڑے ہیں۔ وہ آپ ہی کی باتیں کر رہے ہیں۔

میرا کمپنی حوالدار میجر بھی وہاں موجود ہے۔

جی نہیں۔ لیکن اس کی طرف بھی انہوں نے ایک آدمی کو بھیجا ہے کہ وہ بھی جلدی آئے۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔ جب وہ آجائے تو نوابے کو کہنا کہ اگر مجھے بلانا ہے تو میرے

کمپنی حوالدار میجر کی معرفت بلواؤ۔ میں ڈائریکٹ تمہارا حکم نہیں مانتا۔

او چھوڑو بالو جی۔ حالات مزید خراب ہو جائیں گے۔ پہلے ہی حوالدار نواب خان نے صوبیدار میجر صاحب کو آپ کی پوری رام کہانی سنائی ہے۔ صوبیدار میجر صاحب بڑے غصے میں ہیں۔ اگر اب میں نے آپ کی کہی ہوئی بات جوں کی توں ان کو جا کر بتادی تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔

بے شک تم جا کر ان کو اسی طرح بتا دو۔ نواب کو بتا دینا کہ میں ادھر ہی بیٹھا ہوں اور تمہارا انتظار کروں گا۔ میں اپنے سردار صاحب یا حوالدار میجر کے حکم کے بغیر کسی کا بھی حکم نہیں مانوں گا۔

وہ سپاہی شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا۔ لالہ ہربنس لعل مجھ سے تھوڑا ہی دور کاؤنٹر پر بیٹھا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

اس طرح تو نوکری کرنا آپ کے لیے مشکل ہو گا۔ یہ آپ کے طور طریقے تو آپ کو ایک انجام بد کی طرف لے جا رہے ہیں۔ فوج میں رہتے ہوئے یہ کوئی طریقہ ہے جو آپ نے اپنا رکھا ہے۔ صوبیدار میجر صاحب کا نام سن کر اچھے اچھے منہ زور عہدداروں اور سپاہیوں کو پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور ایک تم ہو کر جیسے دندہ شاہ بلاول کے کسی کمین کے متعلق باتیں کر رہے ہو۔ ملک صاحب یہ طریقہ غلط ہے۔ مجھے اگلے دن صوبیدار میجر صاحب نے کسی کام سے کلب میں شام کو بلوایا۔ وہ صوبیدار گلاب خان صاحب اور جندوڈا شاہ صاحب سے تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جب یہ لڑکا بھرتی ہو کر سنٹر میں پہنچا تو اس نے آتے ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے فوراً ہی نوکری سے بارہ پتھر (ڈسمس) کرا دوں گا۔ لیکن اتفاق سے میں بیمار ہو کر ہسپتال چلا گیا۔ اور پھر کیپٹن بیرج صاحب نے اس کو رکھ لیا۔ انہوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس لڑکے کا باپ اور بیرج صاحب کا باپ دونوں اٹھائیس نمبر رسالے میں اکٹھے تھے۔ اگر اس لڑکے کے باپ نے جنرل صاحب (بیرج صاحب کے باپ) کو خط لکھ دیا اور سب صورتِ حال سے ان کو

آگاہ کر دیا تو پھر بہت بُرا ہو گا۔ بیرج صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس لڑکے کے متعلق کمانڈنٹ کرنل پولارڈ سے بات کروں گا۔ میں اس لیے خاموش ہو گیا۔ لیکن اب اس کی رپورٹیں اچھی نہیں مل رہیں۔ اس کا رویہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔

لالہ ہربنس لعل نے مجھے سرزنش کے انداز میں کہا۔ آرام سے اپنی نوکری کرو۔ اب تو بیرج صاحب بھی لونگ کورس پر ولایت چلے گئے ہیں اور اب اگر صوبیدار میجر صاحب نے کمانڈنٹ کو تمہاری ان نئی کارستانیوں کے متعلق بتا دیا تو تمہاری شامت آجائے گی۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمارا کمپنی حوالدار میجر مجھے بلانے کے لیے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ وی۔ سی۔ اوز کلب (V.C.O.S CLUB) لے گیا۔ باہر برآمدے میں بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ صوبیدار میجر نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسرے نائب سردار صاحبان کلب کے اندر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں چند صاحبان تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ نواب لنگڑا اور رجمنٹل پولیس کے سپاہی دور لان میں ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اوئے لڑکے تم انسان نہیں بنتے۔ صوبیدار میجر نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

انسان نہیں ہوں تو اور کیا ہوں۔

صوبیدار میجر نے میرے تیور بدلے ہوئے دیکھے تو نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

تم آج کہاں گئے تھے۔

حوالدار نواب خان نے آپ کو پوری بات بتا دی ہوئی ہے۔ میں مزید کیا وضاحت کروں۔

نہیں میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔
میں شام کو پکچر دیکھنے شہر گیا۔ راستے میں لوگوں کا ہجوم دیکھا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی کھیل تماشہ ہو رہا ہے۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آل انڈیا کانگرس کا جلسہ ہو رہا ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں کانگرس کے صدر نیتا جی سبھاس چندر بوس اس اجتماع سے خطاب کریں گے۔ میں نے سکول میں اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب سے نیتا جی کی بہت تعریفیں سن رکھی تھیں۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور دل میں عہد کیا کہ آج نیتا جی کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا باتیں تو شاید ان کی میری سمجھ سے بالاتر ہوں۔ بہر حال اس شوق کے پیش نظر میں وہاں بیٹھ گیا۔ اور پھر نیتا جی شہنشاہوں کی طرح ایک سجے ہوئے ہاتھی پر سوار ہو کر جلسہ گاہ میں آئے۔ ان کی تقریر تو مکمل طور پر میری سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن ان کو دیکھنے کی آرزو پوری ہو گئی۔ حوالدار نواب خان اس بھرے مجمعے میں مجھے پکڑ کر رسوا کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی گرفت سے تو بچ گیا لیکن آپ کی گرفت سے نہ بچ سکا۔

تو باتیں بہت کرتا ہے۔ صوبیدار میجر نے طنزیہ انداز میں کہا۔
جناب میں نے اپنے ما فی الضمیر کا اظہار کر دیا ہے۔ میں اپنے دل کی آواز کو دبا کر نہیں رکھ سکتا۔
تمہارے لیے فوج کی نوکری مشکل ہو گی۔ صوبیدار میجر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
جناب مشکل کیوں ہو گی میں سپاہی پیشہ خاندان کا فرد ہوں۔ پشت ہا پشت سے یہی ہمارا پیشہ ہے۔
کس کی اجازت سے تم شہر گئے تھے۔
کسی کی بھی نہیں۔ میں اپنے طور پر گیا تھا۔
تمہیں پتہ ہے یہ جرم ہے۔

جناب جرم ہے تو جرم کی سزا مل جائے گی۔

میرا خیال ہے کرنل صاحب تمہیں سول جیل بھیج دیں گے۔

آپ پہلے ہی سے میری قسمت کا فیصلہ نہ کریں۔ اگر انہوں نے مجھے جیل بھیجا تو میرے والد صاحب ملک المعظم کو خط لکھ کر ضرور داد رسی چاہیں گے۔

تمہارے والد کا ملک المعظم سے کیا تعلق ہے۔

میرے والد حکومت برطانیہ کے لیے جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر لڑے ہیں اور انہوں نے دو گیلینٹری ایوارڈ حاصل کر رکھے ہیں۔ وہ تمغے حکومت برطانیہ نے میرے والد کو بلیوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے نہیں دیے۔

فضول باتیں مت کرو۔ اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا اور پھر بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر اسے کہا۔ اس لڑکے کو فوراً کلوز اریسٹ CLOSE ARREST کر دو۔ اور اسے فوراً کوارٹر گارڈ جا کر بند کرو۔

بہت اچھا سر۔ کریم بیگ نے تابعداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

# ۵

بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ مجھے بازو سے پکڑ کر کوارٹر گارڈ کی طرف چل پڑا۔ کلب سے باہر آئے تو میں نے ایک ہی جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور پھر کریم بیگ نہایت ہی لجاجت آمیز لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔

بیٹا خدا کے لیے بھاگنا نہیں۔ میری سروس کا سوال ہے۔

بزدل آدمی بھاگتے ہیں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ہرگز نہ بھاگوں گا۔ میری بات سے وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور ہم کوارٹر گارڈ پہنچ گئے۔ کریم بیگ نے کوارٹر گارڈ کے گارڈ کمانڈر کو کہہ کر ایک سیل (CELL) (کال کوٹھڑی) کھلوایا اور مجھے اندر بند کر دیا۔ اور پھر گارڈ روم میں بیٹھ کر ضروری کاغذات کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے کا وقت ہو گا۔ جب نیم سرکاری

مہمان بن کر وہاں آیا۔ میں نے کریم بیگ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔
میجر میرے بستر کا انتظام بھی جلدی کریں۔
ہاں بھیا۔ میں تمہارے حوالدار میجر سے کہتا ہوں۔ فوراً بندوبست ہو جائیگا۔
جناب آپ دوسرے آدمی پر ذمہ داری نہ ڈالیں۔ بہتر ہے آپ صوبیدار میجر کو میرا پیغام دیں کہ میرے لیے بستر کا فوری انتظام کرے۔
نہیں احمد بیٹا ایسی فضول باتیں نہیں کرتے۔ صوبیدار میجر صاحب بزرگ آدمی ہیں۔
ہوں گے۔ لیکن خود ان کو اپنی بزرگی کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ان کا ہر فیصلہ تعصب کی عینک کی مدد سے صادر ہوتا ہے۔ صوبیدار میجر یہ نہیں چاہتا کہ ضلع راولپنڈی کے بغیر اور کسی ضلع کا کوئی پنجابی مسلمان سگنل کور میں بھرتی ہو کر آئے۔ یہ کور شاید ان کی جاگیر ہے اور ہم دوسرے اضلاع کے لوگ جیسے ان کے کمین اور معین ہیں۔ اگر وہ چاہیں گے تو ہم نوکری کر سکیں گے اور اگر وہ نہ چاہیں تو ہمیں بارہ پتھر (ڈسمس) کرکے گھر بھیج دیا جائے گا۔
بیٹا حوصلے سے کام لو۔ میں بھی صوبیدار میجر صاحب سے بات کروں گا۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔
بٹالین حوالدار میجر مجھے بہلا کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا کمرہ کمانڈر ایک مسکین سے سپاہی سے میرا بستر اٹھوا کر اور کچھ سامان خود اٹھائے ہوئے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ پہلے سیدھا کوارٹر گارڈ میں گارڈ کمانڈر کے پاس گیا۔ میرا سب سامان کھول کر چیک کروایا۔ اور پھر میرے حوالے کرنے کے لیے سیلوں (CELLS) کی طرف آیا۔ اس نے میرے سل کے قریب آکر مجھے آواز دی۔
بابوجی آپ کا بستر اور دوسرا سامان لے آیا ہوں۔ کہاں ہو۔ آواز دو۔
ارے بھئی برکت علی ادھر آؤ۔ میں نے آواز دے کر اس کی راہنمائی کی۔
اس نے سیل کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ میرا سامان رکھ دیا اور کہنے لگا۔

احمد صاحب کیا حال ہے۔

ٹھیک برکت علی جی۔

یہ ہر روز تم کوئی نہ کوئی بلا اپنے گلے ڈال لیتے ہو۔

خود بخود پڑ جاتی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اس طرح کے حالات سے ہر آئے دن مجھے دو چار نہ ہونا پڑے۔ لیکن کیا کروں ہر بار کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی ہے۔ مجبوری ہے کیا کروں۔

بابا اس صوبیدار میجر سے تم نے کیوں مقابلے کی ٹھان لی ہے۔ یہ بڑا ہی طاقتور آدمی ہے۔ کرنل کمانڈنٹ اس کی مرضی کے بغیر سنٹر میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ بس آپ سمجھ لیں کہ سنٹر میں اس کا حکم چلتا ہے۔ آپ یقین کریں میں نے کرنل صاحب کو کئی دفعہ اس کے گھر آتے ہوئے دیکھا ہے۔ ورنہ کہاں یہ برٹش آفیسرز اور کہاں ہم کالے لوگ۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ اس نے شبہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ہرگز طاقتور نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے ہی اسے سر پہ اٹھا رکھا ہے۔ ایک دفعہ جب ہم اسے نفرت سے پیٹھ دیں گے تو یہ بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔ بھائی برکت علی میں آپ کو بتاؤں۔ بڑے آدمی سے لوگ اس کی برائی کی طاقت کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ اب انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

اچھا بھیا مجھے اجازت دیں۔ برکت نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے آپ جائیں لیکن اس سکھڑے (سکھ) گارڈ کمانڈر کو کہیں کہ وہ بے وقوف میرا سیل کھولے تاکہ میں اپنا سامان اندر رکھ لوں۔

ہاں احمد صاحب یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اور پھر وہ کوارٹر گارڈ کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد حوالدار بلونت سنگھ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے میرے سیل کا تالا کھولا اور پھر برکت علی اور اس کے ساتھ آئے سپاہی نے میرا بستر اور دوسرا سامان اٹھا کر اندر رکھ دیا۔ حوالدار بلونت سنگھ نے سیل کا تالا لگا دیا اور پھر وہ سب واپس کوارٹر

گارڈ کی طرف چلے گئے۔

میرے ساتھ کے سیلوں میں اور بھی قیدی تھے۔ لیکن وہ بے چارے حالات، واقعات کے ہاتھوں مجبور اپنی کشتیِ حیات کے پتوار چھوڑ کر اسے حوادث کے سپرد کر چکے تھے۔ میں نے اپنا سامان درست کیا۔ اس میں پہننے کی وردی۔ بستر اور بار چنگ، آرڈر وغیرہ تھا میں بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ برکت علی میری رضائی اور تکیہ نہ لایا تھا۔ بلکہ اضافی فوجی کمبل جو ہر فوجی کو سردیوں میں اشو ہوتے ہیں، لے کر آیا تھا۔ یہ کمبل بڑے کھردرے ہوتے ہیں۔ جس آدمی کو ان میں سونے کی عادت نہ ہو وہ لاکھ سر پٹکے اُسے نیند نہیں آئے گی۔ میں نے تکیے کی جگہ کپڑے رکھ کر اور ان پر تولیہ ڈال کر تکیہ بنا لیا۔ سردی کی شدت کے باعث میں نے دو کمبل اوڑھ لیے۔ سیل کے دو دروازے ہوتے ہیں۔ لوہے کے مضبوط سلاخوں والا دروازہ مقفل رہتا ہے۔ دوسرا باہر کی طرف کھلا رہتا ہے۔ اگرچہ میں نے دو کمبل اوڑھ لیے تھے لیکن سردی کی شدت میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں لیٹے لیٹے اپنی گذشتہ زندگی پر نظر دوڑانے لگ گیا۔ میں سوچنے لگا میری زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ میں سکون کی تلاش میں گھپ اندھیرں میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقعہ میرا کورٹ مارشل کر دیا گیا اور سول جیل بھیج دیا گیا اور میری ملازمت ختم کر دی گئی تو میرے والد صاحب کیا کہیں گے۔ میں نہ کہتا تھا کہ فوج کی نوکری تم نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا ہی جان جوکھوں کا کام ہے۔ میں نے زندگی کے کسی مرحلے پر بھی تو کوئی سیدھا کام نہیں کیا۔ چھوٹا تھا تو سکول باقاعدگی سے نہ جاتا تھا۔ شرارتیں کرتا تھا۔ روز کسی نہ کسی لڑکے کو مارتا تھا۔ مڈل سکول لاوہ میں داخلہ لیا تو سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ میانوالی ہائی سکول میں گیا تو تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس گاؤں آ گیا۔ والد صاحب نے قرآن کریم پڑھنے کے لیے درس میں چھوڑا تو محترم محمد خان صاحب سے پہلے ہی دن لڑ کر واپس آ گیا۔ گھر میں تھا تو کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بے چارے بوڑھے باپ کو کھیتوں کے کام کاج میں بھی کوئی مدد نہ دیتا تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ لڑ پڑا، وہ

بال بچے دار آدمی تھا۔ میری زیادتی پر بجائے اس کے کہ مجھے مارتا اُلٹا زار و قطار رونے لگ پڑا۔ والد صاحب نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے میرے بھائی سے کہا۔

تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اسے مارتے کیوں نہیں۔ کتنی بدتمیزی کی ہے اس نے۔

ابا۔ مار کیسے سکتا ہوں۔ چھوٹا بچہ ہے بڑا ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گا۔

اور مجھ سے ہزار ہا میل دور میرا شفیق باپ، رحمدل بھائی اور پیار کرنے والی بہن اور بیوی میرے حالات سے بے خبر نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہوں گے میں نے ملازمت کر لی ہے تو اب شاید سلجھ گیا ہوں گا۔ لیکن ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ میں اُسی طرح تند خو اور بد مزاج ہوں اور کسی کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ساتھ والے سیل سے مجھے متواتر سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اوئے پنڈت کیوں رو رہا ہے۔ میں نے اُسے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔

بابو جی بس نیند نہیں آ رہی۔ کل میری پیشی ہے۔ سوچتا ہوں نہ جانے کیا حشر ہوگا۔

حشر کیا ہوگا۔ پھانسی دے دیں گے تمہیں۔ میں نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

بابو جی! آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

مذاق کی بات نہیں حضور پنڈت جی۔ سیکشن حوالدار کے ساتھ جھگڑا کرنا کوئی معمولی بات ہے۔ بیٹا گھبراؤ نہیں چند دن کی (۲۰۰) لائن قید ہو جائے گی۔ پھانسی تمہیں نہیں چڑھائیں گے۔

آپ کے خیال میں مجھے کتنی سزا ہوگی۔

او یار! کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھو۔

سنتری نے ہمیں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

رات کا ایک بج چکا ہے۔ ابھی تک تم لوگ باتیں کر رہے ہو۔ سو جاؤ خاموشی سے

اوسکھ طرے جاؤ دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے۔ سنتری نے جب میری آواز سنی تو خاموشی سے کوارٹر گارڈ کی طرف واپس چلا گیا۔

پنڈت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بابو صاحب کہیں گارڈ کمانڈر بھی ہماری چارج شیٹ نہ بنا دے۔

کس جرم کی پاداش میں

کہ ہم نے سنتری کے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔

مہاراج آپ اطمینان رکھیں کچھ نہیں ہو گا۔

اور پھر ہم تھوڑی دیر میں میٹھی نیند سو گئے۔ صبح ریوالی ہونے پر سنتری نے سب قیدیوں کو جگا دیا۔ ان سیلوں کے ساتھ ملحقہ لیٹرینیں تھیں یہ یونٹ لائنز کی طرح گندی نہیں تھیں۔ قیدی بھی کچھ زیادہ نہ تھے۔ مجھے ملا کر کل چھ آدمی تھے۔ ان میں ہم تین آدمیوں کو اٹھائیس اٹھائیس دن قید سخت ملی تھی۔ شاید ان سب میں ایک آدمی ایسا تھا جو اپنے انجام کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ دل میں سوچتا جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ کڑھنے اور غم کھانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد حوالدار بلونت سنگھ (گارڈ کمانڈر) آیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ آج فلاں فلاں جوان کو دس بجے بٹالین آفس پیشی کے لیے جانا ہے۔ اس لیے تیاری کر لیں۔ ساڑھے نو بجے تمہیں بٹالین آفس لے جانے کے لیے متعلقہ سٹاف آ جائے گا اس نے ہدایت کی کہ صاف ستھری اور اچھی وردی پہن کر پیشی کے لیے جانا۔ میں نے سنی ان سنی کر دی اور بدستور اپنے کمبل میں لیٹا رہا۔ سنٹر میں بیشتر لوگوں کو میرے متعلق پوری معلومات تھیں سب لوگ میری تندخوئی اور بدمزاجی سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس لیے کوئی چھوٹا موٹا عہدیدار مجھ سے سختی کے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے۔ "بھئی اس سے اپنی عزت بچاؤ"۔ اس نے بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ جیسے پوری سگنل کور میں ٹیرر۔ TER-ROR کہے ہیں اور صوبیدار میجر جس کے آگے نیچے والے رینکس تو کجا سردار صاحبان

(وائسرائے کمیشنڈ آفیسرز) بھی دم نہیں مار سکتے۔ اس بابو (کلرک) سے تو وہ بھی اس لب و لہجے میں بات نہیں کرتے جس میں وہ ہما و شما سے کرتے ہیں۔

میں نے آٹھ بجے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور اپنے بستر پر فوجی دستور کے مطابق کٹ لے آؤٹ کر دی اور پھر آہستہ آہستہ وردی پہننے کی تیاری کرنے لگا۔ نو بجے کے قریب ہمارا کمپنی سردار اور حوالدار میجر گارڈ کمانڈر کے ہمراہ سیلوں کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جب نزدیک آگئے تو حوالدار بلونت سنگھ نے آگے بڑھ کر میرے سیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سر کلرک احمد اس سیل میں ہے۔

صوبیدار لوہے کے جنگلے کے پاس آکر بڑے ہی تحکمانہ انداز میں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے۔"

گارڈ کمانڈر نے ساڑھے نو بجے کا وقت بتایا تھا۔ میں اس وقت تک تیار ہو جاؤں گا۔

اب تک کیا کرتے رہے ہو

سویا رہا ہوں۔

یہ سونے کی جگہ ہے۔

سونے کی جگہ نہیں تو کیا یہ پھانسی کی کوٹھڑی ہے۔

کیسی باتیں کرتے ہو۔

مجھے تو اسی طرح کی باتیں آتی ہیں۔

اس لیے تمہارا یہ حشر ہوا ہے۔

بڑے آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے والے ہر آدمی کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

چھوڑیں سر اس کو۔ حوالدار میجر نے بیچ بچاؤ کروانے کے انداز میں کہا۔ اور پھر وہ

سب پلٹ کر واپس چلے گئے۔

کوارٹر گارڈ کے سنتری نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا تو نواب لنگڑا رجمنٹل پولیس کے تین سپاہیوں کو ساتھ لیے سیلوں کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ ان کے پیچھے پیچھے حوالدار بلونت سنگھ تھا۔ اس نے آکر میرے سیل کا دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا کہ بالو جی باہر آجائیں۔ حوالدار نواب خان آپ کو بٹالین آفس لے جانے کے لیے آیا ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے بستر سے اٹھ کر پگڑی سر پر رکھی اور سیل سے باہر آگیا۔ ان میں سے کسی آدمی نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ ایک پولیس والا آگے اور ایک میرے پیچھے مارچ کرنے۔ نواب لنگڑے نے مجھے کئی کاشن دیے۔ قدم ملا کر چلنے کی ہدایت کی لیکن میں جان بوجھ کر ڈھیٹ بنے ان کے درمیان میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان کے ساتھ چلتا رہا۔ نواب لنگڑے نے دو ایک دفعہ دبے دبے الفاظ میں مجھ سے کہا۔

"یار خدا کے لیے میری بے عزتی مت کروانا۔"

میں نے اس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے مجھے بٹالین آفس کے برآمدے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ سٹاف پریڈ کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں ایڈجوٹینٹ کے دفتر کے باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ صوبیدار کٹی کرشنا نائر اپنے دفتر سے باہر نکلے تو انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر میرے پاس آگئے۔

اس زمانے میں پوری انڈین سگنل کور میں ایک ہیڈ کلرک، وائسرائے کمیشنڈ آفیسر ہوتا تھا جو سنٹر میں پوسٹ ہوتا تھا۔ باقی تمام فیلڈ یونٹوں میں ہیڈ کلرک حوالدار ہی ہوا کرتے تھے۔ کٹی کرشنا نائر صاحب مدراسی تھے۔ نہایت قابل اور شریف النفس انسان تھے۔ اپنے ماتحت کلرکوں کی بڑی اچھی طرح سے دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ میرے قریب آکر مجھ سے پوچھنے لگے۔

کیوں احمد کیا ہو گیا ہے۔ پھر کوئی دنگا مار دھنگڑا فساد کر دیا تم نے۔

نہیں سر! میں شہر پکچر دیکھنے گیا تھا۔ وہاں راستے میں میں نے آدمیوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی تماشہ ہو رہا ہے۔ میں بھی وہاں چلا گیا وہاں جا کر پتہ چلا کہ آل انڈیا کانگرس کا جلسہ ہونے والا ہے اور ابھی تھوڑی ہی دیر میں نیتاجی سبھاش چندر بوس جلسے سے خطاب کرنے والے ہیں۔ میں نے نیتاجی کا نام بچپن ہی سے سن رکھا تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب تو نیتاجی کو ہندوستان کا نجات دہندہ کہتے تھے۔ آتش شوق بھڑک اٹھی۔ میں نیتاجی کو دیکھنے اور بصیرت افروز باتیں سننے کے لیے وہاں رُک گیا۔ جب جلسہ شروع ہوا تو تھوڑی دیر کے بعد لزاب لنگر ٹلو ہاں آ پہنچا اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس جرم کی پاداش میں اب گرفتار ہو کر یہاں لایا گیا ہوں۔ رات کو صوبیدار میجر نے جب یہ سنا تو بہت جوش ہوا اور کہنے لگا۔ پھنے خاں بنا پھرتا تھا۔ اب بچ کر کیسے جا سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے رات ہی کو انہوں نے کلوز ارلیسٹ کر کے کوارٹر گارڈ بند کر دیا اور اب کرنل صاحب کے پاس پیشی کے لیے لے آئے ہیں۔

سر بات یہ ہے کہ ہماری قسمتوں کے فیصلے قانون کے مطابق ہونے چاہئیں نہ کہ صوبیدار میجر کی مرضی کے مطابق۔ اس نے رات ہی کو مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں سول جیل بھیج کر دم لوں گا۔

احمد! بیٹا بات یہ ہے کہ بیرج صاحب لونگ کورس پر ولایت چلے گئے ہوئے ہیں۔ کرنل پولارڈ کو تو جو کچھ صوبیدار میجر صاحب کہتے ہیں وہ ویسے ہی کرتے ہیں۔ میں کیپٹن پامر نے ایڈ جوٹنٹ سے جا کر اسے سب صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ ویسے پہلے دن جب تم بھرتی ہو کر آئے تھے اس رات بھی تمہاری صوبیدار میجر کے ساتھ کچھ تلخ کلامی ہوئی تھی۔ صوبیدار میجر تو اس موقعہ پر ہی تمہیں فوج سے ڈسمس کروا کر گھر بھجوانا چاہتا تھا۔ لیکن بیرج صاحب نے اس معاملے کو رفع دفع کروا دیا اور تمہیں نوکری کرنے کی اجازت مل گئی۔ بیرج صاحب نے مجھے اس دن بتایا تھا۔

کہ آپ کے والد صاحب اٹھائیس منبر کیولری میں تھے۔ اور جنگ عظیم میں میسوپوٹیمیا اور فرانس میں دادِ شجاعت کے عوض ان کو گیلنٹری ایوارڈز (GALLANTRY AWARDS) ملے تھے۔ بیرج صاحب کے فادر اس وقت اس رسالے کی کمانڈ کر رہے تھے جو بعد میں جنرل بن کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ بیرج صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر جنرل صاحب یعنی ان کے والد کو احمد کے والد نے خط لکھ کر یہ سب رام کہانی بتا دی تو ہم سب کے لیے بہت برا ہوگا۔ اس وجہ سے کرنل صاحب سے کہہ کر بیرج صاحب نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ پر اب تو بیرج صاحب بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔

بیرج صاحب نہیں ہیں تو کیا۔ اللہ پاک کی ذات تو ہے۔ وہی ہر ذی نفس کو اپنی حفظ و امان میں رکھتا ہے۔۔۔۔۔ سر ایک بات آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ کلرک ہونے کے ناطے آپ ہی ہمارے انچارج ہیں۔

ہاں ہاں کہو بیٹا۔ بلا جھجک کہو۔

سر بات یہ ہے کہ اگر کسی نے میرے ساتھ ذرہ برابر بھی زیادتی کی تو میں والد صاحب کو خط لکھوں گا کہ وہ بیرج صاحب کے والد یعنی جنرل صاحب کو وار آفس لنڈن کے توسط خط لکھ کر ان کو سب حالات سے آگاہ کریں اور ساتھ ہی ملک معظم کو بھی خط لکھیں اور ان کو بتائیں کہ ہم لوگوں نے سلطنت برطانیہ کے استحکام اور بقا کی خاطر کوت العمارہ کے مورچوں میں جب محصور ہو گئے تھے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر خچروں کا گوشت کھا کر دشمن کا مقابلہ کیا تھا اور جرمن اور ترک فوجوں کو پسپائی پر مجبور کیا تھا۔ آج ہمارے بچے ہماری جگہ فوج میں شامل ہوئے ہوئے ہیں تو انہیں علاقائی تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے بچے دوسروں کے بچوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ پھر ان پر یہ نام نہاد فوجی پنڈت اپنے علاقے کے آدمیوں کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ کیا ہمارے بعد ہمارے بچوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہمارے بعد وہ اپنے علاقے اور قبیلے کی نمائندگی کریں۔

میری یہ کڑوی کسیلی باتیں سُن کر کُنی صاحب پامر صاحب کے دفتر میں چلے گئے۔ وہ کافی دیر تک اندر ان کے پاس رہے۔ اتنے میں بٹالین حوالدار میجر اور صوبیدار میجر اپنے دفتر سے نکل کر برآمدے میں میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ صوبیدار میجر نے میرے ڈریس پر ایک نظر ڈالی اور کریم بیگ سے کہنے لگا

میجر اس کا تو ڈریس اچھا نہیں ہے۔

بس سر گذارا ہے۔ رات کو اسے کلوز ارلیسٹ کر دیا تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں نئے اور اچھے ڈریس کا انتظام نہ ہو سکتا تھا

کُنی صاحب باہر صاحب کے دفتر سے باہر نکلے تو صوبیدار میجر نے ان سے پوچھا ہیڈ کلرک صاحب اس جوان کی چارج شیٹ تیار ہے

سر۔ ایڈجوٹنٹ کے پاس ہے۔

صوبیدار میجر ایڈجوٹنٹ کے دفتر میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں پامر صاحب باہر آئے۔ اس نے مجھ سے چند باتیں پوچھیں اور پھر کمانڈنٹ کو رپورٹ دینے کے لیے ان کے دفتر میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کرنل کے دفتر کا دروازہ کھولا اور صوبیدار میجر کو آرڈر دیا۔

"کیس مارچ اِن"

بٹالین حوالدار میجر مجھے مارچ کر کے اندر کرنل کے دفتر میں لے گیا۔ ایک بڑی سی میز کے سامنے کرنل پولارڈ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دراز قد اور بڑا ہی بارعب آدمی تھا۔ ہم ہندوستانی اسے دیکھتے تو ویسے ہی ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی

کرنل نے چارج شیٹ سے میرا آرمی نمبر۔ رینک اور نام پڑھا اور پھر مجھ سے پوچھا۔

"جوان تمہارے یہ کوائف صحیح ہیں۔"

صحیح ہیں سر۔

پھر کرنل نے مجھے چارج شیٹ پڑھ کر سنائی۔ چارج یہ تھا۔

تم نے کل مورخہ ــــــ چار بجے شام آل انڈیا کانگرس کے جلسے میں شرکت کی جو فوجی ڈسپلن اور قانون کے سراسر منافی ہے۔ یونٹ لائنز سے بغیر اجازت کے غیر حاضر رہے اور جلسے کے شرکا کے ساتھ سرکار انگلشیہ کے خلاف نعرے لگائے اور نفرت بھرے جذبات کا اظہار کیا۔ آر۔ پی حوالدار نواب خان نے جب جلسے سے باہر تمہیں بلایا تو تم نے آنے سے انکار کر دیا۔ نیز حوالدار نواب خان جو کہ ایک سینئر عہدیدار ہے کے حکم کی سراسر خلاف ورزی کی جو مروجہ فوجی قانون کے خلاف ہے۔ یہ الزامات ٹھیک ہیں۔ کیا تم نے ان کا ارتکاب کیا ہے۔

نہیں جناب یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔

یہ غلط الزامات تم پر کیوں لگائے گئے ہیں۔

جناب عالی! صوبے دار میجر صاحب مجھے شروع ہی سے پسند نہیں کرتے جب میں بھرتی ہو کر پہلے دن سنٹر میں آیا تو رات کو مجھے سنٹرل رول کال میں کمپنی والے لے گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کس ضلعے سے تعلق رکھتے ہو۔ میرے بتانے پر پھر انہوں نے میری تعلیم پوچھی تو میں نے ان کو بتایا کہ جناب، میں میٹرک میں پڑھتا تھا کہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ پھر انہوں نے بہت ہی ناروا کلمات استعمال کیے جو میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُن کی ہر بات کا جواب نہایت مدلل اور دھیمے لہجے میں جواب دیا جبکہ یہ اتنا شاؤٹ (SHOUT) کر رہے تھے کہ سب سردار صاحبان کلب سے باہر برآمدے میں نکل آئے۔ صوبے دار میجر صاحب نے اسی وقت مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں فوج سے ڈسمس کروا کر گھر بھیج دوں گا۔ خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ اس رات کو بیمار پڑ گئے۔ دوسرے دن مجھے یہاں صوبیدار گلاب خان صاحب نے پیش کیا اور کیپٹن بیرچ صاحب نے مجھے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا اور مجھے ہدایت کی کہ میں اپنی نوکری دلجمعی اور نظم و ضبط سے کروں۔

پھر اس دن کے بعد تم نوکری ٹھیک کر رہے ہو۔
سر اپنی طرف سے تو ٹھیک کر رہا ہوں۔
کیا ٹریڈ ملا ہے تم کو؟
سر۔ میں کلرک ہوں۔
کرنل صاحب نے ایڈ جوٹنٹ کو حکم دیا کہ ہیڈ کلرک صاحب کو بلواؤ۔ اس نے دروازے سے باہر آکر سٹیک آرڈرلی کو کہا کہ کبھی صاحب کو بتایا کہ ان کو کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔ کبھی صاحب فوراً ہی آگئے۔ سیلوٹ کیا اور ایک طرف کو فوجی انداز میں اٹن شن کھڑے ہو گئے۔ کرنل صاحب نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
صوبیدار صاحب! آپ اس جوان کو جانتے ہیں۔ کرنل نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
سر۔ جانتا ہوں یہ سپاہی کلرک احمد ہے۔
یہ کس دفتر میں کام کرتا ہے۔
سر۔ یہاں بٹالین آفس میں۔
اپنا کام ٹھیک کرتا ہے۔
ٹھیک کرتا ہے۔ سر۔ بڑا ذہین لڑکا ہے۔
اس کا ڈسپلن کیسا ہے۔
ٹھیک ہے سر۔ حکم ٹھیک ٹھاک مانتا ہے۔ اپنے کام پر پر وقت آتا ہے۔ وردی ٹھیک پہنتا ہے۔ کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔
آپ اس کی اتنی اچھی رپورٹ دے رہے ہیں۔ لیکن سنٹر کے صوبیدار میجر صاحب جو انڈین رینکس کے ڈسپلن وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ اس کا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر سنیئر لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے
سر۔ اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اس پرفارمنس کام کے اوقات

میں دفتر ہی میں دیکھتا ہوں۔ مجھے تو اس نے آج تک کوئی شکایت نہیں ہوئی ویسے ایک بات ہے سر۔ یہ ہے بڑا با اصول اور سخت مزاج۔ اگر کوئی آدمی چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اگر اس سے غلط طریقے پر بے جا بات کرے گا تو پھر یہ ہرگز برداشت نہ کرے گا۔

صوبیدار صاحب یہ بات تو ماتحت کے حق میں نہیں جاتی۔

بات یہ ہے کہ یہ مارشل ریس کے لوگ ہیں۔ اپنی آن پر کٹ مرنے والے لوگ ہیں۔ اگر ان کی انا کو دھچکا پہنچایا جائے تو پھر یہ برداشت نہیں کر سکتے اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ جب یہ بھرتی ہو کر آیا تھا تو پہلے ہی دن مجھے اس طرح کے حالات و واقعات سے لے سابقہ پڑا تھا۔ اس جوان کے متعلق مجھے کیپٹن بیرج صاحب نے بتایا تھا کہ جنگ عظیم میں اس کا فادر بیرج صاحب کے فادر کے ساتھ اٹھائیس نمبر کیولری میں مڈل ایسٹ میں تھا۔ اور اسے کوٹ العمارہ کے مورچے میں لڑتے ہوئے گیلنٹری ایوارڈ بھی ملا تھا۔ حضور یہ خاندانی آدمی ہے کسی کی غلط بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اچھا یہ ہے وہ لڑکا۔ بیرج صاحب نے مجھ سے بھی بات کی تھی۔ اچھا تھینک یو۔ آپ جائیے۔

کرنل نے بٹالین حوالدار میجر۔ حوالدار نواب خان اور اسکورٹ جو میرے ساتھ تھا۔ ان سب کو باہر جانے کے لیے کہا۔ ان کے چلے جانے کے بعد کرنل نے صوبیدار میجر کو کہا کہ آپ اس کیس اور اس جوان کے متعلق مجھے تفصیل سے بتائیں صوبیدار میجر نے زمانے بھر کی خامیاں مجھ میں گنوا دیں۔ یہ بھی کہا کہ حضور اگر اس طرح کے آدمیوں کو فوج میں رکھا گیا تو یہ فوج تو پھر کچھ عرصے کے بعد سیاست کا اکھاڑہ بن جائے گی۔ میری تو حضور یہ رائے ہے کہ فوج میں ان پڑھ آدمی بھرتی ہونے چاہئیں یہ پڑھے لکھے لوگ ہر بات میں بحث کرنے پر اتر آتے ہیں۔ جن کا اثر دوسرے جوانوں پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ حضور والا! یہ لڑکا تو پکا کانگرسی ہے۔ کوئی فوجی اس

بات کا تصور نہیں کرسکتا کہ وہ سرکار مخالف سیاسی پارٹیوں کے جلسے جلوسوں میں شرکت کرے۔ حضور یہ زہر اسی طرح آہستہ آہستہ دوسرے فوجیوں میں بھی سرایت کرتا چلا جائے گا اور اس طرح سے فوج کا ڈسپلنگ (ڈسپلن) ختم ہو جائے گا۔ اس جوان کو فوج میں رکھنا سرکار بہادر کے مفاد کے خلاف ہے۔ میری رائے میں آج ہی اس کا سمری کورٹ مارشل کر کے اسے نوکری سے بارہ پتھر (پرانے زمانے میں ان پڑھ فوجی ڈسمسل (D/S/M/S.S.A.L) کو بارہ پتھر کہتے تھے۔) کرکے آج ہی سزا دے کر سول جیل بھیجا جائے تاکہ یہ دوسروں کے لیے درس عبرت ہو۔

جوان تم کچھ اپنے ڈیفنس میں کہنا چاہتے ہو۔ کرنل نے مجھے مخاطب کرتے کرتے ہوئے کہا۔

سر۔ بات یہ ہے کہ میں قوم اعوان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم سپاہی پیشہ لوگ ہیں۔ یہ پندرہ روپے کی نوکری میرے لیے کوئی نعمت غیر مترقبہ نہیں ہے۔ میں سول میں اس سے اچھی ملازمت کرسکتا ہوں۔ میں تو سپاہی پیشہ خاندان کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے فوج کی نوکری کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہوں۔ اگر میں ڈسمس ہو کر گھر چلا گیا تو پورے گاؤں میں میرے والد کی بڑی سبکی ہوگی جو آدمی کورٹ مارشل کروا کر اور ملازمت سے ڈسمس ہو کر گھر چلا جائے اسے ہمارے عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں کام تو صوبیدار گُرکرشنا نائر صاحب کے ماتحت کرتا ہوں۔ انہوں نے میری موجودگی میں آپکو میری اچھی رپورٹ دی ہے۔ صوبیدار میجر صاحب سے تو میرا کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں میں تو پکچر دیکھنے گیا تھا۔ بدقسمتی سے راستے میں اتفاقاً لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر رک گیا۔ میں جلسے میں شرکت کے ارادے سے ہرگز نہیں گیا تھا۔

جب تمہیں پتہ چل گیا کہ یہ سیاسی جلسہ ہے اور ایسے جلسوں میں شرکت کرنا فورسز کے لوگوں کے لیے ممنوع ہے تو تم وہاں سے فوراً واپس کیوں نہ ہو آئے۔

سر بات یہ ہے کہ مجھے وہاں جا کر پتہ چلا کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس آج جلسے سے خطاب کریں گے تو میں محض ان کو ایک نظر دیکھنے کے شوق سے وہاں رُک گیا۔ ورنہ میں نہ تو سیاسی آدمی ہوں اور نہ سیاست کی شُدبُد رکھتا ہوں۔ فوجی خاندان کا فرد ہوں۔ ہم لوگوں کو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

تو پھر تم کو سبھاش چندر بوس کو دیکھنے اور اس کی تقریر سننے کا شوق کیوں کر پیدا ہوا۔

سر۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نیتاجی کا نام اکثر ہم لوگوں کے سامنے لیتے رہتے تھے۔ وہ ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ استاد کی باتوں کا لازمی اثر ان کے شاگردوں پر پڑنا چاہیے تھا۔ سو مجھ پر بھی پڑا۔ ایک فطری بات ہے۔ اس وجہ سے میں نیتاجی کو دیکھنے چلا گیا۔ میرے کوئی سیاسی نظریات نہیں ہیں۔

تمہیں پتہ ہے اس کا نتیجہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

سر سچی بات تو یہ ہے کہ دل کی بات ماننے والے نتائج سے بے پرواہ ہو کر قدم اُٹھاتے ہیں۔

اچھا تم یہ بات بتاؤ تمہارا وہ لیڈر انگریزوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

سر یہ بات ہر چھوٹے بڑے انگریز کو معلوم ہے کہ نیتاجی کے دل میں آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل ہے۔

کیا وہ انگریزوں کو اچھا سمجھتا ہے یا بُرا۔

جناب میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔

اپنی تقریر میں وہ کیا کہتا تھا۔

سر یہ باتیں تو آپ سب کو پتہ ہے۔ ان باتوں کا دُہرانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

نہیں پھر بھی بتاؤ تو سہی۔

سر نیتا جی کہتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر دھوکے، چالاکی اور عیاری سے قبضہ کیا ہے۔ یہ تجارت کرنے کے لیے آئے تھے اور مغل بادشاہوں سے کچھ مراعات لے کر یہاں تجارت شروع کی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی مکاری اور دھوکہ بازی سے یہ پورے ہندوستان کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے۔ اگر ہندوستان میں لبنے والے چالیس کروڑ عوام ایک ہو جائیں اور آل انڈیا کانگرس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو انگریزوں کو ایک نہ ایک دن ہندوستان سے جانا ہی پڑے گا انہوں نے بھائی کو بھائی سے لڑا کر اپنے لیے راہ ہموار کر رکھی ہے۔ ان کو ایک نہ ایک دن بوریا بستر باندھنا ہی پڑے گا۔

تمہارے خیال میں یہ ٹھیک کہتا ہے۔

سر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمہارے سیاسی نظریات بھی وہی ہیں جو کانگرس والوں کے ہیں۔ سبھاش چندر بوس کے ہیں۔

سر یہ خیالات ہر ہندوستانی کے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کی حکومت کی بقا کو یقینی بنایا ہوا ہے۔ ان کے بھی یہی نظریات ہیں۔ لیکن یہ خیالات ان کے دل کے نہاں خانوں میں مدفون ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ یہ کھلے بندوں اس کا اظہار کر سکیں۔

تم کانگرس کے نظریات کا پرچار کرنا چاہتے ہو یا فوج کی نوکری۔

سر آپ سے پہلے بھی میں نے گذارش کی ہے کہ میں نے فوج کی نوکری کسی مالی منفعت کے پیش نظر اختیار نہیں کی۔ میں سپاہی پیشہ خاندان کا فرد ہوں۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا فوج ہی ہوتی ہے۔ میں پہلے بھی جناب کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ آپ نے جو باتیں مجھ سے پوچھی ہیں۔ میں نے جھوٹ سے کام نہیں لیا۔ صحیح صحیح باتیں آپ کو بتا دیں۔ اگر آپ میرا چانس (CHOICE) پوچھتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں فوج میں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن ان نظریات کا حامل ہوتے ہوئے اگر تمہیں فوج میں رکھا جائے تو یہ سرکار کے لیے نقصان دہ ہو گا۔ تمہارے ان گمراہ کن نظریات سے اور بہت فوجی متاثر ہوں گے۔ جس سے یہ خطرہ لاحق ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فوج میں میوٹنی (MUTINY) ہو جائے اور اس آگ کے مہیب شعلوں میں ہم سب جل کر بھسم ہو جائیں۔

نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو آج تک کسی سے سیاست کے موضوع پر گفتگو ہی نہیں کی۔

اچھا ہم تم کو ایک موقعہ دیتے ہیں۔ تم اپنی اصلاح کر لو۔

سر۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اچھا ہم تمہارے اس کیس کا فیصلہ سناتے ہیں۔

نمبر ۱۔ تم کو یونٹ لائنز سے بغیر اجازت غیر حاضر ہونے پر اٹھائیس دن کی قید سخت دیتے ہیں۔

نمبر ۲۔ ہم موجودہ حالات میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتے کہ تم بحیثیت کلرک دفتر میں کام کرو۔ اور ہر قسم کے سرکاری رازوں تک تمہاری رسائی ہو۔ اس لیے ہم نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تمہیں کلرکوں سے نکال کر REVERT، سگنل اسسٹنٹ اینیمل ٹرانسپورٹ بناتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم نے اچھی نوکری کی تو تمہارے لیے آگے بڑھنے کے بیشتر مواقع ہوں گے۔

سر۔ میں ایک منٹ کے لیے بھی خچر ڈرائیور کی حیثیت سے فوج میں نہیں رہنا چاہتا۔ آپ بے شک میرا کورٹ مارشل کر کے مجھے سول جیل بھیج دیں۔ آپ مجھے کوئی ایک مثال دیں کہ پوری انڈین سگنل کور میں کوئی انگریزی پڑھا ہوا آدمی بھی خچر ڈرائیور ہے۔ میں کلرکی چھوڑ کر خچر ڈرائیوری ہرگز نہ کروں گا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔

صوبیدار میجر نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا صاحب بہادر سے تم کیسی گستاخی سے بات کرتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔

تم ہٹ جاؤ پیچھے۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے کہا۔

کیس مارچ آف۔ کرنل نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر مجھے صوبیدار میجر۔ بٹالین حوالدار میجر اور حوالدار نواب خان بازوؤں سے پکڑے ہوئے دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے۔ میں سب کو گالیاں دے رہا تھا شاید میری کھری کھری باتوں سے کرنل کا پارہ بھی چڑھ گیا تھا۔ پامر صاحب اُردو نہیں سمجھتے تھے۔

صوبیدار میجر نے باہر آ کر مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں تمہاری کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس نے مصلحتاً نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو احمد بیٹا۔ یہ کوئی طریقہ ہے نوکری کرنے کا۔"

میں نے آپ کو کہہ دیا ہے کہ میں آپ سے کوئی بات کرنے یا سننے کے لیے تیار نہیں۔ اب آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے آپ کر لیں تاکہ آپ کو بعد میں کفِ افسوس نہ ملنا پڑے۔

صوبیدار میجر کھسیانا سا ہو کر آہستہ آہستہ وہاں سے چلتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چلا بٹالین حوالدار میجر اور آر۔ پی حوالدار نواب لنگڑا مجھے واپس کوارٹر گارڈ لے آئے۔ کریم بیگ نے کوارٹر گارڈ کے گارڈ کمانڈر کو بتایا کہ اس جوان کو اٹھائیس دن قید سخت کی سزا ملی ہے۔ اب جو بھی قانون کے مطابق قیدیوں کی روٹین ہے تم اس پر عمل پیرا ہو۔

کریم بیگ واپس جانے لگا تو میں نے اس کو کہا۔

میجر یہ قصہ اب اس انجام کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ ابھی تو اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ صوبیدار میجر نے اپنی بے وقوفی سے جو آگ لگائی ہے اس میں اور کون کون لوگ جل کر راکھ ہوں گے۔ برائی کے خلاف جہاد کرنا ایک صالح عمل ہے۔

میں اس بُرائی کے خلاف جدوجہد جاری رکھوں گا۔ اس مرحلہ پر تو اس کی ابھی ابتدا ہوئی ہے۔

احمد خدا کے لیے اس قصے کو یہاں پر ہی اب ختم کرو۔

حضور والا (میں نے طنزاً کہا) آج ہی میں اپنے والد کو خط لکھ کر سب صورتِ حال سے ان کو آگاہ کرتا ہوں اور جو بھی سلوک یہاں مجھ سے روا رکھا گیا ہے ان کی پوری تفصیل لکھوں گا اور ان کو کہوں گا کہ وہ ملک المعظم یعنی بادشاہ سلامت کو ایک خط لکھ کر اس کیس کی پوری روئیداد سے ان کو آگاہ کریں اور ساتھ ہی بطور احتجاج اپنے گیلینٹری ایوارڈ (بہادری کے تمغے) بادشاہ سلامت کو واپس کر دیں گا اس کے بعد اس حکومت کے ارباب بست وکشاد اگر چاہیں تو ناکردہ گناہوں کی پاداش میں اور کڑی سے کڑی سزا دیں۔ یہ بات میں نے صبح گُپتا صاحب کو بھی بتا دی تھی۔ اب آپ کو بھی بتا رہا ہوں۔ آپ اس بوڑھے ریچھ کو یہ سب باتیں وضاحت کے ساتھ بتا دیں۔ ساتھ ہی اس کو یہ بھی کہہ دیں کہ اس وقت سے لے کر تا دمِ مرگ میں تمہارے ان غلط رویوں کے خلاف احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال کر دوں گا۔

بھیا! اس کی سزا تمہیں پتہ ہے کیا ہے۔ اس نے مجھے ڈراتے ہوئے کہا۔

جی حضور۔ زیادہ سے زیادہ پھانسی کا پھندا۔ جسے میں چُوم کر اپنے گلے میں ڈالنا پسند کروں گا۔

بھیا! میری تو سمجھ میں تمہاری یہ باتیں نہیں آتیں۔

کُھلے دل ودماغ سے اگر کوئی آدمی انہیں سُنے اور ان پر غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ باتیں آجائیں گی۔ باتیں بڑی صاف ہیں۔ البتہ چمچوں کی سمجھ سے یہ باتیں فی الواقعہ بالاتر ہیں۔ صوبیدار میجر بڑا چمچہ ہے اور تم چھوٹے چمچے ہو۔ یہ باتیں سُن کر بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ شرمندہ ہو کر واپس بٹالین آفس کی طرف چلا گیا۔ گارڈ کمانڈر ابھی تک وہاں ہی سہما ہوا کھڑا تھا۔ (میں اپنے سیل کی طرف بڑھا تو اس نے لپک کر جنگلے کا تالا کھولا اور میں سیل کے اندر چلا گیا۔

وردی اُتار کر شلوار قمیص پہن کر میں نے کٹ پیک کی اور بستر لگا کر اس پر لیٹ گیا۔ اور آئندہ پیش آنے والے حالات و واقعات کے متعلق سوچنے لگ گیا۔

گارڈ کمانڈر تالا لگا کر مجھ سے کوئی بات کیے بغیر کوارٹر گارڈ کی طرف واپس چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد قیدیوں کے لیے کھانا آیا۔ لانگری ہر سیل کے دروازے پر آ کر قیدی کو آواز دیتا۔ قیدی جنگلے کے پاس آ کر اپنی پلیٹ آگے بڑھا کر اپنے لیے کھانا لے لیتا اور اپنے بستر پر بیٹھ کر کھا لیتا۔ وہاں ہم کل چھ قیدی تھے۔ چار پنجابی مسلمان ایک سکھ اور ایک ڈوگرہ۔ جب مسلمان لانگری میرے سیل کے سامنے آیا تو مجھے آواز دی۔

بابو جی کھانا لے لو۔

نہیں حسین خان میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے بھیا۔

تھوڑا سا ہی کھا لو۔

نہیں حسین خان۔ میں نے ان سب بچوں سے کہہ دیا ہے کہ ان کے اس ناروا سلوک اور غلط رویوں کے خلاف بطور احتجاج میں تادم مرگ بھوک ہڑتال کروں گا۔ تم ایسا کرنا گارڈ کمانڈر کو بتاتے جانا کہ "احمد بطور احتجاج کھانا نہیں کھاتا۔"

حسین خان چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گارڈ کمانڈر آیا۔ اس نے میری منت سماجت کی کہ میں کھانا کھا لوں۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد صوبیدار میجر۔ ہیڈ کلرک کمی کرشنا نائر صاحب اور بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ سیل کے سامنے کھڑے ہوئے۔ صوبیدار میجر نے مجھے آواز دیتے ہوئے کہا۔

احمد تم نے کھانا کھانے سے کیوں انکار کیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے فوج میں یہ ایک سخت ترین جرم ہے۔

بہت شکریہ آپ کا جناب والا ۔ میں اپنا سود و زیاں خوب جانتا ہوں ۔ اب بات آپ لوگوں سے بڑھ کر کرنل صاحب اور میرے درمیان ہے ۔ کل یہ بات جب اور بڑھے گی اور ایک طرف فریق میرے والد ہوں گے اور دوسری طرف بادشاہ سلامت تو اس وقت صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی ۔ تو اس وقت پتہ چلے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے کئی صاحب بھی خاموش کھڑے رہے ہیں اور پھر وہ سب واپس بٹالین آفس کی طرف چلے گئے ۔

شام تک میرے پاس کوئی آدمی نہ آیا ۔ دوسرے قیدیوں کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ میں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے ۔ اس لیے وہ بھی میری منت سماجت کرتے رہے کہ کھانا کھا لوں ۔ تاکہ میری وجہ سے ان پر کوئی نئی اُفتاد نہ آن پڑے ۔ میرے مسلسل انکار کرنے پر وہ بھی چُپ ہو گئے ۔

## ۵

چاروں طرف گھُپ اندھیرے کا راج تھا ۔ سامنے کوارٹر گارڈ میں لارڈ کی ہلکی ہلکی روشنی ٹمٹما رہی تھی ۔ قیدیوں کی کوٹھڑیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ گارڈ لالٹین اُٹھائے ہوئے میرے دروازے پر آیا اور مجھے آواز دی ۔

بالوجی ! صوبیدار جند وڈے شاہ صاحب آئے ہیں ۔ جب تک شاہ صاحب جنگلے کے سامنے آ گئے ۔

میں نے انہیں اسلام علیکم کہا ۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرائے اور مجھ سے کہنے لگے ۔

ملک صاحب یہ کیا نیا جھگڑا شروع کر دیا ہے ۔ آرام سے اپنی نوکری کرو ۔

سر میں تو کسی سے بھی نہیں جھگڑتا ۔ یہ لوگ مجھے جہنم پہنچا کر دم لیں گے ۔ لیکن میں بھی ان کا آخر دم تک مقابلہ کروں گا ۔

چھوڑو ان فضول باتوں کو اور کھانا کھاؤ ۔ میں نے صوبیدار میجر صاحب سے کہا ہے وہ

کل کرنل صاحب سے بات کر کے تمہیں کوارٹر گارڈ سے نکال دیں گے۔

لیکن سر! میں خچروں کی نوکری تو نہیں کروں گا۔ میرے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ میرے والد اٹھائیس نمبر رسالے کے شہسوار۔ ان کا بیٹا خچروں کی لید اٹھائے گا۔ ان کی مالش کرے گا۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ خدا کے لیے آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیجیے۔ یہ بحث مباحثے تو مجھے پاگل کر دیں گے۔

تم کھانا کھالو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

سر۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ آپ میرے والد صاحب کے دوست اور ان کے ہانڈی وال (ہم نوالہ ۔ ہم پیالہ) بھی رہے ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ خود کرنل اگر مجھ سے بات کرے تب یہ مسئلہ حل ہو گا۔ ورنہ یہ الجھتا ہی جائے گا۔

تم کھانا کھالو۔ میں صوبیدار میجر صاحب سے کہہ کر کل تمہاری کرنل صاحب سے انٹرویو کروا دوں گا۔

سر مجھے تو کرنل کی انٹرویو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ میری بھوک ہڑتال ختم کروانا چاہتا ہے اور اس بات کا بھی متمنی ہے کہ میرے والد صاحب بادشاہ سلامت کو چٹھی لکھ کر اپنے گیلنٹری ایوارڈز واپس نہ کریں تو کرنل پولارڈ صاحب بہادر کو اس موضوع پر مجھ سے بات کرنا ہو گی۔ مجھے نوکری کی کچھ پرواہ نہیں اور نہ ہی کڑی سے کڑی سزا کا خوف میرا راستہ روک سکتا ہے۔

اچھا میں صوبیدار میجر صاحب کو جملہ حالات وواقعات سے آگاہ کرتا ہوں اور پھر صوبیدار سید جنڈو دا شاہ صاحب کوارٹر گارڈ کی طرف واپس چلے گئے۔

میں نے ایک گونہ اطمینان کا سانس لیا کہ میری بھوک ہڑتال ایک واضح اثر مرتب کر رہی ہے۔ دو وقت کا بھوکا تھا اس لیے نیند بھی مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں سوچنے لگا۔ دن بدن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا جانے اس قضیے کا انجام کیا ہو گا۔ اگر میرے والد کو اس بات کا پتہ چل گیا تو وہ فوراً جبل پور پہنچ جائیں

گے اور کرنل اور صوبیدار میجر کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر مجھے مجبور کریں گے کہ میں ان افسرانِ بالا سے معافی مانگ لوں اور آئندہ کے لیے انہیں یقین دلا دوں کہ میں اپنی سروس ٹھیک کروں گا اور کسی قسم کا کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کروں گا۔

کوارٹر گارڈ کے گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا یہ رات میری زندگی کی ایک اہم رات تھی۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں میٹھی نیند کے مزے لینے لگ گیا۔ دوسرے دن چار بجے ریوالی ہوئی تو کوارٹر گارڈ کے سنتری نے سب قیدیوں کو آکر جگا دیا۔ حسبِ دستور وہ سب سیلوں کے سامنے کھڑا ہو کر آواز لگاتا۔

"اٹھو بھائی صاحب ریوالی ہو گئی ہے۔"

اس نے میرے سیل کے دروازے پر بھی آکر آواز لگائی اور واپس کوارٹر گارڈ کی طرف چلا گیا۔ دوسرے سب قیدی اٹھ کر اپنی روزمرہ کی روٹین میں لگ گئے۔ میں بدستور اپنے بستر میں لیٹا رہا۔ کسی نے کوئی تعارض نہ کیا۔ جب چاروں طرف اُجالا نمودار ہو گیا تو گارڈ کمانڈر سیلوں کی طرف ایک چکر لگانے آیا۔ سب قیدی اپنے روزمرہ کے معمولات بجالانے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ وہ باری باری سے ہر ایک سیل میں جھانک کر دیکھتا اور مطمئن ہو کر آگے کو بڑھ جاتا۔ جب میرے سیل میں اس نے جھانک کر دیکھا تو میں اس کی توقع کے خلاف اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھ سے بڑے ہی دھیمے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"بابو جی! آپ دوسرے قیدیوں کے ساتھ مارچنگ آرڈر پہن کر ٹہلائی کے لیے نہیں جائیں گے۔"

جاؤ تم یہاں سے۔ اپنا کام کرو۔ میں نے شاؤٹ (SHOUT) کرتے ہوئے کہا اور وہ بے چارا شرمندہ ہو کر واپس کوارٹر گارڈ کی طرف چلا گیا۔

میں دس بجے تک آرام سے اپنے سیل میں لیٹا رہا۔ کسی نے مجھ سے کوئی بازپرس نہ کی۔ دس بجے کے قریب حسین خان لانگری میرے لیے الگ کھانا ایک بوسیدہ سے

ٹفن کیریر میں لے کر آیا۔ گارڈ کمانڈر بھی اس کے ساتھ تھا۔ حسین خان کی پہلے سے میرے ساتھ گپ شپ تھی۔ اس لیے اس نے آتے ہی نہایت بے تکلفی سے کہا۔

" بالو جی آپ کے لیے کھانا لے کر آیا ہوں۔ کھا لیں۔

حسین خان میں نے کل تم کو بتا دیا تھا کہ جب تک میرے کیس کا فیصلہ انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

یار بالو۔ انصاف کے تقاضے تو بڑوں نے پورے کرنے ہیں۔ وہ کریں گے تم کھانا کھاؤ۔ اپنے پیٹ کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔

نہیں بھتیا میں کھانا ہرگز نہ کھاؤں گا۔ میں نے ایک دفعہ آپ سے کہہ دیا ہے مجھے بار بار تنگ مت کرو۔ اور پھر وہ دونوں واپس کوارٹر گارڈ کی طرف چلے گئے۔

میرے اس جرأت مندانہ رویئے پر سنٹر کے سرکاری حلقوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی بھی عہدیدار یہ جرأت نہ کر سکتا کہ وہ آ کر مجھ سے کسی کی کوئی باز پرس کرے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب صوبیدار میجر، صوبیدار ہیڈ کلرک کی ڈی کرشنا نائر صاحب اور صوبیدار جنرل ڈیوٹی شاہ صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ گارڈ کمانڈر اور بٹالین حوالدار میجر کریم بیگ بھی تھے۔ وہ سب میرے سیل کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

صوبیدار شاہ صاحب مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

احمد بیٹا۔ میں صوبیدار میجر صاحب کو لے آیا ہوں اب تم خود ہی ان سے بات کرو۔

سر۔ مجھے تو ان سے کوئی بات نہیں کرنا۔ یہ کوئی بات کرنا چاہتے ہوں تو کریں۔ صوبیدار میجر ہنستے ہوئے دو قدم آگے کو بڑھا اور جنگلے کی سلاخوں کو پکڑ کر کہنے لگا۔

بھئی احمد۔ تمہاری عمر میرے بچوں سے بھی کم ہے۔ تم اتنے سخت جان اور تند خو ہو کہ کسی سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں۔

صوبیدار میجر صاحب میں آپ کی چکنی چپڑی باتوں میں آنے والا نہیں۔ میں چلا چلا

کہ سب سے اپنے لیے انصاف مانگتا ہوں۔ آپ یہ سوچیں میری جگہ آپ کا اپنا بیٹا ہوتا تو کیا آپ اس کی اتنی ذلت برداشت کر سکتے تھے۔ میں آج ہی اپنے والد کو سب صورتحال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ دو تین دن میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے میں ان کو کہوں گا کہ وہ برج صاحب کے والد صاحب کو اور بادشاہ سلامت کو چٹھیاں لکھیں اور اپنے گیلینٹری ایوارڈز ملک المعظم کو بطور احتجاج واپس بھیج دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس وقت تک بھوک سے مر نہیں جاؤں گا اور اگر مر بھی گیا تو تحصیل تلہ گنگ میں اعوان قبیلے کی ہزاروں مائیں میرے جیسے بچوں کو جنم دے دیں گی جو ظلم اور زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو کر آخر تک بدی کی قوتوں سے مقابلہ کرتے رہیں گے۔

احمد بیٹے اتنے جذباتی نہ بنو۔ تم کھانا کھاؤ اس کے بعد میں آپ کو لے کر کرنل صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ وہاں تم سب باتیں کرنا۔

کرنل پولارڈ کے سامنے کل جو پیش ہوا تھا۔ وہ بے چارہ تو آپ کے ہاتھوں کی لاٹھی ہے جو آپ کے ایما پر استعمال ہوتی ہے

چھوڑو یہ لیڈرانہ قسم کی گفتگو ——— کمی صاحب آپ ہی اسے سمجھائیں۔

سر میں کیا سمجھاؤں۔ میں کوئی آپ سے بڑا ہوں۔ یہ آپ کی بات نہیں مانتا تو میری کہاں سنے گا۔

نہیں یہ ڈائریکٹ آپ کے ماتحت ہے۔ آپ کی بات مانتا ہے۔

مانتا تھا۔ لیکن اب تو کرنل صاحب نے اسے ریورٹ (REVERT) کر کے (A.T.) A.S. بنا دیا ہے اور "E" کمپنی جہاں گھوڑوں اور خچروں کی ٹریننگ ہوتی ہے ایسی پوسٹ بھی کر دیا ہے۔ یہ اب اپنی اٹھائیس دن کی قید سخت کاٹ کر "E" کمپنی میں چلا جائے گا۔ اب آپ ہی کرنل صاحب سے مل کر اور ان سے بات چیت کر کے اس کی دادرسی کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مسئلے کو یہاں ہی سلجھانے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

وہ سب بٹالین آفس کی طرف واپس چلے گئے۔ میں آرام سے اپنے بستر پر لیٹ

کر آنے والے حالات و واقعات کا جائزہ لینے لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیپٹن پامر ایڈجوٹنٹ میرے سیل کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اسے دیکھا تو اپنے بستر سے اُٹھ کر جنگلے کے پاس آگیا اور اس کو "گڈ مارننگ سر" کہا۔ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

تم جلدی سے وردی پہن کر تیار ہو جاؤ۔ میں نے کرنل سے بات کر لی ہے۔ تم اپنا موقف نہایت وضاحت اور پامردی سے بیان کرنا۔ بالکل ڈرنا اور گھبرانا نہیں۔ اب کمانڈنٹ تم سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گیا ہو گیا ہے۔

صوبیدار میجر نے بھی اس سے کچھ بات چیت کی ہے یا نہیں۔ میں نے پامر صاحب سے استفسار بھرے لہجے میں پوچھا۔

کر رہا تھا۔ لیکن میں ان کی گفتگو کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ چونکہ وہ دونو اُردو میں بات چیت کر رہے تھے۔ میں بس اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ تمہارے متعلق ہی بات چیت کر رہے ہیں۔

ٹھیک ہے سر آپ پندرہ منٹ کے بعد گارڈ بھیجیں جو مجھے آکر یہاں سے لے جائے۔

گارڈ کی کیا ضرورت ہے۔ سنگ آرڈلی کے ساتھ ہی تم آجانا۔ میں اسے بھیج دیتا ہوں۔

بہت اچھا جناب۔

اور پھر پامر صاحب بٹالین آفس کی طرف واپس چلا گیا اور میں وردی پہننے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد سنگ آرڈلی میرے سیل کے سامنے آگیا۔ گارڈ کمانڈر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بابو جی تیار ہو گئے ہیں آپ۔

ہاں بھیا۔ تیار ہو گیا ہوں۔

گارڈ کمانڈر نے آگے بڑھ کر جنگلے کا تالا کھولا اور اندر آ کر میری کٹ اور بستر کو لپیٹ کر

دیوار کے ساتھ لگا دیا اور پھر میں اس کے ساتھ سیل سے باہر آگیا۔ مجھے سیل میں محبوس ہوئے کوئی زیادہ وقت نہ ہوا تھا۔ لیکن جب میں برآمدے سے باہر آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں پوری ایک صدی اس سیل میں کرب و اذیت کے عالم میں گذار کر باہر آیا ہوں۔ کل سے نہ میں نے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور نہ غروب آفتاب کا دلفریب منظر دیکھا۔ بٹالین آفس سے ملحق باغیچے کے درختوں پر پہلے کی طرح اب بھی پرندے چہچہا رہے تھے۔ نرم اور خوشگوار دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ زندگی کی گہما گہمی میں ادھر اُدھر آجا رہے تھے۔ سنگ آرڈرلی میرے برابر چلتا ہوا مجھے بٹالین آفس میں لے آیا۔ میں پہلے سیدھا اپنے ساتھی کلرکوں سے ملنے کے لیے مین آفس MAIN OFFICE گیا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے سب گورے اور انڈین مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ چاروں طرف سے ہیلو ہیلو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ نیچے والے رینکس بلا تمیز مذہب و ملت اور رنگ و نسل ایک دوسرے کے سچے بہی خواہ ہوتے ہیں۔

کپٹی صاحب نے مین آفس میں شور سنا تو اپنے آفس سے نکل کر وہ بھی آ گئے مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔

بھئی یہ قیدی کہاں سے آگیا ہے؟

جناب کو سلام کرنے آیا ہوں۔ میں نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ کہا۔

بھئی سلام تو ہم سب تمہیں کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کیسے ایک نحیف و نزار لڑکے نے کئی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ صوبیدار میجر اور کرنل پولارڈ کے علاوہ دوسرے سب لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں میں ان سب کو مل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ سنگ آرڈرلی کو کہا کہ پامر صاحب کو بتا دو کہ احمد آگیا ہے۔"

اس نے اندر جا کر ایڈجوٹنٹ کو بتایا اور پھر دروازے کی چک اٹھا کر مجھ سے کہنے لگا۔

بالوجی اندر آ جائیں۔ ایڈجوٹنٹ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔

میں کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اور فوجی انداز میں سلیوٹ کر کے اٹن شن کھڑا ہوگیا صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "احمد پلیز سِٹ ڈاؤن" میں اس کی میز کی دوسری طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

ایک کپ چائے کا ہو جائے۔

نہیں سر شکریہ۔ میں نے کل صبح سے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ جب تک میرے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔

ٹھیک ہے۔ پھر اسی بات پر قائم رہنا۔ میں بھی تمہاری منت سماجت اگر کروں تم ہرگز نہ ماننا۔ یہ باتیں اس نے سرگوشی کے انداز میں کہیں اور پھر وہ اُٹھ کر سر پر ٹوپی رکھ کر اندر کرنل کو رپورٹ دینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

کرنل صاحب نے کمی صاحب اور صوبیدار جنڈو دے شاہ کو بھی بلایا ہے۔ میرا خیال ہے صوبیدار میجر نے کرنل کو کہا ہوگا کہ اگر یہ دونوں سردار اس سلسلے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں تو تمہیں راہِ راست پر لا سکتے ہیں اور اس طرح یہ معاملہ سلجھ سکتا ہے۔

صوبیدار میجر نے ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں جھانک کر مجھے کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو طنزیہ انداز میں مسکرا پڑا۔ اس کے خیال میں ایک عام آدمی کو کرسی پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں کرسی تو صرف حکومت کے چمچوں اور ہوا خواہوں کے لیے ہوتی ہے جو سرکار اور کے کاز (CAUSE) کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اس کے خیال میں میرے جیسے حکومت مخالف لوگوں کو تو عمر بھر کے لیے کال کوٹھڑیوں سے باہر ہی نہ آنے دینا چاہیے۔

تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار جنڈو دا شاہ صاحب اور صوبیدار کمی کرشنا نارتھ صاحب ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان کو دیکھا تو میں ان کی پذیرائی کے لیے اُٹھنے لگا لیکن یار صاحب نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ ایڈجوٹنٹ اندر کرنل کے کمرے میں چلا گیا۔ کمی صاحب نے میرے قریب آ کر آہستہ سے کہا

"خبردار مضبوط موقف اختیار کرنا۔ پیچھے نہیں ہٹنا" کٹی صاحب کی اس بات سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

پامر صاحب نے کرنل صاحب کا دروازہ کھول کر ان دونوں سرداروں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ صوبیدار میجر اپنے آپ کو آج بہت ہی کمزور اور کمتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوگ اندر کافی دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے۔ درمیان والا دروازہ بند تھا اس لیے اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کا مجھے پتہ نہ چل سکا۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک ایڈجوٹنٹ کے دفتر میں بیٹھا رہا۔ پھر پامر صاحب باہر آئے اور مجھے اپنے ساتھ کرنل صاحب کے دفتر میں لے گئے۔ میں نے اندر جاکر کرنل کو فوجی انداز میں سیلوٹ کیا اور اٹن شن کھڑا ان کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ کرنل نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

جس دن تم بھرتی ہو کر سنٹر میں پہلے دن آئے تھے۔ اس وقت سے لے کر اب تک کی سب روئیداد مجھے تفصیل سے سناؤ۔ وہ میری باتیں نہایت غور اور دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ اور حیران کُن نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ گویا ہوا۔

تمہارے فادر اٹھائیس نمبر کیولری میں تھے۔

جی جناب۔

کیا رینک تھا ان کا؟

سر وہ دفعدار میجر تھے۔

ان کو گیلنٹری ایوارڈز بھی ملے تھے۔

جی جناب۔

کہاں پر۔

جناب کوٹل العمارہ کے مورچوں کی دست بدست جنگ میں۔

تم نے اپنے فادر کو خط لکھ کر یہ سب بات بتادی ہے جو تمہارے ساتھ یہاں

پیش آئی ہے۔

جناب عالی! میں آج ان کو تفصیل سے خط لکھ رہا ہوں۔

کیا لکھو گے؟

سر یہ میرے اور میرے والد کے درمیان معاملہ ہے۔ یہ بات میری ذات سے تعلق رکھتی ہے جو کچھ میں مناسب سمجھوں گا، لکھوں گا۔

مجھے صوبیدار میجر صاحب نے بتایا ہے کہ تم نے میرے لیے پیغام دیا ہے اور تم نے کہا ہے کہ میں آج اپنے فادر کو خط لکھ کر ان کو کہوں گا کہ وہ اپنے گیلنٹری ایوارڈز کنگ ایمپرر (KING EMPEROR) بادشاہ سلامت کو بطور احتجاج واپس کر دیں۔

جناب عالی۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ میں نے ایسا کہا ہے۔

تمغے تم ان سے کیوں واپس کروانا چاہتے ہو۔؟

جناب جب تم تمغوں کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے تو یہ بادشاہ سلامت کو واپس ہی کر دینے چاہئیں۔

تمہارے فادر کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے۔

گیلینٹری ایوارڈز پانے والے اس جانباز سپاہی کے کم سن بیٹے کے ساتھ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہوئی ہے۔ کیا ہم ملک المعظم کی فوج میں ان بہادر جانبازوں کے بیٹے اپنے بزرگوں کی جگہ فوج میں نہیں لے سکتے۔ جنہوں نے کوٹل العمارہ کے مورچوں میں اپنے سینے گولیوں سے چھلنی کروائے ہیں۔

تم فوج میں بھرتی تو ہو گئے ہو۔ تم بھی اپنے فادر کی طرح بہادری کے کارنامے سرانجام دینا۔ تم کو بھی اس طرح کے ایوارڈ مل سکتے ہیں

ناممکن۔ ہمیں تو کوئی یہاں زندہ نہیں رہنے دیتا۔ ایوارڈ کا حصول تو بڑی بات ہے۔

تمہیں تکلیف کیا ہے؟

آپ کو پتہ نہیں ہے۔

نہیں۔

آپ براہِ کرم میری بات توجہ سے سماعت فرمائیں۔

ہاں میں غور سے سن رہا ہوں ۔ کہو۔

سَر۔ بات یہ ہے کہ صوبیدار میجر صاحب پہلے دن سے دن ہی سے بلا وجہ مجھے ناپسند کرنے لگ گئے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے ضلع کے بغیر کسی دوسرے ضلع کا کوئی پڑھا لکھا پنجابی مسلمان انڈین سگنل کور میں بھرتی ہو۔ وہ پہلے دن ہی مجھے فوج سے ڈسچارج کروا کر گھر واپس بھیج دینا چاہتے تھے۔ کیپٹن بیرج صاحب کی پُرزور سفارش پر آپ نے مجھے فوج میں رہنے دیا۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ لیکن آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ سگنل کور میں کئی ہزار آدمی ہیں کوئی ایک بھی انگریزی پڑھا لکھا آدمی آج تک خچر ڈرائیور بنا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں خچر ڈرائیوری کروں گا اور میرا شیر دل باپ بہادری کے تمغے اپنے سینے پر سجائے انگریزوں کے درباروں میں جایا کرے گا۔ ہرگز نہیں ..... میں عمر بھر کال کوٹھڑی میں رہنا پسند کروں گا، بجائے اس کے کہ میں ڈھٹائی کے ساتھ خچر کا لگام پکڑ کر اس کے آگے آگے چلوں اور ذلت اور رسوائی سے گذارے ہوئے مہینے کے اختتام پر اٹھارہ روپے بطور تنخواہ کے وصول کروں۔ سر یہ کبھی ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں یہ باتیں کیں۔

کرنل حیران تھا کہ اُجڈ دیہاتی میں اتنی جرأت اور بے باکی کہاں سے آگئی ہے۔

کرنل بڑے ہی جچے تلے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔

تمہیں پتہ ہے تمہارے ان باغیانہ خیالات کی وجہ سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیل بھیجا جا سکتا ہے۔

میں ایسی ذلیل اور ہتک آمیز زندگی سے جیل جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سوچ لو۔

میں یہ سب باتیں نہایت ہی سوچ سمجھ اور غور وخوض کے بعد کر رہا ہوں۔

تم مجھے آخری بات بتاؤ کہ تم آخر چاہتے کیا ہو؟

سر میں خچر ڈرائیوری کی حیثیت سے ہرگز نوکری نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے کوئی باعزت ٹریڈ دیں۔ میں اپنی تعلیمی اہلیت اور خاندانی سٹیٹس (STATUS) کے مطابق ٹریڈ لینا چاہتا ہوں۔

ایسا کون سا ٹریڈ ہوگا۔

• خچر ڈرائیوں کے علاوہ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ میں اس بات پر مصر نہیں کہ مجھے کلرک ہی رہنے دیا جائے۔

اٹھائیس دن قید سخت کا کیا بنے گا۔ تم اس کی بھی معافی چاہو گے۔

ہرگز نہیں۔ وہ مجھے میرے قصور کی پاداش میں ملی ہے۔ اگرچہ اس معمولی سے جرم کے لیے یہ سزا بہت ہی ہارش (HARSH) ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں قاعدے قانون کے مطابق اسے خندہ پیشانی سے بھگتوں گا۔ اس کے التوا یا معافی کے لیے ہرگز درخواست نہیں کرتا۔

اچھا جوان ہم نے تمہاری سب باتیں غور سے سن لی ہیں۔ تم چونکہ ایک بڑے اچھے اور بہادر فوجی خاندان کے فرد ہو۔ تمہارے خاندان کی بیش بہا فوجی خدمات ہیں جنہیں کوئی انگریز بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ان سب باتوں کے پیش نظر ہم تمہاری اٹھائیس دن کی قید سخت فوری طور پر معطل کرتے ہیں۔ کل ہم نے تمہیں کلرکوں سے نکال کر (A.T) A.S بنائے جانے کے جو احکامات صادر فرمائے تھے۔ فی الحال ریکارڈ میں یہ ایک سال کے لیے سنبھال رہیں گے۔ البتہ تم (A.T) A.S کا کام نہیں کرو گے چونکہ تم کو "ع" کمپنی میں پوسٹ کر دیا گیا ہے اس لیے میں میجر ولنگٹن صاحب کو ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں کہ وہ تم سے میول ٹریننگ نہ کروائیں بلکہ یہ ایک سال تم ان کے دفتر میں کام کرو گے۔ ایک سال کے بعد اگر انہوں نے تمہاری رپورٹ ٹھیک

دی تو ہم تم کو دوبارہ مستقل طور پر کلرک بنا دیں گے۔

ٹھیک ہے۔۔ کرنل نے داد طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے سر۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

کرنل صاحب نے پامر صاحب کو کہا کہ صوبیدار میجر صاحب کو بلوائیں۔ شاید وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہوئے تھے چونکہ فوراً آ گئے۔ کرنل صاحب نے ان کو میرے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

صوبیدار میجر صاحب یہ جوان ایک بڑے اچھے فوجی خاندان کا فرد ہے۔ اس کے فادر کی بہت خدمات ہیں ان کے پیش نظر ہم اس جوان کی اٹھائیس دن کی قید سخت کی سزا معطل کرتے ہیں۔ یہ جوان میول ٹریننگ بھی نہیں کرے گا۔ "ای" کمپنی میں بطور کلرک ایک سال کے لیے اٹیچ رہے گا۔ اگر اس کے بعد "ای" کمپنی" کمانڈر نے اس کی رپورٹ تسلی بخش دی تو ہم اُسے دوبارہ مستقل طور پر کلرک بنا دیں گے۔

ٹھیک ہے سر۔ صوبیدار میجر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس طرح یہ قضیہ بخیر و خوبی احسن طریقے سے انجام پذیر ہوا۔

کرنل صاحب نے میری بھوک ہڑتال کے پیش نظر پامر صاحب، صوبیدار میجر صاحب اور میری چائے اور پیسٹریوں سے بڑی پر تکلف تواضع کی اور اس طرح میری دو دن کی بھوک ہڑتال اختتام پذیر ہوئی۔ پامر صاحب مجھے اپنے ساتھ دفتر میں لے گیا۔ اس نے میرے سامنے میجر ولنگٹن کو ٹیلی فون کیا اور پھر اس کی بات کرنل صاحب سے کروائی۔

"ای" کمپنی میں ہیڈ کلرک حوالدار سلطان علی اور سینئر صوبیدار اللہ بخش خان تھے (یہ دونوں صاحب ضلع میانوالی کے رہنے والے تھے) ان دونوں حضرات کو پامر صاحب نے بٹالین آفس میں بلوایا۔ میری موجودگی میں ان دونوں کو پامر صاحب نے میری پوری روئیداد سنائی اور آئندہ کے لیے میرے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھنے کی تاکید کی۔ میں ایڈجوٹنٹ صاحب سے اجازت لے کر بٹالین آفس میں اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا سب دوستوں اور ساتھیوں سے ملا۔ کٹی صاحب سے ملا تو انہوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور

میرے سٹینڈ پر خصوصی شاباش دی۔ میں ابھی بٹالین آفس ہی میں تھا کہ حوالدار نواب لنگڑا دو سپاہیوں کو ساتھ لیے میری تلاش میں وہاں آ پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

بابو تم تو بڑے تیس مار خاں نکلے۔

فضول بات مت کرو۔ میں انہیں ڈانٹتے ہوئے

نواب خان مجھے ساتھ لے کر کوارٹر گارڈ آیا اور وہاں سے اس نے ان دو سپاہیوں سے میرا سامان اٹھوایا اور مجھے "E" کمپنی کے دفتر میں لے آیا۔ کمپنی والوں نے بڑی اچھی طرح سے میری پذیرائی کی۔ نواب خان اور اس کے ساتھی مجھے وہاں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ حوالدار میجر میاں محمد نے دو سپاہیوں کو بلایا اور میرا سامان بیرکس میں بھیج دیا۔ حوالدار میجر نے ان جوانوں سے کہا کہ بابو جی کے لیے ایک اچھی صاف ستھری سی چارپائی اور ایک کٹ بکس لے کر ان کا سامان اس میں رکھ دو۔ وہ میرا سامان لے کر بیرک کی طرف چلے گئے۔ میں بابو فضل الرحمان اور طالب مہدی کے ساتھ بیٹھا خوش گپیاں کرتا رہا۔ وہ دونو میری اس غیر معمولی جرأت پر اظہار حیرت کرتے رہے۔

دفتروں میں کام کرنے والے لوگ بارہ سے ایک بجے کے درمیان کھانا کھاتے تھے۔ اس لیے جب وہ کھانے کے لیے اٹھے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ سنٹر میں کلرکوں کا ایک الگ میس (MESS) تھا۔ جونہی ہم وہاں پہنچے تو سب ساتھیوں نے مجھے دیکھتے ہی ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہاں اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔

O

اب میں پہلے کی طرح "E" کمپنی میں بطور کلرک کام کرتا تھا۔ یہاں ساتھی اچھے تھے۔ وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ جبل پور میں جو بھی دیکھنے جگہیں تھیں۔ مثلاً دریائے نربدا۔ ماربل راکس۔ دھواں دھار۔ گوہر ندی۔ چونسٹھ

جوگنی کا مندر۔ پسنہاری ٹیمپل اور ہنومان ٹینک۔ یہ سب مقامات مختلف اوقات میں میں نے دوستوں کے ساتھ دیکھے اور ان کے قدرتی حسن سے بہت ہی لطف اندوز ہوا۔ رنگروٹ بھرتی ہو کر سنٹر میں آئے تو ایک سال میں اپنی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد فیلڈ یونٹوں میں پوسٹ ہو کر چلے جاتے۔ ایک میں تھا کہ دو سال سے زیادہ عرصہ سنٹر میں آئے ہوئے ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کشتیٔ حیات حوادث کا شکار کنارے کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

دسمبر کے دن تھے میں رات کو تقریباً ساڑھے نو بجے سنٹر کی کینٹین سے ریڈیو سن کر واپس آیا۔ میں نے آتے ہی اپنی چارپائی پر پڑا ہوا ایک خط دیکھا۔ یہ خط میرے بھائی کا تھا۔ میں نے کھول کر لالٹین کی روشنی میں پڑھا تو چکرا کر چارپائی پر گر پڑا۔ مجھ میں اب مزید تکلیفیں برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔ جس ہستی کے بل بوتے پر میں بڑے بڑے فرعونوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ ہستی گیارہ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

میرے بھائی نے لکھا تھا کہ والد محترم از رضائے الٰہی گیارہ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مشن ہسپتال بنوں میں فوت ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع چونکہ مفقود تھے۔ اس لیے ان کی میت کو گاؤں نہیں لے جا سکے اور بنوں کے قبرستان ہی میں ان کو سپردِ خاک کر دیا ہے۔ نہ جانے میں کب تک بے سدھ اپنی چارپائی پر پڑا رہا۔ دوسرے دن ہی سے میں نے اپنی چھٹی کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن مجھے کمپنی کمانڈر کی طرف سے جواب ملا کہ چونکہ ابھی تک تمہاری ٹریننگ مکمل نہیں ہوئی۔ اس لیے چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں ایک عجیب سی پریشانی کے عالم میں تھا۔ میری دنیا لٹ گئی تھی۔ اور فوج والوں کو اپنی ٹریننگ کی پڑی ہوئی تھی۔ میں سوچتا میں اب نوکری کر کے کیا کروں گا۔ میں دو تین دن تک ایک عجیب سے گومگو کے عالم میں رہا۔ کچھ سمجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا قدم اٹھاؤں۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں پامر صاحب یا کٹی صاحب کو جا کر سب صورتحال سے آگاہ کرتا ہوں۔

دوسرے دن میں بٹالین آفس میں صوبیدار ہیڈ کلرک کٹی کرشنا نائر صاحب کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے مجھے پریشانی کے عالم میں دیکھا تو کہنے لگے۔

خیریت تو ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے نظر آتے ہو۔ پھر تو کسی سے لڑائی نہیں ہو گئی۔

نہیں سر۔ لڑائی تو بہت معمولی چیز ہے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا اور نہ ہی اس سے اس قدر پریشان ہوتا ہوں۔ سر میرے بھائی کا خط آیا ہے کہ ۱۱ دسمبر کو میرے والد بزرگوار اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔

انہوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور نہایت سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ احمد مجھے یہ سن کر بے حد رنج ہوا ہے۔ یہ واقعی بہت ٹریجڈی ہوئی ہے۔ تمہارا شفیق اور شیر دل باپ جس کے بل بوتے پر تم کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے آج تم سے الگ ہو گئے ہیں۔ اب تمہارا سب زور ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ مجھے یہ افسوسناک خبر سن کر بے پناہ رنج ہوا ہے۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمہیں یہ جانکاہ حادثہ سہنے کی ہمت اور استقامت دے۔ آپ بتائیں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟

سر میں نے چھٹی کی درخواست دی ہے وہ کمپنی والوں نے مجھے واپس کر دی ہے کہ جب تک تم اپنی ٹریننگ مکمل نہیں کر لیتے چھٹی نہیں مل سکتی۔

آپ بیٹھیں میں ابھی پامر صاحب کو کہتا ہوں کہ وہ تمہارے کمپنی کمانڈر کو کہیں کہ وہ آج ہی تمہیں ایک ماہ کی چھٹی دیں۔

سر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں گا۔

ہیڈ کلرک صاحب پھر ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو کہنے لگے۔ پامر صاحب نے میجر ولنگٹن سے تمہاری چھٹی کے لیے کہہ دیا ہے۔ تمہارے کمپنی کمانڈر نے پامر صاحب کو بتایا ہے کہ یہ جوان کل ایک ماہ کی چھٹی پر بھیج دیا جائے گا۔

مجھے دوسرے دن ایک ماہ کی تنخواہ بطور ایڈوانس مل گئی۔ میں نے اپنی کٹ اور پرائیویٹ سامان پیک کر کے کمپنی کوارٹر ماسٹر کے پاس جمع کروا دیا۔ اور رات کی گاڑی سے ایک ماہ کی چھٹی پر روانہ ہونے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

میں جنوری ۱۹۴۰ء میں ایک ماہ کی رخصت پر گاؤں آگیا۔ میرا اب گاؤں میں کون تھا۔ میں دو سال کا بچہ تھا تو ماں مر گئی تھی۔ اب والد بھی فوت ہو گئے تھے۔ دوسرا بھی بھائی سوائے بڑے سوتیلے بھائی کے نہ تھا۔ وہ بھی اپنی ملازمت کے سلسلے میں گاؤں سے باہر تھے۔ جب سے میرے والد نے میری شادی کی تھی۔ میری بہن (جاورج) بھی اب پہلے کی طرح مجھ سے پیار نہ کرتی تھی۔ میری بیوی میری رشتہ دار تھی لیکن وہ بیچاری بھی یتیم لڑکی تھی۔ جب یہ چار پانچ سال کی تھی تو اس کا باپ بھی فوت ہو گیا تھا۔ اس کا بھی اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ میری بیوی کے نام کوئی پانچسو کنال کے قریب زرعی اراضی تھی۔ لیکن اس کے دادا حکیم امیر خان نے ایک دن دھوکہ دہی سے کوئی دوسری برقعہ پوش خاتون تحصیلدار کے سامنے پیش کر کے جملہ اراضی اپنے نام منتقل کروالی۔ اسی دن ایک آدمی نے میرے والد صاحب کو آکر بتایا کہ تمہاری بیٹی (بہو) کی زرعی اراضی کا انتقال حکیم امیر خان نے اپنے نام کروالیا ہے۔ اور کوئی دوسری برقعہ پوش عورت پیش کر کے اس کے بیان کروا دیے۔ میرے والد نیک بخت آدمی نے کوئی سنجیدگی سے اس کا نوٹس نہ لیا۔ وہ جب اپنی فوج میں ہوتے تو بڑے سے بڑے نقصان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایسی ہر بات کا جواب ان کے ہاں ہلکی سے مسکراہٹ تھی۔ اس آدمی کے بتانے پر میرے والد ہلکا سا مسکرائے اور اسی آدمی سے کہنے لگے۔

حکیم امیر خان نے اپنی عاقبت خراب کی ہے۔ مجھے اس زمین کے چلے جانے کا کوئی رنج نہیں ہے۔ اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے مجھے کافی سے زیادہ زمین دے رکھی ہے۔ امیر خان نیک بخت اگر مجھ سے بات کرتا تو میں یہ زمین اسے خوشی خوشی دے دیتا۔ یہ اراضی آخر اس کے مرحوم بیٹے ہی کی پیدا کردہ ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس قدر زمین اپنے حصے سے دے دوں گا۔ امیر خان نے

خواہ مخواہ اپنی قبر خراب کی ہے۔ اللہ اس کو جزائے خیر دے۔
میرے خاندان کے سب لوگ کہا کرتے تھے کہ اس کے بعد پھر ملک صاحب نے کبھی بھی اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔ بلکہ زندگی بھر امیر خان کے ساتھ ہنسی خوشی ملتے تھے اور ان کے ساتھ آخر دم تک اچھے مراسم قائم رکھے اور مرتے دم تک امیر خان کے ساتھ اپنے تعلقات میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔

○

میں پورے دو سال اور دو ماہ کے بعد واپس گاؤں لوٹا تھا۔ سب رشتہ داروں نے میری بڑی اچھی طرح سے پذیرائی کی۔ کئی روز تک میرے عزیز و اقارب اور گاؤں کے دوسرے لوگ میرے پاس میرے والد کی فوتیدگی پر اظہارِ تعزیت کے لیے آتے رہے۔ چند روز تک تو میں زیادہ وقت گھر پر ہی گذارتا۔ آخر جب لوگوں کا آنا ذرا کم ہوا تو میں پھر کر نواب خان کے حجرہ پر جانے لگا۔ اب وہاں بیٹھنے اور گپ شپ کرنے میں مجھے پہلے کی طرح کا مزا نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ کھڑا ہوتا پرانے ساتھی بیٹھنے کے لیے تقاضا کرتے۔ لیکن شاید گاؤں سے باہر جا کر اب میری نظر میں کچھ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اب مجھے حجرہ نواب خان میں بیٹھنے میں وہ پہلا سا لطف نہ آتا۔ میں سوچتا ہمارے گاؤں میں دنیا کی وہ رنگینیاں نہیں ہیں، جو گاؤں سے باہر شہروں میں میسر ہیں جو ہم گاؤں کے سادہ طرح لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور پھر ہم لوگ ان ترغیبات سے اپنا پہلو نہیں بچا سکتے۔
ابھی مجھے گاؤں چھٹی پر آئے ہوئے کوئی بیس دن ہی ہوئے تھے کہ مجھے سگنل ٹریننگ سنٹر جبل پور سے ایک سرکاری چھٹی موصول ہوئی۔ فوجی جب اپنے گھروں پر چھٹی گذار رہے ہوں تو اس طرح کی سرکاری چھٹی اگر انہیں موصول ہو تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا میں نے بادلِ نخواستہ وہ چھٹی کھولی۔ اس میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ میرا بھی پوسٹنگ آرڈر تھا۔

مجھے بھی ان کے ساتھ کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل میں پوسٹ کر دیا گیا تھا۔ میرے نام کے سامنے ریمارک دیے گئے تھے کہ یہ سپاہی ایک ماہ کی رخصت پہ ہے۔ ۷ر فروری ۱۹۴۰ء کو اپنی چھٹی کے اختتام پہ ڈائریکٹ اپنی نئی یونٹ میں رپورٹ کرے گا۔ اس موومنٹ آرڈر (MOVEMENT ORDER) کے ساتھ ایک الگ سرکاری چھٹی میرے نام تھی۔ جس کا متن یہ تھا۔

۵ر جنوری ۱۹۴۰ء سے تمہارا پوسٹنگ کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل میں کر دیا گیا ہے میانوالی سے کوہاٹ چھاؤنی تک کا ریلوے وارنٹ منسلک ہے۔ میانوالی سے جبلپور تک ریلوے واؤچر جو تمہارے پاس ہے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ واپس بھیج دو۔ سگنل میں بہادر کو تمہاری سرکاری کٹ اور پرائیویٹ سامان جس کی فہرست لف ہے دے دیا گیا ہے۔ چھٹی کے اختتام پر یعنی ۷ر فروری ۱۹۴۰ء کو آپ اپنی نئی یونٹ میں رپورٹ کریں۔

دستخط × × ×
میجر ولنگٹن
'E' کمپنی کمانڈر
سگنل ٹریننگ سنٹر جبلپور

یہ چٹھی جب میں نے پڑھی تو مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ صوبیدار میجر نے میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر بھرپور وار کیا تھا۔ موومنٹ آرڈر پر میرے نام کے سامنے میرا ٹریڈ (A.T.) A.S. لکھا ہوا تھا۔ صوبیدار میجر یہی چاہتا تھا کہ میری گستاخی کی سزا وہ مجھے اس صورت میں دے۔ شاید سنٹر سے میرے چلے آنے کے بعد اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور میں ایک ماہ کی رخصت پہ گاؤں چلا گیا ہوں۔ اس صورت میں اب اسے اطمینان ہو گیا ہو گا کہ اب ملک المنظم کو اپنے گیلنٹری ایوارڈز واپس کرنے والا شخص اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہے اور اب اس نحیف و نزار سے لڑکے کی مدد کے لیے کوئی نہ آئے گا۔ اب کیپٹن

بیرج بھی وہاں نہ تھا۔ اس کا والد جو ایک ریٹائرڈ جنرل تھا۔ اب وہ بھی ۸۰ ہاکیوری کے کسی دفعدار میجر کی مدد کو نہ آ سکے گا۔ اب صوبیدار میجر اور اس کے حواریوں کو اپنے کچے چھٹے کے کھل جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

سپاہی بہادر خان جس کو میری کٹ اور دوسرا سامان دیا گیا تھا۔ تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کا رہنے والا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ میں رہنے والا تو ضلع کیمبل پور (اٹک) کا تھا لیکن میری دوستی اور تعلقات ہمیشہ میانوالی کے لوگوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی میں جب زیر تعلیم تھا تو یہاں کے لوگوں کی عادات و خصلات اور شجاعت و مردانگی کی روایات کے باعث میرے ذہن پر ان باتوں کا ایک دیرپا اثر مرتب ہوا جو میں اب تک نہیں بھول سکا۔ دوسرے لوگوں کی نسبت میانوالی کے لوگ اچھے دوست ہوتے ہیں جو ہر مشکل وقت میں اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھاتے ہیں۔ اور کبھی مشکل میں پیٹھ پھیر کر اکیلا نہیں چھوڑتے۔

میں نے سوچا بہادر خان کو خط لکھ کر جملہ صورتِ حال سے آگاہی حاصل کروں۔ ان کم بخت سنٹر والوں نے چھٹی کے بقایا دن چین سے کاٹنے کے مواقع ختم کر دیے گاؤں آ کر ان دس پندرہ دنوں میں میں نے جو آسودگی محسوس کی تھی وہ اب پھر رنج و محن اور بے اطمینانی کی نذر ہوتی ہوئی محسوس کرتا تھا۔

میں نے دوسرے دن بہادر خان کو واپسی کا خط لکھا۔ چار دن کے بعد اس کا مفصل جواب آ گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ صوبیدار میجر کا تمہارے پوسٹنگ میں سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ مجھے بابو فضل الرحمان نے بتایا تھا کہ کرنل پولارڈ نے احمد کے متعلق ایک خفیہ سرکاری لیٹر کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل کے کمانڈنگ آفیسر کو بھی لکھا ہے۔ کہ یہ جوان قابلِ اعتبار سپاہی نہیں ہے۔ شوریدہ سر اور کانگرسی نظریات رکھتا ہے اسے کسی دفتری کام پر بھی نہ لگایا جائے۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ میٹرک تک پڑھا ہوا ہے اور بڑی شستہ اور رواں انگریزی بولتا ہے لیکن اس کے

باوجود میں اس بات کی سفارش کرتا ہوں کہ اسے مستقل طور پر (A.T.) A.O.S کے طور پر جبر سے رکھا جائے اور یہ اگر اس بات پر آمادہ نہ ہو تو اسے کڑی سزا دی جائے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اس کا سمری کورٹ مارشل نہ کیا جائے کہ یہ ایک ہی دفعہ سزا کاٹ کر پھر کھلے بندوں حکومت برطانیہ کے خلاف متواتر زہر اگلتا رہے۔ جب یہ چھٹی کے بعد یونٹ میں حاضر ہو جائے تو اسے مستقل طور پر زیر نگرانی رکھا جائے۔

بہادر خان نے مزید لکھا کہ جب ہم کوہاٹ پہنچے اور دوسرے دن سٹاف پریڈ کے لیے آئے تو سینئر سردار نے پوچھا۔

تم میں سے احمد کون ہے؟

مگر وہ ایک ماہ کی چھٹی پر ہے۔ چھٹی کے خاتمے پر یہاں ہی رپورٹ کرے گا۔ میں نے اس کے سامنے وضاحت کی۔

پھر صوبیدار میجر اور ہیڈ کلرک نے بھی یہی بات پوچھی۔ ان کو بھی بتا کر ان کی تسلی کر دی گئی ہے۔ سب کو بتا دیا گیا ہے کہ ۲ فروری کو کوہاٹ میں رپورٹ کرو گے۔ سب لوگ بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ جتنے لڑکے پوسٹ ہو کر یہاں آئے ہیں۔ سب کا پوسٹنگ مختلف سیکشنوں میں ہو گیا ہے۔ میرا اور آپ کا پوسٹنگ "D" سیکشن میں ہوا ہے۔ جس میں سب گھوڑے ہیں۔ لڑکے صبح ریویلی کے ساتھ ہارس لائن میں جاتے ہیں۔ گھوڑوں کی معمولی سی مالش کرتے ہیں۔ اور پھر ان کو پھیری (ایکسرسائز) کے لیے باہر لے جاتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آکر پھر باقاعدگی سے گھوڑوں کی مالش کرتے ہیں پھر اس کے بعد ایک گھنٹہ صفائی ہوتی ہے۔ ایک بجے چھٹی ہوتی ہے۔ چار بجے کھیلوں کے لیے فالن کرتے ہیں۔ آدھے لڑکے ہارس لائن چلے جاتے ہیں اور آدھے کھیلوں پر۔ کھیلوں سے واپس آکر شام کا کھانا وغیرہ کھاتے ہیں اور پھر سکنتی (رول کال) پر چلے جاتے ہیں تقریباً آدھ گھنٹہ رول کال پر خرچ ہوتا ہے۔ رول کال کے بعد عہدیدار (N.C.Os) اور لڑکے سارے شہر کا چکر لگاتے ہیں۔ ہماری یونٹ لائینز بالکل کوہاٹ شہر سے۔

بازار دس منٹ کا پیدل راستہ ہے۔ یہاں ایک ہی لمبا سا بازار ہے۔ جہاں نسوار زیادہ بکتی ہے۔

یونٹ لائنز کے مین گیٹ پر جو سنتری ہوتا ہے وہ سنتری سے نئے والوں کو بازار نہیں جانے دیتا۔ ہم لوگ انگیٹھی کے پاس کمبل بچھا کر رات دس بجے تک خوب مزے سے پیس کوٹ کھیلتے ہیں۔ کل مجھ سے ہمارے سیکشن حوالدار گوردیال سنگھ نے پوچھا تھا۔

بھئی بہادر خان وہ تمہارا پھنے خاں کب آئے گا۔ اس کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔

کون پھنے خان۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

بھئی کیا نام ہے اس کا۔ شاید احمد ہے۔ جس نے سنٹر میں سب لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

نہیں جی۔ وہ تو بڑا شریف لڑکا ہے۔ میں نے پُرا اعتماد لہجے میں اس سے کہا۔

جبھی تو اس کی شرافت کے قصے اس کے پہنچنے سے پہلے سرکاری طور پر یہاں ارسال کر دیے گئے ہیں۔

حوالدار جی! آپ کو کیسے پتہ چلا۔

سینئر سردار نے مجھے بتایا ہے اور خصوصی طور پر ہدایت کی ہے کہ وہ لڑکا جب آئے تو اس پر کڑی نگرانی کرنا۔

بہادر خان کے خط سے سب صورت حال واضح ہوگئی۔ میں سوچنے لگا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ کیا میں زندگی بھر ان بدی کی قوتوں کا مقابلہ کر سکوں گا۔ سب لوگ اپنی اپنی ملازمت احسن طریقے سے کر رہے تھے۔ کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک میں ہوں کہ جہاں بھی جاتا ہوں وہاں محاذ آرائی شروع کر دیتا ہوں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ابھی میں اپنی نئی یونٹ میں پہنچا بھی نہیں۔ ابھی سے میرے خلاف بدی کی قوتیں مجتمع ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ ان سب لوگوں کو نہ جانے کیوں مجھ سے خدا واسطے کا بَیر ہے۔ میرا پوسٹنگ بھی کم بختوں نے گھوڑوں والی سیکشن میں کیا ہے اور میں ہوں کہ

میں نے رائڈنگ کا کورس (گھڑ سواری) ہی پاس نہیں کیا۔ ہارس مینجمنٹ (HORSE MANAGEMENT) تک نہیں جانتا۔ کچھ عجیب ہی صورت حال ہوگی۔ خیر چھوڑو ان جھمیلوں کو۔ کوہاٹ پہنچ کر دیکھا جائے گا۔ اس وقت یہ قبل از مرگ واویلے والی بات ہے۔ چھٹی کے بقایا دن تو مزے سے گزاروں۔ میں نے بہادر خان کو خط لکھ دیا کہ میں فروری کی صبح کو ان شاء اللہ کوہاٹ پہنچ جاؤں گا۔

## ۵

میرے والد کے انتقال کے بعد بیشتر رشتہ داروں کے رویوں میں تبدیلی رونما ہونے لگ گئی۔ میں اپنے بھائی کا مخالف تو نہ تھا لیکن نہ جانے کیوں سب رشتہ دار میرے مقابلے میں میرے بھائی کی زیادہ طرف داری کرتے۔ وہ مجھے ہر معاملے میں نظرانداز کر دیتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرے بھائی کے ننھیال میرے ہی خاندان کے لوگ تھے۔ جبکہ میرے ننھیال ایک دور کے خاندان سے تھے۔ جن کا ہمارے خاندان کے مقابلے میں رعب داب اور دبدبہ ذرا کم تھا۔ یہ سب باتیں سوچ کر گاؤں میں میں کبھی کسی کے مقابلے پر نہیں آیا۔ لہٰذا رسوائی کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

دن گزرتے گئے۔ آخر ۹ فروری ۱۹۴۰ء کا سورج طلوع ہوا۔ جس کے ساتھ مجھ پر پژمردگی اور ناکامی کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ اپنی نئی یونٹ میں جاتا ہی نہیں۔ چند دنوں کے لیے تو پولیس کو پتہ ہی نہ چلے گا کہ میں فوجی بھگوڑا ہوں۔ جب ان کے پاس اطلاع آ جائے گی تو میں گاؤں سے دور کسی دوسرے گاؤں میں چلا جاؤں گا۔ پھر سوچا میری اس حرکت سے پورے خاندان کے وقار کو بٹہ لگے گا۔ سپاہی پیشہ خاندان کا فرد ہوں۔ پھر سب فوجی بھگوڑا کہیں گے۔ یہ کس قدر ناکامی اور رسوائی کی بات ہوگی۔ باپ گیلنٹری ایوارڈ ہولڈر تھا۔ بیٹا فوج سے بھاگ کر چھپتا پھر رہا ہے۔

نہیں نہیں۔ میں ضرور کوہاٹ اپنی نئی یونٹ میں جاؤں گا۔ جبل پور کے قیام کے دوران میں نے جس قدر صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ان سے بڑھ کر کسی تکلیف کا امکان

نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی تک اسی گومگو کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرا خالہ زاد بھائی اکبر خان اور ایک اور عزیز فتح خان، پچتواں رکوڑے گر پہنچ گئے۔ ان تینوں نے گاؤں سے تین چار میل دور مجھے لاری پر سوار کرانا تھا۔ اکبر خان نے آتے ہی للکارتے ہوئے کہا۔

اوئے گھمبیر دار سست آدمی، تو ابھی تک تیار نہیں ہوا۔ اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

میں تو تیار ہوں۔ سامان باندھ رکھا ہے۔ فتح محمد بھی آگیا ہے۔ بس اب چلتے ہیں۔

بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے لاری نکل جائے گی۔ جلدی کرو۔

اکبر خان حویلی کے اندر سے میرا ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس اور ایک پوٹلی جس میں مرونڈا تھا، اٹھا کر باہر لے آیا۔ اور ہم سب کو جلد از جلد چلنے کی ہدایت دینے لگا۔ بکس فتح محمد نے سر پر اٹھا لیا اور فتح خان نے مرونڈے والی پوٹلی اٹھالی۔ گاؤں سے جب تھوڑے فاصلے پر آ گئے تو اکبر خان کی ہدایت پر فتح خان نے پوٹلی سے مرونڈا نکال کر سب کو دیا۔ ہم گپیں ہانکتے اور مرونڈا کھاتے ہوئے اڈا پر پہنچ گئے۔ وہاں پہلے سے اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ لاری ابھی تک نہیں آئی۔ وہاں قریب ہی ایک بیری کا درخت تھا۔ جس پر اکبر خان چڑھ گیا۔ اور اس نے اسے خوب اچھی طرح سے ہلایا۔ پکے ہوئے بیروں سے زمین لال ہو گئی۔ سب لوگوں نے اپنی جیبیں بھر لیں۔ ابھی زمین پر بہت بیر پڑے ہوئے تھے کہ دور سے لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔ اکبر خان میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں جدائی کا غم نہایت واضح تھا۔

لاری ایک دھچکے کے ساتھ آکر رک گئی۔ لاری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس میں مزید کسی آدمی کے بیٹھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان دنوں یہی ایک لاری میانوالی سے لاوہ تک آتی جاتی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس سے رہ گیا تو کل سات فروری ہے۔ مقررہ وقت پر کیسے اپنی یونٹ میں حاضر ہو سکوں گا۔ کہیں بسم اللہ ہی غلط ہو جائے۔ ڈرائیور نے کھڑے ہوئے سب لوگوں کو کہا کہ جلدی سے چھت پر چڑھ جاؤ۔ سردی

کے دن تھے۔ کھلی چھت پر بیٹھ کر بیمار پڑجانے کا خطرہ اپنی جگہ پر تھا۔ لاری کے اندر سے میرے سکول کے زمانے کے ایک دوست نے آواز دی۔

احمد اوپر آجاؤ۔ گذارا کرلیں گے۔

میں نے اکبر خان کو کہا کہ بکس چھت پر رکھ دو۔ میں ان کو گلے مل کر شکستہ دلی کے عالم میں لاری کے اندر چلا گیا۔ وہ میرے تینوں ساتھی میرے سامنے کی کھڑکی میں آگئے۔ جب تک لاری کھڑی رہی وہ میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جارہا تھا اکبر خان کے چہرے پر پژمردگی اور مایوسی کے اثرات نہایت نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ ڈرائیور نے بھونپو بجا کر چلنے کا اعلان کیا۔ اکبر خان اور فتح خان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے رخصت کررہے تھے۔ اسی طرح کے روح فرسا لمحات بھی عجیب طرح کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ آج سے تقریباً دو اڑھائی سال قبل میرے والد، بھائی اور زرینہ نے بھی مجھے اسی طرح سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رخصت کیا تھا۔ زرینہ بے چاری لاری سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی سسکیاں لے رہی تھی، آنسوؤں کی اوٹ سے مجھے ایک انجانے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ آج نہ جانے زرینہ بے چاری کہاں ہوگی۔ میرا شفیق باپ بھی تو نہیں ہے۔ محبت کرنے والا بھائی بھی تو یہاں موجود نہیں۔ وہ حسن کے مندروں کی حسین دیوی زرینہ بھی تو آج مجھے آخری بار الوداع کہنے نہ آئی تھی۔ شاید اسے میرا گاؤں آنے کا پتہ ہی نہ ہو۔ اور یقیناً پتہ نہ ہوگا۔ میں اس سے ملنے بھی تو نہیں گیا۔ ان دو اڑھائی سالوں میں وہ کتنی بدل گئی ہوگی۔ شاید وہ آج کل گاؤں میں نہ ہو۔ بلکہ شیر خان اسے اپنے ساتھ کسی فیملی سٹیشن پر لے گیا ہو۔ لیکن مجھے تو اس کا پتہ کرنا چاہیے تھا۔ دو سال سے زائد عرصہ گذر گیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ بھی تو پتہ نہیں چلا۔ وہ مجھے خط لکھ سکتی تھی۔ میں تو اسے خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اسے پھر کسی نئے احمد کے سہارے کی ضرورت پڑے گی تو کیا وہ عمر بھی ان کمزور سہاروں کی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہے گی اور یہ سہارے تو کچے دھاگے کی مانند ہوتے ہیں

جو ایک ہی ہلکی سی جنبش سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

لاری اب کوہِ ڈھک کی دشوار گذار چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ اعظم خان میرے سکول کے زمانے کے دوست نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

احمد تم جبل پور سے کب آئے تھے؟

اعظم بھائی۔ ایک ماہ کی چھٹی گذار کر واپس جا رہا ہوں۔

تمہارے بعد اشرف اور حبیب خان بھی سگنل میں بھرتی ہوئے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی رنگروٹی پاس کر کے فیلڈ یونٹوں میں چلے گئے ہیں اور تم ہو کہ جبل پور کو چھوڑتے ہی نہیں۔

نہیں اعظم بھائی۔ میں تو جبل پور سے تبدیل ہو کر اب کوہاٹ آگیا ہوں۔

اب تم کوہاٹ جاؤ گے؟

جی ہاں۔

لاری اب چڑھائی چڑھ کر اوپر آگئی تھی۔ میں اب بھی چوری نظروں سے شاہ والی بن کی ٹاہلیاں اور لاوہ کی بلند و بالا عمارتیں دیکھنے میں منہمک تھا۔ آدمی عمر کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ ہو اس کے اندر اس کا جو بچپن چھپا ہوا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی مرحلے پر عود کر ہی آتا ہے۔ شاہ والی بن کی ٹاہلیوں سے میری بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ لاوہ کی بلند و بالا عمارتوں کے قرب و جوار میں زرینہ کی حسین یادیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں سوچتا یہ عجیب بات ہے کہ میں ایک ماہ تک گاؤں میں رہا تو زرینہ کی یاد نہیں ستایا اور اب جبکہ میں گاؤں سے واپس جا رہا ہوں تو زرینہ کی حسین یادیں بُری طرح ستا رہی ہیں۔ سچ ہے یاس اور ناامیدی کے عالم میں اپنے پیارے ہی یاد آتے ہیں۔ آدمی جب خوش ہو تو اسے اپنے ارد گرد کے ماحول کا خیال ہی نہیں رہتا۔

لاری اسی بے ڈھنگی چال سے ہچکولے کھاتی ہوئی میانوالی کی طرف رواں دواں تھی کوئی دس بجے کے لگ بھگ لاری میانوالی کے اڈا پر جا پہنچی۔ سب لوگوں نے اپنا اپنا سامان اُٹھایا اور اپنی منزل کی راہ لی۔ میں اپنا سامان اُٹھا کر ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ بڑی اُداسی اور رنج والم کے عالم میں وہ دن کٹا۔ شام کو سات بجے گاڑی آئی۔ یہ گاڑی ملتان سے

راولپنڈی کو جاتی تھی۔ کوہاٹ جانے کے لیے مجھے اس گاڑی پر سوار ہونا تھا اور پھر اسے جنڈ ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر راولپنڈی سے کوہاٹ جانے والی گاڑی پر سفر اختیار کرنا تھا۔

ہماری گاڑی بارہ بجے رات جنڈ ریلوے سٹیشن پر پہنچی۔ جیسے جبل پور جانے والوں کے لیے بنیا ایک فضول سا ریلوے سٹیشن ہے۔ اسی طرح سے میانوالی سے کوہاٹ جانے والوں کے لیے جنڈ ہے۔ جنڈ ایک ویران سا سٹیشن ہے۔ کہنے کو تو یہ جنکشن ہے۔ لیکن اس میں بڑے ریلوے سٹیشنوں کی کوئی ایک بات بھی نہیں۔ نہ اس ریلوے سٹیشن کا کوئی پلیٹ فارم نہ کوئی ہوٹل اور نہ کوئی رتی۔ جنڈ میں بلا کی سردی پڑتی ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے کوئی معقول مسافر خانہ نہیں۔ دو گھنٹے تک مسلسل یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے سہنے پڑے۔ خدا خدا کر کے دو بجے کے قریب راولپنڈی سے کوہاٹ جانے والی گاڑی آئی۔ ریلوے والوں کا نہایت ناقص انتظام۔ گاڑی بہت دور جا کر رکی اس پر سوار ہونے والے سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے، ریلوے لائن کی پٹڑیاں پھلانگتے ہوئے ایک ہاؤ ہو کے عالم میں گاڑی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ لوگ بے چارے افراتفری کے عالم میں پٹڑی کے متوازی لگی ہوئی سگنل کی تاروں میں الجھ کر جا بجا گر جاتے۔ گرتے پڑتے گاڑی تک جا پہنچے تو پنڈی سے آنے والے مسافر جو محو خواب تھے انہوں نے دروازوں کو اندر سے بولٹ کر رکھا تھا۔ باوجود کھٹکھٹانے اور شور مچانے کے بھی کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ آخر کار مجبور ہو کر میں نے ریلوے گارڈ کے پاس جا کر شکایت کی۔ وہ نہایت بے اعتنائی سے کہنے لگا۔

"بھائی صاحب جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاؤ۔"

مرتا کھپتا۔ سامان اٹھائے، ادھر ادھر میں بھاگتا پھرا۔ کہیں بھی جگہ میسر نہ آئی۔ آخر کار گارڈ کے ڈبہ کے سامنے والے ایک ڈبے کا دروازہ کھلا تو بڑی مشکل سے میں اس کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوا۔ اندر تو پہنچ گیا لیکن جو مسافر حضرات استراحت فرما رہے تھے۔ وہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ مجبوراً میں اپنے بکس پر ہی بیٹھ گیا اور گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کار گاڑی نے وسل دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف

چل پڑی۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ دور دور تک کہیں روشنی کا نام ونشان نہ تھا۔ جو لوگ سوئے ہوئے تھے ان کے ہلکے خراٹوں سے فضا اور بوجھل ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی دریائے سندھ کے پل پر گذر رہی تھی جو خوشحال گڑھ کے مقام پر واقع ہے اور صوبہ سرحد اور پنجاب کا سنگم ہے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ لیکن باہر ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ اور باوجود کوشش کے بھی کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ گاڑی پُل کو عبور کر کے خوشحال گڑھ کے چھوٹے سے سٹیشن پر جا کر رک گئی۔ گاڑی وہاں سے چلی تو گاڑی کے دونوں طرف پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا نظر آرہا تھا۔ عجیب و غریب نام کے دو تین اسٹیشن راستے میں آئے اور پھر گاڑی چار بجے صبح کوہاٹ چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی۔ میں اپنا بکس اُٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ وہاں کافی تعداد میں ٹانگے کھڑے تھے۔ ہر ٹانگہ بان سواریوں کا سامان اُچکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک ٹانگے میں تین سواریاں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی اس ٹانگے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور [illegible] چل پڑا میں نے ٹانگے والے کو بتایا کہ میں نے سگنل میں جانا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ سگنل کی یونٹ بالکل شہر کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ سڑک اس یونٹ کے مین گیٹ کے بالکل پاس سے گذرتی ہے۔ میں آپ کو وہاں گیٹ پر اُتار دوں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر بیٹھے رہیں۔

ریلوے سٹیشن کوہاٹ شہر سے کوئی زیادہ دور نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلے پر ہوگا۔ ٹانگے والے نے مجھے میکوٹین لائنز کے گیٹ پر اُتار دیا اور وہ کرایہ لے کر شہر کی جانب چلا گیا۔ سنتری گیٹ سے دور کوارٹر گارڈ کے قریب کھڑا تھا مجھے دیکھا تو آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے مین گیٹ کی طرف آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

کہیں گرائیں کیا بات ہے۔ (فوج کے لوگوں کا تکیہ کلام ہی گرائیں ہوتا ہے۔ وہ جب بھی کسی اجنبی آدمی کو مخاطب کرتے ہیں تو اسی نام سے کرتے ہیں۔ اس

لفظ کے معنی ہیں۔ " اے میرے گاؤں کے ساتھی "۔)

میں اس یونٹ میں پوسٹ ہو کر آیا ہوں۔

کہاں سے۔؟

جبل پور سے۔

باقی آدمی کہاں ہیں۔ سنٹر سے تو پوسٹنگ کرنے والے ڈرافٹ کی صورت میں ہوتے ہیں۔ سنٹر سے ایک آدھ آدمی تو نہیں آتا۔

میں چھٹی پر تھا اس دوران میں میرا پوسٹنگ اس یونٹ میں ہو گیا ہے۔

سنتری نے آگے بڑھ کر گیٹ کا تالا کھولا اور پھر مجھے اپنے ساتھ گارڈ کمانڈر کے پاس لے گیا۔

گارڈ کمانڈر بڑا تند خو عہدیدار تھا۔ سویا ہوا تھا۔ سنتری کے ڈسٹرب کرنے پر بہت بگڑا۔ بستر میں لیٹے لیٹے رضائی سے منہ نکال کر ایک نظر مجھے غور سے دیکھا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

اوئے تم اس وقت اکیلا کدھر سے آگیا ہے؟

میں نے اسے سب صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ مطمئن ہو گیا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

تمہارا نام کیا ہے!

میرا نام احمد ہے۔

تو جبل پور میں کلرک تھا۔

جی ہاں۔

اچھا۔ اچھا۔ تم تو بڑے نامی گرامی آدمی ہو لیکن ہو ایک چپت کی مار۔

چپت مار کر دیکھ لو۔ میں نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

او۔ یار۔ تم تو یونہی ناراض ہو رہے ہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تم کوئی ڈبنگ آدمی نظر نہیں آتے۔

اس نے سنتری کو کہا کہ اسے یونٹ لائنز میں لے جاؤ اور ڈی کمپنی کی بیرک میں پہنچا دو۔ میں اس سنتری کے ساتھ بیرک میں پہنچا تو سب سپاہی ابھی سو رہے تھے۔ اس نے دیا سلائی جلائی اور کمرے کا جائزہ لینے لگ گیا۔ کونے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر ایک لپٹا ہوا بستر رکھا تھا۔ اس نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔

یہ بستر بچھا کر سو جاؤ۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر تم کو کس نے آرام کرنے دینا ہے۔

کیوں۔ گرامیں۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس سے کہا۔

بھیا۔ اس لیے کہ تمہارے متعلق سنٹر سے یہاں لیٹر آ چکے ہیں۔ جن میں تمہارا سب کچا چٹھا درج ہے۔ اس یونٹ کے سب ہی بااختیار لوگ شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

کیوں۔ میری تکا بوٹی کرنے کے لیے۔

کچھ ایسی صورت ہے۔ میں اگلے دن دفتر اردلی تھا۔ اسی دن سنٹر سے تمہارے متعلق ایک مفصل لیٹر آیا تھا۔ ہیڈ کلرک صاحب نے لیٹر پڑھ کر صوبیدار اکبر علی صاحب کو سب سمجھایا اور اس لیٹر پر اپنے کرنل صاحب کے جو ریمارک تھے ان سے خصوصی طور پر ان کو آگاہ کیا اور عمل درآمد کرنے کی سخت تاکید کی۔ یہ سب لوگ اب بڑی بیتابی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ صوبے دار اکبر علی کون ہے؟

مینیجر سردار ہے۔

کہاں کا رہنے والا ہے؟

گجرات کا۔

کیسا آدمی ہے۔؟

اچھا آدمی ہے۔ مسلمانوں کی بڑی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرتا ہے۔

ہیڈ کلرک نے اس دن ان کو وہ لیٹر پڑھ کر سنایا اور کرنل صاحب کے ریمارکس سے آگاہ کیا تو ان کا اپنا ردعمل کیا تھا۔

انہوں نے ہیڈ کلرک کو کہا کہ سنٹر کے صوبیدار میجر صاحب کو تو راولپنڈی کے علاوہ دوسرے ضلعے کے آدمی پسند ہی نہیں آتے۔

وہ سنتری مجھے وہاں چھوڑ کر واپس کوارٹر گارڈ کی طرف چلا گیا۔ صبح طلوعِ آفتاب کے ساتھ میری آنکھ کھلی۔ بیرک کے پرانے سپاہیوں نے مجھے متجسسانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سب اپنے اپنے مگ میں لنگر سے چائے لے کر روٹی ہاتھ میں پکڑے ہوئے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ بھائی تم کون ہو۔ آخرکار تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی، جس کے بستر میں میں سویا ہوا تھا گارڈ ڈیوٹی سے واپس آگیا۔ میرے پاس آکر مجھ سے پوچھنے لگا۔

برخوردار آپ کس کے مہمان ہیں؟

جی ہاں۔

کس کے؟

سرکار بہادر کے

بھئی۔ مجھے نہ بہکاؤ۔ اپنا صحیح تعارف کرواؤ۔

حضور والا۔ میرا نام احمد ہے۔ میں جبل پور سے پوسٹ ہو کر آج ہی یہاں پہنچا ہوں۔

کوئی نیا ڈرافٹ آیا ہے؟

جی نہیں۔ میں اکیلا ہی آیا ہوں۔ میرے ساتھی چند دن پہلے یہاں آ چکے ہیں۔ میں چھٹی پر تھا۔ چھٹی کے خاتمہ پر یہاں رپورٹ کرنا تھی۔

اچھا تو وہ آدمی ہو جو سنٹر میں کلرک تھے اور جسے وہاں کے صوبیدار میجر نے اپنی ذاتی پرخاش پر کلرکی سے نکلوا کر (A.T.) A.S. بنوا دیا اور اس یونٹ میں پوسٹ کر دیا ہے۔

جی جناب میں وہی آدمی ہوں۔ آپ نے خوب پہچانا۔

یار تم کچھ بچے نہیں ہو۔ دُبلے پتلے سے کم عمر لڑکے ہو۔ تم نے سنٹر میں بڑے بڑے فرعونوں کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ یہ یقین نہیں آتا کہ اتنا کم عمر لڑکا باہمت اور سخت جان بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا۔

زندہ باد

خوش آمدید

کمرے کے سب سپاہی اکٹھے ہو گئے۔ اور زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہ نعرے سُن کر دوسرے کمروں کے سپاہی بھی آ گئے اور جب ان کو پتہ چلا کہ سنٹر سے وہ لڑکا آ گیا ہے جس کا سب افسروں کو انتظار ہے تو وہ سب مجھے دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ میں محترم بنا سر جھکا کر اسی بستر میں ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سپاہی جلدی سے میرے لیے لنگر سے ایک مگ چائے اور ایک کاغذ میں گرم گرم پوری لپیٹ کر لے آیا۔ گویا یہ میرا استقبالیہ تھا۔ یہ ہڑبونگ سُن کر حوالدار میجر محمد دین جو اسی بیرک کے سرے پر ایک سائیڈ روم میں رہتا تھا۔ وصوتی باندھے ہوئے وہاں آ گیا۔ سب لڑکے چپ کھڑے ہو گئے۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

کیوں شور مچاتے ہو۔ پریڈ پر جانے کی تیاری کیوں نہیں کرتے۔ بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔

غلام یاسین جس کے بستر میں لیٹا ابھی تک آنے والے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ حوالدار میجر سے کہنے لگا۔

سر یہ نیا لڑکا احمد جبل پور سے آیا ہے

کون احمد؟

سر۔ پچھلے دنوں جبل پور سے جو ڈرافٹ آیا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکا چھٹی پر تھا۔ اب چھٹی گذار کر آج صبح ہی آیا ہے۔

اچھا۔ اچھا۔ تو وہ یہ لڑکا ہے۔ یہ تو بڑا نامی گرامی ہے۔ لیکن ہے بالکل بچہ سا وہ سب کو پریڈ پر جانے کی ہدایت دے کر اپنے کمرے کی طرف واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا سیکشن کمانڈر حوالدار گوردیال سنگھ آ گیا اور اس نے مجھے ہدایت دی کہ پریڈ پر جانے کی فوراً تیاری کرو۔

لیکن حوالدار جی میرے پاس تو کٹ اور وردی وغیرہ نہیں ہے۔ میں نے بڑے ججے تلے انداز میں اس سے کہا۔

کہاں ہے تمہاری کٹ۔

مجھے کیا خبر ہے میں تو ابھی ابھی صبح کی گاڑی سے چھٹی کاٹ کر آ رہا ہوں۔

صبح کی گاڑی سے آئے ہو تو یہاں مہمان بن کر تو نہیں آئے۔ آخر فوجی سپاہی ہو فوجی دستور کے مطابق تمہیں سب کچھ کرنا ہوگا۔

سنٹر سے مجھے ایک سرکاری لیٹر ملا تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ تمہارا پوسٹنگ کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل میں ہو گیا ہے۔ اب تم اپنی نئی یونٹ میں چھٹی کے خاتمے پر رپورٹ کرنا۔ تمہاری کٹ اور پرائیویٹ سامان سگنل مین بہادر خان کو دے دیا گیا ہے تو اٹھو بہادر خان کا پتہ کرو۔ وہ تمہارا سامان تمہیں یہاں تمہارے بستر میں تو دینے نہ آئے گا۔

مجھے کیا پتہ ہے کہ بہادر خان کہاں ہوگا۔ اور پھر غلام یاسین نے آگے بڑھ کر مجھے خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کی اور حوالدار گوردیال سنگھ کو جانے کے لیے کہا۔

میں نے دل میں سوچا یہاں بھی ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔ دیکھیے آگے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ گوردیال کمرے سے باہر نکل گیا۔ جلد ہی غلام یاسین بہادر خان کو تلاش کر کے لے آیا۔

بہادر خاں نے مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہاری کٹ اور پرائیویٹ سامان میں نے آتے ہی کوارٹر ماسٹر سٹور میں جمع کروا دیا تھا اور جمع شدہ سامان کی رسید بہادر خان نے مجھے دے دی۔

پریڈ پر جانے کی وسل ہوئی تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر پریڈ گراونڈ

کی طرف چلے گئے۔ میں واپس آ کر غلام یٰسین کے بستر میں رضائی لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ ایک آدمی مجھے بلانے کے لیے آ گیا۔

مجھے تیار ہو کر ملو تمہیں سینئر سردار صاحب بلا رہے ہیں۔ اس آنے والے سپاہی نے مجھ سے کہا۔

کہاں بلایا ہے انہوں نے۔؟

پریڈ گراؤنڈ کے ساتھ والی سڑک پر کھڑے ہوئے ہیں۔

میں نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے انہی کپڑوں میں ملبوس میں اس سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے پریڈ گراؤنڈ سے ملحقہ سڑک پر لے آیا۔ وہاں صوبیدار اکبر علی۔ حوالدار میجر محمد دین اور حوالدار گوردیال سنگھ تینوں اکٹھے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے قریب آ کر اٹین شن ہو کر صوبیدار صاحب کو سلام کیا۔

صوبیدار صاحب مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے اور کہنے لگے۔ "آ گئے ہو اسمعٰیل میاں"

آ گیا ہوں سر۔

جاؤ جلدی سے وردی پہن کر آؤ سٹاف پریڈ کے لیے۔

سر آج میری ڈاک چھٹی ہے۔ شام کو میری حاضری ہے۔

اچھا۔ اچھا۔ تو پھر ہم نے غلطی کی ہے تمہیں بلانے کی۔

نہیں سر کوئی بات نہیں ہے۔

تم سنٹر سے آئے ہو یا اپنے گھر سے؟

سر۔ گھر سے سیدھا یہاں آیا ہوں۔

تمہارا سامان اور کٹ وغیرہ تو جبل پور میں ہوگی۔

نہیں سر۔ سنٹر والوں نے مجھے سرکاری طور پر چٹھی لکھ کر مطلع کر دیا تھا کہ تمہاری کٹ اور پرائیویٹ سامان کمل میں بہادر خان کے ہاتھ بھیجا جا رہا ہے۔ بہادر خان مجھے ملا ہے اس نے بتایا ہے کہ اس نے میری کٹ اور پرائیویٹ سامان آتے ہی کوارٹر ماسٹر سٹور

میں جمع کروا دیا ہے۔ رسید اس نے مجھے دے دی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے بعد سٹور سے سامان ڈرا (DRAW) کروا لوں گا۔

گوردیال سنگھ تم احمد کو لے جاؤ اور اس کا سامان کوارٹر ماسٹر سٹور سے ڈرا کرو اور پھر اس کی وردی ابھی دھوبی کو دے دو اور اسے ہدایت دو کہ اس کی وردی شام پریڈ کے لیے شام تک وہ تیار کر دے۔ کل یہ کرنل صاحب کے سامنے پیش ہو گا۔ صوبیدار صاحب نے گوردیال کو تاکید کی

بہت اچھا سر۔ اور پھر گوردیال مجھے کوارٹر ماسٹر سٹورز میں لے گیا۔ مجھ سے رسید کر اس نے سارجنٹ کوپر کو دکھائی۔ کوپر نے ایک ہندوستانی سٹور مین کو آواز دی۔ سٹور مین آیا تو کوپر نے اس سے کہا

اوئے جانی یہ رسید لو اور اس کے مطابق یہ سب سامان نکال دو

اس سٹور مین نے لسٹ کے مطابق چیک کر کے سامان مجھے دے دیا۔ کٹ بیگ کی تمام آئیٹمز (ITEMS) گوردیال سنگھ نے خود پیک کیں۔ اس کے علاوہ ایک صندوق اور دری میں بندھا ہوا بستر تھا۔ وہ میں نے ایک طرف سے چادر ہٹا کر چیک کر لیا سب سامان ٹھیک تھا۔ اس سٹور مین نے میرا صندوق اور سامان اٹھا کر میرے ساتھ باہر برآمدے میں رکھوایا اور پھر وہ اپنے کام پر سٹورز میں واپس چلا گیا۔ گوردیال نے مجھے آرڈر دیا۔

دیکھتے کیا ہو۔ جلدی سے اٹھاؤ اپنا سامان

حوالدار جی۔ یہ تینوں آئیٹم اکٹھی تو نہ لے جا سکوں گا۔ آدھا سامان اب لے جاتا ہوں آدھا دوسرے پھیرے میں لے جاؤں گا۔

نخرے مت کرو۔ اٹھاؤ۔ اس نے بکس اٹھانے میں میری مدد کی اور میرے سر پہ رکھوا دیا اور پھر میرا بستر اٹھا کر بکس کے اوپر رکھ دیا اور کٹ میرے دائیں کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ اٹھتا کیسے نہیں۔ اس نے فتح مندی کے احساس سے بھرپور لہجے میں یہ بات کی۔

وہاں سے بیرک کوئی زیادہ دور نہ تھی اور نہ ہی سامان زیادہ وزنی تھا۔ ویسے بکس کے اوپر ایک پھولا ہوا سا بڑا بستر ایک عجیب سا مضحکہ خیز منظر پیش کر رہا تھا۔ لیکن مجھے تو گوردیال

ذلیل و رسوا کرنے کے درپے تھا۔ اس کی نظر میں انسان کی کوئی عزت نفس نہ تھی ابھی سٹورز سے سامان اُٹھا کر میں چند ہی قدم گیا ہوں گا کہ ایک کار ہمارے پاس سے گزری اس میں بیٹھے ہوئے انگریز نے جب یہ مضحکہ خیز منظر دیکھا تو ڈرائیور کو کار روکنے کا اشارہ کیا۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔ ایک لمبا تڑنگا سا معمر انگریز آفیسر اس کار سے برآمد ہوا۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو اس نے بڑے ہی تحکمانہ انداز میں کہا۔

ٹھہر جاؤ۔ میں رُک گیا۔ گوردیالے نے اسے فوراً اٹین شن ہو کر سیلوٹ کیا۔

اس نے گوردیالے سے پوچھا۔ حوالدار یہ آدمی کون ہے۔

سر یہ وہ بدمعاش سپاہی ہے جو جبل پور سے پوسٹ ہو کر آیا ہے۔ چھٹی پر تھا۔ آج ہی صبح یہاں آیا ہے۔

اُتارو سامان اس کے سر سے۔ تمہیں شرم نہیں آئی یہ تحقیر آمیز الفاظ کہتے ہوئے کیا بدمعاشی کی ہے اس نے۔ آج ہی تو بے چارا اس یونٹ میں پہنچا ہے۔ تم لوگ اس کی اچھی پذیرائی کر رہے ہو۔

سر یہ جبل پور شہر میں ایک مانا ہوا بدمعاش سپاہی تھا۔

تمہیں کیسے پتہ چلا۔ کرنل نے حیرت و استعجاب کے عالم میں پوچھا۔

اس کے ساتھی لڑکوں نے اس کی ساری کہانیاں مجھے سنائی ہیں۔ سر یہ تو کسی سینئر کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔

تمہارے ساتھ اس نے کوئی بدمعاشی کی ہے۔ کسی طرح کی حکم عدولی کی ہے۔

نہیں سر، میرے ساتھ تو نہیں کی۔ آج ہی صبح سویرے تو یہ آیا ہے۔

پھر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم ایک بے گناہ آدمی کے متعلق اس قدر ہتک آمیز ریمارکس پاس کر رہے ہو۔ اس کا آدھا سامان تم اٹھاؤ اور اسے سیدھا اسی حالت میں میرے دفتر میں لے آؤ۔ یہ حکم دے کر وہ بوڑھا کرنیل گاڑی میں بیٹھ کر دفتر کی جانب چلا گیا۔

بہت اچھا حضور ۔ اور پھر گورد یا لے نے میرا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور بکس اور بستر میں نے اٹھا لیے۔ وہ مجھے سیدھا بٹالین آفس میں لے آیا۔ میں سوچ رہا تھا قسمت کے بھی عجیب چکر ہیں۔ جب جبل پور میں تھا تو پہلے ہی دن سویلین کپڑوں میں میری پیشی بٹالین آفس میں ہوئی تھی۔ آج کوہاٹ میں بھی میرا پہلا ہی دن ہے۔ سامان ہم نے برآمدے میں رکھا۔ سب لوگ اپنے اپنے دفتر کے دروازوں سے باہر جھانکتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ میری سیاہ بختی قدم قدم پر مجھے ذلیل و رسوا کر رہی ہے۔ اس ذلت آمیز زندگی سے خدا ہی مجھے چھٹکارا دے۔

فوراً ہی ایک انگریز کیپٹن اپنے دفتر کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ اس نے گوردیالے کو حکم دیا کہ تم اس جوان کا سب سامان اپنے آدمیوں سے اٹھوا کر بیرک میں لے جاؤ۔ اور وہی انگریز کیپٹن جو شاید ایڈجوٹنٹ تھا مجھے انہی کپڑوں میں اندر کرنل براؤن صاحب کے پاس لے گیا۔ کرنل صاحب نے اپنے سامنے میز کی دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے ایڈجوٹنٹ کو کہا کہ تم جاؤ اپنا کام کرو۔

کرنل صاحب نے میرے لیے چائے منگوائی۔ چائے کے دوران وہ مجھ سے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتا رہا۔ وہ میری شستہ اور رواں انگریزی بولنے پر بے حد خوش ہوا۔ اس نے تقریباً ایک گھنٹہ مجھے اپنے پاس بٹھایا اور شروع سے لے کر آج تک پیش آنے والے تمام واقعات میں نے اسے نہایت تفصیل سے سنائے۔

تم سنٹر میں کلرک تھے۔

جی جناب

پھر تمہیں کلرکوں سے کیوں نکال دیا گیا۔

سر۔ بات یہ ہے کہ سنٹر کے صوبیدار میجر صاحب مجھے پہلے دن سے ہی اچھا نہ سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سگنل کور میں جتنی بھی آسامیاں خالی ہوں وہ سب کی سب اس کے علاقے کے لوگوں ہی سے پر کی جائیں چونکہ ان کے ساتھ میری پہلے

دو سالوں سے تسلسل (TRADITION) چل رہی تھی۔ اس لیے جب میں گاؤں ایک ماہ کی چھٹی پر تھا انہوں نے مجھے (S.A.(A.T. بنا کر اس یونٹ میں پوسٹ کر دیا ہے۔ اور مجھے گاؤں کے پتہ پر سرکاری خط لکھ کر مطلع کر دیا کہ میں چھٹی کے اختتام پر کوہاٹ رپورٹ کروں۔

اچھا تم مجھے یہ بتاؤ۔ یہ گیلینٹری ایوارڈز کا کیا قصہ ہے۔

سر۔ کون سے گیلینٹری ایوارڈز؟

تمہارے فادر کے ایوارڈز۔

مجھے سنٹر کے کرنل پولارڈ نے تمہارے متعلق ایک بڑی ہی تفصیل سے سرکاری لیٹر لکھا ہے۔ اس چٹھی میں تمہارے فادر کے ان گیلینٹری ایوارڈز کا بھی ذکر ہے۔

سر وہ گیلینٹری ایوارڈز میرے کس کام کے جس شخص نے کوتل العمارہ کے مورچوں میں لڑتے ہوئے اپنا سینہ گولیوں سے چھلنی کروایا تھا۔ اور جس کی شجاعت اور بہادری کے اعتراف کے طور پر یہ میڈل اسے ملے تھے جب وہ ہی نہیں رہا تو یہ میڈل اس کے پسماندگان کے کس کام کے۔ سنٹر کے صوبیدار میجر نے جب میرے ساتھ معاندانہ رویہ اپنا لیا تو میں نے اپنے والد صاحب کو خط لکھا تھا کہ وہ بطور احتجاج یہ ایوارڈز کنگ ایمپرر (KING EMPEROR) کو واپس کر دیں۔ سر بات یہ ہے کہ میں ایک سپاہی پیشہ خاندان کا فرد ہوں ہم لوگ صرف فوج ہی میں ملازمت کرتے ہیں اور اسے ہی باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ سر آپ غور فرمائیں میں انگریزی پڑھا ہوا آدمی ہوں اور مجھے صرف اٹھارہ روپے تنخواہ ملتی ہے اس سے زیادہ تنخواہ تو میں سول میں کوئی معمولی سی بھی نوکری کروں تو لے سکتا ہوں۔ لیکن نہ ہی میں اور نہ ہی میرے دوسرے اہل خاندان فوج کی نوکری کے علاوہ دوسری کسی اور نوکری کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سر یہ معاملہ میرے، کرنل پولارڈ صاحب اور صوبیدار میجر صاحب کے درمیان طے ہو گیا تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میرے والد کے فوت ہو جانے کے بعد اب

انہیں اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں کہ کوئی بہادر سپاہی بطور احتجاج اپنے گیلنیٹری ایوارڈ بادشاہ سلامت کو واپس کر دے گا۔ یا کسی قسم کا کوئی اور احتجاج کرے گا۔

سر میں نے کمرنل پولارڈ صاحب سے وہاں ہی گزارش کی تھی کہ انڈین سگنل کور کی نفری کئی ہزار ہے۔ وہ کوئی ایسی نظیر (PRECEDENT) پیش کریں کہ کہیں کوئی انگریزی پڑھا ہوا آدمی خچر ڈرائیوری کر رہا ہے۔ آخر مجھ پر یہ عتاب کیوں نازل کیا گیا ہے۔ میں اب اس ارادے کے ساتھ اس یونٹ میں آیا ہوں کہ سول جیل چلا جاؤں گا۔ لیکن اس نئے ٹریڈ میں ایک دن بھی نوکری نہیں کروں گا۔

تم نے (A.T.) S.A. کی ٹریننگ سنٹر میں کی ہے۔

جی نہیں اور نہ ہی کروں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے نہایت ہی پُر اعتماد لہجے میں یہ باتیں کہیں۔

دیکھو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے تھوڑا سا وقت دو۔

ٹھیک ہے سر۔ آپ سب متعلقہ لوگوں کے نام اس طرح کا حکم جاری فرمائیں کہ وہ مجھ سے (A.T.) S.A کا کام نہ لیں۔

کرنل براؤن نے گھنٹی بجائی۔ وہی انگریز کیپٹن جو ایڈجوٹنٹ تھا اندر آیا۔ کرنل نے حکم دیا کہ سینئر سردار کو بلاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار اکبر علی صاحب اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے وہاں کرنل کے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کرنل صاحب نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

صوبیدار صاحب۔ یہ جوان اچھے فوجی خاندان کا فرد ہے۔ اس کے والد کو جنگِ عظیم میں کوتل العمارہ کے مورچوں میں لڑتے ہوئے دادِ شجاعت کے اعتراف کے طور پر ملٹری کراس اور کرڈی (BAR) ملی تھی۔ اس کا والد اب فوت ہو چکا ہے۔ اس جوان کی مدد کرنے والا کوئی آدمی نہیں۔ ہم نے اس کے متعلق سنٹر سے آئی ہوئی رپورٹیں اور سب خطوط بھی دیکھے ہیں۔ میں نے اس جوان کی مکمل ہسٹری بھی پوری تفصیل سے سنی ہے۔ اس نے جس موقعہ پر جو کچھ بھی کیا ہے وہ اس کی خاندانی

روایات کے عین مطابق ہے ۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جلد ہی اس کا ٹریڈ تبدیل کر دیا جائے ۔ جب تک کسی اور اچھے ٹریڈ میں کوئی آسامی خالی نہیں ہوتی ۔ اس وقت تک یہ (AT) A.S کا کام نہیں کرے گا ۔ اس کو ڈی سیکشن میں پوسٹ کر دیں اور ایک گھوڑا اسے دیں ۔ ساتھ ہی اس کی ہارس رائیڈنگ (HOSE RIDING) کی ٹریننگ کا بھی اہتمام کریں ۔ اس جوان کے والد بھی رسالے میں تھے ۔ ویسے بھی اعوان قوم کے جوانوں کی پسند اچھے اور خوبصورت گھوڑے ہوتے ہیں ۔ سب متعلقہ لوگوں کو آپ بتادیں کہ اس جوان کے ساتھ کوئی بھی کسی طرح حجت بازی نہ کرے ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نے ماضی میں جو صعوبتیں اٹھائی ہیں ۔ اس کے والد کے فوت ہو جانے کے بعد ان میں اب بتدریج کمی واقع ہو ۔ آپ سب سردار صاحبان ، اور عہدے داران کی ایک میٹنگ بلا کر ان سب کو اس کے متعلق بریف کر دیں ۔ اس کو بھی قدم قدم پر آپ کی راہنمائی کی ضرورت پڑے گی ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس کی ہر طرح سے مدد اور راہنمائی کرتے رہیں گے ۔ آپ مہربانی سے وقتاً فوقتاً اس سے ملتے رہیں اور مہینے میں ایک آدھ بار مجھے اس کی پروگریس رپورٹ دیا کریں ۔ اچھا بہت شکریہ آپ کا ۔

صوبیدار اکبر علی صاحب بہت ہی اچھے موڈ میں خوشی خوشی سیلوٹ کر کے وہاں سے چلے گئے ۔

سینئر سردار کے چلے جانے کے بعد کرنل براؤن صاحب نے مجھ سے چند نصیحت آمیز باتیں کیں اور ہر طرح سے میرا حوصلہ بڑھایا اور پھر مجھے اپنی بیرک میں واپس جانے کی ہدایت کی ۔ میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا اور اپنی بیرک کی طرف چل پڑا ۔ راستے میں ہیڈ کلرک پیارا سنگھ نے مجھے بلا کر پوچھا کہ کرنل صاحب کے ساتھ تمہاری کیا کیا باتیں ہوئی ہیں ۔ میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا چونکہ اس کی شہرت خراب تھی ۔ وہ مسلمانوں کا بڑا جانی دشمن تھا اور بھی لوگوں نے مجھ سے پوچھنا چاہا لیکن میں نے کسی کو کچھ بھی نہ بتایا ۔ اپنی بیرک میں آکر میں نے اپنے لیے چارپائی اور ٹرنک باکس ایشو کروایا اور اپنا

سامان درست کرنے میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا سیکشن کمانڈر حوالدار گوردیال سنگھ اور نائیک محمد عارف وہاں آ گئے۔ عارف نے مجھے بتایا کہ میں ڈی سیکشن کی ہارس لائن کا انچارج ہوں۔ کل سے آپ ہارس لائن میں اپنا کام شروع کر دیں۔ ہمارے پاس ایک نہایت ہی اعلیٰ نسل کا ریس ([illegible]) والا گھوڑا ہے۔ حوالدار گوردیال سنگھ نے وہ آپ کو الاٹ کیا ہے۔

عارف صاحب کل دیکھیں گے۔ آج تو میری چھٹی ہے۔ آج ہی سے آپ لوگ مجھے پابندیوں میں نہ جکڑیں۔

ہاں۔ ہاں بے شک کل سے کرنا۔ میں تو ویسے آپ کو بتا رہا تھا۔ آپ میرے گرائیں ہیں آپ کو انشاء اللہ تعالیٰ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

وہ دونوں تھوڑی دیر وہاں کھڑے رہے اور پھر کھسیانے سے ہو کر واپس چلے گئے۔ بیرک میں اس وقت کوئی آدمی نہ تھا۔ سب اپنے اپنے کام پہ گئے ہوئے تھے۔ کرنل صاحب کی باتوں سے میری کچھ ڈھارس بندھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دوپہر کے بارہ بجے تک اپنا سامان درست کیا۔ گوردیال نے ایک سپاہی کو میرے پاس بھیجا کہ میں اپنی وردی اس کو دوں تاکہ وہ خصوصی طور پر کل کی سٹاف پریڈ کے لیے اسے دھوبی سے ٹھیک کروا لائے۔ میں نے دل میں سوچا میری انٹرویو تو آج ہی صبح سے ہو گئی ہے۔ کل سٹاف پریڈ پہ جا کر کیا کروں گا۔ بہرحال وہ سپاہی میری وردی لے گیا۔

میں اپنا بستر بچھا کر چارپائی پر رضائی لپیٹ کر لیٹ گیا۔ ایک دو عہدیداروں نے بیرک سے گزرتے ہوئے مجھے سرسری نظر دیکھا لیکن کسی نے کچھ بات کی۔ ایک بجے کھانے کی چھٹی ہوتی تھی۔ چھٹی ہوئی تو سب سے پہلے بہادر خان میرے پاس آیا۔

چلو اٹھو کھانا کھانے چلیں۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

میں بہادر خان لنگر کی طرف چل پڑے۔ بیرکوں کے درمیان میں لنگر تھا۔ گجرات کا ایک لانگری عبدالغنی تھا جو وہاں ہمارے لنگر پہ کھانا پکایا کرتا تھا۔ بڑا اچھا

لانگری تھا۔ نہایت مزے کا کھانا بناتا تھا۔ اس زمانے میں پچھلے انڈین رینکس کے لیے الگ کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) نہ ہوا کرتے تھے۔ بیرک کے برآمدوں میں لنگر کے سامنے ہی بینچ اور میز پڑے ہوتے تھے۔ سب لوگ لنگر سے اپنا اپنا کھانا لے کر وہاں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ یا کچھ سپاہی لنگر سے ملحق گراسی گراؤنڈ میں گھاس پر ہی بیٹھ کر کھا لیتے۔ سنٹر کی طرح کا رواج یہاں بھی تھا۔ کھانا کھا کر اپنی پلیٹ اور مگ دھو کر اپنے ساتھ لے جانا پڑتا۔ شام تک کافی ساتھی آکر مجھ سے ملے۔ بہادر خان بھی ڈی سیکشن میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھسیارے نے جو گھوڑا تمہیں دیا ہے وہ بڑا ظالم گھوڑا ہے۔ آدمی اس کے نزدیک جائے تو وہ حملہ کر دیتا ہے اور کاٹ کھاتا ہے اور دولتیاں مارتا ہے۔ جس آدمی کو بھی یہ گھوڑا الاٹ کرتے ہیں وہ سِک رپورٹ کر کے ہسپتال چلا جاتا ہے۔

کیوں کیا ہے اس گھوڑے کو۔ میں نے بہادر خاں سے پوچھا۔

یار خبط۔ جب اس کی مالش کرنے لگیں تو لاتیں مارتا ہے اور اگر آگے جائیں تو کاٹتا ہے۔ کئی آدمیوں کو اب تک ہسپتال پہنچا چکا ہے۔ ہارس لائن ہی میں بندھا رہتا ہے۔ کوئی اس کے نزدیک تک نہیں جاتا۔ یہ گھسیارے نے تمہارے ساتھ بھلی مہربانی کی ہے۔

اچھا بہادر بھائی دیکھیں گے کل۔ آج تو گپ شپ کرنے دو۔ آج ہی میرا خون خشک نہ کرو۔

بہادر خاں اپنی بیرک میں چلا گیا۔ اور میں رضائی لپیٹ کر سو گیا۔ جو بھی آتا مجھے سویا ہوا دیکھ کر مختلف قسم کے ریمارکس پاس کرتا ہوا گزر جاتا۔ میں سب لوگوں کی باتیں سن کر بھی خاموش رہا اور آرام سے اپنے بستر میں لیٹا رہا۔

## ۵

دوسرے دن میں تیار ہو کر شاف پریڈ کے لیے بٹالین آفس گیا۔ ایڈجوٹنٹ نے

مجھے دیکھا تو سینئر سردار کو بلا کر کہا۔

صاحب اِس جوان کی آرکل بڑی تفصیل سے کرنل صاحب سے انٹرویو ہو گیا ہے۔ آج تم لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا میں کرنل صاحب سے پوچھ بھی لیتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کرنل صاحب ریڈ جوائنٹ کے ساتھ باہر برآمدے میں نکل آئے اور مجھے دیکھ کر انگریزی میں کہنے لگے۔

" ویسے تو تمہارا انٹرویو کل ہی ہو گیا تھا۔ لیکن میں تمہیں یونیفارم میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم وردی میں کیسے لگتے ہو۔ " اور پھر کرنل نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور پھر فوراً ہی دفتر کے اندر چلے گئے، اور مجھے حوالدار میجر ڈی سیکشن میں لا کر سارجنٹ جے۔ ورتھ کے سپرد کر کے واپس چلا گیا۔ اس زمانے میں سگنل کور کی اکثر یونٹوں میں انڈین رینکس کے ساتھ ساتھ (B.O.R.S) گوروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی تھی۔ اُس گورے سارجنٹ نے مجھ سے پوچھا۔

یُو۔ انگلش مالُم (کیا تم انگریزی جانتے ہو۔؟)

یَس سر۔ تھوڑا تھوڑا مالُم۔ مَیں نے بھی اُسے اسی لہجے میں جواب دیا اور پھر وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

یُو۔ نو۔ رائیڈنگ (کیا تم گھوڑ سواری جانتے ہو؟)

نو سَر۔ (نہیں جناب)

تھوڑی دیر تک وہ مجھ سے عجیب سی اردو میں باتیں کرنے کی کوشش کرتا رہا آخر کار اس نے مجھ سے نہایت ہی شُستہ انگریزی میں بات کرتے ہوئے کہا۔

تو پھر تمہیں ان لوگوں نے ہارس لائن میں کیوں بھیجا ہے جبکہ تم رائیڈنگ سرے سے جانتے ہی نہیں۔

سَر۔ رائیڈنگ کوئی مشکل نہیں ہے میں بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔

اور تمہیں پتہ ہے سیکشن حوالدار نے جو گھوڑا تمہیں الاٹ کیا ہے وہ کتنا فیورس ہے؟۔

سر ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔

مجھے ڈر ہے وہ کہیں تمہیں کاٹ نہ کھائے یا دولتی جھاڑ کر تمہاری ٹانگ یا بازو نہ توڑ دے۔

سر مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے وہ مجھے زندگی کے کسی میدان میں بھی ناکامی سے ہمکنار نہ کرے گا۔ میں ابھی سارجنٹ ورتھ کے پاس ہی کھڑا تھا کہ حوالدار گوردیال سنگھ اور نائیک محمد عارف ہمارے پاس آ گئے۔ گوردیالے نے مجھ سے پوچھا۔

سٹاف پریڈ ہو گئی ہے۔؟

ہو گئی ہے۔

کیا حکم ملا ہے!

ایڈجوٹنٹ صاحب اور سینئر سردار صاحب نے حوالدار میجر محمد دین کو میرے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ ڈی سیکشن کے انچارج کے پاس چھوڑ آئے۔ چنانچہ وہ مجھے سارجنٹ ورتھ کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ گوردیال کھسیانا سا ہو کر سارجنٹ ورتھ کے پاس چلا گیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

سلام صاب۔

سلام حوالدار

سر اس نئے جوان کو میں لے جاؤں تاکہ اسی کو یہاں کی سب روٹین سمجھا دوں۔

ہاں لے جاؤ لیکن بہتر ہو گا کہ پہلے یہ وردی اتار آئے اور ورکنگ ڈریس پہن کر آ جائے۔

ٹھیک ہے صاب —— اور پھر گوردیالے نے بڑے ہی تحکمانہ انداز میں مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا۔

احمد جاؤ بیرک میں اور یہ وردی اتار کر اور کوئی دوسری معمولی سی وردی پہن آؤ۔

بہت اچھا۔ میں نے چند ثانیے توقف کیا اور پھر اس سے پوچھا۔ وہ کونسا گھوڑا ہے جو آپ نے مجھے الاٹ کیا ہے۔

تم وردی تبدیل کر کے آؤ۔ گھوڑا بھی تمہیں بتا دیں گے۔ تمہارا یہ شوق بھی بلد ہی پورا ہو جائے گا۔

میں بیرک میں وردی تبدیل کرنے کے لیے چلا گیا۔ ہارس لائنوں میں واپس آیا تو ایکسر سائز والپس آ چکی تھی۔ سب اپنے اپنے گھوڑوں کا پسینہ خشک کر رہے تھے۔ اس شیڈ کے دوسرے سرے پر شکی سانگ کا ایک گھوڑا سب سے الگ بندھا کھڑا تھا۔ اس کی مالش کے لیے کوئی آدمی مقرر نہ تھا۔ میں نے دل میں اندازہ لگایا۔ ہو نہ ہو۔ وہ فیورس گھوڑا یہی ہے۔ جس کا تھوڑی دیر پہلے سارجنٹ ورمانے ذکر کیا تھا۔ مجھے گوردیالے نے دیکھا تو میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

یہی ہے تمہارا گھوڑا۔ تمہیں کس نے بتایا ہے۔

نہیں تو۔

تو پھر اس کے پاس تم کیوں کھڑے ہو۔؟

اسے میں نے سب سے الگ تھلگ دیکھا تو میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو۔ فیورس یہی ہے۔

ہاں بالکل یہی ہے تم نے ٹھیک پہچانا۔ اس کا نمبر بھی دس ہے اور پھر وہ میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا پڑا۔ جیسے وہ مجھے بھی کہنا چاہتا ہو کہ تمہارا نمبر بھی تو دس ہی ہے۔ لیکن وہ کہہ نہ سکتا تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ اس کی اس بات کا میں کیا جواب دوں گا۔

گوردیالے نے قدرے توقف کے بعد مجھ سے کہا۔ تم اس گھوڑے کا چارج رمضو سائیس سے لے لو۔

کیوں اس کا چارج رمضو سائیس کے پاس کیوں ہے۔ کسی سپاہی کے پاس کیوں نہیں؟

بھیا تم اس کے قریب جاؤ گے تو تمہیں خود ہی اس بات کا جواب مل جائے گا۔

حوالدار جی آپ مجھے تین چار دن کی مہلت دیں۔ انشاء اللہ تعالے ایک ہفتے کے بعد میں اسے آپ کے ساتھ باہر ایکسر سائز پرلے کر جاؤں گا۔

یہ ناممکن بات ہے۔

کوئی بات ناممکن نہیں۔ میرا خدا میری مدد کرے گا۔

تین چار دنوں کی بجائے تم ایک ہفتہ لے لو۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہارا ہاتھ کاٹ کھائے یا دولتی جھاڑ کر تمہاری ٹانگ ہی توڑ دے۔

یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔

ٹھیک ہے تم جانو اور تمہارا کام اور پھر گورد یال گھوڑوں کی مالش دیکھنے شیڈ کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا رمضانو سائیس کے پاس چلا گیا۔ وہ دانہ خوری رجہاں گھوڑوں کے لیے دانہ وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ میں بیٹھا ہوا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا۔

رمضان چچا اسلام علیکم۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

ور کیوں بھیا کیا بات ہے؟

چچا مجھے حوالدار گوردیال سنگھ نے کہا ہے کہ میں دس نمبر گھوڑے کا چارج آپ سے لے لوں۔

بھیا تم ہی اس کا چارج لینے کے لیے رہ گئے تھے۔ کسی پرانے ہوشیار سپاہی کو چارج دیتے تو اچھا ہوتا۔

کیوں چچا مجھ میں کیا کمی ہے؟

بھیا میں نے سُنا ہے کہ آپ جبلپور میں بڑے کرنل صاحب کے دفتر میں کلارک بابو تھے اور کسی الیسر (افسر) نے لگتا ہاجی سے آپ کو وہاں سے نکال کر یہ ٹریڈ دے دیا ہے۔

چچا بات تو یہ درست ہے۔

بھیا آپ رائیڈنگ جانتے ہیں؟

نہیں چچا

تو پھر اس گھوڑے کو لے کر کیا کرو گے۔ یہ جیسے پہلے ہر وقت بند ھا رہتا ہے۔ چھ

بھی اسی طرح بندھا رہے گا۔

نہیں چچا۔ انشاء اللہ تمہارے ایسا نہیں ہوگا۔ میں اس گھوڑے پر آپ کو سواری کر کے دکھاؤں گا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ وہ مجھے ساتھ کے ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں اس گھوڑے کی زین اور اس سے متعلقہ سامان وہاں رکھا ہوا تھا۔

وہ سامان چچا نے گن کر میرے حوالے کر دیا۔ اور پھر بڑے ہی خلوص اور محبت سے مجھے دعا دیتے ہوئے کہنے لگا۔ اچھا بیٹا خدا تمہاری نگہبانی کرے اور پھر اس نے میرے قریب آ کر بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"یہ گھوڑا تمہیں دے کر حوالدار گوردیال سنگھ نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔"

میں سیڈل اور دوسرے متعلقہ سامان کا چارج لے کر چچا کے ساتھ شیڈ میں آ گیا جہاں سب گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ سب جوان اپنے اپنے گھوڑے کی مالش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ گوردیال اور نائیک عارف چکر لگا کر ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ چچا نے دس نمبر گھوڑے کے پاس جا کر مجھے بتایا۔ "بیٹا یہ ہے وہ گھوڑا" گھوڑے نے جب مجھے اپنے قریب دیکھا تو نتھنے پھڑکائے اور ایک خوفناک سی آواز نکالی۔ چچا نے مجھے بتایا کہ باقی گھوڑوں کو توبروں میں دانہ دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ گھوڑا توبرا نہیں چڑھانے دیتا۔ اس لیے اس کا دانہ اس کے سامنے والی حوض میں ڈال دیتے ہیں۔ باقی گھوڑوں کو کھول کر حوضیوں پر لے جا کر پانی پلاتے ہیں۔ اس کو بالٹیوں کے ذریعے یہاں ہی پلاتے ہیں۔ ٹھیک ہے چچا اب آپ فارغ ہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ چچا میں اب اس کا انتظام کروں گا۔ چچا حیران کن نظروں سے مجھے دیکھنے لگ گیا۔ جیسے اسے میری باتوں کا یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ چچا واپس دانہ خوری کی طرف چلا گیا۔ اور میں اپنے گھوڑے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ یہ مجھ سے کچھ مانوس ہو جائے۔ میں اگر تھوڑا سا بڑھ کر آگے کو جانے کی کوشش کرتا تو وہ شیش ناگ کی طرح پھنکاریں مارنی شروع کر دیتا۔ وہ کان کھڑے کر لیتا اور یوں پتہ لگتا کہ یہ

اگر بندھا ہوا نہ ہوتا تو فوراً مجھ پر حملہ کر دیتا۔ میں تھوڑا سا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو وہ حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو جاتا۔

گوردیال چوری نظر سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگ جاتا اور نائیک عارف کے ساتھ اشاروں ہی اشاروں میں کچھ باتیں کرتا۔ شاید وہ خوش تھا کہ اس نے میری گستاخی کی ایک مستقل سزا مجھے دی ہے۔ میرے والد اپنے رسالے کی ملازمت کے زمانے کا ایک ایسا ہی واقعہ چوپال پر اکثر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ وہ جب لانس دفعدار تھے تو انہیں بھی سزا کے طور پر ایک ایسا ہی واقعہ چوپال پر اکثر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ وہ جب لانس دفعدار تھے تو انہیں بھی سزا کے طور ایک ایسا ہی گھوڑا دیا گیا تھا۔ انہوں نے جس طرح سے اس گھوڑے کو رام کیا تھا۔ آج وہ نسخہ میں بھی آزمانا چاہتا تھا۔ سب لوگ ابھی تک اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں وہاں سے فوراً یونٹ کینٹین پر چلا گیا۔ وہاں سے میں نے دو آنے کا گڑ خریدا۔ سستا زمانہ تھا۔ ایک سیر کے قریب گڑ مجھے ملا۔ میں اسے لفافے میں ڈلوا کر لے آیا اور اپنے گھوڑے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے نے پھنکاریں مارنی شروع کر دیں۔ میں نے آہستہ سے لفافے سے ایک روڑی گڑ کی نکال کر حوض میں ڈال دی۔ یہ حوض گھوڑوں کے دانے وغیرہ کے لیے تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے حوض میں تھوتھنی ڈال کر گڑ کی اس روڑی کو سونگھا اور پھر فوراً منہ میں ڈال لی اور کھانے لگ گیا۔ وہ کھا چکنے کے بعد اس نے اپنی تھوتھنی حوض کے اوپر سے میری طرف بڑھا لی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اب چاہتا ہے کہ میں اسے اور گڑ دوں۔ چنانچہ میں نے ایک اور گڑ کی روڑی نکال کر اسے دی اور وہ اس نے فوراً منہ میں ڈال لی۔ جتنی دیر دوسرے جوان اپنے اپنے گھوڑوں کی مالش میں مصروف رہے۔ میں اتنی دیر تک اس گھوڑے کے پاس کھڑا رہا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے بعد میں نے ایک اور روڑی نکالی اور اپنے ہاتھ پر رکھ کر ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بغیر توقف کے اور کسی گزند کے وہ روڑی میرے ہاتھ سے اپنی زبان کے ذریعہ منہ میں ڈال لی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی تھوتھنی پر لگایا۔ اس نے مجھے کچھ نہ کہا۔

والد صاحب کا بتایا ہوا یہ نسخہ تیر بہدف ثابت ہوا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے منہ اور ماتھے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کبھی کسی وقت وہ اپنی زبان سے میرے ہاتھ چاٹنا شروع کر دیتا۔ ہارس لائن میں جتنے بھی لوگ تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سب ہی ششدر رہ گئے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو یا میں کوئی جادوگر ہوں جس نے اس تند خو گھوڑے کو اپنے جادو کے زور پر تھوڑے سے ہی وقت میں بالکل رام کر لیا ہو۔ اس کا یہ پیار بھرا رویہ میرے لیے بڑا حوصلہ افزا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر گڑ کی ایک اور روڑی نکالی اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ اس کے منہ کے سامنے کر دیا۔ اس نے نہایت آہستگی اور ملائمت سے وہ روڑی اپنے منہ میں ڈال لی اور کھانے لگ گیا۔ اس عرصے میں اس کے منہ اور ماتھے پر آہستہ آہستہ پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا تاکہ اسے میری محبت کا یقین آ جائے۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے یہ گھوڑا اب مجھے کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ اور منشا کے مطابق جلد کام کرنا شروع کر دے گا۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تقریباً آدھا گڑ اسے کھلا دیا۔ اب میں اس کے پاس جاتا تو وہ مجھے کچھ نہ کہتا۔ سب جوانوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو توبڑوں میں دانہ دیا۔ میں نے اس کے حصے کا دانہ یوں ہی لا کر اس کی حوضی میں ڈال دیا اور وہ کھانے لگ گیا۔ گھوڑے میں یوں نرمی دیکھ کر گوردیالے نے اس کے پاس جانے کی کوشش کی۔ اس نے بلا تاخیر گوردیالے پر حملہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے اس نے جان بچائی۔

دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہو گئی۔ سب لوگ اپنی اپنی بیرک کی طرف چلے گئے۔ میں نے جاتے وقت پھر ایک گڑ کی روڑی اس کو دی اور اس نے بخوشی قبول کر لی اور میرے ہاتھ کو تھوڑی دیر کے لیے چاٹتا رہا۔ میں جب جانے لگا تو میں نے اس کے منہ اور ماتھے پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور وہ اپنے کانوں کو گرائے کھڑا دم ہلاتا رہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ انشاءاللہ تعالے ایک ہفتے کے اندر اندر میں اس گھوڑے پر سواری کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ لیکن میرے ساتھ پرابلم یہ تھی کہ میں نے زندگی میں کبھی بھی کسی گھوڑے پر سواری نہ کی تھی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ جونہی کوئی آدمی کسی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو گھوڑے کو فوراً

بھی پتہ چل جاتا ہے کہ سوار ہونے والا آدمی کتنے پانی میں ہے۔ میں سوچتا اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ گھوڑا پہلے ہی لمحے مجھے زمین پہ پٹخ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔ سردست تو گھوڑے کو رام کرنا مقصود تھا۔ میں نے اپنے اس گھوڑے کا نام بلیک فیوری BLACK FURY رکھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہاں بھی غلط قسم کے لوگوں کو بھرپور شکست دوں گا۔

اس دن لنگر پہ میں دوپہر کا کھانا کھانے گیا تو سپاہیوں میں بیشتر وقت فیوری کے متعلق ہی باتیں ہوتی رہیں۔ اب میں نے اپنے دل میں اگلا پروگرام یہ بنایا کہ اب میں فیوری کو یہ بات سکھاؤں گا کہ وہ صرف میرے ہاتھ سے دی ہوئی چیزیں قبول کرے۔ کسی دوسرے سے کوئی چیز قبول نہ کرے اور اپنے جارحانہ رویے کو بدستور قائم رکھے۔

شام کو جب ہارس لائن جانے کی وسل بجی تو میں بھی دوسرے سپاہیوں کے ساتھ اُدھر کو چل پڑا۔ کچھ منچلے سپاہیوں نے فیوری کے پاس جانے کی کوشش کی۔ ایک جوان پر تو وہ بڑی طرح جھپٹا۔ اس جوان نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی ورنہ اس کا پورا بازو وہ منہ میں لے کر چبا ڈالتا۔ اس سے دوسرے جوانوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ ہی کھڑے رہے۔ میں جونہی سامنے ہوا تو میں نے اسے آواز دی۔ ہیلو فیوری۔ فیوری نے مجھے دیکھ کر ہنہنانا شروع کر دیا۔ میں اس کے قریب آیا تو اس نے تھوتھنی کے اوپر سے اپنی تھوتھنی پیار کے اظہار کے طور پر میری طرف بڑھا دی۔ میں پیار سے اس کے منہ اور ماتھے پر ہاتھ پھیرتا رہا اور وہ کھڑا دم ہلاتا رہا۔ میں نے اپنی جیب سے گڑ کی ایک روڑی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ روڑی چونکہ میں نے انگلیوں میں پکڑ رکھی تھی۔ اس لیے اس بات کا احتمال ہوسکتا تھا کہ وہ جلدی میں اُچکنے کی کوشش کرے اور میری انگلیاں بھی کاٹ کھائے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اس نے منہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور زبان سے اسے چاٹنے لگا۔ میں نے گڑ اس کے منہ میں ڈال دیا اور وہ اس نے کھا لیا۔ اب میں نے ایک جوان کو گڑ کی روڑی دی اور اسے کہا کہ اب تم یہ روڑی فیوری کو دو۔ اس جوان نے وہ گڑ کی روڑی ہاتھ پر رکھ کر اپنا ہاتھ آگے کو بڑھایا تو فیوری نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ گرتے

گرتے بچا۔ اس دن دو تین اور سپاہیوں نے بھی فیوری کو گڑ کھلانے کی کوشش کی لیکن فیوری ان میں سے کسی طرف بھی راغب نہ ہوا۔ بلکہ ان پر جھپٹ پڑتا۔ اور ان کو جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ میں نے فیوری کو بالٹیوں میں پانی لا کر تھان پر ہی پلایا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں اسے بھی دوسرے گھوڑوں کے ساتھ ملنے تھان سے کھول کر بڑی حوضیوں پر پانی پلا سکوں گا۔

دو دنوں ہی میں میں نے فیوری کو رام کر لیا تھا۔ میں اس کے پاس جاتا تو وہ میرا استقبال کرتا اور پیار کے اظہار کے طور پر اپنا منہ میرے ہاتھ پر رکھ دیتا اور آہستہ آہستہ ہاتھوں کو چاٹنا شروع کر دیتا۔ رمضو چاچا نے بھی دیکھا تو کہنے لگا "یہ تو کمال کا سپاہی ہے۔" ایسے بلا کے گھوڑے کو اس نے دو ہی دن میں موم کر لیا ہے۔ شام کو جب سب سپاہی واپس اپنی اپنی بیرک کو لوٹتے تو وہ اپنے اپنے گھوڑے اور خچروں پر جھول ڈال دیتے تاکہ سردی سے ان کا بچاؤ رہے۔ فیوری ایک ایسا گھوڑا تھا جو بغیر جھول کے ہوتا تھا۔ میں نے نائیک عارف کو کہا کہ وہ ایک گھوڑے کو فیوری کے قریب لے آئے اور وہاں پر اس پر جھول ڈلوائے تاکہ فیوری اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھے۔ نائیک عارف نے ایسا ہی کیا۔ میں بھی فیوری کے لیے جھول لے آیا تھا۔ پہلے اُسے ایک گڑ کی روڑی دی۔ وہ گڑ میں مصروف ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی جھول اس کے اوپر ڈال دی اور اس کی گردن اور پیٹ کے نیچے سے تسمے کھینچ کر باندھ دیے۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ میں نے اس کا منہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی گالوں کے ساتھ لگا لیا اور وہ خاموش کھڑا دم ہلاتا رہا۔

"ہارس لائن میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ گوردیال کہنے لگا۔"

بھئی اس لڑکے نے تو کمال کر دیا ہے۔ دو ہی دن میں اتنا بڑا کام کر دکھایا ہے کہ جو کسی سے بھی آج تک نہ ہو سکا۔ اور پھر وہ سینئر سردار کو بلانے چلا گیا اور مجھے اور نائیک عارف کو کہا

آپ لوگ میرے آنے تک ادھر ہی رہیں۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں صوبیدار اکبر علی صاحب کو لے کر آ گیا۔ گوردیال نے انہیں وہ گھوڑا دکھایا جس کے نزدیک آج تک کوئی گورا کرنل کالا سپاہی نہ جا سکا تھا۔ فیوری ایک ہی چھنکار مارتا تو سب کے حوصلے

پست ہوجاتے۔

صوبیدار صاحب نے گوردیال کو کہا۔ حوالدار! تم اس گھوڑے کی یہ جھول کھول کر الگ کردو۔

نہ۔ نہ۔ مائی باپ۔ یہ بڑا ہی ظالم اور تند خو گھوڑا ہے۔ فوراً ہی حملہ کردے گا۔

صوبیدار صاحب نے پھر نائیک عارف کو کہا۔ عارف تم اس کی جھول اتار دو۔

بہت اچھا سر۔ عارف نے سپاہیانہ انداز میں فوراً ہی حکم کی تعمیل کرنے کی حامی بھرلی۔

عارف نے مجھ سے گڑ کی ایک روڑی لی اور ہاتھ پر رکھ کر چمکارتے ہوئے فیوری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ جونہی عارف فیوری کی زد میں آیا اس نے عارف پر ایک بھرپور حملہ کردیا۔ اس کا ہاتھ لہولہان ہوگیا۔ اسے ہسپتال لے جانے کے لیے جلد ہی ایمبولینس کے لیے ٹیلی فون کیا گیا۔

صوبے دار صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ جوان اس گھوڑے پر یہ جھول تم نے باندھی ہے۔؟

جناب میں نے باندھی ہے

اب اس کی جھول اُتارے گا کون ؟۔ گوردیال سنگھ یا تم۔

جناب میں ہی اُتاروں گا۔ میرے علاوہ اور جو کوئی بھی اس کے نزدیک گیا تو اس کا یہی حشر کرے گا۔ جو اس نے نائیک محمد عارف کا کیا ہے۔

یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔

اللہ کے فضل و کرم سے یہ مجھے کچھ گزند نہیں پہنچا سکتا۔

آپ اس کے پاس جائیں۔

میں اس کے پاس گیا اور میں نے اسے مخاطب کیا۔

فیوری، اس نے کان نیچے گرا لیے اور دم ہلانے لگ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی

گردن اپنے بازوؤں میں لے لی اور اس نے میری گردن چاٹنی شروع کر دی۔

بھئی گوردیال سنگھ! کمال کر دیا ہے اس لڑکے نے تو۔ بیٹا یہ سب باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں۔

جناب۔ میں اعوان قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ پشت ہا پشت سے ہم لوگ رسالوں میں نوکری کرتے ہیں۔ ہماری قوم کے بچے بچے کو یہ باتیں معلوم ہیں۔

میں کرنل صاحب کو لا کر تمہاری یہ کارکردگی دکھاؤں!

نہیں جناب ابھی چار پانچ دن آپ ان کو نہ لائیں۔ میں چونکہ سواری کرنا نہیں جانتا ایک دو دن کسی اصیل سے گھوڑے پر سواری کرنا سیکھ لوں۔ پھر اس پر بھی سوار ہو کر آپ کو دکھا دوں گا۔ پھر ان شاء اللہ ہر روز صبح سویرے ایکسرسائز والے جانوروں کے ساتھ میں فیوری کو بھی باہر لے جایا کروں گا۔

انہوں نے گوردیال کو کہا، حوالدار اس جوان کو تین چار دن تم کسی اصیل سے گھوڑے پر سواری کرنا سکھا دو۔ پھر یہ اس گھوڑے کو خود ہی قابو کرے گا۔ میں فیوری کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ صوبیدار صاحب میری پیٹھ تھپتھپانے کے لیے آگے بڑھے، فیوری ان پر بھی حملہ آور ہو گیا۔

میں نے فیوری کو غصے سے ڈانٹا تو فیوری۔ نو۔ اس نے کان نیچے گرا دیے۔ میں نے صوبیدار صاحب سے کہا۔ سر اب بے شک آپ آگے آئیں۔ یہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ فیوری بدستور میرا ہاتھ چاٹتا رہا اور وہ لوگ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب منتشر ہو کر اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

سب سپاہی اپنی اپنی بیرک کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے آخری بار فیوری کی جھبول ٹھیک کی۔ اس کی گردن تھپتھپائی۔ اور ایک روڑی گڑ کی اس کے منہ میں ڈال کر میں نے بھی اپنے کمرے کی راہ لی۔

دوسرے ہی دن گوروپا بے نے مجھے ایک نہایت ہی اصیل گھوڑے پر رائیڈنگ کی ٹریننگ دینا شروع کر دی۔ اس نے پہلے دن مجھے گھوڑے پر سیڈل (زین) لگانا سکھایا۔ پھر مجھ سے تھوڑے تھوڑے سے وقفے کے بعد سیڈل اُتروا کر نئے سرے سے لگانے کا حکم دیتا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے سیڈل لگانا سیکھ لیا۔ پھر اس نے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے اور اسے قابو میں رکھنے کے گُر بتائے۔ غرضیکہ ایک ہی دن میں اس نے مجھے گھوڑے پر سوار ہونا سکھا دیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جب جوان سیڈل میں بیٹھے تو گھٹنوں اور رانوں کی گرفت اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ اگر گھوڑا شرارت بھی کرنا چاہے تو اس کی ایک نہ چلے۔ وہ مجھے گھوڑے پر سوار کر کے اپنے ساتھ رائیڈنگ سکول میں لے گیا۔ تھوڑی دیر تک چلتے گھوڑے پر بیٹھنے کی مشق کی اور پھر دُلکی چال سے چلنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ میں نے تین دن ہی میں سواری کرنا سیکھ لیا اور اب میں گھوڑے پر بیٹھ کر اسے پوری رفتار سے دوڑا سکتا تھا۔ معمولی قسم کے جمپ بھی کروا سکتا تھا اب میرے لیے اگلا اور صبر آزما مرحلہ فیوری پر سواری کرنا تھا جو سب لوگوں کے خیال میں ایک ناممکن بات تھی۔

میں نے رائیڈنگ سکول سے واپس آ کر اس گھوڑے کو فیوری کے نزدیک ہی باندھا۔ اس کی سیڈل اُتاری۔ پسینہ خشک کیا اور پھر تھوڑی دیر تک اس کی مالش کرتا رہا۔ فیوری اپنے تھان پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے خوشی کا اظہار نہ کیا۔ شاید وہ رقابت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی گردن تھپتھپائی تو پھر بھی اس کا ردِ عمل کوئی حوصلہ افزا نہ تھا۔ میں نے گڑ کی ایک روڑی نکال کر اس کے منہ کے سامنے کی۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ فیوری مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہو گیا ہے کہ میں نے دوسرے گھوڑے پر کیوں سواری کی ہے۔ میں نے اس کو بہت منانے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور کسی سنگدل حسینہ کی طرح روٹھا رہا اور مجھے خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔ میں نے ایک ساتھی سپاہی کو کہا کہ وہ گھوڑا یہاں سے لے جا کر اس کی اپنی مقررہ جگہ پر باندھ دے۔ وہ گھوڑا لے گیا لیکن فیوری پھر بھی مجھ سے

راضی نہ ہوا۔ وہ شام تک اِسی طرح مجھ سے روٹھا ہوا چپ چاپ کھڑا رہا۔

شام ہو گئی۔ میں نے اس کی حوضی میں اس کا دانہ لا کر ڈال دیا اور پھر اس پر جھول باندھ کر واپس اپنی بیرک میں چلا گیا۔ میں اس معاملے پر جتنا بھی غور کرتا مجھے یہ اتنا ہی الجھا ہوا محسوس ہوتا۔ اب میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں فیوری کی موجودگی میں کسی دوسرے گھوڑے پر ہرگز ہرگز سواری نہ کروں گا۔ میں جانوروں کی عادات کو نہیں سمجھتا تھا لیکن فیوری کے معاندانہ رویے سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ میرے ساتھ اس وجہ سے ناراض ہے کہ میں نے اس کی موجودگی میں دوسرے گھوڑے پر کیوں سواری کی ہے۔

دوسرے دن صبح میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ہارس لائن میں آیا جو آدمی بھی فیوری کے پاس سے گزرتا، فیوری پھنکاریں مارتا ہوا غصے کا اظہار کرتا۔ جب میں سامنے آیا تو اس نے ہنہنا کر مجھے خوش آمدید کہا۔ میں اس کے پاس آیا۔ پیار سے اس کے منہ اور ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور پھر انعام کے طور پر ایک گڑ کی روڑی میں نے اس کو دی۔ اس نے گڑ لینے سے انکار کر دیا۔ ابھی تک اس کا دل صاف نہ ہوا تھا۔ میں نے زبردستی اس کا منہ کھول کر وہ روڑی اس کے منہ میں ڈال دی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد میرا ہاتھ چاٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی جھول کھول کر الگ کر دی اور برش کے ساتھ اس کے جسم کے داغ دھبے دور کرنے لگ گیا۔ وہ بدستور کان گرائے کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سٹور سے اس کی سیڈل نکال لایا۔

## ۵

سارجنٹ ورتھ حوالدار گوروپال سنگھ کے ساتھ ہارس لائن کا چکر لگا رہا تھا۔ ورتھ صاحب ڈی سیکشن کے انچارج تھے۔ ابھی مجھے آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے لیکن ان کا رویہ میرے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا۔ وہ اُردو کم ہی جانتے تھے۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ وہ اکثر ہندوستان کے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت

کے متعلق بڑی مدلل گفتگو کیا کرتے تھے۔ مجھے بالکل اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔
میرے سامنے سے گذرے تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ گورودیال سے پوچھنے
لگے۔

ویل حوالدار! یہ گھوڑا تم نے احمد کو کیوں دیا ہے۔ یہ گھوڑا تو بڑا فیورس اور ڈینجرس ہے
یہ نیا آدمی ہے اس نے ہارس مینیجمنٹ (HORSE MANAGEMENT) کا کورس
بھی نہیں کیا۔ ینگ پرامزنگ لڑکا ہے۔ بے چارا کہیں اِن ولیڈ (INVALID) نہ
ہو جائے۔ آپ نے کب اس کو یہ گھوڑا دیا ہے؟

جس دن سے اس نے ہارس لائن میں رپورٹ کی ہے۔ آپ سے اجازت لے
کر ہی یہ گھوڑا میں نے اس کو دیا تھا۔

آپ کو کسی سینیئر نے خصوصی طور پر یہ ہدایت دی ہے کہ یہ فیورس گھوڑا اس نئے
لڑکے کو دیں۔

جی نہیں۔ کسی سینئر نے مجھ سے نہیں کہا۔

حوالدار میں نے اگر کہا ہوگا تو جوک (JOKE) کیا ہوگا۔ اس فیورس گھوڑے کو تو پرانے
سپاہی بھی ڈیل نہیں کر سکتے۔ یہ بے چارا نیا، ناتجربہ کار لڑکا ہے۔ فوج میں آ کر اس نے ہمیشہ
دفتروں میں کام کیا ہے۔ یہ ہنڈا اس کے بس کا نہیں۔

لیکن سر اس لڑکے نے تو اس گھوڑے کو مکمل طور پر قابو کر لیا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

سر آپ آ کر دیکھ لیں۔

اور پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے
درتھ صاحب کو "گڈ مارننگ سر کہا"۔ اس نے خندہ پیشانی سے مجھے جواب دیا اور پھر
مجھ سے پوچھنے لگا۔

احمد کیا یہ گھوڑا تم نے اپنی خوشی سے لیا ہے یا زبردستی تمہارے سر تھوپا گیا ہے۔

سر میں نے اپنی مرضی سے تو نہیں لیا۔ حوالدار گورودیال سنگھ کے بس میں اتنا کچھ ہی

تھا۔ اس نے یہ گھوڑا دے کر اپنی طرف سے تو مجھے ایک دہکتے ہوئے جہنم زار میں جھونک دیا ہے۔ لیکن میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مجھے زندگی کے کسی مرحلے پر ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

کیوں یہاں آ کر پھر تم نے کوئی غلطی کی تھی۔

نہیں سر۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ ان لوگوں نے میری شہرت اتنی خراب کر رکھی ہے کہ جو بھی میرا نام سنتا ہے تو ایک دفعہ تو چونک ہی جاتا ہے۔

تم نے یہ بدماش (بدمعاش / شرارتی) گھوڑا قبول کیوں کیا ہے۔!

سر میں نے اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں جلد کامیاب ہو جاؤں گا۔

احمد تم اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالو۔

اللہ مالک ہے سر ۔۔۔ میں نے تھوڑے توقف کے بعد سارجنٹ ورمتھ کو کہا۔

سر آپ حوالدار صاحب سے بھی کہیں کہ وہ صرف ایک دفعہ فیوری کے منہ پر ہاتھ تو لگا کر دکھائیں ۔۔۔ گورو پال طیش میں آ گیا اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

تم بڑے تیس مار خاں بنے پھرتے ہو۔ لو دیکھو، اور وہ فیوری کو پچکارتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ فیوری نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بے چارا بوکھلاہٹ کے عالم میں جان بچاتے ہوئے پیچھے جا کر گرا۔ سارجنٹ نے دوڑ کر اسے اُٹھایا۔

میں نہ کہتا تھا یہ گھوڑا بڑا ڈیجرس ہے۔ میں کرنل صاحب کو کہہ کر اس کو گولی مروا دیتا ہوں۔

نہیں سر ایسا نہ کریں یہ بڑا قیمتی گھوڑا ہے۔

نو۔ احمد۔ یہ کسی آدمی کو نقصان پہنچائے گا۔ اگلے دن نائیک عارف کو بری طرح زخمی کیا ہے۔ آج گورو پال سنگھ پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا وہ بچ گیا لیکن اس گھوڑے نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

نہیں سر۔ اس کے ساتھ اگر صحیح طریقے سے ڈیل کیا جائے تو یہ کچھ نہیں کہتا۔

تم اس سے ٹھیک ڈیل کرتے ہو۔

اپنی طرف سے تو کوشش کرتا ہوں کہ صحیح طریقے سے اس کو ڈیل کروں۔

تم بھلا اس کے قریب جاؤ۔

نہیں سر یہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔ میرا تو دوست بن گیا ہے۔

بھلا آگے تو جاؤ۔ میں بھی تو دیکھوں۔

میں نے آہستہ سے دو قدم اپنی دائیں جانب بڑھائے اور فیوری کی گردن جا کر تھپتھپائی۔ اس نے کان گرا دیے اور دم ہلانی شروع کر دی۔

سارجنٹ ورمتھ نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں گوردیال کی طرف دیکھا اور وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔

میں نے سارجنٹ ورمتھ کو کہا۔ سر آپ بے شک اس کے پاس آئیں یہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔

نو۔ نو۔ لوائے۔ ویری ڈینجریس۔ آئی کانٹ ٹیک دِس رِسک

نہیں سر۔ آپ بغیر کسی خوف کے آ جائیں۔ میں ذمہ دار ہوں۔

سارجنٹ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے فیوری کی طرف بڑھنے لگا فیوری نے پھنکارنا شروع کر دیا۔ وہ جب بھی اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو شیش ناگ کی طرح پھنکاریں مارنی شروع کر دیتا۔ میں اس کے پاس کھڑا تھا۔

میں نے بلند آواز سے اس سے کہا۔

نو۔ فیوری۔ نو۔

فیوری نے دم ہلانا شروع کر دی۔ میں نے سارجنٹ کو۔

سر اب آپ بلا خوف و خطر اس کے پاس آ جائیں۔

وہ فیوری کے پاس آ گیا۔ میرے کہنے پر سارجنٹ نے مزید آگے بڑھ کر فیوری کی گردن تھپتھپائی۔ وہ خاموش کھڑا اپنی دم ہلاتا رہا۔

احمد۔ تم میجک (M A G I C) (جادو) جانتے ہو۔ سارجنٹ نے مجھے مخاطب کرتے

ہوئے کہا۔

نہیں سَر۔ اس میں کوئی میجک (MAGIC) نہیں ہے۔ ہر اجنبی آدمی جو فیوری سے پیار کرے گا یہ اس کا دوست بن جائے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہارس لائن میں کام کرنے والے آدمیوں نے شروع ہی سے اس کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ جب بھی کبھی فیوری اس یونٹ میں پہلے پہل آیا ہوگا تو متعلقہ لوگوں نے اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہوگا۔ مارا پیٹا ہوگا۔ اس کا ڈائٹ (DIET) (خوراک) اس کو ٹھیک نہیں دیا ہوگا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ اپنے ارد گرد کام کرنے والے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس نفرت کا اظہار یہ (VOILANCE) کے ذریعے کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی نیا آدمی میرے کہنے کے مطابق اگر اسے ہینڈل کرے گا تو یہ ایک نارمل اینیمل (ANIMAL) ہے اور بالکل صحیح رویے کا اظہار کرے گا۔

آپ نے دیکھا ہے وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔ کوئی بھی نیا آدمی میری موجودگی میں بے شک اس کے پاس آئے۔ اِسے چھوئے۔ اس سے پیار کرے یہ کچھ نہیں کہے گا۔ میں کوئی جانوروں کی نفسیات کا ماہر نہیں ہوں لیکن اپنے طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جانوروں کو بھی اپنی عزتِ نفس کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی انا بھی مجروح ہو تو وہ مختلف طریقوں سے اس کا احتجاج کرے گا۔ آپ کتّے ہی کی مثال لے لیں ہر کتّا اجنبی آدمی کو بھونکتا ہے اور اگر وہ آدمی اس کو پتھر مارتا ہے یا لاٹھی سے مارتا ہے تو وہ حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اُسی کتّے کو اگر آدمی پچکارتا ہے۔ روٹی کا ایک ٹکڑا دیتا ہے تو وہ یقیناً اس پر حملہ نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں ہر ذی روح کو پیار اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں کرنل صاحب کو یہ سب کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ سارجنٹ نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سَر، مہربانی سے آپ ایک ہفتے کی مجھے مزید مہلت دیں۔

اچھا چلو میں ایک ہفتے کے بعد ہی ان کو ہارس لائن میں لے کر آؤں گا۔ اس نے فیوری کے پاس حوضی پر پڑی ہوئی سیڈل اور متعلقہ کٹ دیکھی تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

آپ یہ سامان کیوں لائے ہیں؟

سر میں کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ فیوری پر سیڈل وغیرہ لگاؤں۔ اس ضمن میں میں اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ متعلقہ سامان دیکھ کر مجھ سے کیسا بی ہیو (BEHAVE) کرتا ہے۔

اچھا کوشش کر کے دیکھ لو اور پھر سارجنٹ در بتا بٹالین آفس کی طرف چلا گیا۔

میں نے دو تین منٹ تک فیوری کی مالش کی وہ آرام سے کھڑا رہا۔ اس وقت دوسرے سب سپاہی اپنے اپنے گھوڑوں پر زینیں کس رہے تھے۔ میں نے مالش ختم کی تو جیب سے گڑ کی ایک روڑی نکالی اور فیوری کو دکھائی وہ گڑ کی روڑی زبردستی میرے ہاتھ سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسے طریقے سے کہ مجھے کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچے۔ آخر ناکام ہو کر اس نے میرا ہاتھ چاٹنا شروع کر دیا۔ اور پھر میں نے اپنی مٹھی کھول دی اور اس نے گڑ کی وہ روڑی فوراً ہی اپنے منہ میں ڈال لی۔ میں نے پہلے کمبل اس کی پیٹھ پر تہ کر کے ڈالا۔ وہ خاموش رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے سیڈل اٹھا کر اس کی پیٹھ پر رکھی۔ لگام لگایا اور سیڈل کو اچھی طرح سے کس دیا۔ پھر پہلے اس کی اگاڑی اور پھر پچھاڑی کھول کر اس کو آزاد کیا۔ میں اس کا لگام اپنے بازو میں ڈال کر ہارس لائن سے باہر آ گیا۔

سب لوگ مجھے حیرت زدہ ہو کر دیکھے جا رہے تھے۔ میں نے سڑک پر آ کر گورد یال کو کہا۔

حوالدار جی۔ فیوری کو میں آج رائیڈنگ سکول میں لے جانا چاہتا ہوں۔

نہیں احمد۔ میرا خیال ہے ابھی آپ دونوں کے لیے وہ مرحلہ نہیں آیا۔
نہیں سر۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ ٹھیک بی ہیو (BEHAVE) کریگا۔
اتنی جلدی میں کہیں کوئی نقصان نہ کر بیٹھو۔
مجھے اُمید ہے سب کچھ انشاءاللہ تعالےٰ ٹھیک ہوگا۔
اچھا تمہاری مرضی۔

٥

حوالدار میجر نے وسل بجائی اور ایکسرسائز پر جانے والے اپنے اپنے جانوروں کے سامنے سڑک پر فالن ہوگئے۔ سرسری سے ملاحظے کے بعد حوالدار میجر نے ایکسرسائز کو مارچ آف کا آرڈر دیا اور وہ سب آہستہ آہستہ مین گیٹ سے نکل کر بڑی سڑک پر چڑھ گئے۔

میں اسی طرح فیوری کی لگام بازو میں ڈالے اس کے آگے آگے چلتا ہوا رائیڈنگ سکول میں آگیا۔ ایک چکر میں نے اسے اسی حالت میں کہ اس کے آگے آگے پیدل چل رہا تھا۔ لگوایا اور پھر اسے روک کر اپنا اور اس کا اعتماد بڑھانے کے لیے تھوڑی دیر کھڑا میں اس کی گردن تھپتھپاتا رہا اور اس کے منہ اور پیشانی پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ میں نے اس کا لگام اس کے سر سے پلٹ کر گردن پر کر لیا اور پھر رکاب میں پاؤں رکھ کر ایک ہی جست میں اس پر سوار ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اسے یہ سب کچھ ناگوار گذرا تو وہ اچھا جا گسیخ پا ہو جائے گا۔ یا کوئی اور شرارت کرے گا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ فیوری ایک مثالی اصیل گھوڑے کی طرح قدم جمائے کھڑا رہا۔ جب میں زین میں جم کر بیٹھ گیا تو میں نے اس کو ایڑ لگائی اور وہ میرے اشارے پر رائیڈنگ سکول کی طرف چل پڑا۔ پہلے دو تین چکر میں نے اس سے چلتے ہوئے لگوائے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے دوڑانا شروع کر دیا۔ وہ اتنی نفاست اور سبک رفتاری سے دوڑتا تھا کہ مجھے کوئی

ہچکولے ہی نہ لگا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک میں نے اس سے یہ ایکسرسائز کروائی اور اس نے نہایت شرافت اور فرمانبرداری سے میرے ہر اشارے کو سمجھا اور اس کی تعمیل کی میں نے فیوری کو آخرکار روک لیا رائیڈنگ سکول کے بالکل سامنے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر بٹالین آفس تھا۔ میں نے دیکھا آفس کے باہر کرنل صاحب ایڈجوٹنٹ۔ سینئر سردار اور کئی دوسرے افسر کھڑے میری اور فیوری کی یہ نئی کارکردگی دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاید یہ ایک کشمکش تھی ورنہ ہم دونوں کے درمیان تو مکمل طور پر ہم آہنگی اور انڈرسٹینڈنگ تھی۔ جب میں گھوڑے سے اُترا تو وہ سب کے سب رائیڈنگ سکول کی طرف چل پڑے۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا فیوری سے پیار کرتا رہا۔ انعام کے طور پر ایک روڑی گڑ کی میں نے اسے دی۔ وہ سب میرے قریب آ گئے۔ صوبے دار علی اکبر صاحب نے کہا کہ کرنل صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

میں فیوری کی لگام اس کے سر سے نکال کر اپنے بازو میں ڈال لی اور اس کے آگے چلتے ہوئے کرنل صاحب کے پاس آ گیا۔ میں نے فوجی انداز میں کرنل صاحب کو سلوٹ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر مجھے شاباش دینا چاہتے تھے کہ فیوری نے پھنکاریں مارنی شروع کر دیں۔ میں نے اس سے عرض کی۔

سر آپ تھوڑی دیر کے لیے وہاں ہی رک جائیں۔

کیوں کیا ہو گیا ہے؟

سر فیوری کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک میں اسے منع نہیں کروں گا اس کا رویہ معاندانہ ہی رہے گا اور کوئی بعید نہیں کہ اگر آپ اس کے زیادہ قریب آئیں تو یہ آپ پر بھی حملہ کر دے۔

او۔ نو۔ اور وہ دو تین قدم اور آگے بڑھ آئے۔ فیوری نے اُچھل کر لگام میرے بازو سے چھڑا لیا اور کرنل صاحب پر حملہ کر دیا۔ وہ ابھی اس کے حملے کی زد میں نہ تھے۔ اس لیے بچ گئے۔ میں نے فیوری پر غصہ کا اظہار کیا۔ نو۔ فیوری

پلیز اور وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کرنل صاحب سے کہا۔

سر اب آپ بے شک فیوری کے پاس جائیں۔ اب یہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ جب تک میں اسے نہ کہوں گا اس وقت تک یہ کسی کو بھی اپنے تئے تنگ کا موقع نہیں دیتا اور پھر کرنل صاحب اور دوسرے تمام آفیسرز فیوری کے پاس آ گئے۔ میں نے کرنل صاحب کے علاوہ دوسرے تمام صاحبان سے کہا کہ آپ ذرا پیچھے ہٹ جائیں۔ کرنل صاحب ڈرتے ڈرتے فیوری کے پاس آئے۔ میں نے گڑ کی ایک روڑی کرنل صاحب کو دی کہ یہ فیوری کو انعام کے طور پر دیں۔

کرنل صاحب نے وہ ہاتھ پہ رکھ کر ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔ فیوری نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ کرنل صاحب میرے منہ کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ میں نے اُن کو بتایا کہ

سر جب تک میں فیوری کو نہیں کہوں گا یہ گڑ کی روڑی آپ کے ہاتھ سے نہیں لے گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کرنل صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آپ ابھی دیکھ لیں۔ اب آپ ہاتھ آگے کو بڑھائیں۔ انہوں نے ہاتھ آگے کو بڑھایا۔

میں نے فیوری کو کہا۔ "فیوری ٹیک اِٹ"

فیوری نے آگے بڑھ کر کرنل صاحب کے ہاتھ سے گڑ کی روڑی منہ میں ڈال لی۔ جلدی سے کھا کر پھر ان کے ہاتھ کو چاٹنا شروع کر دیا۔

او۔ دس از۔ امیزنگ (یہ حیرت میں ڈال دینے والی بات ہے)

میں نے دور سے سارجنٹ دربھ اور گوردیالے کو بھی آتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے آتے ہی کرنل صاحب کو سلیوٹ کیا۔ کرنل نے سارجنٹ دربھ سے کہا۔

سارجنٹ۔ دس ایپی سود از آن بِلیوایبل (THIS EPISODE IS UNBELIEVABLE)۔

میں پرسوں احمد اور فیوری کی یہ ناقابلِ یقین کارکردگی دیکھ چکا ہوں۔ کمال کر دیا ہے اس نوجوان نے۔ اس نے رائیڈنگ اور مینجمنٹ کا کوئی کورس بھی نہیں کیا ہوا۔ یہ سب اس نے اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت کے بل بوتے پر سرانجام دیا ہے میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اس گھوڑے کی کاسٹنگ کے لیے آپ کو کیس بنا کر پٹ اپ کروں۔ لیکن اس جوان نے اگلے دن ہی مجھ سے یہ بات کی تھی کہ سر یہ بڑا ہی قیمتی گھوڑا ہے۔ یہ محض مس ہینڈلنگ کی وجہ سے سپائل ہو گیا ہے میں اسے ٹھیک کر لوں گا۔

کرنل صاحب نے مجھے ہدایت دی کہ میں کسی اور جوان کو بھی اپنے ساتھ سٹینڈ بائی رکھوں وہ بھی وقتاً فوقتاً تمہارے ساتھ مل کر فیوری کی ٹریننگ میں تمہارا ہاتھ بٹائے۔

سر یہ ناممکن ہے۔ میں نے کرنل صاحب کو بتایا۔

ناممکن کیوں ہے۔؟

اس لیے کہ جو جوان اس وقت ہارس لائن میں کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ یہ ٹھیک سلوک نہیں کرے گا۔ کوئی نئے لڑکے آئے تو ان میں سے کسی موزوں لڑکے کا میں خود انتخاب کر لوں گا اور پھر کرنل صاحب نے میری یہ تجویز مان لی۔ ایڈجوٹنٹ کو کہا کہ سردست وائرلیس اور پیٹر کی کوئی ویکینسی خالی نہیں ہے۔ آپ فی الحال احمد کو موٹر ڈرائیونگ کے طور پر ٹریننگ دلوائیں۔ پھر جب بھی کسی دوسرے اچھے ٹریڈ میں کوئی ویکینسی خالی ہوئی تو اسے اُدھر ایڈجسٹ کریں گے۔

ایڈجوٹنٹ نے مجھے آرڈر دیا کہ گھوڑے کو ہارس لائن میں چھوڑ کر تم میرے دفتر میں آؤ۔ میں فیوری سے فارغ ہو کر سیدھا بٹالین آفس پہنچا۔ ہیڈ کلرک پیارا سنگھ نے مجھے ڈائریکٹ ایڈجوٹنٹ کے پاس جانے کی اجازت نہ دی تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے ایڈجوٹنٹ صاحب نے بلایا ہے۔ پیارا سنگھ ایک متعصب اور کٹر برہمن تھا۔ اسے یہ بات پسند ہی نہ تھی کہ میں ڈائریکٹ کرنل اور ایڈجوٹنٹ سے اپنا رابطہ

رکھوں - میں اس کی کیا کیا جھجک جھجک کی پرواہ کیے بغیر اڈیجوٹنٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا - اڈجوٹنٹ نے تھوڑی دیر تک مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں اور پھر میرے کوالٹ سے کرپیارا سنگھ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ آج ہی اس جوان کی ایم - ٹی ٹریننگ کا پارٹ ون آرڈر کردو -

مجھے ابھی کوہاٹ آئے ہوئے بمشکل دو مہینے ہوئے ہوں گے کہ میری ایم - ٹی ٹریننگ شروع ہوگئی - اس زمانے میں آج کی طرح مکینکل ٹرانسپورٹ کی بھرمار نہ ہوتی تھی - پوری یونٹ میں گنی چنی دو چار گاڑیاں ہوتی تھیں - سب سے پہلے حوالدار سید غلام اکبر شاہ جو چکوال کے قریب کسی گاؤں کے تھے اور ہماری یونٹ میں ایم - ٹی کے انچارج حوالدار تھے انہوں نے میری ٹریننگ تھری ٹن لاری پر شروع کردی - میں نے کوئی تین ماہ کے عرصے میں یونٹ میں موجود مختلف قسم کی گاڑیوں کی ٹریننگ مکمل کرلی - مجھے کوہاٹ آئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ سارجنٹ جے - ورتھ کو کمیشن مل گیا اور وہ پشاور ڈسٹرکٹ سگنل میں پوسٹ ہو کر چلا گیا - اس کے چلے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا موصوف نہایت ہی شریف النفس اور مہذب انگریز تھا خصوصی طور پر مجھ سے بڑے مہذب انداز میں گفتگو کرتا تھا - جاتے وقت مجھ سے کہنے لگا -

احمد مجھے افسوس ہے میری جلد ہی پوسٹنگ ہوگئی ہے - اِن تھوڑے دنوں میں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا -

## ۵

دسمبر ۱۹۴۰ء کے دن تھے - اس وقت تک میں یونٹ کے سب لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا - اب کاغذوں میں میرا ٹریڈ ایم - ٹی تھا لیکن میں فیوری کی وجہ سے بدستور ہارس لائن میں کام کرتا تھا - فیوری کو اب میں یونٹ ایکسرسائز والوں کے ساتھ باہر پھیری پر لے جاتا تھا - اب وہ بالکل ایک نارمل اینیمل کی طرح

بی ہیو (BEHAVE) کرتا تھا۔ میں باہر لے کر اُسے کھُلے میدان میں خوب دوڑاتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر چونکہ ریس کا گھوڑا تھا۔ اِس لیے اپنے سے آگے کسی دوسرے گھوڑے کو نہ نکلنے دیتا۔ فیوری کی وجہ سے میری گارڈ ڈیوٹی صاف تھی۔ میرے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

رات کا کھانا کھا کر میں اپنے جیسے دو چار اور (IN - DISCIPLINED) لڑکوں کو ساتھ لے کر شہر یوسف کے ہوٹل میں جا پہنچتا۔ وہاں رات دس بجے تک ریکارڈنگ سنتے اور چائے کی چسکیاں لگاتے رہتے اور پھر دس بجے یونٹ لائینز میں واپس آجاتے یوسف کے ہوٹل کے علاوہ جلد ہی میرا ایک اور اڈا بھی بن گیا۔ اور یہ تھا کنگ گیٹ کے باہر کا ایک اجتماع جو تقریباً ہر روز رات گئے رہتا۔ یہ اجتماع تھا کوہاٹ کے مقامی شاعروں اور ادیبوں کا۔

٥

ایک دن میں اپنے ان ساتھیوں کے ہمراہ یوسف کے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا جب کنگ گیٹ کے پاس مسجد کے نزدیک پہنچے تو ہم نے لالہ رحیم بخش کی دکان کے سامنے چارپائیوں اور کرسیوں پر بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے دیکھے۔ ایک آدمی شعر پڑھ رہا تھا حاضرین اسے داد و تحسین سے نواز رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ آپ ہوٹل میں جا کر بیٹھیں میں تھوڑی دیر کے بعد آجاؤں گا۔ چنانچہ میں ان لڑکوں سے الگ ہو کر ان آدمیوں کے پاس آگیا۔ وہ شاعر بدستور اپنا کلام سنا رہا تھا اور دوسرے لے داد دینے ہی میں منہمک رہے۔ میں بھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ شاعر جناب عزیز اختر وارثی تھے اور شرکائے محفل تھے۔ اثر سرحدی، غلام حیدر اختر، محمود شوکت، رانا بنگش اور رحیم بخش۔ یہ رحیم بخش صاحب رہنے والے تو پشاور کے تھے لیکن کوہاٹ میں ان کا قالینوں کا کاروبار تھا۔ یہ محفل روزانہ انہی کے زیر انتظام منعقد ہوتی تھی۔ رحیم بخش چائے پانی سے حاضرین کی خاطر مدارت کیا کرتے۔ اب میں بھی یہاں باقاعدگی

سے آنے لگا۔ اس سے پہلے میرا شاعری سے بس اتنا واسطہ تھا کہ جب کبھی میں دوسرے فوجیوں کے ساتھ ریل کا سفر اختیار کرتا۔ تو راستے میں اے۔ ایچ وہیلر کے ریلوے بک سٹالوں سے حضرت بہزاد لکھنوی کی شاعری کی چھوٹی چھوٹی کتابیں جو اس زمانے میں صرف ایک روپے میں ملا کرتی تھیں خرید لیتا اور جب کبھی سفر کے دوران میں تاش کھیلتے کھیلتے "دل اکتا جاتا تو ٹین کے صندوق پر بیٹھ کر اس کی تھاپ پر بہزاد کی کوئی غزل گانا شروع کر دیتا۔ جس میں میرے ساتھی بھی اپنا بے ہنگم سروں کا اضافہ کر کے سویلین مسافروں کے لیے سفر کو ناقابل برداشت بنا دیتے۔ البتہ ہم لوگوں کے یہ سفر بڑے مزے سے کٹتے۔ ٹی۔ سٹالوں سے چائے پی کر پیسے نہ دیتے۔ چھابڑیاں لوٹتے اور اگر شومیِ قسمت سے خوبرو کراڑی مل جاتی تو اُسے بھی تنگ کرنے سے نہ چوکتے۔

مجھے بچپن سے ہی شعر پڑھنے اور سننے کا بڑا شوق تھا۔ اس زمانے میں دیہاتی سکولوں کی لائبریریوں میں شاعری کی کتابیں نہ ہوتی تھیں۔ اس لیے کورس کی کتاب میں جن شعرا کا کلام ابتدائی جماعتوں کی بچوں کی مسجد سے بالاتر تھا۔ میں نے جب پہلی دفعہ حضرت بہزاد لکھنوی کا کلام پڑھا تو مجھے بہت اچھا لگا ان کا کلام پڑھنے کے بعد میں جدید شاعری کی طرف راغب ہوا۔ کوہاٹ آیا تو ان شعرائے کرام کی محفل میں متواتر بیٹھنے اور ان کا کلام سننے سے مجھے بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ میں بھی بحر اور وزن سے بے نیاز ہو کر شعر کہنے لگا۔ اور اپنے سپاہ پیشہ ساتھیوں کو وہ شعر سنا کر خوب داد وصول کرتا۔

کوہاٹ کے یہ شعرا اور ادیب حضرات انجمن ترقی اُردو کوہاٹ شاخ کے ممبر تھے جو فارغ وقت میں وہاں جمع ہو کر اپنی تفریح کا سامان پیدا کرتے۔ ایک دن وہاں بیٹھے بیٹھے کر جناب عزیز اختر وارثی جو انجمن کے سیکرٹری تھے انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ مشاعرہ کی تاریخ کا تعین کر لیا گیا ہے۔ میں نے پشاور کے دوستوں سے مشاعرے میں شرکت کی رضامندی حاصل کر لی ہے۔ انگر سرحدی کے پوچھنے پر عزیز اختر وارثی صاحب نے بتایا کہ پشاور سے جناب ضیا جعفری۔ جناب عبدالودود قمر۔ جناب

فارغ بخاری۔ جناب رضا ہمدانی اور جناب خاطر غزنوی اور نوشہرہ سے جناب کلیم جلیسری نے مشاعرے میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ میں نے عزیز اختر صاحب سے مشاعرے کے انعقاد کی تاریخ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ پرسوں رات کو یہ مشاعرہ مقامی سینما ہال میں ہوگا۔

میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ مشاعرہ میں ضرور شرکت کروں گا۔ لیکن فوج میں رہتے ہوئے ہم لوگوں کے لیے رات کو دس بجے کے بعد یونٹ لائینز سے غیر حاضر ہونا ایک ناممکن سی بات ہے۔ رات کو دس بجے ہر حالت میں ہر جوان کو واپس اپنے بستر پر موجود ہونا چاہیے۔ مشاعرے کے انعقاد میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے گوردیال سنگھ کو اعتماد میں لے کر یہ بات بتائی کہ مجھے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے چھٹی لے دیں۔ وہ چپ ہو گیا۔ گوردیالہ پرانی وضع کا ہندو تھا۔ اس کے دل میں جو بات ہوتی اس کا اظہار وہ کسی پر نہ ہونے دیتا۔

مشاعرہ میں اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ شام کو جب رول کال ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میری چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی کوارٹر گارڈ کے لیے لگائی گئی۔ اس سے پہلے فیوری کی وجہ سے آج تک میری کوئی ڈیوٹی نہ لگی تھی۔ میں پریشان کن اور پھٹی پھٹی نظروں سے گوردیالے کو دیکھے جا رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے کوارٹر گارڈ ماؤنٹ ہوئی تھی جو دوسرے صبح آٹھ بجے جا کر تبدیل ہوتی۔ میں نے رول کال کے بعد گوردیالے کو کہا۔

حوالدار جی میں نے کل آپ کو بتایا تھا مشاعرے میں شرکت کے لیے جانا ہے مجھے چھٹی لے دیں۔

مجھے یہ ڈیوٹی میں نے تو نہیں لگائی۔

آپ کچھ میری مدد کریں۔ آپ کسی اور آدمی کو میری جگہ بھیج دیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تمہارا پارٹ ون آرڈر ہو چکا ہے۔

لیکن میں مشاعرہ سننے کے لیے تو ضرور جاؤں گا۔

ارے میاں خدا خدا کر کے اب تمہاری ریپوٹیشن کچھ ٹھیک ہوئی ہے۔ خیال کرنا ایسی حرکت نہ کرنا اس نے ناصحانہ انداز میں مجھ سے کہا۔

## ۵

مَیں دوسرے دن کوارٹر گارڈ کی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ مَیں نے گارڈ کمانڈر سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی ٹو دو نمبر پر لگوائی۔ صبح آٹھ بجے گارڈ تبدیل ہوتی تھی۔ ہر دو گھنٹے کے بعد سنتری تبدیل ہوتا تھا۔ مَیں نے اپنے ذہن میں مشاعرہ کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے کسی پر اس کا اظہار نہ کیا۔ مَیں چھ بجے شام اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوا۔ دوسرے جوان اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ مَیں نے جلدی سے کھانا کھایا اور بستر میں لپیٹے ہوئے اپنے سویلین کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں وردی اتار کر لٹکا دی اور سویلین کپڑے پہن کر باتھ روم کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ گارڈ کمانڈر کو یا کسی اور کو میری اس حرکت کا پتہ ہی نہ چلا۔ یونٹ کے مین گیٹ سے باہر آکر مَیں نے سکھ کا سانس لیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہمیشہ سے قید تنہائی میں زندگی گذار رہا تھا۔ اور اب یکایک آزاد ہو کر باہر آیا ہوں۔ اور آزاد فضاؤں میں سکھ کا سانس لے رہا ہوں۔ میں سوچنے لگا اب اگر مجھے کوئی دیکھ بھی لے تو میں اب یونٹ لائنز میں ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔ میں جب مقامی سینما ہال پہنچا تو سات بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مشاعرے کی صدارت خاں بہادر خان محبوب علی خان ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کر رہے تھے۔ مَیں نے ایک دو دروازوں سے اندر جھانک کر دیکھا کوئی سیٹ مجھے خالی نظر نہ آئی۔ عزیز یہ اختر وارثی صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس سٹیج پر بلا لیا۔

اختر صاحب کوئی سیٹ مجھے خالی نظر نہیں آئی۔ مَیں نے ملتجیانہ انداز میں وارثی صاحب کو کہا۔

کوئی بات نہیں آپ شعراء کے ساتھ سٹیج پر ہی بیٹھ جائیں

لیکن میں تو کچھ نہیں پڑھوں گا۔

نہ پڑھیں یہاں شعرا کے ساتھ بیٹھنے میں تو کوئی ہرج نہیں ۔ روزانہ جن دوستوں کے ساتھ گنگ گیٹ کے باہر بیٹھتے ہیں۔ وہی ہوں گے یا پھر پشاور کے چند دوست

ٹھیک ہے بہت شکریہ آپ کا۔

اتنے میں پشاور کے شعرائے کرام تشریف لے آئے۔ سب سے آگے اُن کے قافلہ سالار جناب سید جعفری تھے۔ ان کے پیچھے جناب کلیم جلیسری۔ عبدالودود قمر فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی ایک قطار میں ہال کے اندر تشریف لائے ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ حاضرین نے اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ شعرائے کرام کا استقبال کیا۔

اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق سب سے پہلے مقامی شعراء نے اپنا کلام سُنایا سٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب عزیز اختر وارثی ادا کر رہے تھے۔ مقامی شعرا کے بعد مہمان شعرا کی باری آئی۔ سب سے پہلے جناب خاطر غزنوی نے اپنا کلام سُنایا۔ اُن دنوں خاطر صاحب کوئی چوبیس پچیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ سفید جرّاہی گاؤن پہنے بہت ہی وجیہہ نظر آ رہے تھے۔ حاضرین نے اس کے کلام پر اُن کو دل کھول کر داد دی خاطر صاحب کے بعد جناب رضا ہمدانی۔ جناب فارغ بخاری۔ قمر صاحب۔ کلیم جلیسری اور جناب سید ضیا جعفری صاحب حاضرین کو اپنے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ یوں تو سب شعرائے کرام کا کلام لائقِ تحسین تھا۔ لیکن جناب کلیم جلیسری صاحب مشاعرہ لوٹ کر لے گئے۔ کلیم صاحب تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ لیکن میں نے اتنا اچھا تحت اللفظ پڑھنے والا کوئی شاعر نہیں دیکھا۔

میں مشاعرہ میں خصوصیت سے جناب فارغ بخاری کو دیکھنے اور ان کا بصیرت افروز کلام سننے کے لیے آیا تھا۔ جب سٹیج سیکرٹری نے یہ اعلان کیا۔ حضرات اب پشاور کے نوجوان شاعر جناب فارغ بخاری اپنے کلام سے حاضرین کو نوازیں گے۔ تو مجھے اچھی طرح

یاد ہے بہت دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

ایک ٹھگنے سے قد کا چپٹی ناک والا آدمی مائیک کے سامنے آیا۔ شعر پڑھنے لگا تو منہ سے کم اور ناک سے زیادہ آواز نکالتا تھا۔ مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ میرا جی چاہا کہ رو پڑوں اور چپکے سے جاکر کوارٹر گارڈ کی ایک کال کوٹھڑی میں خود سے بند ہو جاؤں۔ لیکن مجھے معاً یاد آیا کہ کوئی زیادہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا ابھی ایک ہی سال پہلے جبلپور کے قیام کے دوران جب میں اجنتا ایلورا دیکھنے گیا تھا تو میں نے چشتیہ ہال میں ناگا راجہ کا بت دیکھا تھا اور جس کے پہلو میں راج نرتکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہیں راجہ کے سامنے ایک بدھ بھکشو بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑا تھا۔ یہ آدمی تو وہی بدھ بھکشو ہے۔ بالکل وہی ناک نقشہ۔ البتہ اس آدمی نے گیروے کپڑے نہیں پہنے ہوئے بلکہ یورپی طرز کا لباس زیب تن کر رکھا ہے۔
میں نے سٹیج پر کھڑے اس آدمی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو ان میں بلا کی کشش تھی جو انسانی عظمت کی آئینہ دار تھی۔ یہ ماڈرن بھکشو اردو کے شعر پڑھ رہا تھا۔ اس کے کلام میں مجھے کچلی ہوئی انسانیت کا حقیقی چہرہ نظر آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ محض ایک شخص کی آواز نہیں بلکہ دنیا بھر کے کچلے ہوئے انسانوں کی آواز ہے۔ جو ہر طرح کے تصنع سے بے نیاز ہے۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی پر رونا آ گیا کہ میں نے بادی النظر میں اسے ایک عام سا آدمی سمجھا۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن ہونے کا آیا وہ شخص آج تک میرے ذہن کے نہاں خانوں میں سنگ مرمر کی ایک حسین مورتی کی طرح اپنا تقدس لیے ہوئے موجود ہے۔ میں اگرچہ ایک چھوٹے۔ ذہن کا ایک ناپختہ اور کم عمر فوجی تھا لیکن پھر بھی میں نے محسوس کر لیا کہ یہ ایک عام سا بھکشو نہیں بلکہ ایک ویگانیک ہے۔ ایک ایسا فنکار ہے جو انسانیت کے کرب کو اپنے فن میں سمو رہا ہے اور پھر ایک دن آئے گا کہ یہ کرب اسے ایک ابدی زندگی سے ہمکنار کر دے گا اور پھر وہ امر ہو جائے گا۔ مجھے اس کے ساتھ ایک گہری ذہنی اور قلبی رفاقت کا احساس ہوا۔ اب وہ پستہ قد شاعر مجھے ایک بڑی ہی قد آور شخصیت نظر آنے لگا۔

جیسے وہ کوئی مجبور انسان نہ ہو بلکہ تخلیق کرنے والا کوئی سودیوتا ہو۔

۵

رات کے دو بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ مَیں تھکے ماندے ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ مَیں جب یونٹ کے مین گیٹ پر آیا تو سنتری نے گیٹ کھولا۔ اور میرے اندر جانے کے بعد اُسے تالا لگا کر وہ مجھے سیدھا ڈیوٹی آفیسر کے پاس لے گیا۔ جس نے اپنے بستر میں لیٹے لیٹے ہی سنتری کو حکم دیا کہ کوارٹر گارڈ کے کمانڈر کو کہہ دو کہ اس جوان کو کلوز اریسٹ (CLOSE ARREST) کر دے۔ میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا مَیں پہلے سے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ سنتری کے بتانے پر گارڈ کمانڈر نے ایک خالی سیل (CELL) کا تالا کھول کر مجھے اس میں بند کر دیا۔ دوسرے روز میرا چارج شیٹ بنی۔ کرنل کے سامنے پیش ہوا۔ مجھے اٹھائیس دن کی قیدِ سخت کی سزا ملی۔ لیکن میں نے ایسی معمولی باتوں کو زندگی میں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔

دوسرے دن گورد یالہ ایک لڑکے سے میری کِٹ اُٹھوا کر لے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کرنل صاحب نے حکم دیا ہے کہ احمد حسب سابق دن میں بارس لائن میں اپنے دوست فیوری کے ساتھ رہے گا اور اپنی پرانی روٹین جاری رکھے گا۔ البتہ رات کو بیرک میں سونے کی بجائے کوارٹر گارڈ اپنے سیل میں آ جائے گا۔ مَیں نے بڑے غصے بھرے لہجے میں گورد یالے کو کہا۔

حوالدار جی آپ سب اعلیٰ افسران کو بتا دیں۔ مَیں بارس لائن میں نہیں جاؤں گا۔ قانون کے مطابق قیدیوں کی جو بھی روٹین ہوتی ہے میں وہ پوری کرنے کا پابند ہوں۔ بارس لائن جانے کا پابند نہیں۔

لیکن مجھے تو سینئر سردار نے بُلا کر کہا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کے لیے کرنل صاحب کا یہ حکم ہے۔ گورد یالے نے مجھے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

حضور میں نے آپ سے کہہ دیا ہے میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" آپ بے شک سب کو جا کر یہ بتا دیں۔ گورو بالیہ کھسیانا سا ہو کر چلا گیا۔

○

چند ایک سردار صاحبان اور عہدیداروں نے مجھے سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن میں نے کسی کی بھی نہ مانی اور ہارس لائن میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سینئر سردار کے حکم سے سب لوگوں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ مجھ سے کوارٹر گارڈ اگر کوئی آدمی بھی ملاقات نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اشیاء وغیرہ ہی بھجوا سکتا ہے میں نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ سٹینڈنگ آرڈر کے مطابق جو بھی قیدیوں کی روٹین ہوتی میں صرف وہی کچھ کرتا۔ کبھی مجھے کسی نے آکر نہ بتایا کہ فیوری کو دانہ پانی کون دیتا ہے۔ چونکہ پابندی کی وجہ سے مجھ سے کوئی آدمی نہ ہی ملتا اور نہ ہی بات چیت کرتا۔ اس لیے میں دنیا سے بے خبر اپنی سزا کاٹ رہا تھا۔

میری قید کی میعاد ختم ہوئی تو مجھے کچھ اور ایم۔ ٹی۔ ڈرائیوروں کے ساتھ پشاور ڈسٹرکٹ سگنل میں پوسٹ کر دیا گیا۔ وہاں جا کر سٹاف پریڈ ہوئی اور مجھے نمبر ۲ کمپنی میں بطور ڈرائیور کے پوسٹ کر دیا گیا۔ یہ جنوری ۱۹۴۱ء کے دن تھے کہ میں نے نئی یونٹ میں اپنا کام شروع کر دیا۔ حسن اتفاق دیکھیے جب میں نمبر ۲ کمپنی کمانڈر کے پاس انٹرویو کے لیے گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا نیا کمپنی کمانڈر کوہاٹ کی ڈی سیکشن کا سارجنٹ ورتھ تھا جو اب کیپٹن تھا۔ ورتھ صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے سب لوگوں کا انٹرویو ہو گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر میں لے گئے اور مجھ سے جملہ حالات و واقعات تفصیل سے دریافت کیے۔ میں نے ان کو سب حالات سے صحیح طور پر آگاہ کر دیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگے۔

احمد تم اپنی گذشتہ زندگی کے ناخوشگوار واقعات کو بھول جاؤ اور اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ ابھی تم چند روز ایم۔ ٹی گیراج میں کام کرو۔ میں چند دنوں تک تمہاری

وائرلیس آپریٹر کی ٹریننگ شروع کروا دوں گا۔ اور بہت جلد تم اوپریٹر وائرلیس بن جاؤ گے۔

○

میں زندگی کے اس مرحلہ پر اب سمجھتا ہوں کہ اس وقت مجھ میں بنیادی طور پر کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جو اگر کسی بھی فوجی سپاہی میں ہوں تو ایسا سپاہی افسران بالا کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں جہاں بھی جاتا بہت جلد وہاں میرے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا۔

ہماری اس نئی یونٹ میں آدھے پنجابی مسلمان اور آدھے سکھ تھے۔ سینئر ہیڈ کلرک رام رکھا سنگھ ایک نہایت ہی سخت اور متعصب سکھ تھا جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو خاص طور پر نظر میں رکھتا۔ اس دوران میں نے کوئی ایسی غلطی نہ کی کہ جس سے اس کو موقعہ ملتا اور مجھے وہ اپنے ستم اور تعصب کا نشانہ بناتا۔ بہرحال وہ اپنے طور پر جا بجا ڈانٹ ڈپٹ مجھے ضرور پلاتا رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد ورمقہ صاحب کی ترقی ہو گئی اور وہ میجر بن گئے۔ انہی دنوں میں انہوں نے میری وائرلیس اوپریٹر کی ٹریننگ شروع کر دی۔ ان دنوں چونکہ جنگ عظیم دوم زوروں پر تھی اس لیے سنٹر کے علاوہ یونٹوں میں بھی رنگروٹوں کی ٹریننگ شروع ہو گئی تھی۔ ورمقہ صاحب نے مجھے لانس نائیک بنا کر ریکروٹ ٹریننگ ونگ میں ایجوکیشن انسٹرکٹر بنا دیا۔ اس طرح مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ چھ ماہ کی مختصر سی ٹریننگ کے بعد میرا امتحان ہوا اور میں پاس ہو کر وائرلیس اوپریٹر بن گیا۔ ورمقہ صاحب میری ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر بہت خوش تھے۔ البتہ رام رکھا سنگھ میری اس ترقی سے ناراض تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ کرنل صاحب سے بھی اس ضمن میں بات کی لیکن انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور اس طرح اس نے چپ سادھ لی۔ میں اس یونٹ میں تقریباً ایک سال رہا۔ رنگروٹوں کے میں تین چار پیریڈ آرمی ایجوکیشن کے لیتا تھا۔

اب میں نے پشاور شہر میں آنا جانا شروع کر دیا تھا اور آخر کار تلاشِ بسیار کے بعد پشاور کے ادبی حلقوں تک میری رسائی ہو گئی۔ اس زمانے میں جن شعرائے کرام سے میں یہاں متعارف ہوا اُن میں محترم قاضی محمد عمر قضا صاحب جو حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ اس وقت قاضی صاحب کافی ضعیف العمر تھے اور قوتِ سماعت سے تقریباً محروم ہو گئے تھے۔ دوسرے شعرا میں جناب ضیا جعفری۔ نذیر مرزا برلاس۔ مظہر گیلانی مرزا محمود سرحدی۔ شوکت واسطی۔ فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی۔ خاطر غزنوی۔ محمد شفیع صابر۔ مسعود انور شفقی۔ مضطر تاتاری اور جمیل حشمی کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ اب میں بھی اکثر مقامی مشاعروں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ یہاں کی ادبی فضا بڑی سازگار تھی۔ چنانچہ میں نے بھی باقاعدہ مشقِ سخن شروع کر دی۔ شروع شروع میں مجھے اوزان اور بحور کا پتہ نہ تھا لیکن فنِ شاعری پر متعدد کتابیں پڑھنے کے بعد مجھے کچھ شُد بُد ہو گئی۔ اور میں نے اپنا کلام حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی جو کہ اس زمانے میں مدراس یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین تھے کو بغرضِ اصلاح بھیجنا شروع کر دیا۔ علامہ صاحب اس زمانے میں لکھنؤ سکول کے آخری نمائندہ شاعر تھے۔ آپ مشہور شاعر حضرت عزیز لکھنوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ آپ جب بھی کوئی اصلاح شدہ کلام واپس بھیجتے تو اس کے ساتھ بڑی محنت سے مفصل ہدایات فرماتے اور زیرِ نظر کلام کے عیوب و محاسن پر سیر حاصل بحث کرتے۔ اس زمانے میں انہوں نے مجھے فنِ شاعری پر متعدد کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی۔ ان سے اصلاح کا سلسلہ ۴۶ - ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ اس عرصے میں میں مکمل طور پر اردو ادب کی طرف راغب ہو گیا۔ میں نے شروع میں اپنا تخلص لطف رکھا لیکن علامہ صاحب نے احمد لطفی تجویز فرمایا۔ میری مشقِ سخن کوئی دس بارہ سال پر محیط ہے۔

۵

۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے اتحادیوں کو مشرقِ بعید میں آ لیا۔ ڈچ بھاگ کر ا...

ملک واپس چلے گئے۔ البتہ انگریز امریکہ کی مدد سے آخری دم تک جاپانیوں کیخلاف لڑتے رہے۔ ۱۹۴۲ء کے آخر تک جاپان نے انڈونیشیا، ملایا، سنگاپور، برما اور مشرق بعید کے کئی چھوٹے چھوٹے ملک ہتھیا لیے اور اب اس کی فوجیں ہندوستان کے مشرقی دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ سبھاش چندر بوس کو ہندوستان کی حکومت گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ وہ روپوش ہو کر بچتے بچاتے افغانستان جا پہنچے اور وہاں سے جرمن چلے گئے۔ نیتاجی کی اپنی استدعا پر ہٹلر نے ان کو جاپان پہنچا دیا۔ جاپان پہنچ کر انہوں نے حکومتِ جاپان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ انڈین نیشنل آرمی بنانا چاہتے ہیں جن میں وہ ہزاروں ہندوستانی فوجی قیدی شامل ہوں جو اب تک جاپان کی قید میں ہیں۔ اس پر دونوں فریق متفق ہو گئے اور نیتاجی نے اپنا ہیڈکوارٹر مشرق بعید کے جزائر میں بنایا اور وہاں انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں ہزاروں کی تعداد وہ ہندوستانی فوجی شامل ہوئے جو مشرق بعید میں انگریزوں کی شکست فاش کے بعد قیدی بنائے گئے تھے۔ ان میں جنرل شاہنواز، جنرل حبیب الرحمان، میجر فتح خاں، میجر شنگھارا سنگھ کافی مشہور ہوئے۔ سبھاش چندر بوس سے عقیدت کے باعث میرے دل کے کسی گوشے میں بھی جنگِ آزادی کے ان سپاہیوں کے لیے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لوں۔ اس وقت میری عمر کوئی اکیس سال کے لگ بھگ تھی اور ہوش کی نسبت جوش زیادہ تھا۔

ایک دن مجھے میجر ورتھ نے اپنے دفتر میں بلایا۔ میں حاضر ہوا تو وہ کہنے لگے لڑائی آج کل زوروں پر ہے۔ مغرب میں جرمنی اور مشرق میں جاپان فتوحات کرتا ہوا آگے ہی آگے کو بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اب ہمیں جاپان کے مقابلے کے لیے دو نئے محاذوں پر فوج بھیجنی ہے۔ اس صورت میں تمہارے لیے ترقی کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو تمہیں بیس کیمپ (BASE CAMP) میرٹھ پوسٹ کر دیا جائے۔ جانے سے پہلے تمہیں نائیک بنا دیں گے۔ وہاں سے کسی فیلڈ یونٹ میں

جب کسی نئے محاذ پر تمہارا پوسٹنگ ہوگی تو تم دو تین ماہ میں حوالدار بن جاؤ گے تمہارے لیے ایمرجنسی کمیشن کے مواقعے زیادہ ہوں گے۔ اب اگر تم کوشش کرو اور اپنی سروس ٹھیک ٹھاک کرو۔ کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرو تو مجھے یقین ہے تمہیں جلدی کمیشن مل جائے گا۔

سر۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

ٹھیک ہے۔ بٹالین آفس والوں نے پوسٹنگ کے لیے وائرلیس اوپریٹرز کے نام مانگے ہیں۔ ان میں میں تمہارا نام بھی شامل کر دیتا ہوں اور آج ہی تمہارا پروموشن آرڈر بھی کروا دیتا ہوں۔

سر۔ بہت شکریہ آپ کا۔ میں دل ہی دل میں اپنی اس قدر جلد ترقی پر بہت خوش ہوا۔ اور پھر اپنے خوش آئند مستقبل میں کھو گیا۔

شام کو رول کال میں جو پارٹ ون آرڈر پڑھ کر سنایا گیا اس میں میری ترقی کے احکامات بھی شامل تھے۔ لڑائی کے دنوں میں جتنی بھی ترقیاں ہوتی تھیں وہ سب عارضی ہوتی تھیں۔ پشاور سے کل تیرہ آدمیوں کی پوسٹنگ بیس کیمپ میرٹھ کو ہوئی۔ ان میں میرا نام سرفہرست تھا۔ دوسرے دن شام کو ہمیں میرٹھ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ فوج کا یہ ایک طریقۂ کار ہے کہ جب بھی کوئی آدمی پوسٹ آؤٹ ہوتا ہے تو یونٹ کوارٹر ماسٹر اُس کی تمام کٹ تفصیل سے چیک کرتا ہے۔ ہر جانے والے کو یونٹ کینٹین والوں کا حساب بے باک کرنا پڑتا ہے اور جانے سے پہلے کلیرنس سرٹیفکیٹ حوالدار میجر کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ ہم سب کی کلیرنس وغیرہ ہو گئی۔

دوسرے دن شام کو ہم سب یونٹ ٹرانسپورٹ کے ذریعے پشاور کینٹ ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ایک سردار صاحب ہم لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے ریلوے سٹیشن تک آئے۔ اس رخصتی میں دوستی اور ہمدردی کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ وہ سردار واپس جا کر اپنے سینئر افسروں کو محض یہ رپورٹ دیتے ہیں کہ پوسٹنگ جانے والے جوان ٹھیک ٹھاک اپنی نئی یونٹ کو روانہ ہو گئے ہیں۔ میں پوسٹنگ کے جانے والے

اس ڈرافٹ میں سب سے سینئر تھا۔ لیکن عمر میں دو تین لانس نائیک مجھ سے بڑے تھے میری سینیارٹی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ درحقیقت سول لائف کی طرح ہم فوجیوں کی بھی وہاں چھوٹی چھوٹی دوستیاں اور دشمنیاں ہوتی ہیں۔ ان میں علاقائی حد بندیوں کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہم راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہماری گاڑی کوئی گھنٹہ بھر وہاں ٹھہری اور پھر اپنی منزل مقصود کو روانہ ہو گئی۔ ہم دوسرے دن کافی رات گئے میرٹھ جا پہنچے۔ وہاں ایک سرکاری گاڑی اور استقبالیہ کا عملہ موجود تھا۔ ان کی رہنمائی میں ہم نے اپنا سامان اس تھری ٹن لاری میں رکھا اور بیس کیمپ ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئے یہ بیس کیمپ تمام کا تمام انڈین سگنل کور کے لیے تھا۔ استقبالیہ والوں کے بتانے پر ہم نے اپنا سامان ایک خالی بیرک کے برآمدے میں اتار کر رکھا۔ اتنے میں ایک مدراسی صوبیدار میجر۔ ایک حوالدار میجر اور دو تین اور عہدیدار وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے لانگری چائے کا ایک دیگچہ اٹھائے ہوئے آگیا۔ سب لڑکوں نے چائے پی۔ صوبیدار میجر نے سب لڑکوں سے خندہ پیشانی سے بات کی۔ باتوں ہی باتوں میں ہمیں پتہ چلا کہ ہم سب کو ۱۸۱۲ وائرلیس سیکشن میں پوسٹ کیا جائے گا۔ جس کی نفری کوئی اسی افراد کے لگ بھگ ہوگی۔ صوبیدار میجر اچھا پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جب مجھ سے باتیں کیں تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ سیکشن کے انچارج عہدیدار ہوں گے۔ اسی بیرک میں آپ لوگ اپنے بستر لگا لیں مجھے اس نے کہا کہ آپ بیرک کے سرے پر ایک سائیڈ روم لے لیں۔ صوبیدار میجر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد کوئی پچاس ساٹھ کے قریب سپاہی چار پائیاں اور کٹ بکس اٹھا کر لے آئے اور میرے حوالے کر کے چلے گئے۔ میں دل میں خوش ہوا کہ یہاں پذیرائی تو اچھی ہوئی ہے۔ میں نے موومنٹ آرڈر راہداری اور راشن سرٹیفکیٹ حوالدار میجر کے حوالے کیے۔

تمام کور رول کال ہوئی۔ ایک بہت بڑی سی گراؤنڈ میں رول کال پریڈ ہوتی

تھی۔ کمپنی وائرز سب جوان فالن ہوتے تھے۔ میں نے اسی شام آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر دیکھا۔ کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ رول کال سے فارغ ہو کر کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ مجھے ایک واقف کار حوالدار عہدیداروں کے میس پر لے گیا۔ وہاں کھانا کھایا۔ کھانا اچھا تھا۔ میں نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ فوجی یونٹوں میں ہر میس پر چاہے وہ سپاہیوں کا ہو یا عہدیداروں کا ہو یا سردار صاحبان کا کھانا اچھا ہی ہوتا ہے۔ فوج میں عام طور پر فوجی ہسپتالوں۔ ٹرانزٹ کیمپوں اور قیدی کیمپوں میں کھانا اچھا نہیں ہوتا۔ ہسپتال میں کھانا اچھا نہ ملنے کی کوئی وجہ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ البتہ ٹرانزٹ کیمپوں اور قیدیوں کے کیمپوں کا تو مجھے علم ہے کہ متعلقہ لوگ راشن خرد برد کر لیتے ہیں۔ فوج میں راشن کی چوری میں پچھلی نصف صدی سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس مسئلے کو آج تک کوئی نہیں سلجھا سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ارباب بست و کشاد جنہیں یہ مسئلہ سلجھانا چاہیے وہی اس لوٹ کھسوٹ کے زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ تو آپ ہی بتائیں یہ مسئلہ پھر کیسے احسن طریقے سے سلجھے گا۔

اسی شام کو کمپنی حوالدار نے مجھے روزانہ کی روٹین سمجھا دی۔ معمولی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ یہ روٹین سب جگہ ایک سی ہوتی ہے۔ دوسرے دن ہمیں میس کیمپ ہیڈ کوارٹر کے مین آفس میں سٹاف پریڈ کے لیے لے گئے۔ صوبیدار میجر نے کرنل صاحب کو بتایا کہ یہ سب کے سب وائرلیس اوپریٹرز ہیں جو ۲۸ وائرلیس سیکشن کے لیے پوسٹ ہو کر آئے ہیں۔ کرنل نے ہمارے ٹرن آؤٹ (TURN OUT) کا ایک ایک کے سامنے کھڑا ہو کر معائنہ کیا۔ کرنل ایک بوڑھا گھاگ انگریز تھا۔ بڑا گرگ باراں دیدہ تھا۔ مجھے دیکھ کر صوبیدار میجر کو کہنے لگا۔

فی الحال اس نائیک ہی کو ان کا انچارج بنا دو۔ اگر کوئی حوالدار جلد پوسٹ ہو کر نہ آیا تو پھر اسے ہی پروموٹ کر دیں گے۔

شریر لڑکا بڑا پڑھا لکھا اور قابل عہدیدار ہے۔ میرے خیال میں اسے ہی ترقی

کا موقعہ ملنا چاہیئے۔

کرنل نے مجھ سے انگریزی میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔ میں نے بھی اپنی طرف سے کوشش کی کہ اُسے مطمئن کروں۔ اُس نے ہر زاویئے سے میری لیاقت کو پرکھا۔ پھر صوبیدار میجر کو کہنے لگا۔

صوبیدار میجر صاحب آپ ایڈجوٹنٹ صاحب کو بلائیں۔

بہت اچھا سَر۔ اور پھر وہ ایڈجوٹنٹ کو بُلا کر لے آیا۔

کرنل نے ایڈجوٹنٹ کو حکم دیا کہ اس نائیک کو آج ہی حوالدار کے عہدے پر ترقی دے دو۔ آج ہی اس کا پارٹ ون آرڈر کر دو۔

بہت اچھا سَر۔

چنانچہ اسی روز ہی میری ترقی کے احکامات جاری ہو گئے۔ سٹاف پریڈ کے بعد میں اُن جوانوں کو مارچ کر کے نمبر ۳ کمپنی میں لے آیا۔ وہاں کمپنی کمانڈر میجر گرین تھے۔ اُن سے مختصر سا انٹرویو ہوا اور پھر ہمیں ایک بڑی سی بیرک میں حوالدار میجر جا کر چھوڑ آیا۔ اس نے بتایا کہ اس بیرک میں آپ کے سٹورز ہوں گے اور آدھی بیرک میں آپ اپنے جوانوں کی ٹریننگ کے لیے روزانہ ان کی کلاسیں لیا کریں گے۔ کمپنی کمانڈر مجھ سے ملا تو ہر نئے ملنے والے کی طرح وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوا۔ ہماری سیکشن میں ہر روز کہیں نہ کہیں سے آدمی پوسٹ ہو کر آتے رہے۔ ان میں دو حوالدار بھی تھے۔ چونکہ وہ مجھ سے سینئر تھے اس لیے کرنل نے ان کو ۲۱۸ وائرلیس سیکشن کی بجائے دوسری جگہ پوسٹ کر دیا تاکہ میں ذہنی طور پر ڈسٹرب (DISTURB) نہ ہوں۔

میں چونکہ بنیادی طور پر کلرک تھا اس لیے دفتری کام نہایت ہی چابکدستی اور مہارت سے کرتا تھا۔ مجھے میرٹھ آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہوا ہو گا کہ ایک انگریز آفیسر کیپٹن پیرس (PEARS) کو بطور آفیسر کمانڈنگ ۲۱۸ وائرلیس سیکشن پوسٹ کر دیا۔ میجر گرین نے اسے بتایا کہ حوالدار احمد نہایت ذہین اور قابل عہدیدار ہے۔ اب تک اس نے سیکشن کا تمام کام نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ میں نے اس کا نام ایمرجینسی کمیشن کے

لیے کرنل صاحب کے پاس بھیجا ہوا ہے۔ جنہوں نے اپنی سفارش کے ساتھ اس کا کیس آرمی ہیڈکوارٹر کو ریفر (REFER) کیا ہوا ہے۔ شاید یہ آپ کے ساتھ بر ما نہ جا سکے گا چونکہ یہ اس وقت تک انڈین ملٹری اکیڈمی لونگ ٹرم ٹریننگ کے لیے چلا جائے گا۔ بہر حال جب تک یہ ہے اس سے آپ خوب کام لیں اور مجھے یقین ہے آپ اس کے کام سے مطمئن ہوں گے اور آپ کو سیکشن کی ریزنگ (RAZING) اس کے لیے سٹورز کی فراہمی کے لیے یہ آپ کا ممد و معاون ثابت ہو گا۔

## ۵

اگرچہ میں سپاہ پیشہ خاندان کا فرد تھا لیکن نہ جانے مجھ میں بنیادی طور پر کیا کمی تھی کہ میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو فوجی سپاہی نہیں سمجھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں فطرتاً فوجی سپاہی ہونے کا اہل نہ تھا۔ مجھ میں جو بنیادی طور پر کمزوریاں تھیں انہیں جانتے ہوئے بھی میں نے کبھی ان پر قابو پانے کی کوشش نہیں۔ کبھی ذاتی طور پر سود و زیاں کا سنجیدگی سے نوٹس ہی نہیں لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب میں بھرتی ہوا اس وقت کوئی صاحب اختیار آدمی مجھے صحیح گائیڈ لائن دینے والا ہوتا تو میں قدم قدم پر اپنی حماقتوں اور سینہ زوریوں کا مظاہرہ نہ کرتا تو شاید میں بھی کسی اعلیٰ فوجی عہدے تک ترقی کر جاتا۔ میری بدقسمتی اور میری نادانیوں نے یہاں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں ٹروپس (TROOPS) پہ کمان کرنے کے فن سے قطعاً ناآشنا تھا۔ میں صبح سویرے ان کو ڈرل اور پی۔ ٹی نہ کروا سکتا تھا۔ چونکہ ان دونوں شعبوں میں شروع ہی سے میں گھامڑ تھا۔ اس لیے میری یہ نفسیاتی کمزوریاں مجھ پر حاوی ہوتی گئیں۔ میں نے اپنے ایک ماتحت نائیک خان بہادر کو سیکشن کے ان کاموں کے لیے اپنی طرف سے انچارج بنا رکھا تھا۔

میں روزانہ شام کو کھانا کھا کر اپنے دو تین ہم مشربوں کے ساتھ میرٹھ بازار کا رخ کرتا۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے پیتے اور سیر دوسرے تیسرے روز مشہور قوال کلن خان کی قوالی سننے کے لیے ان کے اڈے پر جا پہنچتے۔ فوجی روٹین کے ساتھ ہماری یہ

آؤٹ ڈور روٹین بھی باقاعدگی سے چلتی رہی۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے میرا کال کب آتا ہے۔

ایک دن کوئی ساڑھے دس بجے دن جب میں وائرلیس ٹریننگ کی کلاس لے رہا تھا کہ دفتر سے ایک اردلی آیا اور اس نے مجھے کہا کہ آپ کو صوبیدار میجر صاحب بلا رہے ہیں۔ میں اُن کے پاس پہنچا۔ سلام کیا اور بُلانے کی غرض و غایت پوچھی تو وہ چُپ رہے۔ میں خوش تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید اکیڈمی سے میرا کال آگیا ہے۔ صوبیدار میجر بغیر کسی تاخیر کے مجھے بٹالین آفس لے گیا۔ تھوڑی دیر میں کرنل نے ان کو کہا کہ حوالدار احمد کو اندر لے آئیں۔

صوبیدار میجر مجھے مارچ کر کے کرنل کے سامنے لے گیا۔ ان کو سیلوٹ کیا اور رپورٹ دی۔

سر۔ حوالدار احمد پریذنٹ۔

کرنل نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حوالدار ٹھیک ہو۔ ؟

ٹھیک ہوں سر۔

تمہاری سیکشن کا کاروبار کیسے چل رہا ہے ؟

ٹھیک چل رہا ہے سر۔

کتنی نفری ہے تمہاری سیکشن میں ؟

سر۔ فی الحال کوئی اسّی کے قریب ہے۔

تم اُن پر کمانڈ ٹھیک طرح سے کرتے ہو ؟

سر۔ بالکل ٹھیک کرتا ہوں۔

آج تمہاری سیکشن کے سب آدمی پریذنٹ ہیں ؟

پریذنٹ ہیں سر۔

اور پھر اُس نے اپنی میز پر پڑے ہوئے شیشے کے نیچے سے ایک چٹ نکالی

اور مجھ سے کہنے لگا۔

سگنل مین صابر حسین اور منیر حسین کو بلا کر ہمارے سامنے لے آؤ۔

بہت اچھا سر۔ اور میں اسے سیلوٹ کر کے ان لڑکوں کو بلانے کے لیے چلا گیا۔ میری عدم موجودگی میں خان بہادر ان کی کلاس لے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی خان بہادر سے پوچھا۔

خان بہادر۔ صابر حسین اور منیر حسین کہاں ہیں؟

اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ خان بہادر سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

بتاؤ یہ دونوں لڑکے کہاں ہیں؟ میں نے درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔

سر یہ تو صبح سے نہیں ہیں۔

مجھے بتایا کیوں نہیں؟

میں نے سوچا ادھر ہی کہیں ہوں گے آجائیں گے۔ معمولی بات ہے۔ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔

یہ معمولی بات ہے۔ تم نے میرا کیریر ہی تباہ کر دیا ہے۔

صابر اور منیر کہاں ہیں؟ میں نے کلاس میں بیٹھے ہوئے لڑکوں سے پوچھا۔

سر وہ تو رات سے غیر حاضر ہیں۔ کئی لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

کسی کو پتہ ہے کہاں گئے ہیں؟

سر وہ سینما دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

لیکن سینما دیکھ کر تو ان کو رات ہی کو واپس آجانا چاہیے تھا۔

نہیں سر۔ ان کے بستر رات بھر خالی رہے۔

تم لوگوں نے خان بہادر کو یہ بات بتائی تھی؟

سر یہ بات خان بہادر کے اپنے فرائض میں شامل ہے کہ وہ لائٹ آؤٹ کے بعد سب کو فرداً فرداً چیک کر کے حوالدار میجر کو رپورٹ دے۔

خان بہادر نے کل رات کو چیکنگ کی تھی؟

نہیں جناب۔

میں بوجھل قدموں سے چلتا بٹالین آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا تاریک مستقبل میرے سامنے منہ پھاڑے مجھے نگلنے کے لیے آگے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں بٹالین آفس پہنچا تو صوبیدار میجر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر کہنے لگا۔

بدقسمت آدمی۔ تھوڑے دنوں کی بات تھی۔ تم اپنی سیکشن پر اتنا کنٹرول بھی نہیں کر سکتے۔

میں شرمندہ سا ہو کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

وہ مجھ سے کوئی مزید بات کیے بغیر مجھے کرنل کے دفتر میں لے گیا۔ مجھے باہر برآمدے میں کھڑا کیا اور خود اندر کرنل کو رپورٹ دینے کے لیے چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر ہی میں باہر آ گیا اور پھر مجھے مارچ کر کے اندر کرنل کے پاس لے گیا۔

حوالدار۔ لے آئے ہو اپنے وہ دونوں سپاہی۔ کرنل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نہیں سر۔

کیوں نہیں لائے؟

سر وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔

صبح تھے؟

میں خاموش ہو گیا۔

میں جب اُن دونوں لڑکوں کی تلاش میں گیا تھا تو کرنل نے ایڈجوٹنٹ سے کہہ کر میری چارج شیٹ فریم کروا لی تھی۔ چارج یہ تھا کہ میں نے ۲۱۸ وائرلیس سیکشن کا عہدیدار انچارج ہونے کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں پر صحیح فوجی طریقے سے صحیح کنٹرول نہیں کیا۔ اور اس لاپرواہی کی وجہ سے دو سپاہی صابر حسین اور منیر حسین بھاگ کر لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہوئے ہی تھے کہ بریگیڈ کی ملٹری پولیس کے گوروں

نے ان کو پکڑ لیا۔ کرنل نے مجھے چارج شیٹ پڑھ کر سنائی اور پھر مجھے جواب دینے کے لیے کہا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ سمری ٹرائل تھا اس لیے کرنل نے بغیر کسی تاخیر کے فیصلہ سنا دیا۔

حوالدار احمد کو ڈی موٹ (DEMOTE) کر کے نائیک بنایا جاتا ہے۔ اور کمیشن کے لیے اس کے جو کاغذ آرمی ہیڈ کوارٹر نئی دہلی کو بھیجے گئے ہیں وہ واپس منگوانے کے لیے آج ہی سگنل دیا جائے گا۔ کیس مارچ آف۔

صوبیدار میجر نے ریزر بلیڈ سے میرے عہدے کا ایک سٹرائپ میرے بازو سے فوراً اتار لیا۔ اور پھر مجھے مارچ کر کے باہر لے آیا۔ وہاں وہ تھوڑی دیر تک کھڑا مجھے سمجھاتا رہا۔ اور پھر اپنے کام پر جانے کے لیے کہا۔ اسی روز سگنل مین صابر حسین اور منیر حسین بھی پکڑے ہوئے یونٹ کوارٹر گارڈ میں منتقل کر دیے گئے۔ دوسرے دن ان کی بھی پیشی ہوئی۔ ان دونوں کو اٹھائیس اٹھائیس دن کی قیدِ سخت کی سزا ملی۔

ابھی تک ہماری سیکشن میں کوئی حوالدار پوسٹ نہ ہوا تھا۔ اگرچہ میں نائیک تھا لیکن پہلے کی طرح ۲۱۸ وائرلیس سیکشن کا این۔ سی۔ او انچارج تھا۔ اتنا بڑا تازیانہ لگنے کے بعد بھی میری بدقسمتی نے مجھے سنبھلنے کا موقعہ نہ دیا اور میں بدستور اپنی پرانی روٹین پر قائم رہا۔ اگرچہ اس واقعہ کے بعد کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن میرے لیے یہ واقعہ اتنا شدید تھا کہ میں یہ ذہنی دھچکا برداشت نہ کر سکا اور اپنے آپ کو حالات و واقعات کے مطابق نہ ڈھال سکا۔

مارچ ۱۹۴۲ء کو ہماری سیکشن محاذِ جنگ کے لیے روانہ ہو گئی۔ میرٹھ سے ہمیں ریل گاڑی پر سوار کر دیا گیا۔ سوائے کیپٹن پیرس کے کسی کو بھی یہ پتہ نہ تھا کہ ہماری منزلِ مقصود کہاں ہے۔ اس زمانے میں فوجی یونٹوں کو محاذِ جنگ پر لے جانے کے لیے سپیشل ریل گاڑیاں چلائی جاتی تھیں۔ اگرچہ ہماری سیکشن کی نفری کوئی زیادہ نہ تھی۔ لیکن فوجی ساز و سامان۔ وائرلیس سیٹ۔ سٹورز۔ فوجی گاڑیاں اتنی تھیں کہ

اس سپیشل ٹرین میں تقریباً آدھی گاڑی ہمارے استعمال میں تھی۔ محاذِ جنگ کی طرف جانے والی سپیشل ٹرینیں رات کے اندھیرے میں چلا کرتی تھیں تاکہ دشمن کے ایجنٹ فوجی نقل و حرکت سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ یہ گاڑیاں راستے میں کئی سٹیشنوں پر ضرورت کے تحت رُکتیں تو اُن کو پلیٹ فارموں سے بہت دُور اُجاڑ سی جگہ پر روکتے۔ انجن گاڑی کو ویرانے میں چھوڑ کر اپنے لیے کوئلہ اور پانی وغیرہ لینے جاتے ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود ہمیں کچھ اندازہ ہو گیا کہ یہ ٹرین مشرق کی سمت کہیں جا رہی ہے۔ گاڑی رات کے اندھیروں میں ریلوے سٹیشن سے دور گھنٹوں کھڑی رہتی اور فوجی اپنے لیے مقررہ وقت پر چائے اور کھانا وغیرہ حاصل کرتے۔ تقریباً دو دن کے بعد مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ یہ گاڑی کوہیما۔ منی پور۔ امپھال محاذ کی طرف جا رہی ہے۔ راستے میں ہم نے ٹرین سے گذرتے ہوئے گورکھپور کا بورڈ دیکھا اس سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ چونکہ شمال مشرقی سرحد پر یو۔ پی کا یہ آخری ضلع ہے اور اس سے آگے آسام کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم آسام کی طرف جا رہے ہیں۔ اور یہ سفر آخر کار کوہیما۔ منی پور کے محاذ پر پہنچ کر ختم ہو گا۔

تیسرے دن ہماری گاڑی آسام کی حدود میں جا داخل ہوئی۔ اس وقت تک تقریباً سب جوانوں کو پتہ چل چکا تھا کہ ہم کوہیما۔ امپھال محاذ پر جا رہے ہیں۔ شام کو ہماری گاڑی آمین گاؤں جا پہنچی۔ آمین گاؤں دریائے برہم پترا کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں سب سامان سٹورز اور گاڑیاں وغیرہ ریل سے اُتاریں۔ ریلوے کے عملے نے بتایا کہ یہاں سے اب سٹیمر پر بیٹھ کر دریا کے اس پار لینا پانڈو گھاٹ جائیں گے۔ وہاں سے ہمیں دوبارہ ریل پر سوار ہونا تھا۔ اس دن چونکہ دیر ہو گئی تھی اس لیے رات آمین گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر بسر کی اور دوسرے دن بڑی مشکل سے شام تک اپنے سٹورز اور گاڑیاں پانڈو گھاٹ پر پہنچائیں۔ وہاں پہلے سے ایک سپیشل ٹرین ان فوجیوں کو محاذِ جنگ پر لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ چونکہ زمانہ جنگ میں رات کو روشنیوں کی اجازت نہیں ہوتی۔

اور کھانا وغیرہ بھی غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی کھا لیتے ہیں۔ اس لیے یہ رات ہمیں پانڈو گھاٹ ریلوے سٹیشن پر بسر کرنا پڑی۔ یہ بالکل آمین گاؤں کے بالمقابل دریائے برہم پترا کے مشرقی کنارے پر چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ اس پر بھی کوئی پلیٹ فارم وغیرہ نہ تھا۔ دوسرے دن صبح سویرے ہم نے اپنا سازوسامان اور گاڑیاں وغیرہ اس ریل گاڑی میں لوڈ کیں۔

دن کے دس بجے یہ گاڑی اپنی نئی منزل کے لیے روانہ ہوئی۔ راستے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ریلوے سٹیشن آئے لیکن ہماری گاڑی ان میں کسی پر بھی نہ ٹھہری۔ آخرکار شام کو چار بجے ہماری گاڑی دیماپور کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی ابھی کوہیما۔ امپھال اور منی پور آگے تھے۔ ہمیں دیماپور ہی میں اپنا سامان اور سٹورز وغیرہ اُتارنے کا حکم ملا۔ اندھیرا ہوتے ہوتے ہم نے اپنی سب گاڑیاں۔ سٹورز اور دوسرا سب سامان ریل گاڑی سے نیچے اُتار لیا۔ وہ سپیشل ٹرین ہمارے ڈبوں کو کاٹ کر دیماپور سٹیشن پر چھوڑ کر کوہیما کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

اب ہر سُو اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھانا پکانے کا مسئلہ تھا۔ اگرچہ سب راشن ہمارے پاس موجود تھا لیکن رات کی اس تاریکی میں آگ جلانا ممنوع تھا۔ اس رات ہم نے مقامی لوگوں سے کیلے۔ انناس اور حلوہ پوری لے کر گذارا کیا دیماپور ریلوے سٹیشن سے کوئی سات آٹھ میل کے فاصلے پر "آر" ۔ ایل آف سی کینبل یونٹ تھی۔ ہماری سیکشن نے اس یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی۔ رات جوں توں کر کے بسر کی۔ دیماپور میں تقریباً چوبیس گھنٹے بارش ہوتی رہتی ہے۔ رات ہم لوگوں نے ریل کے خالی ڈبوں اور اپنی موٹر گاڑیوں میں بسر کی۔ وہاں مچھر اور جونکوں کی بھرمار تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہماری یونٹ سے موٹر گاڑیوں کا ایک کالونائے ہمیں لینے کے لیے آیا۔ ان کے ساتھ لنگر کا عملہ بھی تھا جنہوں نے ہمارے لیے چاول کے بڑے بڑے دیگچے اُتارے۔ ہانس کی بنی ہوئی دو بڑی بڑی ٹوکریاں،

تھیں جو پوریوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سب جوانوں نے خوب مزے لے لے کر ناشتہ کیا۔ کیپٹن پیرس کو بھی میں نے ناشتہ بھجوا دیا۔ اس نے بھی بڑے شوق سے ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد لڑکوں نے سامان گاڑیوں میں لوڈ کرنا شروع کر دیا۔ کالوئے انچارج ایک مسلمان سردار تھا۔ اس نے کیپٹن صاحب کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا اور کالوائے یونٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جنگل کاٹ کر اندر سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ مسلسل بارش اور ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے ان سڑکوں پہ دریا کے کنارے کی دلدلی زمین کا گمان ہوتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ جنگل میں جھاڑیاں اور گھاس پھوس صاف کر کے ہمیں خیمے لگانے کا حکم ملا۔ ایسی زندگی کا ہم سے کسی کو بھی تجربہ نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کرنل اور صوبیدار میجر وہاں آ گئے۔ کرنل نے سپاہیوں کو لوں سُست رفتاری سے کام کرتے ہوئے دیکھا تو پہلے کیپٹن پیرس کو ڈانٹ پلائی اور پھر مجھے جھاڑا۔ اس دن شام تک ہم اپنے خیمے بھی نصب نہ کر سکے۔ سٹورز باہر بارش میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان پر صرف ترپال ڈلوا دیے تھے۔ شام کو غروب آفتاب سے پہلے کھانا کھایا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس قدر مشکل حالات میں بھی اتنا اچھا کھانا پکا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ امن کی چھاؤنیوں میں تو گوشت سپلائی ڈپو سے ہی فوجیوں کو ملتا ہے جو نہایت ناقص اور بدمزہ ہوتا ہے۔ لڑائی کے میدان میں یونٹوں کو زندہ بکرے مل جاتے ہیں اور وہ خود انہیں اپنی ضرورت کے مطابق ذبح کرتے ہیں۔ چونکہ امن کی چھاؤنیوں میں سپاہیوں کا راشن چوری چھپے کھانے والے بہت ہوتے ہیں اور یہاں راشن چوری ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس لیے راشن کی فراوانی تھی۔ تازہ گوشت، مِلک گھی۔ چینی۔ ٹِن مِلک۔ ٹن فروٹ۔ سگریٹ وغیرہ بڑی فراوانی سے ملتے تھے۔ میں نے انگریزوں کا سپلائی کا نظام نہایت اعلیٰ دیکھا۔ فرنٹ لائن پر بھی کبھی کوئی سپاہی ان چیزوں سے محروم نہیں ہوا۔

دوسرے دن شام تک ہم نے اپنے سٹورز کے لیے خیمے لگا لیے۔ سامان کو خیموں میں رکھ دیا۔ اپنے رہائشی خیموں کو اندر سے تین چار فٹ کھود کر اس کے اوپر خیمے لگائے جو مٹی نکلی اس کے بند خیموں کے کناروں پر بنا دیے تاکہ بارش کا پانی خیموں کے اندر نہ آئے۔ ہم تقریباً ایک ماہ تک یونٹ ہیڈکوارٹر میں رہے ہوں گے کہ ہماری وائرلیس ڈی ٹیچ منٹس (DETACHMENTS) ڈیپلائے DEPLOY کر دی گئیں۔ ہماری سیکشن کا ہیڈکوارٹر دریائے برہم پترا کے کنارے ایک بڑے سے قصبے "دھوبڑی" میں رکھا گیا اور دوسری وائرلیس ڈی۔ ٹیچ منٹس دریائے برہم پترا کے کنارے کنارے اسی اسی سو سو میل کے فاصلوں پر تعینات کی گئیں۔ ان کے ذمہ سٹیمروں کے کنٹرول کا انتظام تھا۔ جو حکومت نے فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے حاصل کر لیے تھے۔ اس سب انتظام کو فوجی افسر کنٹرول کرتے تھے۔

۵

دھوبڑی کے ایک ہائی سکول میں ہم نے اپنا ہیڈکوارٹر قائم کیا۔ اسی سکول میں ایک بریگیڈ ہیڈکوارٹر بھی تھا۔ جس میں زیادہ تعداد گوروں کی تھی۔ ایک دن جبکہ شام کا وقت تھا میں ایک سرکاری کام سے کیپٹن پیرس کے خیمے میں گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ گورا کپتان کیمپ کاٹ (سفری چارپائی) پر اپنے بستر میں لیٹا ہوا ہے اور اس کا اردلی سگنل مین محمد بشیر جو ایک کشمیری خوبرو لڑکا تھا اس کے ساتھ سویا ہوا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا غصہ آیا میں اُلٹے پاؤں واپس ہوا۔ وہ کپتان مجھے بلاتا رہا۔ لیکن میرا پارہ حدِ اعتدال سے بڑھ چکا تھا۔ میں نے اس گورے کپتان کی کوئی بات نہ سنی بلکہ سیدھا اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ ساتھی کھانا لائے لیکن میں نے غصے کے مارے کھانا بھی نہ کھایا۔ لنگر کمانڈر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ جب کیپٹن پیرس کا اردلی سگنل مین محمد بشیر آئے تو اُسے میرے رُوبرو پیش کرنا۔ تھوڑی دیر میں بشیر بھی لنگر پر کھانے کے لیے آیا۔ لانس نائیک محمد یوسف اسے میرے پاس لے آیا۔ اس

جب مجھے دیکھا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ندامت کے باعث سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسے حکم دیا۔

بشیر اس وقت کے بعد تم کیپٹن پیرس کا اردلی نہیں تھے۔ تم اس کے خیمے میں نہیں جا سکتے۔ آج سے تم اپنے ٹریڈ کا کام کرو گے۔ کھانا کھا کر فوراً منشی خان سے گاڑی کا چارج لے لو اور پھر میں نے یوسف کو کہا کہ منشی خان سے چارج دلوا کر اسے بطور کیپٹن پیرس کے اردلی کے آج ہی بھیج دو یہ فوراً اسے جا کر رپورٹ کرے۔

اُن میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی اور سر جھکائے واپس چلے گئے۔

بشیر اور میرے بغیر اور کسی کو بھی اس تبدیلی کی وجہ معلوم نہ تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک جوان آیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ آپ کو کیپٹن صاحب بُلا رہے ہیں لیکن میں بطور احتجاج اُس کے پاس نہ گیا۔

اس کا نیا اردلی جب اس کے پاس پہنچا تو اُس نے پوچھا۔

منشی خان تم کیوں آئے ہو؟

سر۔ مجھے سیکشن حوالدار (میں اس وقت تک دوبارہ حوالدار بن چکا تھا) آپ کا اردلی بنا کر بھیجا ہے۔

نہیں تم واپس جاؤ۔ حوالدار کو بولو کہ سگنل مین محمد بشیر ہی کو بھیجو۔

سر اس کو حوالدار نے مجھ سے گاڑی کا چارج دلا دیا ہے۔ میرے سامنے حوالدار نے بشیر کو کہا ہے کہ اب تم کیپٹن پیرس کے اردلی کے طور پر کام نہیں کرو گے۔

اچھا تم واپس جاؤ اور حوالدار کو کہو کہ جلدی بشیر کو ہمارے پاس بھیجو۔

منشی خان نے واپس آ کر مجھے سب صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے اُس کو کہا کہ تم اپنے ٹینٹ میں جا کر آرام کرو۔ تم چار بجے شام کو اُسے آفیسرز میس سے شام کی چائے لا دینا۔ کچھ زیادہ وقت نہ گذرا ہو گا کہ ملکہ وکٹوریہ کا وہ پوتا غصے سے پھُنکا ہوا خود میرے ٹینٹ کے دروازے پر آ گیا۔ نہایت غصے سے مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

حوالدار احمد باہر آؤ۔ میں باہر آیا تو شیر کی طرح بپھرا ہوا مجھ سے کہنے لگا۔

حوالدار ہمارا اردلی کدھر ہے ؟

کونسا اردلی ؟

سگنل مین بشیر ۔

اس کو مَیں نے تبدیل کر کے گاڑی کا چارج دلوا دیا ہے ۔ وہ اب آپ کے اردلی کے طور پر کام نہیں کرے گا ۔ اس کی جگہ مَیں نے سگنل مین منشی خان کو ڈیٹیل (DETAIL) کیا ہے ۔ اُسے مَیں نے آپ کے پاس بھیجا تھا ۔ آپ نے اس کو واپس کر دیا ہے ۔

منشی خان ہمارا اردلی نہیں ہے ۔ ہمارا اردلی سگنل مین بشیر ہے ۔ آئی ۔ وانٹ بشیر (I WANT BASHIR) (مجھے بشیر ہی چاہیئے)

مَیں نے اس گورے کپتان کو واضح طور پر بتا دیا کہ اب سگنل مین بشیر آپ کے پاس بطور اردلی کام نہیں کرے گا ۔

ہم او ۔ سی (آفیسر کمانڈنگ) ہے یا تم ۔ اس سیکشن میں ہمارا حکم چلے گا ۔

وہ حکم جو قانون کے دائرے میں ہو گا ، ضرور چلے گا ۔ غلط حکم نہ میں خود مانتا ہوں نہ اپنے سے نیچے والوں کو اسے بے ہودہ حکم کی تعمیل کے لیے کہہ سکتا ہوں ۔

یُو ۔ شٹ اَپ (YOU SHUT - UP)

یُو ۔ شٹ اَپ ۔

یُو ۔ ڈیم فول انڈین ۔ ہاؤ ۔ یُو ۔ ڈیر ٹو ۔ سے دِس (او بیوقوف ہندوستانی تمہیں یہ باتیں کہنے کی جرأت کیسے ہوئی ۔)

شٹ اَپ ۔ یُو ۔ سَن آف ۔ اے ۔ بِچ ۔ (کواس بند کرو کُتیا کے بچے)

آئی ۔ وِل ۔ سی ۔ یُو ۔ (میں تمہیں دیکھ لوں گا)

آئی ۔ وِل ۔ ٹیل ۔ ٹو ۔ کرنل ۔ دی ہول سٹوری ۔ اباؤٹ ۔ یُور سیکشوئل ریلیشنز ودھ بشیر ۔ آئی ۔ وِل ۔ ٹیل ۔ ہِم ۔ وَٹ ۔ آئی ۔ ہیو ۔ پرسنلی ۔ سین ۔ ٹوڈے ۔

وہ شامی خیلا بُھنا وہاں سے واپس اپنے خیمے کی طرف چلا گیا ۔ چار بجے منشی خان آئے

پا ہو گیا اس نے آفیسرز میس سے لے کے چائے لا دی۔ ٹامی نے اس سے کچھ بات چیت نہ کی
میں سوچنے لگا اب اس گورے کپتان سے بھی ٹھن گئی ہے۔ سیکشن کا کام مشکل ہی
سے چلے گا۔ میں نے دوپہر کو جب اسے اور بشیر کو ناقابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا
تو اس وقت سے میرا خون کھول رہا تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک کمانڈر
اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ اس طرح کا اخلاق سوز رویہ بھی روا رکھ سکتا ہے۔
میں سمجھتا ہوں کہ ماتحت لوگ اپنے سے سینئر لوگوں کے بیٹے اور بھائی ہوتے ہیں
چہ جائیکہ اُن کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کیے جائیں۔ یہ ٹامی کپتان ویسے بھی جوانی
عمر کا آدمی تھا۔ میں سمجھتا ہوں اسے تو ویسے بھی سب کے ساتھ فادرلی اپروچ روا
رکھنا چاہیے تھا۔ فوجی چاہے کسی بھی قوم کا ہو۔ کسی بھی ملک کا ہو۔ بے چارہ جنس زدہ
ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم جنسیت کی گہری دلدل میں دھنسا ہوا ہوتا ہے۔ خصوصیت
سے جنگ کے زمانے میں بے چارے سالہا سال تک اپنے گھروں اور بیویوں سے
دور رہتے ہیں اور اس طرح یہ اس قعرِ مذلت میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ میرے
خیال میں سب کے سب لوگ اس کمزوری میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن پھر بھی ان کی
اچھی خاصی تعداد اس میں ملوث ہوتی ہے۔

اب چونکہ گورے کپتان کے ساتھ ٹھن گئی تھی۔ اس لیے میں ردِ عمل کے طور
پر اپنے آپ کو مقابلے کے لیے تیار کرنے میں لگ گیا۔ دوسرے دن صبح کپتان
پی۔ ٹی۔ پریڈ پہ آیا۔ میں نے اس کے رویے میں کوئی خاص تبدیلی نہ دیکھی۔ میں
سمجھتا تھا وہ پہلے کی نسبت زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔
دن گذرتے گئے۔ اُس نے پھر اس موضوع پر مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کی۔ ایک
دن اس نے ہیڈکوارٹر والے وائرلیس سٹیشن جو کہ میرے چارج میں تھا اس کا سب
سامان اور سٹورز مجھے لے آؤٹ (LAY OUT) کرنے کا حکم دیا۔ میں نے حسب الحکم
سب سامان لے آؤٹ (LAY OUT) کروا دیا۔ تب سٹورز بڑی باریک بینی سے چیک
کرتا رہا۔ ہر وائرلیس سٹیشن پہ ایک سائفر کوڈ اور ڈی کوڈ بک ہوتی تھی جو خصوصی

طور پر انچارج کی تحویل میں ہوتی تھی۔ ہیڈ کوارٹر سٹیشن کی یہ کتابیں میرے چارج پر تھیں سگنل کور والوں کی یہ بڑی ہی خفیہ دستاویز ہوتی ہے۔ اگر یہ دشمن کے ہاتھ چڑھ جائیں تو وائرلیس کا سب نظام ہی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُس گورے کپتان کے چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سائیفر بکس (CIPHER BOOKS) موجود نہیں ہیں بڑی سرگرمی سے ان کی تلاش کی گئی۔ لیکن وہ نہ ملیں۔ اس گورے کپتان نے میری موجودگی میں بریگیڈ کمانڈر کو ٹیلی فون کر کے مفصل صورتِ حال سے اُسے آگاہ کیا۔ اس نے بریگیڈ کمانڈر کو بتایا۔

"سر میرا یہ سیکشن حوالدار جس کے چارج میں یہ سائیفر بکس تھیں۔ سیاسی طور پر کانگرسی خیالات رکھتا ہے اور حکومت کا بڑا مخالف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ کتابیں دشمن کے ایجنٹوں تک پہنچا دی ہیں۔ اب پوری آرمی میں سائیفر کا یہ نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی رپورٹ آپ فوراً آرمی ہیڈ کوارٹر کو بھجوائیں۔ اس حوالدار کو میں نے کلوز اریسٹ (CLOSE ARREST) کر دیا ہے مہربانی سے آپ گارڈ بھیجیں تاکہ میں اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں لے آؤں۔"

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک گورا سارجنٹ گورے سپاہیوں کی گارد لے کر آ گیا۔ اور اس کپتان نے مجھے اس سارجنٹ کے حوالے کر دیا۔ سیکشن میں ایک عجیب سی سراسیمگی کا عالم تھا۔ سب انڈین رینکس سہمے سہمے پھر رہے تھے۔ وہ گورا سارجنٹ مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں لے آیا۔ وہاں کوئی باقاعدہ قسم کے سیل نہ تھے۔ بہر حال اُس نے مجھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ شام تک کئی انگریز افسر بغرض تفتیش میرے پاس آئے۔ ان میں ہر ایک یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ سائیفر بکس میں نے کس کو دی ہیں۔ اگر تفتیش میں تعاون نہ کیا تو کورٹ مارشل کر کے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دا کر گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان انگریز افسروں نے مجھ سے باری باری ملاقات کی تو اس سے مجھے اپنے پر لگائے گئے الزامات کا پتہ چلا۔ سب سے بڑا چارج یہی تھا کہ میں نے سائیفر بکس کانگرسی

ہائی کمانڈ والوں کے پاس بھجوا دی ہیں۔ میں نے ہر آفیسر کے سامنے اپنے پر لگائے گئے سب الزامات کی واضح طور پر تردید کی۔ میں نے ہر ایک سے یہی کہا کہ برگیڈ کمانڈر صاحب سے تنہائی میں بات کروں گا۔ کھانا مجھے اپنی سیکشن سے آتا تھا۔ گورے کپتان نے سیکشن کے سب لوگوں پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ کوئی بھی مجھ سے ملاقات نہ کرے۔

شام کو جو لانگری میرا کھانا لے کر آیا اس نے مجھے بتایا کہ کپتان صاحب نے سگنل مین بشیر کو پھر اپنا اردلی رکھ لیا ہے۔ اور منشی خان کو واپس بھیج دیا ہے۔ دوسرے دن انگریز برگیڈ کمانڈر کے پاس میری پیشی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ جو بات بھی اس ضمن میں کروں گا وہ تنہائی میں کروں گا۔ یہ سن کر وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اس زمانے میں انگریز بہادر کلی طور پر مختار کل تھا۔ اس کے پیچھے ان کی دو سو سالہ حکومت تھی جو وہ ہندوستان پر کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم ہندوستانیوں کو وہ انسان ہی نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی کالا آدمی (ہندوستانی باشندہ) ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے۔ اس برگیڈیر نے چند لمحوں کے لیے برہمی کا اظہار کیا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہ کالا آدمی تو اس کے غیض و غضب سے قطعاً متاثر نہیں ہوا تو وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے برگیڈیر سے کیپٹن پیریس کی موجودگی میں کہا۔

سر اگر آپ اس کیس کی صحیح نوعیت سمجھنا چاہتے ہیں تو میں آپ سے تنہائی میں بات کر کے آپ کو سب بات واضح طور پر بتا دوں گا۔ بصورت دیگر آپ جس طرح چاہیں یک طرفہ فیصلہ کر دیں۔ مجھے نتیجے کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے۔

اس نے سب آدمیوں کو اپنے دفتر سے باہر نکال دیا اور سٹاف کیپٹن کو کہا کہ دروازہ بند کر دو اور سنتریوں کو کہو۔ وہ باہر برآمدے میں ٹھہریں۔ کیپٹن پیریس کو آپ اپنے ساتھ اپنے دفتر میں لے جائیں۔ برگیڈیر نے سٹاف کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کوئی خاص بات ضرور ہے ورنہ یہ کالا آدمی اتنی جرأت اور حوصلے سے بات کرنے

کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔

وہ سب لوگ چلے گئے۔ برگیڈیر نے مجھے اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر اپنے لہجے میں نرمی اور متانت پیدا کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

حوالدار۔ اب تم جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے۔ بلا خوف و خطر کہو۔

سر چند دن پہلے کی بات ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں ایک ضروری کام سے کیپٹن پیرس کے ٹینٹ میں گیا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ کیپٹن صاحب اور اس کا ہندوستانی اردلی سگنل مین بشیر دونوں ننگے ایک ہی بستر میں تھے اور کیپٹن پیرس سگنل مین بشیر کے ساتھ غیر فطری جنسی فعل کا ارتکاب کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر واپس آ گیا میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس فعل شنیع کا اب مزید کیپٹن پیرس ارتکاب کرے چنانچہ اسی دن میں نے سگنل مین بشیر کو تبدیل کر کے سگنل مین منشی خان کو کیپٹن صاحب کے اردلی کے طور پر بھیج دیا۔ کیپٹن صاحب اس بات پر مُصر تھے کہ میں سگنل مین بشیر ہی کو بطور اردلی رکھوں گا۔ سر۔ یہ سب تنازعہ اسی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سائیفر کوڈ یونٹ "بی" باکس میں ہر وقت وائرلیس سٹیشن پر موجود رہتی تھیں تاکہ بوقت ضرورت فوراً استعمال کی جا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتابیں کیپٹن پیرس ہی نے خود وہاں سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے چرائی ہیں تاکہ وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا کر اپنی ہوس رانیوں کی تکمیل کر سکے۔

برگیڈیر نے کیپٹن پیرس کو بلایا اور اس سے پوچھا۔

کیپٹن پیرس تمہارا اردلی سگنل مین بشیر کتنے عرصے سے تمہارے پاس ہے۔

سر اُسے تقریباً چار ماہ کا عرصہ میرے پاس آئے ہوئے ہو گیا ہے۔

حوالدار احمد، چند دن پیشتر تمہارے ٹینٹ میں سرکاری کام سے گیا تھا۔

سر گیا تھا۔

تم اور تمہارا اردلی اس وقت دونوں شرمناک جنسی فعل کا ارتکاب کر رہے تھے اور اس نے تم دونوں کو اپنی آنکھوں سے اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا۔

نہیں سر۔ یہ بالکل غلط ہے۔

حوالدار نے سگنل مین بشیر کو اسی دن تبدیل کر کے سگنل مین منشی خان کو تمہارے اردلی کے طور پر بھیجا تھا۔

سر بھیجا تھا۔

پھر تم اس بات پر مُصر کیوں تھے کہ سگنل مین بشیر ہی کو مَیں اردلی رکھوں گا۔

سر۔ سگنل مین بشیر میری ڈیلی روٹین سمجھتا تھا۔

تمہارا اتنا کون سا زیادہ کام تھا کہ دوسرا آدمی اسے نہ کر سکتا تھا۔

حوالدار تم سیکشن کے ساتھ میرٹھ میں تھے۔ برگیڈیر نے مجھ سے پوچھا۔

سر جب میرٹھ میں ۲۱۸ وائرلیس سیکشن ریز (RAZE) ہوئی تو مَیں پہلا آدمی تھا جو اس سیکشن میں پوسٹ ہوا۔

کیپٹن پیرس تمہارے بعد آیا تھا۔

سر۔ میرے بعد آیا۔

سگنل مین بشیر کو تم نے کیپٹن پیرس کا اردلی ڈی ٹیل (DETAIL) کیا تھا۔

نہیں جناب۔ انہوں نے سب سیکشن کو فالن کر کے سب آدمیوں میں سے اُسے چُن کر لیا تھا۔

کیوں کیپٹن یہ باتیں صحیح ہیں۔ برگیڈیر نے کیپٹن پیرس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

سر۔ صحیح نہیں ہیں۔

اب سگنل مین منشی خان تمہارے پاس ہے یا کوئی اور۔

نہیں سر۔ مَیں نے سگنل مین بشیر کو واپس بلوا لیا تھا۔ منشی خان اپنی گاڑی پر کام کرتا ہے۔

دیکھو کیپٹن اس سلسلے میں جس قدر حقائق میرے سامنے آئے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حوالدار احمد کا اتنا زیادہ قصور نہیں جتنا کہ تمہارا ہے۔ حوالدار احمد کو ہم

اس بات کی سزا دیتے ہیں کہ اس نے سائیفر بکس کی صحیح نگہداشت نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتابیں تم نے اس سے بدلہ لینے کے لیے نکال لی ہیں یا کسی دوسرے آدمی کی معرفت وہاں سے غائب کروادی ہیں۔

۱۔ حوالدار احمد کو میں یہ سزا دیتا ہوں کہ اسے حوالدار کے عہدے سے ریورٹ (REVERT) کر کے نائیک بناتا ہوں۔

۲۔ کیپٹن پیرس کو حکم دیتا ہوں کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر یہ دونوں کتابیں میرے سامنے پیش کرے۔ ورنہ اس کا بھی کورٹ مارشل کیا جائے گا۔

سٹاف کیپٹن ہم سب کو باہر لے آیا۔ باہر آ کر اس نے میرے بازو سے ایک فیتہ ریزر بلیڈ سے کاٹ کر نکال لیا اور مجھے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا۔ کیپٹن پیرس اس قدر حواس باختہ ہو چکا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں سائیفر کی دونوں کتابیں بریگیڈ کمانڈر کے سامنے لا کر پیش کر دیں۔ بریگیڈیر نے اس سے کہا کہ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔ انڈین رینکس کے سامنے تم نے ایک غلط مثال پیش کی ہے۔ میں کور ہیڈ کوارٹر میں تمہاری ریورشن (REVERSION) کے متعلق آج ہی لیٹر لکھوں گا۔ ابھی سے تم ۲۱۸ وائرلیس سیکشن کا آفیسر کمانڈنگ نہیں ہے۔ کل صبح تم اپنی یونٹ میں دیمالپور واپس جاؤ گے۔ میں آج ہی تمہارے کمانڈنگ آفیسر سے بھی ٹیلی فون پر تفصیل سے بات کروں گا۔

دوسرے دن کیپٹن پیرس یونٹ ہیڈ کوارٹر کو واپس چلا گیا۔ میرے متعلق ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے بریگیڈیر کو کہا کہ احمد کو گوہاٹی وائرلیس سٹیشن پر بھیج دیں۔ میری بدلی حوالدار محمد زکریا نے کی۔ میں زکریا کو چارج دے کر گوہاٹی چلا گیا۔ گوہاٹی آسام کا ایک نہایت ہی خوب صورت اور پُر فضا شہر ہے جو دریائے برہم پترا کے کنارے پر واقع ہے۔ شہر کے اندر برلب سڑک دریا کے کنارے پر ایک وسیع و عریض کوٹھی میں وائرلیس سٹیشن قائم تھا۔ جس میں تقریباً تیس آدمی کام کرتے تھے یہ سب کے سب ہندوستانی تھے لیکن انہیں ایک برٹش سگنل رجمنٹ کے ساتھ

اٹیچ (ATTACH) کیا ہوا تھا۔ اسی سیکشن کے لوگ اپنا پیشہ وارانہ کام تو ٹھیک کرتے تھے لیکن تھے سب کے سب شتر بے مہار (IN - DISCIPLINED) قسم کے سپاہی۔ وائرلیس سٹیشن کی ڈیوٹی سے واپس آکر پھر یہ کسی کے قابو نہ آتے تھے۔ رات بھر آوارہ گردی کرتے تھے۔ اپنی قیام گاہ پر یہ اکثر رات کو لڑکیاں ساتھ لے آتے تھے۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں انگریزوں نے اپنی مکاری اور عیاری سے بنگال اور آسام میں زبردست قحط پیدا کر دیا تھا کہ لوگ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں کے کنارے مرے ہوئے ملتے تھے۔ ایسے میں یہ منچلے فوجی جوان عورتوں کو بھات (ابلے ہوئے چاول) دینے کا چکمہ دے کر ساتھ لے آتے اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے۔

لڑائی کے زمانے میں فوجیوں کو وافر مقدار میں راشن ملتا تھا۔ اس لیے انہیں ان عورتوں کو چند پلیٹیں اُبلے ہوئے چاولوں کی دے دینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں دیکھا کہ جہاں کہیں فوجی قیام پذیر ہوتے وہاں یہ بھوک کی ماری نادار اور بے بس عورتیں ایک مٹھی بھر چاول کے حصول کی خاطر منڈلاتی رہتیں کہ کوئی فوجی ان کو ایک مٹھی چاول دے دے اور یہ اس کی جنسی بھوک مٹا دیں۔

۵

جس برٹش یونٹ کے ساتھ یہ وائرلیس سٹیشن اٹیچ تھا اس کا کمانڈنگ آفیسر ان لڑکوں کے رویئے سے سخت نالاں تھا۔ وہ ہماری یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کو کئی بار لکھ چکا تھا کہ کوئی سخت اور جابر قسم کا عہدیدار اس وائرلیس سٹیشن کا انچارج بنا کر بھیجیں۔ چنانچہ یہ قرعۂ فال میرے ہی نام نکلا اور مجھے اس وائرلیس سٹیشن کا انچارج بنا کر بھیج دیا گیا۔

اس سیکشن میں سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ شاہ لانگڑی اور سنگلی مین سنگھ ان کے لیڈر تھے۔ خلاف توقع مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ سنگھ اصل میں مدراسی

ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ ان کا ڈسپلن ٹھیک کروں لیکن مجھے اس میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے شاہ لانگری کو تبدیل کروا دیا۔ یہی ان کا سب سے بڑا سرغنہ تھا۔ چونکہ راشن اسی کے پاس ہوتا تھا۔ اس لیے سب لڑکے راشن کے بے جا حصول کے لیے شاہ لانگری سے بنا کر رکھتے تھے۔ شاہ لانگری جب یونٹ میں واپس چلا گیا تو اس چنڈال چوکڑی کی کمر ٹوٹ گئی۔ جو نیا لانگری آیا اُسے میں نے سب نشیب فراز سمجھا دیے۔ ویسے بھی وہ اس قماش کا آدمی نہ تھا۔ سنگھ بڑا ہوشیار اور شاطر تھا۔ میری سادگی سے اس نے فائدہ اُٹھایا اور میرے ساتھ دوستی گانٹھ لی اور پھر مجھے بھی اپنے ساتھ شہر میں اپنے اڈوں پر لے جانے لگا۔ میں ایک دیہاتی قسم کا سادہ لوح نوجوان تھا۔ ہمارے علاقہ اعوان کاری کے رسم و رواج کے مطابق مردوں کی رسائی غیر عورتوں تک ہونا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ سنگھ نے مجھے جس سوسائٹی میں لے جا کر متعارف کروایا وہاں جوان عورتوں کا غیر مردوں سے ملنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی بلکہ جس لڑکی کے جتنے زیادہ ملنے والے ہوتے وہ اپنے خاندان میں اِن سوشل تعلقات کی وجہ سے اسی قدر زیادہ عزت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی۔ میری زندگی میں یہ ایک انوکھا اور نیا تجربہ تھا جو مجھے اپنے طور پر بہت اچھا لگا۔ سنگھ اور اس میں ایک بنگالی ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر آنے جانے لگے۔ اس گھر میں اس کی دو خوبصورت اور حسین و جمیل بیٹیاں تھیں جو دو نو بی۔ اے میں پڑھتی تھیں گھوش صاحب کی ایک جواں سال بہو اور اس کا ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔ گھوش صاحب کی پتنی (بیوی) ایک عرصے سے چارپائی پر پڑی ہوئی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کا بیٹا فوج میں کہیں ڈاکٹر تھا جو ایک عرصہ ہوا گھر نہیں آیا تھا۔

سنگھ نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ میرے آنے سے سنگھ پر اس قدر پابندی ہو گئی کہ وہ دس بجے رات تک واپس اپنی سیکشن میں آ جاتا تھا۔ جلد ہی ہمارے حلقہ میں ایک اور دوست مسٹر کمار شامل ہو گیا۔ کمار کوئی سترہ اٹھارہ سال کا خوبرو

بے ریش لڑکا تھا۔ اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے۔ بعض اوقات لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا تو پہلی نظر میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ مسٹر کمار باوجود کمسن ہونے کے زندگی کے معاملات میں بڑا ہوشیار تھا۔ اس کے آنے سے ہمارے حلقہ میں مزید کئی لڑکیاں شامل ہو گئیں۔ ان میں فوجی ہسپتال کی ایک نرس رُوشی بھی تھی جو حُسن کا ایک مکمل نمونہ تھی اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں فطرتاً چونکہ شرمیلا تھا اور صنفِ نازک کی کمپنی میسر نہ ہونے کی وجہ سے اب میں ان سے مکس اَپ ہوتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس لیے سب پارٹی میری اس کمزوری پر خوب انجائے (ENJOY) کرتی تھی۔ میرے شرمیلے پن کی وجہ سے رُوشی خود بخود میری طرف کھنچی چلی آئی۔ مجھ میں ایک عجیب کمپلیکس (COMPLEX) ہے کہ جس لڑکی یا خاتون سے میری دوستی ہو جائے اس سے میں نے کبھی بھی جنسی تعلقات استوار نہیں کیے۔ کوئی ماہر نفسیات ہی اس کا نفسیاتی تجزیہ کر کے بتا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ میں سمجھتا ہوں رُوشی نے شاید مجھے اسی وجہ سے پسند کیا تھا اور بہت جلد اس نے مجھے شادی کی "آفر" دے دی۔ جس کے لیے میں نے اس سے معذرت کر لی۔ میں نے اس کو صاف صاف بتا دیا کہ "محترمہ! میں شادی شدہ آدمی ہوں۔" اور اس طرح سے شادی کر کے جو لڑکیاں ہمارے علاقے میں جاتی ہیں۔ وہاں کا معاشرہ انہیں اپنانے سے گریز کرتا ہے۔ وہ لوگ ایسی لڑکیوں کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ سب باتیں بتا دینے کے باوجود بھی وہ آخری دم تک مُصر رہی اور کہتی رہی کہ میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ (ADJUST) کر لوں گی۔ اس لڑکی کو بھی مسٹر کمار ہمارے گروپ میں لایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُسے لفٹ (LIFT) نہ دیتی تھی۔ حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ کمار مجھ سے کئی گنا زیادہ خوب صورت تھا۔ اور مقامی ڈپٹی کمشنر کا بھائی ہونے کے ناطے اونچی سوسائٹی میں اس کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں میں ایک دیہاتی۔ گنوار اور پندرہ روپے کا زر خرید غلام۔ جو شیکسپیئر۔ ٹالسٹائی۔ مونالیزا۔ غالب اور خیام پر گفتگو نہ کر سکتا تھا۔ رُوشی مجھ سے کہتی تھی۔ احمد صاحب میں مسلمان ہوں ایک ہندو لڑکے سے

شادی نہیں کر سکتی۔

ہماری زیادہ سٹنگز (SITTINGS) گھوش صاحب کے وسیع و عریض گھر ہی میں ہوتیں۔ گھوش صاحب ہماری ان سرگرمیوں سے بہت خوش ہوتے اور سب کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ ان کی ایک بیٹی بلا کی کتھک ڈانسر تھی۔ جب شیلا کو پتہ چلا کہ مجھے شاعری اور موسیقی سے بے پناہ لگاؤ ہے تو وہ مجھے اور بھی چاہنے لگی۔ وہ مجھے کتھک ناچ اور پکے گانے سناتی۔ خدا کا یہ فضل رہا کہ اس ماحول میں رہ کر بھی مَیں نے اپنے آپ کو جنسی آلودگی سے بچائے رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کے لیے کسی مرد کی زندگی کا یہ پہلو ہی زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔ روشی کا وہاں سے جاوا سماٹرا (مشرقِ بعید) کی کسی میڈیکل یونٹ میں پوسٹنگ ہو گیا۔ وہ آخر دم تک مجھ سے ایک اچھے دوست کی طرح ملتی رہی۔ سماٹرا سے بھی اس کے خطوط مجھے باقاعدگی سے آتے رہے۔ اپنے ہر خط میں وہ مجھے اس بات کا عندیہ ضرور دیتی کہ اگر زندگی کے کسی مرحلے پر میری ضرورت پیش آئے تو مَیں آپ کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کروں گی۔ سپاہیوں کی دوستیاں ویسے بھی بڑی ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ایک عرصے تک اس کے خط آتے رہے اور پھر اچانک یہ خوش کن سلسلہ منقطع ہو گیا اور نہ جانے انسانوں کے بحرِ ذخار میں وہ کہاں کھو گئی۔ اس کے بعد پھر اس کا کبھی کوئی خط نہ آیا۔

روشی کے چلے جانے کے بعد اس حلقہ میں میری حاضری بھی بتدریج کم ہوتی گئی۔ کبھی ہفتے دس دن میں ایک آدھ دفعہ چلا جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ جاتا۔ کمار کے سوا اس حلقہ کے سب ممبران مجھے دل و جان سے چاہتے تھے۔ کمار سے مخاصمت کی وجہ روشی تھی جو اب اُفق کی پنہائیوں میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

## ۵

اب وائرلیس سٹیشن کے آدمیوں کی طرف سے یونٹ والوں کو کوئی شکایت نہ تھی۔ صبح سویرے پی۔ ٹی۔ بھی کرتے تھے۔ رات کو دس بجے لائٹ آؤٹ ہونے پر سب باقاعدگی

سے حاضر ہوتے تھے۔ اچھا بھلا کام چل رہا تھا کہ اچانک میری سیاہ بختی نے پھر سر اُٹھایا کہ ایک رات بڑا ہی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ رات کو ڈیوٹی آفیسر میری سیکشن کے آدمیوں کو چیک کرنے کے لیے آیا۔ ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ چھ چھ سپاہی رہتے تھے۔ میں اکیلا ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ کسی نے زور زور سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈیوٹی آفیسر کیپٹن میکنٹوش باہر کھڑا ہے۔ میں نے اسے اٹین شن ہو کر سلام کیا۔

حولدار تمارا آدمی لوگ سب ٹھیک ہے۔

ٹھیک ہے سر۔ میں نے فوراً ہی فوجی انداز میں جواب دیا۔

اُم۔ چیک کرنا مانگتا۔ آؤ امارے ساتھ۔

وہ گورا کپتان مجھے ساتھ لیے سب کمروں میں باری باری گیا۔ ہر چارپائی کے نزدیک جاکر وہ مچھردانی کے اندر سوئے ہوئے سپاہیوں پہ ٹارچ کی روشنی ڈالتا اور جب اسے اندر سویا ہوا آدمی نظر آجاتا تو وہ آگے کو بڑھ جاتا۔

سب آدمی ٹھیک تھے۔ اب صرف ایک کمرہ باقی تھا۔ جس کے آدمی وائرلیس سٹیشن کی شفٹ پر گئے ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک سنگھ آف ڈیوٹی تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ شہر سے رات دس بجے واپس آگیا تھا۔ ڈیوٹی آفیسر نے اس کی مچھردانی پر ٹارچ کی روشنی کی اور مجھے گھورتے ہوئے غصے بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

لک ایٹ۔ دِس (LOOK AT THIS)۔ یہ دیکھو۔

میں نے آگے بڑھ کر مچھردانی اُٹھائی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سنگھ کے ساتھ ایک عورت سوئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں خراٹے بھر رہے تھے۔ میری رگِ ظرافت بھڑک اٹھی۔ میں نے کہا۔

سر۔ آدمی کم تو نہیں ہیں۔ زیادہ ہیں تو اور اچھا ہے۔

اس گورے کپتان کو میری اس بات پر غصہ آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔

یو۔ ڈیم۔ فول۔

مت گالی مت دیں ۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میرے معذرت خواہانہ انداز سے اس کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ اول فول بکنے لگا۔

یو۔ باسٹرڈ۔ انڈین۔

میں آہستہ سے اس کے قریب گیا اور اس کی گردن مروڑ کر اسے فرش پر گرا لیا۔ اور لاتوں اور گھونسوں سے اُسے مارنا شروع کر دیا۔ جلد ہی انگریز بہادر کے مزاج ٹھیک ہو گئے۔

ٹھیک ہے ۔ حوالدار۔ ٹھیک ہے ۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں مجھ سے کہے جا رہا تھا۔

تیری ماں کا سر ٹھیک ہے ۔ کتیا کے بچے۔

اسی ہنگامے کی وجہ سے سنگھ اور وہ عورت دونوں بیدار ہو گئے۔

کیپٹن مجھ سے کہنے لگا۔ سنگھ کو میں لے جا کر کوارٹر گارڈ بند کرتا ہوں اور اس عورت کو تم اپنی تحویل میں رکھو۔ کل صبح جب سنگھ چارج شیٹ کے ساتھ کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیش ہو گا تو تم اس عورت کو وہاں لا کر پیش کرنا۔

وہ سنگھ کو یونیفارم پہنوا کر اپنے ساتھ لے گیا اور اس عورت کو میں اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں نے موم بتی جلائی اور اس عورت کو سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور خود اپنے بستر پر لیٹ کر اس کے حالات معلوم کرنے لگا۔ اس عورت نے کرسی سے اُٹھ کر اپنی ساڑھی کھول کر الگ رکھ دی اور بالکل برہنہ ہو کر میرے ساتھ بستر میں آ کر لیٹ گئی۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کسی عورت کو اس طرح ننگا نہیں دیکھا تھا۔ میرے ماتھے اور چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے۔ میں نے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں آہستہ سے اپنی چارپائی سے اُٹھا اور اس عورت کو اس کی ساڑھی اُٹھا کر دی۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنی ساڑھی باندھ لو۔

وہ عورت شرمندہ سی ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور موم بتی کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں

ساڑھی باندھنے لگ گئی۔ وہ عورت خوبصورت اور جوان تھی۔ اس کا یہ جان لیوا وار خالی گیا تھا۔ اب ندامت کے باعث وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔ کرسی کو میری چارپائی کے قریب کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

تم کس قسم کے مرد ہو۔ تمہیں عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔

مَیں نے اِس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔

یہ فوجی تو بھوکے بھیڑیوں کی طرح عورتوں کو چھوڑتے رہتے ہیں۔ ہم تنگ پڑ جاتی ہیں لیکن وہ نہیں تھکتے۔

ہوگا۔ سب لوگ تو سنگھ کی طرح نہیں۔ چھوڑو تم اِس بات کو۔ تم اپنی کہانی سناؤ۔

کیا سناؤں بابو۔ جب سے آپ یہاں انچارج بن کر آئے ہیں ہمارا تو کاروبار ہی ٹھپ ہوگیا ہے۔

سب کے بچے بھوک سے بلکتے رہتے ہیں۔ بھات کہیں سے ملتا ہی نہیں۔

لیکن سنگھ تو میرے ساتھ شہر میں تھا۔ ہم رات کو دس بجے واپس آئے ہیں۔ تمہارے پاس وہ کب گیا۔

بابو۔ وہ نہیں گیا۔ مَیں خود آئی ہوں۔

تمہیں یہ جگہ کیسے پتہ چلی ہے۔

حضور۔ مَیں نے آپ کو بتایا ہے کہ مَیں پہلے بھی یہاں آتی رہتی ہوں۔ شاہ لانگری کے پاس کئی راتیں بسر کی ہیں۔ سنگھ کے پاس تو اکثر آتی ہوں۔ یہ اتنا اچھا آدمی ہے ہر روز میرے منے کے لیے ایک بھری ہوئی پلیٹ بھات کی لے کر رکھتا ہے۔ میں آج آئی ہوں تو تھوڑی دیر تک بات چیت کرتے رہے پھر دونوں ایسے بیہوش ہوئے کہ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہی۔ مجھے افسوس ہے میری وجہ سے وہ گورا صاحب لوگ سنگھ کو بندی خانے (قید خانے) میں ڈال دے گا۔ میرے منے کے لیے اب بھات کہاں سے آئے گا اور پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ بڑے

ہی مایوس کن انداز میں رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگ گئی۔

تمہارا پتی (خاوند) کہاں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

بابو چار ماہ ہوئے ہیں کلکتہ چاکری کے لیے گیا ہے۔ آج تک اس کی کوئی کوئی خبر نہیں۔ رام جانے جندہ (زندہ) بھی ہے یا نہیں۔ سنتے ہیں بنگال میں تو اس سے بھی زیادہ کال (قحط) ہے۔ ہزاروں لوگ سڑکوں کے کناروں پر مرے پڑے ہوتے ہیں۔ بے چارا کہیں مر گیا ہوگا۔ اگر جندا ہوتا تو رام قسم وہ ایسا نہ تھا، ہم کو ٹکہ (روپے) ضرور بھیجتا۔

تو پھر تم کیسے گذر بسر کرتی ہو

جسم بیچ کر۔

تمہارا گاہک کون لوگ ہیں۔

سب فوجی لوگ۔ بے چارے بڑے اچھے مانس (آدمی) ہیں۔ بھات بھی دیتے ہیں۔ ٹکہ بھی دیتے ہیں۔

تمہارا منا کہاں ہے۔

باشے میں (گھاس پھوس کے بنے ہوئے مکان کو باشہ کہتے ہیں)

وہاں اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ۔

بابو۔ ہم وہاں چھ سات عورتیں رہتی ہیں۔ ان میں تین کے بچے بھی ہیں۔ ایک عورت ان بچوں کو سنبھالنے کے لیے پیچھے رہ جاتی ہے۔ باقی بھات کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

صبح سویرے تم کو میں سنگھ کے ساتھ بڑے صاحب کے پاس پیش نہیں کروں گا۔ اگر اس نے تمہیں بھی سنگھ کے ساتھ قید خانے میں بھیج دیا تو تمہارے بچے کا کیا بنے گا۔

اس کے آنسو ڈھلک پڑے۔ بابو! منا مر جائے گا۔ میرے بعد اسے کون اپنے پاس رکھے گا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے۔

مَیں دل میں سوچنے لگا۔ یہ محض جسم بیچنے والی عورت نہیں ہے۔ ایک مجبور عورت ہے جو بنگال سے خوراک کی تلاش میں یہاں تک آ پہنچی ہے۔ یہ بنگال کی بیٹی ہے۔ نیتا جی کی بیٹی ہے۔ عظیم ہندوستان کی بیٹی ہے۔ میں غیر ارادی طور پر وہاں سے اُٹھ کر سنگھ کی چارپائی کے پاس آیا۔ مَیں نے ٹارچ روشن کی۔ چارپائی کے سرہانے کی طرف ایک بنچ پر چاولوں کی بھری ہوئی پلیٹ پڑی تھی۔ مَیں اٹھا لایا۔ وہ بھات مَیں نے اس عورت کو دیا اور اپنی جیب سے دس روپے بھی اُسے نکال کر دیے۔ وہ میرے منہ کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ مَیں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت تو ایک جسم بیچنے والی عورت نہیں بلکہ میری بہن ہے۔ تُو عظیم ہندوستان کی بیٹی ہے۔ مَیں تمہیں مزید ذلیل و رسوا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اپنی لوکری کی خاطر چند ٹکوں کی خاطر اپنی بہن کو کھینچے کھینچے گورے ٹامیوں کے درباروں میں لیے لیے نہیں پھروں گا۔ یہ لو بھات اور میری طرف سے یہ حقیر سا نذرانہ اور فوراً چلی جاؤ یہاں سے۔

نہیں بابو مَیں ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ گورا صاب لوگ میری بجائے تمہیں بندی خانے (قید خانے) میں ڈال دے گا۔

تم میری فکر نہ کرو۔ حالات جیسے بھی ہوئے میں خندہ پیشانی سے ان کا مقابلہ کروں گا۔

وہ جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ تم تو مجھے کوئی دیوتا معلوم ہوتے ہو۔ تم دوسرے مردوں سے کتنے مختلف ہو۔

مَیں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم مجھے غلط سمجھی ہو۔ مَیں بھی ایک عام سا مرد ہوں۔ مجھے بھی عورتیں اچھی لگتی ہیں لیکن ماں۔ بہن اور بیٹی کے رُوپ میں۔ ہم مسلمان زندگی بھر ایک ہی عورت کے ساتھ نباہ کرتے ہیں۔ آدمی اگر ایک دفعہ پھسل جائے تو پھر وہ زندگی بھر سیدھے راستے پر نہیں چل سکتا۔ تم فوراً یہاں

سے چلی جاؤ۔ اور وہ سجات اور حقیر سی رقم لے کر رات کے اندھیرے میں اپنے باشے کی طرف چلی گئی۔

## ۵

دوسرے دن گورا سارجنٹ میجر مجھے وائرلیس سٹیشن پہ بتانے آیا کہ دس بجے سانڈ پر ہیڈ پر بٹالین آفس میں آنا اور اس عورت کو بھی ساتھ لانا۔

میں دس بجے بٹالین آفس پہنچا تو سارجنٹ میجر نے مجھ سے پوچھا۔

وہ عورت کہاں ہے؟

رات کو میں سو گیا تو وہ چپکے سے بولٹ کھول کر بھاگ گئی۔

اس نے کیپٹن میکنٹوش۔ ایڈجوٹنٹ اور کرنل کو جا کر یہ بات بتائی۔ میری اور سنگھ ہم دونوں کی چارج شیٹ بنی ہوئی تھی۔ پہلے سارجنٹ میجر سنگھ کو مارچ کر کے اندر کمانڈنگ آفیسر کے پاس لے گیا۔ کرنل نے اسے چارج شیٹ پڑھ کر سنائی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے فوجی بیرک میں رات کو ایک غیر عورت کو غیر قانونی طور پر لاکر رکھا اور اس کے ساتھ جنسی فعل کا ارتکاب کیا۔

سگنل مین سنگھ کیا صحیح ہے یہ بات۔ کرنل نے سنگھ سے پوچھا۔

حضور والا! بالکل سو فیصدی صحیح ہے۔

تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟

سر۔ میں پچیس سال کا تندرست و توانا آدمی ہوں۔ دو سال ہو گئے ہیں اپنی میم صاحب کے پاس نہیں گیا۔ جوان آدمی ہوں۔ ایسی عورتوں کو نہیں لاؤں گا تو اور کیا کروں گا۔!

ویل تم کو دو سال ہو گیا تو اپنی میم صاحب کے پاس اپنے ہوم نہیں گیا۔

یس سر۔ (YES SIR)

کیپٹن ولیم۔ سنڈے سی اژان ڈن منتھ یونیفام کُڈے۔ کیس مارچ آف۔

سنگھ کو ایک ماہ کی چھٹی مل گئی۔ اب میرا اندر جانے کا نمبر تھا۔

سارجنٹ میجر مجھے مارچ کر کے اندر لے گیا۔ کرنل مجھ سے کہنے لگا۔

حوالدار احمد۔ تم نے کل رات کیپٹن میکنٹوش کو مارا ہے اور اس نے جو عورت تمہاری تحویل میں دی تھی وہ تمہاری غفلت اور عدم توجہی کی وجہ سے فرار ہوگئی۔ ٹھیک ہے یہ بات۔

ٹھیک ہے سر۔

کچھ کہنا مانگتا ہے۔

سر۔ کیپٹن میکنٹوش نے مجھے گالیاں دیں۔

کیا گالیاں دیں؟

مجھ سے کہا۔ یو۔ ڈیم۔ فول۔ باسٹرڈ انڈین۔ سر ایسا مجھے جو بھی کہے گا میں اس کو ماروں گا۔

آل رائٹ۔ حوالدار سے ریورٹ (REVERT) کر کے نائیک بنایا جاتا ہے اور آج ہی واپس دیناپور اپنی یونٹ میں جائے گا۔ کیس مارچ آف۔

سارجنٹ میجر مجھے مارچ کر کے باہر برآمدے میں لے آیا۔ ریزر بلیڈ سے میرا ایک سٹرپ میرے بازو سے اتار لیا اور پھر مجھے اپنی سیکشن میں جانے کا حکم دیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد مجھے موومنٹ آرڈر (MOVEMENT ORDER) اور ریلوے وارنٹ مل گیا اور ایک ٹرک مجھے پانڈو گھاٹ چھوڑنے کے لیے آگیا۔ میرے ساتھیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ میں اپنا سامان سنبھال کر یونٹ ہیڈ کوارٹر میں جانے کے لیے دیناپور روانہ ہوگیا۔ پانڈو گھاٹ گوہاٹی سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ہوگا۔ ڈیوٹی ٹرک والا مجھے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر واپس چلا گیا اور میں اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو کر ایک چھابڑی والے سے کیلے لے کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ گاڑی یہاں ہی سے دیناپور کے لیے چلتی تھی جو پہلے سے سٹیشن پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے

اپنا سامان گاڑی میں رکھ دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی۔ شام پانچ بجے کے قریب گاڑی دیپالپور کے سٹیشن پر جا پہنچی۔ میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور ریلوے سٹیشن سے باہر آگیا۔ وہاں کافی تعداد میں فوجی گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ فوجی ٹرک بھی ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا سامان اُٹھا کر سگنل یونٹ کی گاڑی میں رکھ دیا اور بھی جوان میرے ساتھ اس گاڑی میں آ بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ میں نے اپنی راہداری بٹالین حوالدار میجر کو جا کر دی۔ اس نے ایک جوان کو کہا کہ ان کا سامان اُٹھا کر ہیڈ کوارٹر کمپنی میں لے جاؤ۔

دوسرے دن میں بٹالین آفس سٹاف پریڈ پر گیا۔ پہلے صوبیدار میجر نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

کتنے خوب صورت جوان ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ ایک اچھے فوجی گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ جہاں بھی جاتے ہو۔ لڑ جھگڑ کر واپس آ جاتے ہو۔ کہیں ایک جگہ جم کر نوکری کیوں نہیں کرتے۔ میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایڈجوٹنٹ اپنے دفتر سے باہر آیا۔ صوبیدار میجر نے اس کو رپورٹ دی۔

سر نائیک احمد گوہائی سے آیا ہے۔

اچھا یہ وہ نائیک ہے جس نے وہاں کیپٹن میکنوٹش مارا ہے اور ریورٹ ہو کر REVERT واپس آیا ہے۔

ہاں سر وہی ہے۔

یہ تو بڑا خراب آدمی ہے۔ اس نے کیپٹن پیرز کے ساتھ دھوبڑی میں بھی جھگڑا کیا تھا۔ یہ خود بھی ڈیموٹ (DEMOTE) ہو گیا تھا۔ کیپٹن پیرز بے چارے کو بھی اس نے نقصان پہنچایا وہ بھی اسی کی وجہ سے ریورٹ ہو کر لیفٹیننٹ بنے۔ ورنہ اب تک میجر ہو گئے ہوتے۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ ایڈجوٹنٹ، کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ دینے کے لیے اندر

چلا گیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک انگریز میجر تھا۔ صوبیدار میجر نے رسان پریڈ اٹن شن کر کے قائم مقام کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ دی۔ وہ میجر جب میرے سامنے آیا تو ایڈ جوٹنٹ نے میری کہانی مختصر الفاظ میں اُسے سنائی۔ وہ میجر مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

ہیلو مائی سن ہاؤ آر یو۔ (میرے بیٹے کیا حال ہے آپ کا)

فائن سر۔ یہ میجر میرا پرانا کرم فرما جے ورمتھ تھا۔ جن کو میں پشاور ڈسٹرکٹ سگنل میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اب یہ اس یونٹ میں بطور سیکنڈ۔ ان۔ کمانڈ پوسٹ ہو کر آئے تھے اور کرنل کی عدم موجودگی میں آج یونٹ کی کمانڈ کر رہے تھے۔

وہ ایڈ جوٹنٹ اور صوبیدار میجر کو کہنے لگے۔ آئی۔ لو۔ ہم۔ ہی۔ از اے۔ ٹائیگر۔

سٹاف پریڈ ختم ہو گئی۔ صوبیدار میجر نے مجھے کہا کہ آپ کرنل صاحب کے دفتر میں میجر ورمتھ صاحب کے پاس جائیں۔ میں وہاں گیا تو ورمتھ صاحب اُٹھ کر مجھے گلے ملا۔ کرسی پر بٹھایا اور چائے سے تواضع کی۔ پشاور سے پوسٹ ہو کر آنے کے بعد کی داستان پوری تفصیل سے سُنی۔ درمیان میں کئی موقعوں پر وہ مجھ سے کہنے لگے۔ احمد جسٹ۔ بیڈ۔ لک اور وہ میری بدقسمتی پر ہاتھ ملتا رہا۔ جنگ عظیم دوم زوروں پر تھی۔ اس زمانے میں ہر یونٹ میں اپنا پروموشن ہوتا تھا۔ ورمتھ صاحب نے ہیڈ کلرک کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ اوپریٹر وائرلیس حوالدار کی کوئی جگہ خالی ہے۔

سر۔ ویکنسی تو خالی ہے لیکن پروموشن کی منظوری کرنل صاحب بہ نفس نفیس خود دیتے ہیں اس سے پہلے ایک مرتبہ سیکنڈ۔ ان۔ کمانڈ صاحب نے ایک آدمی کو نائیک پروموٹ کر دیا تھا تو کرنل صاحب اور میجر صاحب کی اچھی خاصی لڑائی ہو گئی تھی۔ آخر کار کرنل صاحب نے اس نائیک کو ریورٹ کر دیا تھا۔ اُس دن کے بعد انہوں نے مجھے سٹینڈنگ آرڈر دے رکھا ہے کہ جب تک میں کمانڈنگ آفیسر ہوں اور عارضی طور پر اگر کہیں باہر ڈیوٹی پر جاتا ہوں تو میری عدم موجودگی میں یونٹ میں

کوئی پروموشن آرڈر نہ کیا جائے۔

ٹھیک ہے یہ ذمہ داری میری ہے۔ کرنل صاحب نے اگر پوچھا تو میں جواب دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

اُسی دن مجھے حوالدار بنا کر ہیڈکوارٹر کمپنی میں پوسٹ کر دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ کرنل صاحب یونٹ میں واپس آئے تو کرنل گارڈینر اور میجر ورمہ کے درمیان جنگ عظیم سوم کی ابتدا ہو جائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ شاید ان دونوں کے درمیان کوئی بات چیت ہوئی ہو لیکن ہمیں اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں بدستور بطور حوالدار ہیڈکوارٹر کمپنی میں کام کرتا رہا۔

ڈیپالپور میں تقریباً ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ مچھر، جونکیں اور حشرات الارض کی بھرمار تھی۔ ۱۹۴۲ء میں ڈیپالپور کے علاقے میں وبائی پیچشوں کی بیماری پھوٹ پڑی اس سے ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس کا کوئی موثر علاج اس وقت تک ہسپتال والوں کے پاس نہ تھا۔ وہ اس وقت کی مروجہ روایتی دوائیاں استعمال کر رہے تھے۔ جن سے مریضوں کو کچھ بھی افاقہ نہ ہوتا تھا۔ پورے محاذ پر دو تین ہسپتال تھے۔ مریضوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ہسپتال کم تھے۔ ہسپتالوں میں داخلہ نہ ملتا تھا۔ جوان بے چارے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ ڈیپالپور کے علاقے میں صاف پینے کا پانی نہ ملتا تھا۔ جو پانی ہم لوگ پیتے تھے۔ اسے اگر شیشے کے گلاس میں ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیتے تو تھوڑی دیر کے بعد چکناہٹ سی اوپر آ جاتی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس پانی میں مٹی کے تیل کی آمیزش ہے۔

ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ پیچشوں کی اس موذی بیماری کا سبب پانی پر تیل کی یہی چکنی تہہ تھی۔ لیٹرینیں یونٹ کے رہائشی ایریا سے ذرا ہٹ کر تھوڑی دور تھیں۔ چونکہ آسام میں گھنے جنگل تھے۔ اس لیے جنگل کے بیچوں بیچ تقریباً دو تین فٹ چوڑی پگڈنڈی لیٹرینوں تک بنا دی گئی تھی۔ گہرے گڑھے کھود کر ان پر لکڑی کی سیٹیں رکھ

کر لیٹرینیں بنا دی گئی تھیں۔ جن پر ڈھکنے لگے ہوئے تھے جو ضرورت کے وقت اُٹھا کر لیٹرین استعمال کر لی جاتی تھی۔ ان ڈھکنوں کی وجہ سے لیٹرین کے گڑھوں میں بارش کا پانی نہ جا سکتا تھا۔ لیٹرینوں میں جا بجا کیڑے کلبلا رہے ہوتے تھے۔ مجھے یہ کیڑے دیکھ کر بڑی گھن آتی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ جو پرابلم تھی وہ یہ تھی کہ رات کو روشنی کرنا یا ٹارچ وغیرہ جلانا ممنوع تھا۔ اس لیے غروب آفتاب کے ساتھ ہی سب لوگ کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہو جاتے تھے۔

رات کو اندھیرے میں اگر کسی کو لیٹرین جانا پڑ جاتا تو اس پگڈنڈی پر جو درخت تھے وہ اتنے زہریلے تھے کہ اگر بدن کے کسی ننگے حصے پر لگ جاتے تو آدمی گھنٹوں کھجلا کھجلا کر اپنے آپ کو زخمی کر لیتا اور یہ خارش اور جلن گھنٹوں رہتی۔

مجھے بٹالین ہیڈکوارٹر میں آئے ہوئے بڑی مشکل سے دس دن ہوئے ہوں گے کہ میں بھی اسہال کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اس واقعہ کو گذرے پوری ایک نصف صدی بیت چکی ہے لیکن وہ اذیت ناک دن میں اب تک نہیں بھولا جو میں نے اس مرض میں مبتلا رہ کر گذارے۔ باوجود کوشش بسیار کے بھی مجھے کسی بھی ہسپتال میں داخلہ نہ ملا۔ اور میں موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا اپنے ہی ٹینٹ میں بغیر دوا دارو کے پڑا رہا۔ مرض کا یہ حال تھا کہ یکایک پیٹ میں بلا کا درد اُٹھتا۔ لیٹرین جانے کی حاجت محسوس ہوتی۔ اندھیری رات میں زہریلے درختوں کی ٹہنیاں ہاتھوں اور منہ پر لگتیں کھجلاہٹ شروع ہو جاتی۔ اس حالت میں لیٹرین رفع حاجت کے لیے بیٹھتا تو پیٹ سے تھوڑی سی میوکس کا اخراج ہوتا اور پھر واپس ٹینٹ میں آ جاتا۔ بستر پر لیٹتا کہ تھوڑی دیر کے بعد پھر پیٹ میں شدید درد اُٹھتا اور پھر لیٹرین جانا پڑتا۔ میں جتنے دن بھی یونٹ میں رہا انہی اذیت ناک لمحوں سے دوچار رہا۔

ایک دن صوبیدار میجر انسپیکشن کرتے کرتے جب میرے ٹینٹ میں آیا تو میں نے اُن سے گذارش کی کہ آپ ازراہ کرم میجر ورمہ صاحب کو میرے متعلق بتائیں کہ میں کئی روز سے سخت بیمار ہوں اور مجھے کسی بھی ہسپتال میں داخلہ نہیں مل رہا۔ میرا خیال ہے

صوبیدار میجر نے اُس وقت میجر درتھ صاحب کو میرا پیغام جاکر دیا چونکہ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ میجر صاحب مجھے دیکھنے کے لیے میرے ٹینٹ میں آگئے۔ میں نے ان کو سب صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں کمانڈنگ آفیسر صاحب سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔ کسی نہ کسی ہسپتال میں آپ کو ضرور داخل کروا دوں گا۔

درتھ صاحب مجھے دیپاپور سے لے گئے، اور گوہیار روڈ پر واقع ایک ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ ان کے اس ہمدردانہ رویہ سے میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ یہ ایک ایسا فوجی ہسپتال تھا جو محاذِ جنگ سے آئے ہوئے زخمیوں اور بیماروں کو دو تین دن وہاں رکھتا اور پھر ان کی چھاؤنیوں کے ہسپتالوں میں ہندوستان بھیج دیتا بڑے بڑے خیموں کو ملا کر نصب کر کے وارڈ بنائے گئے تھے۔ مجھے اس ہسپتال میں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ ہیضہ کے موذی مرض سے روزانہ بیسیوں مریض لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ صبح جب ڈاکٹر راؤنڈ پر آتا تو اپنے عملے کے لوگوں کو ہر مریض کے لیے فرداً فرداً ہدایت دیتا جاتا۔ اگر مریضوں کو وہاں سے شفٹ کرنا ہوتا تو ایک الگ نصب شدہ بڑے سے خیمے میں لے جاتے۔ جس کے متعلق مریضوں میں مشہور تھا کہ جو مریض لاعلاج سمجھے جاتے ہیں ان کو اس خیمے میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ چونکہ کبھی کوئی اس خیمے سے شفایاب ہو کر واپس نہ آیا۔ اس لیے یار لوگ کہتے تھے کہ ایسے مریضوں کو ٹیکہ لگا دیتے ہیں تاکہ وہ آرام سے ابدی نیند سو جائیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ محض لنگر گپ تھی۔ ڈاکٹر لوگ بھی انسانیت کی خدمت کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ اُن سے چھٹکارا پانے کے لیے غلط راہیں تلاش کرتے ہیں چونکہ اُس خیمے سے کبھی کوئی واپس نہ لوٹا تھا۔ اس لیے اُس خیمے کا تصور بھی سب کے لیے رُوح فرسا تھا۔

ایک بوڑھا سا بنگالی ڈاکٹر۔ جس کے ساتھ میٹرن۔ نرسیں اور نرسنگ سپاہی تھے دوسرے دن راؤنڈ پر آیا۔ کافی دیر تک میرا چارٹ دیکھتا رہا۔ پھر سپاٹ نظروں سے میرے چہرے کو دیکھنے لگ گیا۔ آخر کار اس نے میرا چارٹ

میٹرن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

شفٹ ہم (SHIFT HIM) ٹو ایمرجینسی وارڈ۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پہلے دوسروں کی موت کا سنتے تھے۔ آج میری اپنی موت خونی جبڑے پھاڑے مجھے نگلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ڈاکٹر تھوڑی دیر تک وہاں ہی کھڑا رہا۔ شاید وہ میرا ردِّعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جوانی کی سرمستیاں۔ سینہ زوریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اور میں نے نڈھال ہو کر اور ہتھیار چھوڑ کر اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

سَر مجھے خدا کے لیے اسی وارڈ میں ان ساتھیوں کے ساتھ رہنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا آخری سانس بھی اس بیڈ پر لوں اور زندگی کے آخری لمحوں میں میرے یہ غمگسار میرے پاس ہوں۔

اس وارڈ میں کیا خرابی ہے؟ وہ وارڈ تو انتہائی نگہداشت میں رکھے جانے والے مریضوں کے لیے ہے۔ وہاں اس وارڈ کی نسبت زیادہ کیئر (CARE) کی جاتی ہے۔

سَر۔ آپ کی یہ سب باتیں ٹھیک ہوں گی لیکن میری یہ آخری خواہش ہے کہ آپ مجھے یہاں ہی مرنے دیں۔

ڈاکٹر نے میٹرن کو کہا۔ ٹھیک ہے میٹرن۔ اس جوان کو شفٹ مت کرو۔ لیکن اس کے ضروری کوائف نوٹ کر لو۔

بہت اچھا سَر۔ میٹرن نے جواب دیا اور پھر وہ کاپی پنسل لے کر میرے پاس آگئی۔

آپ کی موت کی اطلاع کس کو دی جائے۔

سَر۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جب میرے وارثوں کو میری موت کی خبر ملے گی تو وہ یہ خبر خوشی خوشی وصول کریں گے۔ تاکہ میری جائداد کی بندربانٹ

کر سکیں۔ انہیں میری موت کا کوئی غم نہ ہوگا۔ یہ خبر تو اُن کے لیے ایک خوشی کا پیغام ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر نے میٹرن کو کہا۔ فی الحال اس مریض کی اطلاع کو التوا میں رکھو اور پھر وہ دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔

جب ڈاکٹر کا راؤنڈ ختم ہوگیا تو وہ انگریز میٹرن میرے پاس پھر آئی۔ وہ اُردو بہت کم جانتی تھی۔ میرے ساتھ چونکہ وہ انگریزی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔ اِس لیے میرے ساتھ بات چیت کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ میرے سٹریچر کے پاس ایک سٹول پر آکر بیٹھ گئی۔ اور میرے خاندانی حالات مجھ سے پوچھنے لگ گئی۔ میری باتوں سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

احمد بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔؟

شکریہ۔ میڈیم۔

جو بھی مریض اس موذی مرض میں گرفتار ہوتا۔ وہ کچھ کھا پی نہ سکتا تھا۔ کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی۔ مریض جونہی کوئی چیز کھاتا پیٹ میں بلا کا درد شروع ہوجاتا اور پھر لیٹرین جانا پڑتا۔ جہاں خون اور میوکس کے سوا اور کسی چیز کا اخراج نہ ہوتا۔

آپ کو ہسپتال کے ڈائٹ (DIET) کے علاوہ اور کوئی چیز کھانے پینے کے لیے چاہیئے۔

جی ہاں۔ چاہیئے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے یونہی کہہ دیا۔

کیا چاہیئے۔ مجھے بتاؤ۔ اس نے بڑی مستعدی اور شفقت سے کہا۔

مجھے کہیں سے برانڈی لا دیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔

وہ حیران ہوکر میری طرف دیکھنے لگ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

آر۔ یو۔ ایڈکٹ۔ (کیا تم شراب پینے کے عادی ہو۔)

نہیں میڈم۔ ڈرنک کرنا تو درکنار میں نے تو آج تک شراب کو چھوا بھی نہیں۔

پھر تمہیں یہ کیا سوجھی ہے؟

میرے اندر کے انسان کی یہ آواز ہے۔

یہ تو مسلمانوں کے لیے حرام ہے۔ انسان کو مرتے سمے کسی اچھی چیز کی آرزو کرنا چاہیے۔

میڈم نہ جانے میرا جی کیوں چاہ رہا ہے کہ میں آج برانڈی پیوں۔

اچھا میں لا دیتی ہوں۔ وہ چلی گئی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک سوڈے کی بوتل اور ایک گلاس میں تھوڑی برانڈی لے کر واپس آگئی۔ وہ میرے پاس ایک سٹول پہ آکر بیٹھ گئی اور پھر شیشے کے گلاس میں تھوڑا سا سوڈا ڈالا اور تھوڑی سی برانڈی بھی اس میں انڈیل دی اور گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

خدا کرے تم یہ ڈائجسٹ (ہضم) کر سکو۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک پیاسے آدمی کی طرح ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نو۔ بوائے۔ نو۔ ویس۔ از ناٹ دی وے۔ (نہیں اچھے لڑکے اس کے پینے کا یہ طریقہ نہیں ہے)

پینے کو تو میں پی گیا۔ لیکن وہ نہایت کڑوی اور بد مزہ تھی۔ یوں پتہ چلا جیسے کوئی شے سینہ چیرتی ہوئی نیچے کو اتری ہے۔ اس نے پھر تھوڑا سا سوڈا ڈالا اور اس میں تقریباً ایک گھونٹ برانڈی ملا دی۔ پھر مجھے ماہر استاد کی طرح ہدایات دینے لگی۔ اب کے تم اسے آہستہ آہستہ سپ کرنا۔ پھر اس کا لطف دیکھنا۔ یہ تو بہت ہی کڑوی کسیلی تھی۔ میں اسے مزے لے لے کر سرور کی خاطر نہ پی رہا تھا۔ بلکہ مجھے تو اس کے متعلق کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو اونس برانڈی میڈیکل سٹور سے میرے پینے لے کر آئی ہے جو میں نے پی لی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ پہلی چیز تھی جو میں نے پی اور جس کے پینے سے میرے پیٹ میں درد نہ اٹھا۔ اور لیٹرین جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ورنہ پچھلے کئی دنوں

سے یعنی جب سے مَیں اس عارضے میں مبتلا ہوا تھا، ڈر کے مارے کوئی چیز کھاتا پیتا ہی نہ تھا چونکہ ایسا کرنے سے فوراً ہی پیٹ میں بلا کا درد اُٹھتا اور لیٹرین جانے کی ضرورت پیش آتی۔ مَیں اور تھوڑی دیر تک اس کی اثر انگیزی کا انتظار کرتا رہا۔ مَیں نے آدھ گھنٹہ اس کا انتظار کیا۔ اس کے پینے سے مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی بلکہ اُلٹا اچھا اثر ہوا۔ مَیں اب اپنے آپ میں ایک عجیب سی طاقت محسوس کرنے لگا۔ میرے لیے فی الواقعہ یہ آبِ حیات سے کم اثر انگیز ثابت نہ ہوئی۔ میٹرن چلی گئی۔ مَیں اپنے بیڈ پر لیٹ کر ساتھ والے مریض سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا۔ بارہ بجے دوپہر کے کھانے کی گھنٹی ہوئی۔ جو مریض چلنے پھرنے کے قابل تھے وہ اپنا کھانا خود لنگر سے لے کر کھاتے جو مریض چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے ان کو لانگری اُن کے بستروں پر لا کر کھانا دیتے۔ ہمارے ٹمینٹ میں سب سیریس (SERIOUS) قسم کے مریض تھے۔ کوئی خوشی سے کھانا نہ کھاتا تھا۔ چاول شوربا اور چپاتیاں ہوا کرتی تھیں۔ زیادہ تر مریض ایک آدھ نوالہ کھا کر بقایا کھانا واپس کر دیتے۔ آج جب لانگری میرے پاس آیا تو خلافِ توقع اس نے مجھے اچھے موڈ میں دیکھا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

حوالدار جی کیا کھاؤ گے چاول یا روٹی۔

روٹی۔ بھیّا۔

لانگری نے تین پتلی پتلی چپاتیاں مجھے دے دیں اور پلیٹ میں گوشت ڈال کر ہنستے ہوئے میرے پاس لے آیا۔ آج کھانا کھانے کو میرا جی چاہتا تھا۔ چنانچہ مَیں نے اپنے بیڈ پر ہی بیٹھ کر شوربے کے ساتھ ایک چپاتی کھائی۔ جب سے مَیں اس موذی مرض میں مبتلا ہوا تھا۔ آج یہ پہلا دن تھا کہ مَیں نے کھانا شوق سے کھایا۔ ورنہ اس سے پہلے زہر مار ہی کرتا تھا اور جونہی کوئی چیز کھاتا فوراً پیٹ میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ اللہ کے فضل سے مجھے آج کچھ تکلیف نہ ہوئی۔ اور مَیں آرام سے بستر پہ لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد لنگر کا ایک سپاہی فروٹ تقسیم کرنے کے لیے

آیا۔ اس نے سب مریضوں کو دو دو کیلے دیے۔ میں نے ایک کیلا فوراً کھالیا۔ میں اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ طبیعت شاداں و فرحاں تھی۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس سے پہلے مجھے نیند باقاعدگی سے نہ آتی تھی۔ آج میں لیٹا تو مجھے فوراً نیند آگئی۔

۵

ڈاکٹر اپنے لاؤڈ لشکر کیساتھ حسبِ معمول شام کو وارڈ کا چکر لگانے آیا۔ میرے پاس آیا تو مجھے خوشگوار موڈ اور اچھی حالت میں دیکھ کر کہنے لگا۔

ونڈرفل۔ اس مریض کی حالت مجھے بہت اچھی نظر آ رہی ہے۔ میٹرن کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

سر۔ بڑی عجیب و غریب بات ہوئی ہے۔ میں نے اسے آج دوا و نس برانڈی لاکر دی۔ یہ پہلی چیز تھی جو اسے ڈائجسٹ ہوئی ہے۔ نہ پیٹ میں درد ہوا ہے اور نہ ہی وومٹنگ (VOMTING) ہی ہوئی ہے۔

از۔ اِٹ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! ڈاکٹر نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

بس سر۔ یہ معجزاتی طور پر عمل ہوا ہے۔ برانڈی لینے سے اس کی حالت تھوڑی ہی دیر میں سنبھل گئی۔ میرا خیال ہے اور دو تین جو سیریس (SERIOUS) مریض ہیں ان کو بھی برانڈی دی جائے۔

بالکل ٹھیک ہے۔ جو خوشی سے لینا چاہیں انہیں بے شک دوا کے طور پر دیں۔ مسلمان اس معاملے میں بڑے کچی (TOUCHY) ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نے میٹرن کو کہا۔

سر یہ مریض بھی تو مسلمان ہے۔

ٹھیک ہے۔ لیکن اس نے تو خود ڈیمانڈ کی تھی۔

سر میں اور دو تین مریضوں کا انتخاب کر کے ان پر اس کا اثر دیکھنا چاہتی

ہوں۔

ہاں۔ ایسا ضرور کرو۔ اگر یہ اس قدر مفید ثابت ہو تو اس سے ہزاروں جانیں بچائی جا سکتی ہیں۔

سر۔ اس کا کریڈٹ اُس مریض کو جائے گا۔

نہیں میڈیم ایسی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرتی طور پر کسی غائبانہ طاقت نے اس مریض کو اس پر قائل کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس مریض نے کبھی یہ استعمال نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑے یہ باتیں کرتے رہے اور آخر کار یہ طے پایا کہ اگر یہ تجربہ اور مریضوں پر بھی کامیاب رہتا ہے تو اس موذی مرض میں مُبتلا سب مریضوں کے ڈائٹ (DIET) میں دوا اونس برانڈی کا اضافہ کر دیا جائے۔ راؤنڈ ختم ہو گیا۔ سٹاف کے سب لوگ اپنے اپنے دفتروں میں چلے گئے۔ میٹرن واپس ہمارے ٹینٹ میں آئی۔ اس نے میرے ساتھ کے دو تین مریضوں کو اس دوا کے استعمال پر راضی کر لیا اور پھر وہ وہاں سے اپنے دفتر کی طرف چلی گئی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ دوبارہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی جس میں سیال سونا چمک رہا تھا سب سے پہلے اس نے مجھے سوڈے میں ملا کر تھوڑی سی برانڈی دی۔ وہ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ سِپ کی۔ اس کے بعد اُس نے اُن تین آدمیوں کو بھی میرے سٹریچر کے قریب بُلا لیا۔ جس طرح اس نے مجھے یہ دوا دی تھی۔ اسی طرح اُن دوسرے مریضوں کو بھی یہ دوا دی۔ منہ بناتے ہوئے کڑوے کسیلے گھونٹ انہوں نے بھی اپنے حلق سے نیچے اُتارے۔ میٹرن واپس چلی گئی۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد شام کا کھانا تقسیم ہونے کے لیے آیا۔ اُن نئے ساتھیوں نے بھی میری طرح کھانا کھانے پر آمادگی ظاہر کی۔ اور اپنی طبیعت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کھانا کھایا۔ یہ کھانا کھانے کے بعد ان میں سے کسی کو بھی تکلیف نہ ہوئی۔ ورنہ اس سے پیشتر سب مریض کھانا کھانے پر آمادہ ہی نہ ہوتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس آبِ حیات کا ایک چرچا ہو گیا۔ اور آخر کار پورے آسام

منی پور اور امپھال کے ہسپتالوں میں اس دوا کا استعمال شروع ہو گیا اور خدا کے فضل سے ہزاروں لوگوں کی قیمتی جانیں اس دوا کے استعمال سے بچ گئیں۔ میں بہت تیز رفتاری سے رُو بصحت ہو رہا تھا۔

٥

کچھ دنوں کے بعد دوسرے مریضوں کے ساتھ مجھے بھی ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے امن کی چھاؤنیوں کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ یہ ٹرین پانڈو گھاٹ تک آئی وہاں سے فوجی ٹرکوں کے ذریعے ہمیں گوہاٹی کے ایک فوجی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ کوئی ہفتہ دس دن تک ہم وہاں رہے۔ پھر وہاں سے ہسپتال کے ایک دریائی بجرے میں ہمیں سراج گنج لے گئے۔ غرضیکہ کوئی پندرہ دن کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم باقی ماندہ مریض میرٹھ آ پہنچے۔ جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا وہ کوئی باقاعدہ فوجی ہسپتال نہ تھا بلکہ گوروں کی بیرکوں میں عارضی طور پر یہ ہسپتال قائم کیا گیا تھا۔ یہاں سے مریض مکمل طور پر شفایاب ہو کر اپنے اپنے گھروں کو ایک ماہ کی چھٹی پر چلے جاتے اور پھر چھٹی کے خاتمے پر اپنے اپنے سنٹروں میں رپورٹ کرتے۔ میں نے چھٹی کے خاتمے پر جبلپور جا کر رپورٹ کی۔ وہاں مجھے ایک وائرلیس کلاس کا انسٹرکٹر بنا دیا گیا۔ چند دنوں کے بعد اچانک پتہ چلا کہ چونکہ جنگ کے زمانے میں سب ترقیاں عارضی ہوتی ہیں اور وہ اسی یونٹ تک محدود ہوتی ہیں جس میں آدمی مستقل طور پر پوسٹ ہوتا ہے اگر کوئی عہدیدار کسی وجہ سے اپنی یونٹ سے اٹھائیس دن یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے غیر حاضر رہے تو اسے اس کے موجودہ رینک سے ڈیموٹ کر دیا جاتا۔ چنانچہ میری (REVERSION) تنزلی کے احکامات بھی آخر کار جبلپور آ پہنچے۔ جن کے نتیجے کے طور پر مجھے ریورٹ (REVERT) کر کے نائیک بنا دیا گیا اور پھر ایک ماہ کے بعد لانس نائیک بنا دیا گیا۔ ان سب تازیانوں سے میں بہت دل برداشتہ ہو گیا۔ اب میں نے دل میں ٹھان لی کہ اب مجھے جلد از جلد برما کے محاذ پہ جانا چاہیے۔ جہاں جا کر

میں آسانی سے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو سکوں گا۔ اور پھر اس طرح سے جنگ آزادی کے سپاہیوں کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لے کر ہندوستان کو ان گورے آقاؤں سے چھیننے میں مدد دوں گا۔

O

۲۴۔ آرٹلری رجمنٹ سگنل سیکشن کے ساتھ مجھے برما جانے کے لیے نامزد کیا گیا۔ میں بہت خوش تھا کہ برما جا کر میں آسانی سے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو سکوں گا۔ یہ رجمنٹ رانچی میں ریزہوئی۔ لڑائی کے دنوں میں یونٹوں کی نقل و حرکت صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے۔ ہم سپیشل ٹرین کے ذریعے مدراس پہنچے وہاں سے بحری جہاز پر سوار ہوئے۔ سری لنکا۔ جزائر انڈیمان ہوتے ہوئے کوئی دو ہفتے کے بعد ہمارا جہاز چٹاگانگ کی بندرگاہ پہ جا کر لنگر انداز ہوا۔ چٹاگانگ سے پوری رجمنٹ کو پیدل چل کر اراکان تک کم و بیش کوئی ایک سو میل کا دشوار گذار راستہ طے کرنا تھا۔ اراکان سے جانب غرب دریائے ٹیکناف برما اور ہندوستان کی سرحد پر بہتا ہے۔ اس سے مغرب کی جانب ہندوستان اور مشرق کی سمت برما واقع تھا۔ دریائے ٹیکناف کو عبور کرنے کے بعد ہماری رجمنٹ نے اراکان برما کے دامن میں جا کر کیمپ لگایا۔ یہاں پہلے سے ۲۶ انڈین ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر تھا جو انہی دنوں نیا نیا مشرق وسطی سے تبدیل ہو کر اس محاذ پر آیا تھا۔ اراکان برما کے شرق کی طرف ساتواں انڈین ڈویژن تعینات تھا۔ ہماری سگنل سیکشن کی نفری کوئی ایک سو آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اس سیکشن کا آفیسر کمانڈنگ (او۔سی) بمبئی کا ایک پارسی نوجوان پی۔ ایم کیرالی تھا۔ یہ صاف اردو نہ بول سکتا تھا۔ بلکہ بمبئی کے مخصوص لہجے اور تلفظ میں اردو بولتا تھا۔ اس کا یہ لہجہ ہم لوگوں کو بہت ہی ناگوار گذرتا تھا۔ اس کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں محض انڈین نیشنل آرمی میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے اس محاذ پر آیا ہوں۔ اس نے میرے اس جذبے کو بہت ہی سراہا۔ ایک دن مجھ سے تنہائی میں کہنے لگا۔

انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بھاگ کر جانے میں بہت زیادہ خطرات پنہاں ہیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں کی لڑائی ہو اور ہمارے لوگ ہتھیار ڈال دیں۔ قیدی بن جائیں۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد نیشنل آرمی میں شمولیت اختیار کرلیں۔ ویسے نارمل حالات میں اِدھر سے بھاگ کر جانا مشکل ہے۔ آپ وقت کا انتظار کریں۔ کیرانی صاحب کی بات معقول تھی۔ میری آرزو دل ہی میں رہ گئی۔

## ۵

چوتھا انڈین ڈویژن ارکان برما کے مغرب میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ بوتھی ڈانگ تک جو ساحلِ سمندر پر واقع تھا، پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن تقریباً آدھی رات کا وقت ہو گا کہ جاپانیوں اور نیشنل آرمی والوں نے چوتھے ڈویژنل ہیڈکوارٹر پر حملہ کر دیا۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر کی حفاظت پر ایک گورکھا بٹالین متعین تھی۔ میرے بنکر سے تھوڑی ہی دور رات بھر دست بدست شدید جنگ ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے اس قدر شدید چیخ و پکار ہوتی رہی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب کبھی تھوڑی دیر کے لیے فائرنگ تھمتی تو انڈین نیشنل آرمی والے ہم لوگوں کو پنجابی زبان میں بہت ہی فحش گالیاں دیتے اور غیرت دلاتے کہ ہم لوگ انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ وہ ترغیب دیتے کہ ہم انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہتھیاروں سمیت انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جائیں۔ میں ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن کیرانی صاحب کی باتیں مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں۔

فائرنگ کی شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور آخرکار پو پھٹنے سے پہلے لڑائی تھم گئی۔ اب سوائے زخمیوں کی کراہٹوں کے اور کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ دونو فریقوں نے اپنے اپنے زخمیوں کو اٹھایا اور پھر ایک مسلسل اور ہیبتناک خاموشی چھا گئی۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر سے ہٹ کر کوئی چار سو گز کے فاصلے پر بانسوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ پھر اس گاؤں کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں

آنے لگ گئیں۔ جاپانی اور انڈین نیشنل آرمی والے اب اس گاؤں میں جا گھسے تھے۔ بہت دیر تک گولیوں کی آوازیں آتی رہیں اور قیامت کی سی چیخ و پکار جاری رہی میرا بنکر اس گاؤں کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی ٹیکری پر تھا۔ اس رات کوئی آدمی بھی نہ سو سکا۔ ہماری نگاہیں اس گاؤں کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے اب تک مسلسل چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی کبھی درمیان میں اکا دکا گولی چلنے کی آواز بھی آ جاتی۔

ستارۂ سحری طلوع ہو چکا تھا۔ ان ظالم اور وحشی انسانوں نے جاتے وقت گاؤں کے گھاس پھوس کے جھونپڑوں کو بھی آگ لگا دی۔ بانسوں اور گھاس پھوس سے بنے ہوئے باشے جل رہے تھے۔ گاؤں میں ایک قیامت کا ساسماں تھا۔ آہستہ آہستہ شور تھمتا گیا۔ صبح کا اجالا ہوتے ہی وہ وحشی انسان گاؤں سے نکل کر ملحقہ جنگل میں غائب ہو گئے۔

صبح سورج کی سنہری کرنوں کے ساتھ ہم نے اس گاؤں کا منظر دیکھا۔ اُجڑے ہوئے اور جلے ہوئے گھروندے درس عبرت دے رہے تھے۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر اس گاؤں میں گیا۔ میں وہ قیامت خیز منظر کھڑا دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرتے آنسو میرے چہرے پر گر رہے تھے۔ جا بجا انسانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ بوڑھے۔ جوان اور بچے سب قتل کر دیے گئے تھے۔ دو معصوم بچے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے پاس بیٹھے آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان دو معصوم بچوں جن کی عمر بمشکل پانچ چھ سال ہو گی کے سوا کوئی زندہ انسان اُس بستی میں ہمیں نظر نہ آیا تھا۔ جوان عورتیں ننگی پڑی ہوئی تھیں۔ ظالم انسانوں نے انہیں ہوس کا نشانہ بنا لینے کے بعد ان کی شرم گاہوں میں سنگینیں گھونپ دی تھیں۔ وہ کوکھ ننگی تھی جس سے قدرت کا عظیم شاہکار جنم لیتا ہے۔ عورتوں کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جس کے متعلق حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا تھا کہ عورت ماں ہے۔ اور ماں کی چھاتیوں سے جو دودھ کی نہریں بہتی ہیں

یہ دودھ کی نہریں جنت کی وادیوں سے ہوکر آتی ہیں۔ آج وہ ماں ننگی پڑی ہوئی تھی وحشی انسان نے اپنی ہی ماں کی چھاتیاں کاٹ دی تھیں۔ اپنی ہی ماں کی کوکھ میں سنگین گھونپ دی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ آج کے انسان پر اگر معاشرے کی گرفت نہ ہو تو وحشی درندوں اور اس میں کیا فرق ہے۔ وہ پھول سے بچوں کے پیٹوں میں سنگینیں گھونپ دیتے ہیں۔ یہ سب ہمارے قومی ہیروز ہیں۔ یہ انڈین نیشنل آرمی کے سورماؤں کی کارروائی تھی۔ مجھے ان سے ایک گونہ نفرت سی ہوگئی۔ میں نے اپنے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے ایسے درندہ صفت اور وحشی انسانوں کے گروہ میں شامل ہونے سے بچایا۔ میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے ظلم کرنے والوں کا ساتھی نہ بنایا۔

○

ایک تاریک رات میں جاپانیوں نے ساتویں انڈین ڈویژن پر بھرپور حملہ کیا بڑا کشت و خون ہوا۔ ساتویں ڈویژن نے پسپائی اختیار کی اور بھاگ کر دریائے ٹیکناف کے کنارے ہی پہنچ کر دم لیا۔ انیسویں انڈین ڈویژن نے شمال مغرب کی جانب سے جاپانیوں پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ اور ان سے بہت سا مفتوحہ علاقہ واپس لے لیا۔ انہی دنوں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر یکے بعد دیگرے ایٹم بم گرائے۔ ان بموں کی قیامت خیز تباہی کے باعث جاپانیوں کے حوصلے پست ہو گئے جس کے باعث انہوں نے اراکان فرنٹ سے مکمل طور پر پسپائی اختیار کر لی۔ جاپانی فوجوں کا پریشر جب کچھ کم ہوا تو ہماری سیکشن کو ہندوستان جانے کے احکامات مل گئے۔ چنانچہ چند ہی روز میں ہماری سیکشن دریائے ٹیکناف کے مشرقی کنارے پر واقع ایک ٹرانزٹ کیمپ (TRANSIT CAMP) میں پہنچ گئی۔ میں گذشتہ ایک سال سے بدستور لانس نائیک ہی تھا۔ ہمارا سیکشن حوالدار ضلع راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ میں نے راولپنڈی اور گجرات کے بہت کم لوگ دیکھے ہیں کہ جو

دوسرے اضلاع کے لوگوں کے ساتھ تعصب نہ برتتے ہوں۔ یہ حضرت بھی نہایت متعصب قسم کے عہدیدار تھے۔ جتنا عرصہ بھی مَیں ان کے ماتحت رہا ان کو کبھی بھی میری کارکردگی پسند نہ آئی۔ دراصل سب سے زیادہ ناپسندیگی کی وجہ ان کی نظر میں پڑھا لکھا ہونا تھا۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ وہ مجھے حد درجہ اکڑ خان اور فسادی خیال کرتے تھے۔ وہ کافی ہوشیار آدمی تھے۔ ہمیشہ پہلو بچا کر رکھتے جس کی وجہ سے کبھی بھی یہ نوبت نہیں آئی کہ ان کے ساتھ کسی کی ٹھنے۔

O

ٹرانزٹ کیمپ میں آئے ہوئے ہمیں تیسرا ہی دن تھا کہ مَیں دوسرے جوانوں کے ساتھ لنگر پر کھانا کھانے کے لیے گیا۔ وہاں مَیں نے دیکھا کہ ایک لانگری ایک بڑے سے توے پر روٹیاں پکا رہا ہے۔ مَیں نے لنگر کمانڈر سے کہا۔

بھئی آج تیسرا دن ہے ہمیں روٹی نہیں ملی۔ اُبلے ہوئے چاول اور پتلی فضول سی دال ان پر ڈالنے کے لیے ہمیں ملتی ہے۔ ہم پنجابی ہیں۔ متواتر چاول نہیں کھا سکتے۔ آج مہربانی سے ہمیں روٹی دو دیں۔ کیمپوں میں جو سٹاف کے آدمی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بڑے عہدے دار ہوں یا چھوٹے، سب باون گز کے ہوتے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر فرعون ہوتا ہے۔

روٹی صرف کیمپ کے سٹاف کے لیے ہے۔ چاول کھانے ہیں تو لے لو۔ یہاں نخرے نہیں چلیں گے۔ اس نے نہایت رعونت اور تند خوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

بھائی صاحب۔ مجھے دو تین چپاتیاں مہربانی سے دے دیں۔ مَیں چاول نہیں کھا سکتا۔ یہاں تمہاری ماں تو نہیں بیٹھی ہوئی کہ تمہیں الگ سے روٹی پکا کر دے گی۔ سب لوگوں کو جو کھانا ملتا ہے تمہیں بھی وہی ملے گا۔ خاموشی اور شرافت سے لے لو، کھالو۔ زیادہ باتیں مت بناؤ۔

میں نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا چولہے کے پاس لے آیا تاکہ اس کا سر چولہے میں ڈال سکوں۔ لانگریوں نے میری منت سماجت کر کے اس کی گلو خلاصی کرائی مگر الگ ہوتے ہوتے بھی میں نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی خوب مرمت کی۔ میں نے اُسے چھوڑا تو وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا میری سیکشن کے جو آدمی میرے ساتھ لنگر پر آئے تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ جس قدر چپاتیاں پکی ہوئی پڑی ہیں سب اُٹھا لو۔ اور ان دیگچوں کو دیکھو ان حرام خوروں نے اپنے لیے ضرور الگ کچھ اچھی چیز پکائی ہوگی۔ ایک چھوٹا سا دیگچہ عزیز اکبر میرے پاس اُٹھا کر لے آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

دیکھو لالہ اس میں کلیجی پکی ہوئی ہے۔

سب لے لو۔ انہوں نے یہ اپنے باپ کے گھر سے تو نہیں لائی۔ ہمارا ہی پیٹ کاٹ کر یہ گلچھرے اُڑاتے ہیں۔

میری سیکشن کے جوانوں نے اپنے اپنے میس ٹن (MESS TIN) (یہ ایک ڈھکنے والا ڈبہ ہوتا ہے جو جنگ کے دنوں میں سب کو ایشو ہوتا ہے۔ جو کھانا کھانے اور لے کر محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔) اس پکی ہوئی کلیجی سے بھر لیے اور خود ہی چپاتیاں اُٹھا کر اپنے اپنے خیموں کی طرف چلے گئے۔ میں نے میر اکبر کو کہا کہ تم بھی اپنا میس ٹن بھر کر لے جاؤ اور حوالدار کو بھی میری طرف سے کھلاؤ۔

ہم کھانا ابھی کھا ہی رہے تھے کہ ایک موٹا تازہ سانڈ کی طرح پلا ہوا صوبیدار میجر اپنا لاؤ لشکر لے کر وہاں آ گیا۔ لنگر کمانڈر بھی اس کے ساتھ تھا۔ صوبیدار میجر نے اُس سے پوچھا۔

وہ کون سا جوان ہے جس کی یہ سب شرارت ہے۔

یہ لانس نائیک جو سامنے بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا ہے۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بتایا۔

اوئے جوان! باہر آؤ۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بڑے رُعب

اور تمکنت سے کہا۔

میں نے سُنی ان سنی کر دی اور اطمینان سے بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔

اوئے جوان تم نے سُنا نہیں۔ ہم تم کو بُلا رہے ہیں۔

میں نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میرے ساتھی کے لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور صوبیدار میجر شرمندہ سا ہو کر تلملانے لگا۔ اس کا ایک چمچہ ٹینٹ کے اندر داخل ہو کر مجھے بازو سے پکڑنے لگا۔ میں نے اُٹھ کر اسے ایک زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔ میرے ساتھی لڑکوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

میری اس تند خوئی کو دیکھ کر صوبیدار میجر کے کچھ مزاج درست ہوئے۔ وہ ٹینٹ کے اندر آ کر مجھ سے کہنے لگا۔

جوان! تم نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟

کون سی حرکت۔

لنگر سے روٹی اور ترکاری زبردستی لینے کی۔

کیا ہمارا راشن نہیں آتا۔ یہ چپاتیاں اور کلیجی سٹاف کے لوگوں کا ہی صرف حق ہے۔

بیٹا۔ لڑائی نہیں کرتے۔ کیمپوں میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سٹاف کے لوگوں کا کھانا الگ ہی پکتا ہے۔

چچے۔ ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ لیکن ہم لوگ اُبلے ہوئے چاول نہیں کھا سکتے۔ ہم پنجابی ہیں روٹی کے بغیر ہماری گزر بسر نہیں ہو سکتی۔ میں نے لنگر کمانڈر سے بارہا پُر زور التجا کی کہ ہمیں کچھ چپاتیاں دے دے۔

بھئی وہ کہاں سے دیتا۔ جو چیز میسر ہو گی وہی ملے گی۔ اس نے اپنے پاس سے تو کچھ نہیں دینا۔

سٹاف والوں کے لیے یہ چپاتیاں اور بھُنی ہوئی کلیجی کہاں سے آتی ہے۔ ان لوگوں

کی راشن سکیل ہم لوگوں سے الگ ہے۔

بھئی۔ میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ میں کیمپ کمانڈنٹ کو یہ سب کچھ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ ان کی مرضی ہے آگے وہ جو چاہیں کریں۔

بالکل ٹھیک ہے۔ یہی صحیح اور قانونی طریقۂ کار ہے۔ کسی کو بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

صوبیدار میجر کھسیانا سا ہو کر اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس دفتر کی طرف چلا گیا۔ اس نے جا کر کیمپ کمانڈنٹ کو سب صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈنٹ نے ہمارے او۔سی کو بلوایا۔ وہ بے چارا نوجوان سا ناتجربہ کار لڑکا۔ بڈھے کھوسٹ انگریز کمانڈنٹ کی جھاڑ کھا کر سیدھا میرے ٹینٹ میں آیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

احمد۔ پھر تم نے یہ کیا گل کھلا دیا (جھگڑا) کر دیا۔ کرنل صاحب بہت ناراض ہو گئے ہے اس نے تمہارے کوائف (PARTICULARS) مجھ سے مانگے ہیں۔

میں نے کیرانی صاحب کو سب صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر اس سے کہا کہ آپ میری سروس کے جملہ کوائف اس کو دے دیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑا مجھے سمجھاتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ سر۔ آپ کا سمجھانا بجھانا بے سود ہے۔ جب بھی کوئی آدمی مجھ سے غلط بات کرے گا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا۔

بابا خدا کے لیے خیر خیریت سے اپنی یونٹ میں کوہاٹ پہنچ جانے دو۔ چند دنوں ہی کی تو بات ہے۔ گذارا کرو۔ وہ یہ سب باتیں کر کے واپس جانے لگا تو مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نہ جانے اس بات کا کیا مطلب تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔

کیرانی صاحب ذاتی طور پر مجھے پسند کرتا تھا۔ لیکن سروس کی مجبوریوں کے باعث اسے میرے خلاف کچھ نہ کچھ ایکشن (ACTION) لینا ہی پڑتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہماری سیکشن تقریباً ایک ہفتہ سے اس ٹرانزٹ کیمپ میں رہی۔ صبح و شام ٹھیک ٹھاک

کھانا ملتا رہا۔ ہم حسب ضرورت چپاتیاں لیتے رہے۔ پھر کسی بڑے پیٹ والے کو اس پر اعتراض نہ ہوا۔ اب ہمارا اور سٹاف والوں کا راشن ایک ہی سکیل پر آتا تھا۔

## ۵

ہماری سیکشن ٹرانزٹ کیمپ سے ایک فوجی کانوائے کے ساتھ چٹاگانگ آ گئی۔ دو تین دن وہاں ٹرانزٹ کیمپ میں قیام کیا پھر وہاں سے کلکتہ پہنچا دیے گئے کلکتہ سے ایک فوجی ٹرین کے ذریعے دہلی پہنچے۔ دہلی سے دوسری سپیشل ٹرین میں سوار ہوکر ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ پوری گاڑی فوجیوں کی تھی۔ ٹرین کا کمانڈر ایک انگریز کرنل تھا۔

دہلی سے گاڑی رات کو دیر سے چلی۔ صبح سات بجے کے لگ بھگ ہماری گاڑی جالندھر کے ریلوے سٹیشن پر آ پہنچی۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی کہ ملٹری پولیس کے دو گورے موومنٹ کنٹرول کے عملہ کو ساتھ لے کر ہمارے ڈبہ میں آئے میں نے اُوپر کی سیٹ پر بستر لگایا ہوا تھا۔ میرے نیچے کی سیٹ پر ہمارا ایک سپاہی لیٹا ہوا تھا۔ وہ ملٹری پولیس والے گورے اور موومنٹ کنٹرول والے چند مزید فوجیوں کو ہمارے ڈبے میں بٹھانا چاہتے تھے۔ گورا سارجنٹ جونہی ڈبے میں داخل ہوا اُس نے ہمارے اس نوجوان کو جو میری سیٹ کے نیچے بستر لگائے ہوا تھا اس کو ایک لگ ٹھوکر، لگائی اور گویا ہوا۔

گیٹ اَپ لیوانڈین۔

وہ جوان مسکین طبیعت تھا۔ بے چارا خاموشی سے بغیر کسی احتجاج کے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس گورے سارجنٹ نے دو مزید آدمی راولپنڈی کے لیے لاکر بٹھا دیے۔ یہ سب کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے مصلحت اندیش حوالدار صاحب بہادر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی چپ رہے۔ اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چادر کھینچ کر اوڑھ لی اور پہلو بدل کر مصنوعی خراٹے لینے لگ گئے۔ میں قدرتی طور پر ایسی باتوں کو برداشت

نہیں کر سکتا۔ میں نے اوپر اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی گورے سارجنٹ کو کہا،
سارجنٹ یہ ڈبہ ہماری سیکشن کے لیے دہلی سے راولپنڈی تک کے لیے ریزرو
ہے۔ اگر آپ اس میں مزید آدمی بٹھانا چاہتے ہیں تو آپ ہمارے او۔سی سے اجازت
لے کر بٹھائیں۔

اس گورے سارجنٹ کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور ناگوار گذرنا بھی چاہیے تھی۔
وہ ملکہ وکٹوریہ کا پوتا۔ اس کا مخاطب ایک غلام ابن غلام۔ گورے کا پارہ چڑھ
گیا۔ اس نے فوراً جو پہلی بات مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہی۔ یہ تھی۔

"یو باسٹرڈ انڈین۔ (حرامزادے ہندوستانی) تمہیں یہ بات کرنے کی جرأت
کیسے ہوئی"؟

میں آہستہ سے اپنی سیٹ سے نیچے اتر آیا۔ گورے سارجنٹ کا غصہ ابھی ٹھنڈا
نہ ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔ ہم دونوں ڈبے کے دروازے
کے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں نے اس زور سے اسے ایک لات رسید کی کہ وہ
نیچے پلیٹ فارم پر کمر کے بل جا کر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ ملٹری پولیس کے دوسرے
گوروں نے لمبی لمبی سیٹیاں بجانی شروع کر دیں اور پھر تین گورے ڈبے کے اندر
آ کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ پہلے گورے نے مجھے ایک ہنٹر مارا۔ میں نے اسے بھی اٹھا
کر کھڑکی سے نیچے پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ وہ بھی سارجنٹ کی طرح چت ہو گیا۔
ہمارے حوالدار صاحب بہادر نے سیکشن کے آدمیوں کو منع کر دیا کہ کوئی آدمی بھی صاب
لوگوں (گوروں) کے خلاف لڑائی میں میری مدد نہ کرے۔ اور پھر میرے متعلق
کہنے لگا۔

"اس کو تو ماں باپ کی بددعا ہے۔" جہاں بھی جاتا ہے لڑائی جھگڑے کے سوا
اس کا اور کوئی کام ہی نہیں۔ سیکشن کے سب آدمی جو میری مدد کے لیے اٹھے تھے
بیٹھ گئے۔ ان میں سے صرف بھاپا عزیز اکبر چوہل پور (بھارا کہو) کے اعوان خاندان کا چشم و
چراغ تھا۔ میری مدد کے لیے گوروں کے مقابلے میں آیا۔ اگر بھاپا بھی میری مدد کو نہ آتا تو

بھی مَیں اکیلا ہی ان گوروں کے مزاج درست کر سکتا تھا۔ یہ دلچسپ لڑائی دیکھنے کے لیے بہت سے آدمی ٹرین سے نیچے اُتر آئے۔ اور انھوں نے یہ سب کچھ بچشم خود دیکھا۔ کئی منچلے تو میرا دل بھی بڑھا رہے تھے۔ آخر کار ٹرین کمانڈر اور دوسرے بہت سے انگریز افسر اُتر کر ہمارے ڈبے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

کرنل نے مجھے آرڈر دیتے ہوئے کہا، نائیک! اپنے سب آدمیوں کو نیچے پلیٹ فارم پر ایک دم فالن کرو۔

مَیں نے کرنل کو کہا۔

سر آپ ہمارے او۔ سی کو بلائیں۔ وہ مجھے حکم دے۔ مَیں اس کے بغیر اور کسی کا حکم نہیں مانوں گا۔

انگریز کرنل بڑا جوشیلا سپاہی تھا اُس کو فوراً غصہ آگیا اور اُس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ میرے پاس بھی ۳۰۳ رائفل تھی مَیں نے ڈبے کے دروازے میں کھڑا ہو کر اس میں دس گولیاں لوڈ کر لیں۔ مَیں نے کرنل کو للکارتے ہوئے۔ "میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔" یہ کونسا طریقہ نہیں ہے کہ آپ نے حالات و واقعات سے آگاہی حاصل کیے بغیر مجھ پر پستول تان لیا ہے۔ گورے سارجنٹ نے سب ہندوستانیوں کو گالیاں دی ہیں اور مجھے چانٹے مارے ہیں۔ مَیں مارشل ریس کا ایک فرد ہوتے ہوئے کھڑا کیا یہ سب کچھ دیکھتا رہوں گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مَیں اپنی بے عزتی برداشت کر لوں گا۔ ہرگز نہیں۔ جو بھی میرے مقابلے پر آیا مَیں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس کا مقابلہ کروں گا۔

کرنل نے میری بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ آگے بڑھ کر اس نے ٹرین کی کھڑکی کے پاس آکر سب لوگوں کو نیچے فالن ہونے کا حکم دیا۔

تعمیل حکم کے لیے سیکشن کے کچھ آدمی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مَیں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ساتھیو! میری بات غور سے سنو۔ اب حالات ہمیں ایسے مقام پر لے آئے ہیں

جہاں سے اب ہم پلٹ کر واپس نہیں جا سکتے۔ میں آپ لوگوں کو خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی آدمی نیچے خالی ہونے کے لیے گیا تو میں سب سے پہلے اس کو گولی ماروں گا۔ حوالدار بہادر چادر لپیٹ کر بدستور خراٹے لے رہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کرنل کو بُرا نا دُر آ رہا تھا۔ وہ دانت پیستے ہوئے بار بار میرے سامنے آتا۔ اور مجھے اس کھیل کے خطرناک انجام سے ہر بار آگاہ کرتا۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

نائیک۔ تُم نالُم۔ میوٹنی میوٹنی۔ فائرنگ سکاڈ۔ (یعنی تمہیں پتہ ہے کہ تم ملک المعظم اور تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہو اور اس کی سزا موت ہے۔ یعنی فائرنگ سکاڈ کے سامنے کھڑا کر گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا ہو گا۔

ہم کو سب مالُم۔ میں نے اس بوڑھے کرنیل کو اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

تم لوگ نیچے کیوں نہیں آتے؟

میں صرف اپنے او رسی کا حکم مانوں گا اور کسی کا بھی نہیں۔

کہاں ہے تمہارا او رسی۔

مجھے کیا پتہ ہے۔ آفیسرز کمپارٹمنٹ میں کہیں ہو گا۔

وہ سب برٹش آفیسر لیفٹیننٹ کیرانی کی تلاش میں ٹرین کی پچھلی طرف چلے گئے۔ گاڑی کوئی گھنٹہ بھر لیٹ ہو گئی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ سکھ رجمنٹ کی ایک کمپنی رائفلیں اور برین گنیں اٹھائے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ ان کا کمانڈر ایک سکھ کپتان تھا۔ انہوں نے ہمارے ڈبے کے دونوں طرف برین گنیں سٹینڈز پر لگا کر پوزیشن سنبھال لی۔ وہ سکھ کپتان، انگریز کرنیل (ٹرین کمانڈر) کے ساتھ ہمارے ڈبے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

تم نے یہ کیا مصیبت بنائی ہوئی ہے!

کوئی مصیبت نہیں۔

تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے۔ ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی ہے۔ تم نے حکومت کا ہزار ہا روپے کا نقصان کر دیا ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنے آدمیوں کو نیچے لا کر فالن کر دو۔ میری تم کو یہ آخری وارننگ ہے۔

میں نے کرنل صاحب کو بتا دیا تھا کہ میں اپنے او۔ سی (.O.C) کے علاوہ اور کسی کا بھی حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

تم اور تمہارے یہ چند آدمی ایک پوری کمپنی کا مقابلہ کیوں کر کر سکیں گے۔

آپ یہاں مقابلہ کرنے کے لیے آئے ہیں؟

تمہارا مہمان بن کر تو نہیں آیا۔

تو پھر آپ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کریں گے۔

تم کیا کام کرو گے؟

جو تم کرو گے۔

میں تو طاقت کا استعمال کروں گا۔

ہم اپنی پوری استطاعت کے مطابق اس کا بھرپور جواب دیں گے۔

۳۰۳ رائفل والے، برین گن والوں کا کیا مقابلہ کریں گے۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ کیوں حرام کی موت مرتے ہو۔

مجھے نصیحتیں دینا بند کرو۔ جو کچھ کرنا ہے کر کے دکھو۔

وہ سکھ کپتان آپے سے باہر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ میں ابھی تم لوگوں کو اس کا انجام بتاتا ہوں۔ میں آخری بار تم لوگوں کو وارننگ دیتا ہوں کہ نیچے آ کر فالن ہو جاؤ اور اپنے اپنے ہتھیار رکھ دو۔

میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم مقابلہ کریں گے۔ مر جائیں گے تو کیا ہو گا۔

تم تو پاگل ہو۔ دوسرے جوانوں کو بھی خواہ مخواہ شوٹ کرواؤ گے۔

زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تم عمر بھر یاد رکھو گے۔

شٹ اپ (SHUT UP)

یو۔ شٹ اپ۔

سکھ کپتان نے پیچھے کو پلٹ کر اپنی کمپنی کو آرڈر دیا۔ لوڈ۔ ٹیک یور پوزیشنز۔

نو۔ نو۔ کیپٹن۔ انگریز کرنل نے تقریباً چیختے ہوئے کہا

سکھ کپتان کرنل کے پاس آکر کہنے لگا۔ سر آپ انٹرفیئر نہ کریں۔ میں اس مرہٹے کو ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔

نو کیپٹن۔ ایک مسلح آدمی اور ایک خالی ہاتھ آدمی کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ یہ جوان وار تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ غلطی اس برٹش سارجنٹ کی تھی۔ میں ایک معمولی سی بات کی وجہ سے اتنی قیمتی جانیں نہیں ضائع کرنا چاہتا۔ یہ کہیں اور کام آئیں گے۔

سکھ کپتان ضد کرنے لگا۔ انگریز کرنل نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

میری عرضداشت پر تمہیں میری مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں تمہیں آرڈر دیتا ہوں کہ تم پیک اپ (PACK UP) کرو اور اپنی یونٹ کو واپس چلے جاؤ۔

تو یہ گتھی کیسے سلجھے گی۔ سکھ کپتان نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

سلجھ جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ میرا کام ہے۔

سکھ کپتان نے کرنل کے سامنے ناراض ہو کر اپنے آدمیوں کو پیک اپ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے آدمی اپنا اپنا سامان سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ بے وقوف کپتان میرے ڈبے کے سامنے آکر تقریباً للکارتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

اگر کرنل صاحب بیچ بچاؤ نہ کراتے تو میں تم لوگوں کو مزا چکھاتا۔

وہ سکھ کپتان ہوش و خرد سے بالکل عاری، مجھ سے یہ باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی اس سے کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا وہ طاقت کے نشے میں بدمست تھا۔ میں اپنی آن پر مرمٹنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ تم کرنل سے اجازت لے کر جس قسم کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو کرو۔

کس چیز کا مقابلہ۔

میرے ساتھ کشتی کر لو۔ زور آزمائی کر لو۔ دوڑ لگا لو۔ اور اگر لڑنا ہی چاہتے ہو تو دونو خالی ہاتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

کرنل نے اُس سکھ کپتان کو تقریباً شاؤٹ کرتے ہوئے کہا۔ کیپٹن۔ سٹاپ آل۔ دِس۔ نان سینس

وہ کپتان واپس اپنے جوانوں کی طرف چلا گیا۔ جن کو اب ایک سکھ صوبیدار نے فالن کیا ہوا تھا۔ کرنل نے اس کو حکم دیا کہ وہ اپنے جوانوں کو واپس اپنی بیرکس BAKR-ACK میں لے جائے۔ میں سٹیشن کمانڈر سے ابھی ٹیلی فون پر بات کرتا ہوں۔ وہ سکھ کپتان اپنے جوانوں کو مارچ کر کے سٹیشن سے باہر لے آیا۔ وہاں اُن ٹرانسپورٹ موجود تھی۔ وہ اسی میں سوار ہو کر واپس چلے گئے۔ میں کرنل کے اس رویئے سے بہت متاثر ہوا۔ میں گاڑی سے نیچے اُتر کر آیا اور اسے سیلوٹ کرتے ہوئے اپنی بندوق اس کے سامنے زمین پر رکھ دی اور گولیوں کا گٹھا نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔

دنیا بھر کے فوجیوں کی یہ روایت ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں تو اسے شکست کے مترادف تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ انگریز کرنل حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگ گیا۔ جیسے اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا ہو۔

اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی نیچے بلاؤ۔ کرنل نے مجھ سے کہا۔

سَر میں صرف لانس نائیک ہوں۔ ہمارا سیکشن حوالدار ڈبے کے اندر موجود ہے۔ آپ اُسے بلا کر حکم دیں۔

کہاں ہے حوالدار۔ میں تو تمہیں حوالدار سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا تم ہی سٹیشن کے انچارج ہو۔

نہیں سَر۔ حوالدار اندر سویا ہوا ہے۔

سویا ہوا ہے۔ بے وقوف۔ یہاں قیامت کا سا سماں ہے اور وہ نیرو کی طرح چین کی بنسری بجا رہا ہے۔

کرنل خود ڈبے کے اندر گیا اور حوالدار کو دھکے مار کر ڈبے سے باہر لے آیا۔ کرنل اس سے کہہ رہا تھا۔ تم کیسا غیر ذمہ دار حوالدار ہے۔ یہاں گولی چلنے لگی تھی اور تم اندر مزے سے سو رہے ہو۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ اس جوشیلے نوجوان کے علاوہ اور کوئی سینئر آدمی ڈبے کے اندر ہے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

حوالدار نے سیکشن کو نیچے پلیٹ فارم پر فالن کیا۔ اتنے میں ایک انگریز میجر لیفٹیننٹ کیرانی کو بھی کہیں سے تلاش کر کے لے آیا۔ کرنل نے اس کو ڈانٹ پلائی۔ گاڑی کو پلیٹ فارم پر کھڑے اب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔ کرنل ہم سب کو وہاں اسی حالت میں چھوڑ کر سٹیشن کمانڈر سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے موومنٹ کنٹرول آفس میں چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے لیفٹیننٹ کیرانی صاحب کو کہا۔

کیرانی تم اپنی سیکشن کے سب جوانوں کو یہاں پر اتار لو۔ بریگیڈیئر صاحب نے حکم دیا ہے کہ تمہاری پوری سیکشن کو کلوز اریسٹ (CLOSE ARREST) کیا جانا ہے۔ میں نے یہ بات سنی تو دو قدم آگے نکل کر کرنل سے کہا۔

سر۔ اس سارے قصے میں میرے اور عزیز اکبر کے سوا اور کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ جی۔ ایم۔ پی کو ہم نے مارا ہے۔ سیکشن والوں کا کیا قصور ہے۔ آپ بے شک ہم دونوں کو کلوز اریسٹ کر دیں۔ لیکن باقی سیکشن والوں کو آپ جانے دیں۔ ان کو آپ اس بات کی سزا نہ دیں کہ یہ میرے جیسے بے وقوف آدمی کی سیکشن میں ہیں۔

ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کرنل نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

سر۔ آپ ایک مہربانی کرنل کریں۔ بریگیڈیئر صاحب سے میری انٹرویو کروا دیں۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات مان جائیں گے۔

وہ کرنل اس بات پر راضی ہو گیا اور مجھے ساتھ لے کر سٹیشن ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈیئر صاحب

کے پاس لے گیا۔ برگیڈیر ایک بڈھا، جہاندیدہ انگریز تھا۔ جو بہت جچے تلے اور بہت ہی محتاط انداز میں باتیں کرتا تھا۔ مَیں نے بغیر کسی جھجک کے پوری بات اس کے گوش گذار کر دی۔ پھر مَیں نے اس سے کہا کہ سَر، اگر یہ غلطی ہے تو اس کا ارتکاب مَیں نے اور عزیز اکبر نے کیا ہے۔ آپ ہم دونوں کو بے شک کلوز اریسٹ کر دیں۔ باقی آدمیوں کو آپ اپنے اپنے گھروں کو جانے دیں، بے چارے لڑائی کے میدان سے واپس آ رہے ہیں۔

برگیڈیر نے کرنل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کرنل یہ جوان بات تو ٹھیک کرتا ہے۔"

ہاں سَر بات تو ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

ٹھیک ہے۔ ان دو جوانوں کو رکھ لو۔ مَیں سٹاف کیپٹن کو ابھی گارڈ کے لیے کہتا ہوں۔ گارڈ ان کو لے جا کر اے۔ ٹی (A.T) سنٹر والوں کے حوالے کر دے۔ اس کے بعد آپ لوگ بے شک اپنا سفر جاری رکھیں۔

بہت اچھا سَر۔ کرنل مجھے واپس لے کر ریلوے سٹیشن آ گیا۔ وہاں ابھی تک سب لوگ اسی طرح پریشان کن حالت میں کھڑے تھے۔

کرنل نے لیفٹیننٹ کیرانی کو آرڈر دیا کہ تم اپنے یہ دو جوان یہاں چھوڑ جاؤ، باقی آدمیوں کو اپنی منزلِ مقصود کی طرف لے جاؤ۔

کیرانی صاحب نے پہلے تو اکڑ فوں دکھائی کہ مَیں اپنے آدمیوں کو یوں چھوڑ کر ہرگز نہ جاؤں گا۔ لیکن کرنل کے سمجھانے بجھانے پر مان گیا۔ مجھے اور عزیز اکبر کو گارڈ والے اے۔ ٹی سنٹر میں لے گئے اور ٹرین راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئی۔

○

اے۔ ٹی۔ سنٹر میں ایک قیدی کیمپ تھا۔ جس میں سینکڑوں کی تعداد میں فوجی قیدی تھے۔ گارڈ والے ہم دونوں کو کیمپ کے انچارج جسے وہاں ہم دوست

(PROVOST) کیتے ہنٹنے کے حوالے کر کے ریڈ لے کر واپس سٹیشن ہیڈ کوارٹر چلے گئے
اس کیمپ میں قیدیوں کی نگرانی پر جو سنتری متعین تھے اُن میں سے ایک جس کا نام
محمد خان تھا ۔ میرا ہموطن نکلا ۔ وہ تلہ گنگ کے نزدیک کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا
محمد خان نے ہمیں بتایا کہ پرووسٹ دفتر چلا گیا ہے ۔ ابھی یہاں موجود نہیں ہے ۔
یہاں کا طریقۂ کار یہ ہے کہ جب بھی کوئی نیا قیدی اس کیمپ میں آتا ہے تو سٹاف
والے سب سے پہلے اس قیدی کو پرووسٹ صاحب کے سامنے پیش کرتے
ہیں ۔ پرووسٹ ایک نہایت ہی تنومند اور طاقتور آدمی ہے ۔ ہر نئے آنیوالے
کو بغیر کسی وجہ سے وہ پہلے تو اچھی طرح زدوکوب کرتا ہے اور اگر کوئی قیدی
احتجاج کرے یا اکڑ فوں دکھلائے تو اُسے پکڑ کر گرا لیتا ہے اور پھر لاتوں اور مکوں
سے بُری طرح پیٹتا ہے ۔

میں نے محمد خان کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے ہمیں قبل از وقت اس بات سے
آگاہ کر دیا ہے ۔ اب ہم دونو ذہنی اور جسمانی طور پر اس کی انٹرویو کے لیے تیار
ہو گئے ۔ کیمپ والے مجھے اور عزیز اکبر کو ایک سیل میں بند کر کے واپس چلے گئے ۔
اُس سیل میں پہلے سے ایک نحیف و نزار سا بنگالی جوان سال لڑکا بند تھا ۔ نہ جانے
بے چارا کس جُرم کی پاداش میں اس انجام کو پہنچا تھا ۔ وہ اُردو یا انگریزی دونو زبانوں
سے نا آشنا تھا ۔ میں اور عزیز اکبر گپ شپ کر رہے تھے کہ ایک آدمی ہم دونو کو
لینے کے لیے آگیا ۔

قیدی کیمپ کے چاروں طرف اونچی اونچی کانٹے دار تار لگی ہوئی تھی ۔ سیل دن
میں کھلے رہتے ۔ صرف رات کو بند کرتے تھے ۔ وہ آدمی ہم دونو کو لے کر کیمپ کے
اندر واقع پرووسٹ کے دفتر کے برآمدے میں لے آیا ۔ ہمیں کھڑا کیا ۔ اور خود اندر
اسے رپورٹ دینے کے لیے چلا گیا ۔ تھوڑی ہی دیر میں اس آدمی نے پرووسٹ
کے دفتر کے دروازے میں کھڑا ہو کر پہلے مجھے بُلایا ۔ پرووسٹ کافی خوفناک شکل و
صورت کا مالک تھا ۔ نہایت ہی گرانڈیل جوان تھا ۔ میں السلام علیکم کہہ کر ایک

طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے عقابی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔
ریلوے سٹیشن پر تم لوگوں نے لڑائی کی ہے۔
جی نہیں۔
کس نے کی ہے؟
گریشان ملٹری پولیس کے گورے سارجنٹ نے مجھے گالیاں دیں اور گریبان سے پکڑ کر کھینچا۔
اس وجہ سے تم نے ان صاحب لوگوں کو مارا۔
اپنی حفاظتِ خود اختیاری میں میں نے بھی ہاتھ پاؤں چلائے۔
بھئی۔ صاحب لوگوں کو مارتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔ کالے لوگوں کو تو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی ان کو مارنے لگ جائیں۔
صاحب لوگوں (گوروں) کو مارنے اور گالیاں دینے کا حق کس نے دیا ہے۔
دیکھو جوان۔ بحث مت کرو۔ فوج میں ماتحت لوگ، افسر لوگوں سے بحث نہیں کیا کرتے۔
میں بحث نہیں کر رہا۔ میں اپنے حقوق کے تحفظ کی بات کر رہا ہوں۔
ماتحت آدمی کے کیا حقوق ہوتے ہیں۔
اپنی عزتِ نفس اور جان و مال کی حفاظت۔
اگر اسی طرح کے حالات و واقعات تمہیں یہاں بھی پیش آئے تو پھر کیا کرو گے؟
بالکل اسی طرح یہاں بھی ری ایکٹ (RE - ACT) کروں گا۔
کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ تم میرا مقابلہ کر سکو؟
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آزما کر دیکھ لو۔
تم مجھے چیلنج کرتے ہو۔؟
چیلنج نہیں کرتا۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قانون کے دائرے سے ہٹ کر

اگر کسی نے بھی میرے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تو انشاء اللہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ میں اپنا دفاع کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔

کیا تو یہاں لڑنے کے لیے آیا ہے؟

ہرگز نہیں۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے بات کرنا چاہی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس سے کہا۔

یہ کیا طریقہ ہے۔ بات کرنا ہے تو دور ہٹ کر بات کرو۔ اگر تمہارے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال ہے تو تمہاری یہ خام خیالی ہے۔ یہاں قیدی کیمپ میں اور سنٹر میں تمہارا اچھا خاصا رعب داب بنا ہوا ہے اسے قائم رکھو۔ میں نے تو بڑے بڑے افسروں کی بھی کبھی بات نہیں سُنی۔

زیادہ باتیں مت بناؤ۔ جاؤ اپنے سیل میں۔

میں اُس کے دفتر سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔ میرے ساتھ پرووسٹ بھی باہر برآمدے میں آ گیا۔ عزیز اکبر کوئی لمبا تڑنگا جوان تو نہ تھا۔ لیکن اس نے علاقہ اعوان کاری کے اعوانوں کی طرح بڑی بڑی مونچھیں ضرور رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ خاصا بارعب آدمی دکھائی دیتا تھا۔ پرووسٹ اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔

دوسرا آدمی تو ہے جس نے ریلوے سٹیشن پر لڑائی کی تھی۔

جناب۔ میں ہی ہوں۔ عزیز اکبر نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

یہاں قیدی کیمپ میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا۔ آرام سے اپنے دن گذارنا۔ جاؤ۔ دونوں چلے جاؤ۔ ہاں ایک بات بتا دوں۔ کل سے تم دونوں بھی ورکنگ کے لیے باہر جایا کرو گے۔

عزیز اکبر چپ سادھے کھڑا رہا۔ میں نے پرووسٹ سے پوچھا۔
ہم نے کون سی ورکنگ پر باہر جانا ہے؟۔ ہم تو انڈر ٹرائل ہیں۔ قیدی تھوڑے ہیں۔
جو بھی ہو گا۔ موقعہ کے مطابق کام کرنا پڑے گا۔
میں نے آپ کو پہلے بتا دیا ہے کہ ہم سے قانون سے ہٹ کر کوئی غلط بات نہ کرو۔
قانون یہ کہتا ہے کہ قیدیوں کو پلنگوں پر سلاؤ۔
ہم قیدی نہیں ہیں۔ قیدیوں اور انڈر ٹرائل ملزموں میں فرق ہوتا ہے۔
زیادہ قانون مت چھانٹو۔ جاؤ اپنے سیل میں۔

۵

میں اور عزیز اکبر اپنے سیل میں لیٹے ہوئے تھے کہ انگریز ایڈ جوٹنٹ، صوبیدار میجر اور پرووسٹ ہمارے سیل کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ پرووسٹ نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو بتایا۔
سر یہ ہیں وہ جوان جنھوں نے ریلوے سٹیشن پر کیس کیا ہے۔ اب ان کو ورکنگ کے لیے کہا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم قیدی نہیں ہیں بلکہ انڈر ٹرائل ملزم ہیں۔ ہم ورکنگ نہیں کریں گے۔
اس ٹامی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ جوان تمھیں یہاں ورکنگ (بیگار) کرنا پڑے گی۔
کیمپ کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کریں گے لیکن اگر آپ کہیں ہم راشن کی بوریاں اٹھائیں۔ تو مجھے افسوس ہے یہ کام ہم ہرگز نہ کریں گے۔
تم کو یہ قانون کس نے بتایا ہے؟
میں خود جانتا ہوں۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔

سٹیشن ہیڈکوارٹر سے ایک رپورٹ تمہارے کیس کی جائے گی ایسا نہ ہو کہ ہمیں
بھی ایک اور رپورٹ تمہاری یونٹ کو بھیجنا پڑے۔

اگر ہم کوئی غلط کام کریں تو بے شک آپ ہماری رپورٹ بھیجیں۔

تم اپنی زبان کو لگام نہیں دے سکتے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری یہ بدزبانی ہی
تمہیں جگہ جگہ ذلیل و رسوا کروا رہی ہے۔ گورے کپتان نے برہم ہو کر کہا۔

سر۔ میں سچی بات کرتا ہوں۔ آپ اسے بدنامی سمجھتے ہیں۔

ایسی سچی بات کا کیا فائدہ جو تمہیں ہر جگہ افسروں کی نظروں میں ذلیل و رسوا
کرے۔

وہ سب کے سب قیدی کیمپ سے واپس دفتر کی طرف چلے گئے۔ کوئی بارہ
بجے کے لگ بھگ چار پانچ آدمی ٹرالیوں پر بڑے بڑے دیگچے رکھے قیدی
کیمپ میں آ گئے۔ سب قیدی اپنے اپنے میس ٹن (MESS TIN) اٹھا کر کھانا
لینے کے لیے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں اور عزیز اکبر بھی لائن میں کھڑے
ہو گئے۔ پرووسٹ ہم دونوں کے قریب آ کر کہنے لگا۔

تم لوگ آج آئے ہو۔ لنگر والوں کو تمہارا راشن کل شروع ہو گا۔ آج تم لوگوں کو
کھانا نہیں ملے گا۔

جناب پہلے تو ایسا کبھی فوج میں نہیں دیکھا کہ فوجی جوان محض اس وجہ سے
بھوکا رکھا جائے کہ آج اس کا نام راشن سٹیٹ میں شامل نہیں۔

بھئی تمہیں پتہ ہی ہے کہ راشن سٹیٹ ایک دن پہلے کوارٹر ماسٹر اسٹورز
میں چلی جاتی ہے۔

یہ بات تو پتہ ہے۔ لیکن ہمارے کھانے کا کچھ انتظام تو ہونا چاہیے۔

بھئی انتظام کہاں سے کریں گے جب تمہارا راشن ہی آج شروع نہیں ہوا۔

تو ہمارے کھانے کا کیا بنے گا؟

تم دونوں کو کل تک روزہ ہی رکھنا پڑے گا۔

روزے اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں رکھے جاتے ہیں۔ آپ کے عائد کردہ خود ساختہ قوانین اس کا جواز نہیں پیش کر سکتے۔

مَیں تم لوگوں سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کھانا تم دونوں کو آج نہیں ملے گا۔ کھانا تقسیم کرنے والے یہ بات چیت سُن رہے تھے۔ اب رہی سہی یہ اُمید بھی دَم توڑتی نظر آ رہی تھی۔

دوپہر کو ہمیں کھانا نہیں ملا۔ شام کو چائے نہیں ملی اور پھر رات کے کھانے سے بھی ہم محروم رہے۔ بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مَیں اپنے اس تلہ گنگ والے گرائیں کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئے تو ہمارے کھانے کا کوئی انتظام کرے۔ شام کو سورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ محمد خان رات کی ڈیوٹی کے لیے تیار ہو کر آ گیا۔ وہ میرے پاس آیا تو مَیں نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ مسکین طبیعت آدمی تھا۔ بے چارا سُن کر چُپ ہو گیا۔ مَیں نے اُسے کچھ پیسے دیے کہ وہ ہمیں سنٹر کی کینٹین سے کچھ کھانے کے لیے لا دے۔ ڈرتے ڈرتے پیسے اُس نے لے لیے اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

گرائیں! اگر پرووسٹ صاحب کو پتہ چل گیا تو وہ میرا ستیاناس کر دے گا۔

بھائی محمد خان۔ آپ کسی طریقے سے کچھ چیزیں لے آئیں اور ہمیں چھُپا کر دے دیں۔ ہم اسے چوری چھپے کھا لیں گے۔ رات کاٹنی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کل سے تو ہمیں سرکاری طور پر روٹی ملنا شروع ہو جائے گی۔

مشکل ہے۔ اس نے نہایت وثوق سے کہا۔

کیوں مشکل کیوں ہے! ہم گورنمنٹ کے ملازم نہیں ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کا کھانا پرووسٹ نے ایڈجوٹنٹ اور صوبیدار میجر کی ایما پر بند کیا ہے۔ وہ خود ایسا نہ کر سکتا تھا۔

کھانے کے بعد قیدیوں کی مکمل طور پر چیکنگ ہوئی اور پھر انہیں اپنے اپنے سیلوں اور بارکوں میں بند کر دیا گیا۔ سب کے تالے گارڈ کمانڈر لگاتا جا رہا تھا۔ مجھے اور عزیز اکبر

کو بھی بند کر دیا گیا۔ وہ ہمارا بنگالی ساتھی چُپ چاپ بیٹھا آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کبھی نہ آئیں گے اور آخر کار وہ مایوس ہو کر اپنے آپ کو وقت کے دھارے کے سپرد کر دے گا۔

اب باہر چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ محمد خان نے چپکے سے ایک لفافہ لوہے کے جنگلے سے اندر کرتے ہوئے کہا۔

گرائیں جلدی سے لے لو۔ اور مہربانی سے چھپا کر کھانا۔ بہتر ہو گا جب چیک کرنے والے واپس چلے جائیں تو تب کھانا تاکہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ آپ کو خورد و نوش کی چیزیں باہر سے لا کر فراہم کی گئی ہیں۔

بہت اچھا گرائیں آپ اطمینان رکھیں۔ ہم کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دیں گے۔

چیکنگ والے سب قیدیوں کو چیک کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ آخری بار پر دوست نے ایک چکر لگایا اور پھر وہ بھی کیمپ کے بڑے گیٹ سے نکل کر باہر چلا گیا۔ قیدی کیمپ میں جا بجا سنتری تعینات تھے۔ قیدیوں کی سیلوں اور بارکوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا اس میں مختلف قسم کی مٹھائیاں تھیں۔ میں نے عزیز اکبر کو بلایا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ میں نے کھانے کے لیے کچھ مٹھائی منگوا رکھی ہے میں نے بنگالی ساتھی کو بھی بلایا لیکن وہ ہمارے ساتھ شامل نہ ہوا۔ میں نے مٹھائی کے دو تین بڑے بڑے ٹکڑے اسے بھی دیے جو اس نے شکریے کے ساتھ لے لیے۔ مٹھائی کافی تھی۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھائی۔ تھوڑی سی بچ بھی رہی۔ اس طرح ہم نے پیٹ کے اس دہکتے ہوئے جہنم کو ٹھنڈا کیا اس کے بعد تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

دوسری صبح سب قیدیوں کو روٹین کے مطابق چائے پوری دینے والے آئے۔ انہوں نے ہمارے اس بنگالی ساتھی کو چائے اور پوری دی۔ نہ ہم نے

مانگی اور نہ انہوں نے اپنے طور پر ہی دی۔ میں سنتریوں کا یہ غیر انسانی رویہ دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا۔ میں سوچتا اِن کا کتنا ان ہیومن ایٹی چیوڈ (IN-HUMAN ATTITUDE) کتنا غیر انسانی اور بے دردانہ رویہ انہوں نے ہمارے خلاف روا رکھا ہے۔ ایسا تو ڈارک ایجز (DARK AGES) یعنی عہد قدیم میں بھی قیدیوں کے ساتھ سلوک روا نہ رکھا جاتا ہوگا۔ چہ جائیکہ عہد برطانیہ جس میں انگریز اپنے آپ کو دنیا کی مہذب قوم کہتے نہیں تھکتے۔ ان کے عہد حکومت میں ایسا انسانیت سوز سلوک اور وہ بھی اپنے سپاہیوں کے خلاف۔ میں جتنا سوچتا یہ مسئلہ اتنا اُلجھتا جا رہا تھا۔

چائے کے بعد سب قیدیوں نے بوسیدہ اور میلی کچیلی وردی پہن لی اور اپنے اپنے سیلوں اور بارکوں سے باہر آ کر چیکنگ (گنتی) کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد پرووسٹ بھی اپنے ہوا خواہوں کے جھرمٹ میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اور عزیز اکبر اپنے سیل کے اندر چلے گئے۔ پرووسٹ نے پورے قیدی کیمپ کا ایک چکر لگایا اور پھر ہمارے سیل کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ وہ تھوڑی دیر شاید اس اُمید پر کھڑا رہا کہ ہم اُٹھ کر اس کو سلام کریں گے۔ لیکن میں نے عزیز اکبر کو منع کر دیا تھا کہ پرووسٹ کی عزت اور تکریم کی خاطر ہرگز نہ اُٹھنا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا رہا اور پھر کھسیانا سا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ ایک کشادہ جگہ پر قیدیوں کو فالن کیا۔ ان کی حاضری لگائی اور پھر سنتریوں کی نگرانی میں ان کو کیمپ سے باہر ورکنگ (بیگار) پر بھیج دیا۔ زیادہ تر ورکنگ ریلوے سٹیشن پر سٹورز کی لوڈنگ اور ان لوڈنگ ہوتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کینہ پرور ہمیں بھی باہر بلائے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ بنگالی بابو اپنے طور پر ان کی روٹین کے مطابق سب کام احسن طریقے سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سب قیدی اپنے اپنے کاموں پر باہر چلے گئے تو میں اور عزیز اکبر بھی اپنے سیل سے باہر آ گئے۔

میں کیمپ کی کانٹے دار تار کے ساتھ کھڑا تھا کہ میں نے تھوڑی دُور واقع گراؤنڈ میں گھوڑے پر سوار ایک فوجی افسر کو ایکسر سائز (EXERCISE) کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کیمپ کے مین گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری سے پوچھا۔

گرائیں۔ یہ گھوڑے پر سوار افسر کون ہے۔

یہ سنٹر کے کمانڈنٹ صاحب ہیں۔

کیا نام ہے ان کا

کرنل اکبر خان۔ یہ پہلا مسلمان فل کرنل میں نے تو دیکھا ہے۔

کرنل صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں۔

چکوال شہر کا۔ میرا گرائیں ہے۔ میرا بھی گھر چکوال کے قریب ہے۔ اس سنتری نے بڑے ہی فخریہ انداز میں کہا۔

میں سنتری کے پاس سے ہٹ کر تھوڑی دُور تار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جب کرنل صاحب گھوڑا دوڑاتے ہوئے میرے سامنے سے گذرے تو میں نے تقریباً چیختے ہوئے بلند آواز سے ان کو آواز دی —— کرنل بابا اکبر خان۔ کرنل بابا اکبر خان۔

اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور گھوڑے کو روک لیا اور کیمپ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ کیمپ کی طرف سے کسی نے ان کو آواز دی ہے۔ اس زمانے میں کسی فوجی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کوئی فوجی اس قدر بے تکلفانہ انداز میں کسی اتنے بڑے افسر کو یوں بھی مخاطب کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے پھر اسی انداز میں آواز دی۔

کرنل بابا اکبر خان۔ کرنل بابا اکبر خان۔

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور قیدی کیمپ کے مین گیٹ پر آ گیا۔ میں بھا

وہاں پہنچ گیا۔ گیٹ پر ہم دو آدمی تھے۔ ایک سنتری تھا اور دوسرا میں۔
مجھے کس نے آواز دی ہے۔ کرنل صاحب نے ہم دونوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔
سر میں نے آواز دی ہے۔ میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔
تم کون ہو؟
سر میں ایک قیدی ہوں۔ کل صبح سٹیشن ہیڈکوارٹر والے مجھے اور میرے ایک ساتھی کو یہاں بند کر گئے ہیں۔
تم سٹیشن ہیڈکوارٹر میں کام کرتے ہو۔
نہیں سر۔ ہم سپیشل ٹرین سے راولپنڈی جا رہے تھے کہ ملٹری پولیس کے گوروں کے ساتھ ہماری لڑائی ہوئی۔
اچھا۔ اچھا۔ وہ تم ہو بریگیڈیر صاحب نے تمہارے متعلق مجھے بتایا ہے۔
اب کیا بات ہے مجھے کیوں بلایا ہے؟
سر کل صبح سے لے کر اب تک ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا گیا۔
کیوں۔ انہوں نے حیران کن نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
سر۔ کل۔ ایڈجوٹنٹ۔ صوبیدار میجر اور پرووسٹ میرے سیل میں آئے تھے۔ ایڈجوٹنٹ نے ان گوروں کی طرفداری کرتے ہوئے مجھے لعن طعن کی۔ میں اپنے دفاع میں اپنا موقف بیان کیا۔ جس پر وہ ناراض ہو کر میرے ساتھ الجھ پڑے۔
اچھا تو تم نے یہاں بھی جنگ شروع کر دی ہے۔
نہیں سر۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ ایڈجوٹنٹ نے سراسر زیادتی کی ہے۔ میں نے آپ کو بلانے کی جرأت اس لیے کی ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ فوج میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی غلطی کی پاداش میں کسی سپاہی کا کھانا پینا

ہی بند کر دیا جائے۔ یہ تو نہایت ہی غیر انسانی فعل ہے۔ یہ بات فوجی روایوں کے سراسر منافی ہے۔

کس نے تمہارا کھانا بند کیا ہے؟

سر آپ ان تینوں کو بلا کر پوچھ لیں۔

کمانڈنٹ صاحب نے سنتری کو کہا کہ گیٹ کھولو۔ سنتری نے گیٹ کھولا تو کرنل صاحب مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں آ گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور میرے لیے چائے اور پیسٹری منگوائی اور مجھ سے کہنے لگے۔

آپ پہلے ناشتہ کریں میں بعد میں آپ سے تفصیل سے بات سنوں گا۔

میں نے گرم گرم بڑی ہی مزیدار چائے پی اور نہایت لذیذ پیسٹریاں کھائیں تو جان میں جان آئی۔ میں چائے پی چکا تو بیرے نے برتن اُٹھائے۔ کمانڈنٹ صاحب مجھ سے پوچھنے لگے۔

آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

سر میرا گھر تحصیل تلہ گنگ میں ہے۔

آپ اعوان ہیں۔

جی جناب۔

آپ کا اور بھی کوئی عزیز فوج میں ملازم ہے؟

سر۔ ہم سپاہی پیشہ لوگ ہیں۔ فوج کے علاوہ اور کہیں ملازمت کرتے ہی نہیں۔

کہاں تک آپ کی تعلیم ہے؟

سر میں دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا کہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہوں۔

آپ کے کیس کی سرکاری طور پر تو مجھے رپورٹ موصول ہو چکی ہے۔ آپ بھی ذرا تفصیل سے ٹھیک ٹھیک حالات و واقعات سے مجھے آگاہ کریں۔

میں نے کمانڈنٹ صاحب کو تفصیل کے ساتھ مکمل داستان سنائی۔ وہ میری باتیں سُن کر بے حد متاثر ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے۔

بیٹا مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ آپ کا کیس چونکہ آپ کی یونٹ میں لڑائی سے ہوگا۔ اس لیے یہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے بیل (BELL) بجا کر ایڈجوٹنٹ کو بلایا۔ وہ اندر آیا اور اس نے مجھے کرسی پر کمانڈنٹ صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بڑی ہی رحم طلب نظروں سے کمانڈنٹ صاحب کو دیکھنے لگ گیا۔

ولی (ولیم) آپ اس جوان کو جانتے ہیں؟ کرنل صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

سر۔ جانتا ہوں۔

ان کا کھانا کس نے بند کیا ہے؟

ایڈجوٹنٹ کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ چُپ سادھے کھڑا رہا۔ کمانڈنٹ صاحب نے اردلی کو کہا کہ صوبیدار میجر صاحب کو بُلا کر لے آؤ۔ صوبیدار میجر آیا اور اس نے جب مجھے کمانڈنٹ صاحب کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھا اور ایڈجوٹنٹ کو یوں پریشان حال دیکھا تو وہ بھی گھبرا سا گیا۔ کرنل صاحب نے اس سے پوچھا۔

صوبیدار میجر صاحب۔ آپ اس جوان کو جانتے ہیں!

جانتا ہوں جناب عالی۔

کون ہے یہ؟

حضور! یہ ایک نمبر کا بدمعاش سپاہی ہے۔ کل اس نے ریلوے سٹیشن پر بہت بڑا ہنگامہ کیا ہے۔ پورے سٹیشن پر اس نے ایک افراتفری کا عالم برپا کیے رکھا۔ سکھ رجمنٹ کی ایک کمپنی امن و امان قائم کرنے کے لیے وہاں گئی۔ انہوں نے ان کے ڈبے کو چاروں طرف سے گھیرا دے کر اس کو اور اس کے دوسرے ساتھی کو بڑی مشکل سے قابو کیا۔ ورنہ یہ بھی مسلح تھے۔ جانی نقصان ہو جانے کا بڑا

احتمال تھا۔

صوبیدار میجر صاحب آپ ریلوے سٹیشن پر موجود تھے اور کیا آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

جناب عالی! میں موجود تو نہ تھا لیکن سٹیشن ہیڈ کوارٹرز والوں نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔

آپ نے اس کی بات بھی سنی ہے۔

جناب عالی!۔ اس کی بات سننے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ڈسپلنگ (ڈسپلن) کے خلاف بات ہے۔

اچھا تو آپ نے ان کا کھانا بند کر کے اچھے ڈسپلن کا نمونہ پیش کیا ہے۔

جناب عالی! کھانا میں نے تو نہیں بند کیا۔ یہ تو جٹین (ایڈجوٹنٹ) صاحب کا حکم تھا۔

اچھا آپ سن لیں۔ یہ دونوں حوالدار میس (MESS) سے کھانا کھائیں گے۔ بہتر ہے آپ ان کا کھانا مقررہ وقت پر ان کو کیمپ میں بھجوا دیا کریں۔

بہت اچھا حضور۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ مجھے تو جو بھی حکم ملے گا۔ میں تو وہی بجا لاؤں گا۔

اچھا آپ لوگ جائیں۔ ایڈجوٹنٹ اور صوبیدار میجر دونوں وہاں فوراً سیلوٹ کر کے باہر نکل گئے۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد کمانڈنٹ صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

بیٹا۔ آپ صرف چند روز یہاں رہیں گے۔ پھر آپ کی یونٹ اسکورٹ (ESCORT) یہاں سے آپ کو اپنی یونٹ میں لے جائے گا۔ آپ اتنے دن کسی کے ساتھ مزید جھگڑا وغیرہ نہ کریں۔ تاکہ مجھے اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے ندامت نہ اٹھانا پڑے۔

سر۔ آپ اطمینان رکھیں انشاء اللہ آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہ دوں گا۔

کمانڈنٹ صاحب نے ہیڈ کلرک کو بلایا اور اسے حکم دیا۔

صاحب! کل سے یہ جوان آپ کے ساتھ میرے دفتر میں کام کرے گا۔ ہیڈ کلرک پھر مجھے اپنے ساتھ لے کر کرنل صاحب کے آفس سے باہر آ گیا۔

## ۵

مَیں صبح ناشتہ کر کے بٹالین آفس میں آ جاتا تھا۔ ایک بجے تک وہاں کام کرتا اور پھر حوالدار میس سے کھانا کھا کر اپنے سیل میں خود ہی چلا جاتا۔ مجھے جب باہر آنا ہوتا آتا تو مین گیٹ کے سنتری کے لیے یہ سٹینڈنگ آرڈر تھا کہ وہ میرے لیے گیٹ کھول دیتا۔ مَیں کسی سنتری کی نگرانی کے بغیر سنٹر میں پھرا کرتا تھا۔ کینٹین میں جاتا تھا۔ حوالدار میس کھانا کھانے جاتا۔ اس کے بعد پھر کبھی کسی نے مجھ سے باز پرس نہ کی۔ عزیز اکبر اپنے سیل میں سویا رہتا تھا۔ حوالدار میس سے اس کے لیے بھی ناشتہ اور کھانا آتا تھا۔ اس معمولی سے واقعہ کے بعد پھر کسی پرووسٹ نے، کسی ایڈجوٹنٹ نے یا کسی صوبیدار میجر نے مجھ تعرض نہ کیا کہ میاں تم کون ہو۔ کہاں پھرتے ہو۔ قیدی کیمپ سے نکل کر کہاں جاتے ہو۔؟

ایک دن مَیں ہیڈ کلرک صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک موٹا سا حوالدار اور تین سپاہی وہاں آئے۔ سپاہی دروازے کے ساتھ رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے اور وہ موٹا حوالدار ہیڈ کلرک صاحب کے پاس آیا۔ سیلوٹ کیا اور ایک لفافے میں بند ایک سرکاری خط ان کو دیا۔ انہوں نے کھول کر پڑھا۔ ہلکا سا مسکرائے اور وہ خط میری طرف بڑھا دیا۔ مَیں نے پڑھا تو مَیں بھی جواباً مسکرا دیا۔ ہیڈ کلرک صاحب نے مجھ سے کہا۔

آپ اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں۔

ٹھیک ہے سر۔ آپ اس لیٹر پر لکھ دیں کہ یہ آدمی آج شام کو اپنی یونٹ میں جائیں گے۔ ان کا موومنٹ آرڈر ایشو کیا جائے ــــــ ہیڈ کلرک نے میرے کہنے کے مطابق اس چٹھی پہ لکھ دیا۔

وہ چھٹی میں نے ایک کلرک کو موومنٹ آرڈر جاری کرنے کے لیے دی۔ ساتھ ہی میں نے اس سے کہا کہ آج رات کی گاڑی سے ہم لوگ اپنی یونٹ کو جائیں گے اس کے بعد کوہاٹ سے آئے ہوئے ان آدمیوں کو میں کینٹین پہ لے گیا۔ وہاں ان کو پر تکلف چائے پلائی اور پھر میں ان کو حوالدار میجر کے پاس چھوڑ آیا اور میں واپس اپنے سیل میں آ گیا۔

شام کو چار بجے پرووسٹ حوالدار میجر اور کوہاٹ سے آئی ہوئی گارڈ ہمیں لینے کے لیے قیدی کیمپ میں آئے۔ سنتری نے مین گیٹ کھولا اور وہ سب پرووسٹ کے دفتر کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی مجھے اور عزیز اکبر کو بلانے کے لیے آیا۔ اس نے کہا کہ آپ دونوں اپنا تمام سامان لے کر تیار ہو کر پرووسٹ صاحب کے دفتر میں آ جائیں۔ آپ کو یونٹ سے گارڈ لینے کے لیے آ گئی ہے۔ میں اور عزیز اکبر پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ وردی پہنی ہوئی تھی۔ اپنا سامان اٹھا کر اس آدمی کے ساتھ پرووسٹ کے دفتر میں پہنچ گئے۔ ہم نے اپنا سامان ایک طرف کو رکھا۔ پرووسٹ نے اس موٹے حوالدار کو کہا۔

یہ ہیں آپ کے قیدی۔ اس موٹے حوالدار نے مجھے دیکھا تو حیران کن نظروں سے مجھے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس نے پرووسٹ سے کہا۔ سر یہ قیدی ہے؟ اسی نے تو ہمیں کمانڈنٹ صاحب کے دفتر میں ریسیو کیا اور پھر ہماری بڑے اچھے طریقے سے خاطر مدارت کی۔

یہی دونوں آپ کے قیدی ہیں۔ اب آپ ان کو ہتھکڑیاں لگائیں تاکہ ڈیوٹی ٹرک آپ کو سٹیشن پہ چھوڑ آئے۔

نہیں ان کو ہتھکڑیاں نہیں لگاؤں گا۔ موٹے حوالدار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

یہ تو صرف قانون کی بات ہے۔ ہتھکڑیاں تو آپ کو لگانا ہی پڑیں گی۔ ورنہ اگر بغیر ہتھکڑیوں کے آپ ان کو لے کر گئے اور ایڈجوٹنٹ نے دیکھ لیا تو آپ سب پہ مصیبت آ جائے گی۔

آجائے جو مصیبت آئی ہے۔ یہ اتنا اچھا آدمی ہے۔ یہ دوسری کور کا آدمی تھا۔ اور آپ کے سنٹر میں کھلا پھرتا رہتا تھا۔

وہ تو کمانڈنٹ صاحب کا حکم تھا۔

میرے سمجھانے بجھانے پر وہ موٹا حوالدار مان گیا اور اس نے دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دیں لیکن اتنی شرافت پھر بھی برتی کہ ہمارا سامان اپنے سپاہیوں سے اٹھوایا۔ مین گیٹ کے باہر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن آگئے۔ اس وقت ملٹری پولیس والے گورے جن کی ہم نے پٹائی کی تھی، وہاں ڈیوٹی پر تھے۔ وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ ہماری طرف معنی خیز انداز سے دیکھ کر مسکرا اٹھتے۔ وہ فاتحانہ انداز میں اکڑ اکڑ کر ہنٹر گھماتے ہوئے پلیٹ فارم کی دوسری سمت چلے گئے۔

## ۵

شام کو سات بجے کے قریب گاڑی چلی۔ یہ گاڑی دہلی سے پشاور جا رہی تھی۔ دوسری صبح ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔ جب جالندھر ریلوے سٹیشن سے گاڑی چلی تھی تو اس موٹے حوالدار نے ہم دونوں کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ راولپنڈی سے ہم نے گاڑی تبدیل کرنا تھی۔ کوہاٹ کے لیے اب شام کو سات بجے گاڑی نے روانہ ہونا تھا۔ ہم نے اپنا سامان اتارا۔ پلیٹ فارم پر لگے ہوئے ایک نل پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر ریلوے ٹی سٹال پر ناشتہ کرنے کے لیے چلے گئے۔ اس حوالدار نے ہماری نگرانی پر کسی بھی سپاہی کو متعین نہ کیا تھا۔ مجھے اس کی شرافت کا بڑا خیال تھا کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے اس شریف آدمی پر کوئی آنچ آئے۔

شام تک ہم لوگ صدر بازار اور راجہ بازار کے چکر لگاتے رہے۔ کوہاٹ کی گاڑی پنڈی سے رات کو چل کر صبح چار بجے کوہاٹ پہنچتی تھی۔ چنانچہ ہم شام کو سات

بجے اس گاڑی میں سوار ہو کر چار بجے کوہاٹ چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچے۔ اب میں نے احتیاطاً حوالدار امیر زمان (موٹا حوالدار) کو کہا کہ اب آپ احتیاط برتیں اور ہمیں ہتھکڑیاں لگا لیں۔ اس نے شرماتے ہوئے بے دلی سے یہ فرض ادا کیا۔ اس نے سٹیشن ماسٹر کے دفتر سے اپنے بٹالین آفس میں گاڑی کے لیے ٹیلی فون کیا اور پھر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ایک فوجی گاڑی ہمیں لینے کے لیے وہاں پہنچ گئی ہم سب اس میں سوار ہو کر تھوڑی دیر کے بعد میکوئین لائینز میں پہنچ گئے۔ جو کوہاٹ سے بالکل متصل ہیں۔ گاڑی کوارٹر گارڈ کے سامنے جا کر رکی۔ ہم سب گاڑی سے اتر کر کوارٹر گارڈ کے اندر چلے گئے۔ حوالدار امیر زمان نے ہمیں گارڈ کی تحویل میں دیا اور خود لیونے لائینز میں چلا گیا۔ گارڈ کمانڈر نے ایک سیل کا دروازہ کھول کر ہم دونوں کو اندر بند کر دیا اور خود گارڈ روم میں واپس چلا گیا۔

## ۵

فوج کا یہ دستور ہے کہ صبح افسر صاحبان کے یونٹ میں آنے سے پہلے ڈیوٹی والا سردار یا صوبیدار میجر کوارٹر گارڈ کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ صفائی ستھرائی دیکھتے ہیں۔ گارد کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دن بھی صوبیدار میجر روٹین کے مطابق کوارٹر گارڈ آیا۔ گارڈ کمانڈر نے اس کو بتایا کہ جو لندھر سے جن قیدیوں نے آنا تھا وہ آگئے ہیں۔ اور وہ صوبیدار میجر کے ساتھ ہمارے سیل کا دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

صوبیدار میجر نے ہم سے سرسری سی گفتگو کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ صوبیدار میجر بڑا جہاندیدہ اور گھاگ قسم کا سردار ہے۔ وہ چلا گیا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک پٹھان قسم کا موٹی مونچھوں والا حجام کوارٹر گارڈ میں آوارد ہوا جو خاصا کم عقل اور بدتمیز تھا۔ وہ آتے ہی گارڈ کمانڈر سے کہنے لگا۔

کہاں ہے خو وہ نیا قیدی؟

کیوں خان صاحب کیا ہو گیا ہے۔ گارڈ کمانڈر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

ہم اُس کا سر خود روڈا کرے گا۔

گارڈ کمانڈر نے سیل کا دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی ایک ماہر قصائی کی طرح میرا جائزہ لیا اور پھر نہایت ہی بدتمیزی سے مجھے کہنے لگا۔

جلدی کرو۔ تمہارا سر خود روڈا کرنا ہے۔

خان صاحب میں تو سر روڈا نہیں کرواتا۔ میں نے جان بوجھ کر مسکین بنتے ہوئے کہا۔

مارڈا۔ کیسے نہیں کرواتا۔ تمہارا باپ بھی کروائے گا۔

میری یہ عادت ہے کہ جب کوئی شخص اس طرح عقل سے عاری ہو کر باتیں کرے تو میں اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرتا ہوں تاکہ اس نے جس قدر تندخوئی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرنا ہے، اچھی طرح کرے۔ اس نے جونہی یہ بات کی میں آہستہ سے لکڑی کے ایک تخت جس پر میرا بستر لگا ہوا تھا اس سے اُٹھ کر اس حجام کے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر زور کا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

بال کاٹنے دے گا یا یونہی بے وقوفی کا مظاہرہ کرتا رہے گا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کی لمبوتری داڑھی پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ اس کے سر کے پچھلی طرف رکھ کر اس کی گردن یوں مروڑی کہ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اُوپر سے میں نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی کوئی تواضع کی۔ اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گارڈ کمانڈر دوڑ کر آ گیا۔ میں حجام محترم کی چھاتی پر سوار تھا کہ گارڈ کمانڈر نے مجھے کھینچ کر اُتارا۔ حجام صاحب نے اسی میں عافیت سمجھی فوراً دم دبا کر وہاں سے بھاگا۔ اس کے لب و لہجے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ جاتے ہوئے مجھے گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ اگر میں کوارٹر گارڈ میں پابند نہ ہوتا تو اس کے پیچھے جا کر پھر پکڑ کر اُسے اچھی طرح زدوکوب کرتا

گارڈ کمانڈر مجھ سے کہنے لگا۔ نیک بخت آدمی آپ کو پتہ نہیں۔ یہ نائی

کرنل صاحب کا خاص الخاص آدمی ہے۔

کیا یہ کرنل صاحب کا سالا ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں گارڈ کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بھئی۔ سالا کس نے کہا ہے۔ کرنل انگریز ہے۔ یہ کم بخت پٹھان ہے۔ کرنل ہماری اس یونٹ میں آنے سے پہلے فرنٹیر کنسٹیبلری میں تھا۔ یہ نائی بھی اس کے ساتھ وہاں تھا۔ یہ کرنل صاحب کے لیے وہاں سی۔ آئی۔ ڈی کا کام کرتا ہے۔ کرنل کو اس کی کارکردگی اتنی پسند تھی کہ جب وہ اس یونٹ میں بطور کمانڈنگ آفیسر کے پوسٹ ہوکر آیا تو اس حجام کو بھی اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ یہاں بھی یہ وہی کام کرتا ہے۔ یونٹ کی چھوٹی سے چھوٹی بات یہ کرنل صاحب کو جاکر بتاتا ہے۔ پوری یونٹ کے سردار صاحبان اور دوسرے سب لوگ اس سے خائف رہتے ہیں۔ لیکن کیا کریں۔ مجبوری کے باعث ملازمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ کرنل کی نظر میں اس کے مقابلے میں کسی کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ اس حجام کے سامنے پوری یونٹ میں کوئی آدمی بھی دم نہیں مار سکتا۔ اسے اگر کوئی آدمی نائی یا حجام کہہ دے تو یہ اس کے گلے پڑ جاتا ہے۔ یہ کہتا ہے میں نے باربر شاپ کا کنٹریکٹ لیا ہوا ہے۔ مجھے کنٹریکٹر صاحب کہہ کر بلایا کرو۔ بے چارے ڈر کے مارے سب لوگ اس بدتمیز حجام کو کنٹریکٹر صاحب ہی کہتے ہیں۔

ابھی آپ دیکھ لینا۔ آپ نے اس کو مارا ہے۔ اس واقعہ کی اطلاع صوبیدار میجر سے پہلے کرنل کو پہنچ جائے گی۔

میں نے گارڈ کمانڈر سے کرنل کا نام پوچھا۔

کرنل کا نام پراوڈ لک (PROUD - LUCK) ہے۔ گارڈ کمانڈر کی نظر باہر کی طرف اٹھی۔ تو وہ گھبرا گیا۔ حواس باختہ ہوکر کہنے لگا۔

"لو وہ کرنل صاحب آرہے ہیں۔"

میں نے کوارٹر گارڈ کی کھڑکی کے شیشے سے دیکھا تو ایک لمبا تڑنگا سا آدمی شکل وصورت سے تو انگریز معلوم ہوتا تھا لیکن جو لباس اس نے زیبِ تن کیا ہوا تھا اس سے وہ ایک ٹپیکل (TYPICAL) پٹھان نظر آرہا تھا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص۔ پاؤں میں موٹے تلے کی کوہاٹی چپل۔ سر پر طرّہ دار پگڑی۔ میں نے اُسے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نہایت ہی بے وقوف انگریز ہو گا۔ وہ کوارٹر گارڈ کے سامنے سے گذرتا ہوا دفتر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار میجر گھبرایا ہوا کوارٹر گارڈ آیا اور آتے ہی ہمارے سیل کے سامنے کھڑا ہو کر مجھ سے کہنے لگا۔

پھر کیا نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے تم نے۔ پہلے کچھ کم گل کھلا کر آئے ہو۔ کیا وہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ جو تم پیچھے کرتے چلے آئے ہو۔

سر کیا ہو گیا ہے۔ کہیں آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑا۔ میں نے غیر سنجیدہ ہو کر اُسے جواب دیا۔

کچھ ہوا ہی نہیں۔ تم نے باربر شاپ کے کنٹریکٹر کو بڑی طرح زدوکوب کیا ہے اس نے کرنل صاحب کے پاس جا کر ڈائریکٹ رپورٹ کر دی ہے۔

سر۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اگر میری غلطی ثابت ہو گئی تو مجھے سزا مل جائے گی۔

بس تم زندگی بھر سزائیں ہی کاٹتے رہنا۔ کوئی زندگی میں اچھا کام نہ کرنا۔

سر میں تو اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ لیکن جنابِ عالی! میں کیا کروں میری سیاہ بختی میرے ساتھ رہتی ہے۔

بھئی۔ اس میں قسمت کا کیا قصور ہے۔ تم جہاں بھی جاتے ہو تمہیں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ تم میں برداشت کا مادہ ہی نہیں۔ ذرا سی بات بھی ہو جائے تو تم اس کو پہاڑ بنا لیتے ہو۔ اچھا چھوڑو اس بحث مباحثہ کو۔ تم اپنی پیشی کی تیاری کرو۔ تم دونوں کی پیشی آج ہی کرنل صاحب کے سامنے ہو گی۔ اس

کیس سے پہلے کے تین کیسوں کی رپورٹیں بھی تمہاری آئی ہوئی ہیں۔
صوبیدار میجر مجھے بتلا کر چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے گارڈ کمانڈر کو کہہ گیا کہ ان جوانوں کو جلدی سٹاف پریڈ کے لیے تیار کر لینا۔ گارڈ کمانڈر ہمارے سیل کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور میری کارکردگی دیکھتا رہا۔ اس نے ایک آدھ دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے کوئی لفٹ نہ دی اور وہ کھسیانا سا ہو کر گارڈ روم کی طرف واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حوالدار میجر مجھے دفتر لے جانے کے لیے آیا اور جلدی جلدی کی رٹ لگانے لگ گیا۔ میں نے اُس سے ترش روئی سے بات کرتے ہوئے کہا۔
میجر! تیار ہو رہا ہوں۔ کوئی مشین تو نہیں لگی ہوئی۔
بس اس کی اتنی ہی اکڑ فوں تھی۔ اس کے بعد وہ پھر نہیں بولا۔ یونٹ کا بچہ بچہ ہمارے حالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ ہم سے کوئی بھی اونچی آواز میں بات کرنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ گارڈ کمانڈر نے حوالدار میجر کو اپنے پاس بلایا اور سگریٹ پیش کیا۔ وہ دونوں سگریٹ پیتے رہے اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتے رہے مجھے یقین تھا کہ یہ ہمارے متعلق ہی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے ان کی کسی بھی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ میں اور عزیز اکبر دونوں تیار ہو گئے۔ میں نے حوالدار میجر کو کہا۔

میجر! اب ہم تیار ہیں۔ جہاں لے جانا ہے۔ لے جائیے۔
گارڈ کمانڈر اور میجر حوالدار دونوں ہمارے سیل کی طرف لپک کر آئے۔ جلدی سے دروازہ کھولا اور ہم باہر آ گئے۔ میں نے حوالدار میجر سے کہا۔
کوئی سنتری یا سکیورٹی وغیرہ تو بلا لیتے۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہم دونوں کو سیدھا بٹالین آفس ہی لے آیا۔ ایڈجوٹنٹ باہر برآمدے میں آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا۔ ابھی تک تمہارے وہی طور طریق ہیں جو جبل پور میں تھے۔ تم نے اپنی یہ لڑائی بھڑائی والی عادت ابھی تک نہیں چھوڑی۔

تم دونوں کی بہت سی رپورٹیں آئی ہوئی ہیں۔ ان رپورٹوں سے کرنل صاحب اتنے ناراض نہ تھے بلکہ کہتے تھے کہ میری یونٹ میں دو بہادر آدمی آرہے ہیں۔ آج جو تم نے بار بر کو بُری طرح مارا ہے۔ کرنل صاحب تمہاری اس حرکت سے بہت ناراض ہیں۔

سَر۔ ناراض ہیں تو پھانسی پر تو نہیں چڑھا دیں گے۔ قانون۔ کے مطابق جو سزا ہو گی۔ بے شک دیں۔ معمولی بات ہے۔

زندگی بھر تم نے کبھی سنجیدگی سے نوکری کی ہی نہیں۔ نہ زندگی بھر تمہارے ساتھ ہی مس ہیپ (MISS - HAP) ہوتے رہیں گے۔

یہ ایڈجوٹنٹ میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں اکٹھے سپاہی رہے تھے۔ یہ دوست کی حیثیت سے مجھ سے کھلی باتیں کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مجھ سے جو بھی کہے گا۔ میں اس کی باتوں کا بُرا نہ مناؤں گا۔

ایڈجوٹنٹ اندر کرنل کو رپورٹ دینے کے لیے چلا گیا۔ صوبیدار میجر اور حوالدار میجر دونوں ہمارے ساتھ باہر برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایڈجوٹنٹ نے باہر جاتے ہوئے صوبیدار میجر سے کہا۔

صاحب کیس کو مارچ کر کے اندر لے آئیں۔ صوبیدار میجر ہمیں اندر لے گیا۔

کرنل نے ہماری سب رپورٹیں ہمیں پڑھ کر سنائیں۔ جالندھر کا واقعہ اور پھر آج کا واقعہ خصوصیت سے بیان کیا۔ پھر عزیز اکبر کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ عزیز اکبر بے چارا مونچھوں کی وجہ سے پکڑا گیا۔ کرنل نے سمجھا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا اسی مونچھوں والے کا ہے۔ صوبیدار میجر نے کرنل کو بتایا۔

سَر یہ سب کارستانیاں اس دوسرے آدمی کی ہیں۔ اصل شرارت تو اس آدمی کی ہے۔ کرنل بے وقوف قسم کا آدمی تھا۔ مفت میں میرے ساتھ اُلجھ پڑا۔ آخر کار مجھے اس سے کہنا پڑا۔

سر آپ میری بات بھی تو سنیں۔ آپ نے یک طرفہ طور پر باتیں سن کر اثر قبول کر لیا ہے۔ اُسے میری یہ بات کرنا بہت ہی ناگوار گذرا۔ ایڈجوٹنٹ کو کہنے لگا۔
کیپٹن آج ہی ان دونوں کی سمری آف ایوی ڈینس۔ SUMMARY OF EVI. DENCE ریکارڈ کرائیں اور کل تک میرے سامنے پیش کریں۔ میں کل ہی ان کا سمری کورٹ مارشل کر کے ان کی کارستانیوں کا مزہ اِن کو چکھاتا ہوں
" صوبیدار میجر صاحب کیس مارچ آف۔"
صوبیدار میجر ہم دونوں کو مارچ کر کے باہر برآمدے میں لے آیا۔
ایڈجوٹنٹ نے اسی وقت کیپٹن شاہانی کے نام ہماری سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ اور حوالدار میجر اسکورٹ کی نگرانی میں ہم دونوں کو واپس کوارٹر گارڈ ہمارے سیل میں چھوڑ گیا۔
تھوڑی دیر ہی گذری ہوگی کہ ایڈجوٹنٹ کوارٹر گارڈ میں میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔
تم اپنے لیے کیپٹن شیخ کو وکیل مقرر کرائے جانے کی استدعا کرنا۔ چونکہ سمری کورٹ مارشل میں وکیل کی کارکردگی مروجہ قوانین کے تحت محدود ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے وکیل کو (ACCUSED FRIEND) ملزم کا دوست مددگار۔ طرفدار یا حمایتی کہتے ہیں۔ جو اس کی طرف سے کیس کی پیروی صرف اس حد تک کرتا ہے کہ وہ ملزم کو گواہان پر جرح کرنے کے لیے، چپکے سے اس کے کان میں پوچھے جانے والے سوالات بتاتا ہے۔ یا اگر کوئی سوال کورٹ ملزم پر کرے تو اس کا جواب ملزم کو بتائے۔ اُسے نہ تو گواہان پہ جرح کرنے اور نہ ہی بیانات ریکارڈ کرانے کی اجازت ہوتی ہے۔

## ۵

کیپٹن شاہانی ایک متعصب اور کٹر ہندو تھا۔ جو کراچی کا رہنے والا

تھا۔ میں نے اس زمانے میں فوج میں دیکھا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ سب سے زیادہ تعصب ہندو برتتے تھے۔ لیکن بنگالی اور مدراسی ہندو اتنے متعصب نہ تھے۔ سکھ، پنجابی ہونے کے ناطے سے پنجابی مسلمانوں کے ساتھ رواداری سے پیش آتے تھے۔ لیکن ان کے مقابلے میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک روا رکھتے تھے۔ البتہ ایک بات ضرور تھی۔ وہ آپس میں علاقائی عصبیت کا بُری طرح شکار تھے۔ جو اپنے اپنے گرائیوں (ضلع والوں) کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔

حوالدار میجر مجھے اور عزیز اکبر کو سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کروانے کے لیے کیپٹن شاہانی کے دفتر میں لے گیا۔ کیپٹن شاہانی۔ ایک بدمزاج اور تندخو افسر تھا۔ سب انڈین رینکرز اُس سے ڈرتے تھے۔ مجھے اپنے جاننے والوں اور بہی خواہوں نے بتا دیا تھا کہ اس سے بات چیت محتاط انداز میں کریں۔ میں نے عزیز اکبر کو سب قانونی موشگافیاں سمجھا دی تھیں۔ میں چونکہ پہلے کلرک رہ چکا تھا اس لیے انڈین آرمی ایکٹ اور اس سے متعلقہ قوانین اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے عزیز اکبر کو کہہ دیا تھا کہ آپ سے اگر ان کیسوں کے متعلق پوچھیں تو آپ سرے سے انکار ہی کر دیں۔ کہ "ہم نے ایسا کسی بھی جگہ، کسی مرحلہ پر بھی نہیں کیا۔" اور یہ سب کچھ غلط ہے۔ بات دھیمے لہجے میں کریں۔

ہمیں کیپٹن شاہانی نے اپنے دفتر کے اندر بُلا لیا۔ اپنی میز کے سامنے ہمارے بیٹھنے کے لیے ایک بنچ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اس بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر وہ انڈین آرمی ایکٹ کی ضخیم کتاب کے ورق اُلٹتا پلٹتا رہا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ حضرت ملٹری لا (MILITARY LAW) سے قطعاً کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر اس نے وہ آرمی ایکٹ کی کتاب بند کر دی اور فائلوں میں لگی ہوئی مختلف رپورٹیں جو ہمارے خلاف جالندھر سے آئی ہوئی رپورٹ نکال کر ہمیں پڑھ کر سنائیں۔ جب وہ سب رپورٹیں ہمیں پڑھ کر سنا چکا تو

اس نے ہمیں ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ انگریزوں کا یہ غلام اس بیوقوف کرنل کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ حالانکہ اُسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ جب وہ رپورٹیں پڑھ کر ہمیں سُنا چکا تو پھر کہنے لگا۔

اب میں تم لوگوں کے بیانات قلم بند کروں گا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا۔ احمد تم نے نمبر ۹۶ ٹرانزٹ کیمپ میں دنگا فساد کیا تھا۔ اور صوبے دار میجر اور سٹاف کے لوگوں کو گالیاں دی تھیں۔

نہیں جناب۔ یہ سب غلط ہے۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور ان لوگوں کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ اس نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح بڑے غضبناک لہجے میں یہ بات کی۔

سر کون کہتا ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ وہاں کیا ہے۔

وہاں سے جو رپورٹ آئی ہے وہ کہتی ہے۔

سر۔ رپورٹ تو اس وقت تک ویلڈ (VALID) نہیں ہے جب تک جس آدمی نے یہ رپورٹ درج کرائی ہے۔ وہ یہ بیان آپ کے سامنے زبانی آکر نہیں دیتا۔

تم ہم کو قانون پڑھانے کے لیے آگیا ہے۔

نہیں سر۔ قانون پڑھانے کی بات نہیں ہے۔ یہ ایوی ڈینس ایکٹ (EVIDENCE ACT) کے مندرجات ہیں۔

تم زبان بند رکھو۔ میں جو کچھ پوچھتا ہوں۔ وہ بتاؤ۔

بہت اچھا سر۔

اچھا بتاؤ۔ جالندھر ریلوے سٹیشن پر کیا واقعہ ہوا تھا؟

سر۔ مجھے تو کچھ علم نہیں۔

باربر شاپ کے کنٹریکٹر کو کس نے مارا۔؟

سر۔ اس کی بھی مجھے کچھ خبر نہیں۔

پھر اُس نے یہ سب باتیں عزیز اکبر سے ایک ایک کر کے پوچھیں۔ عزیز اکبر

نے توقع سے بڑھ کر جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ہر بات میں میری تائید کی۔ کیپٹن شاہانی آگ بگولہ ہو کر اپنی آگ میں خود ہی جلنے لگا۔

کیپٹن شاہانی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ تم کو یہ سب باتیں کس نے پڑھائی ہیں؟

کسی نے بھی نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ حقیقت ہے اور سچی بات کہنے کے لیے کسی لگی لپٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تُو تو مجھے چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ اس نے برہمی اور بیزاری کے لہجے میں کہا۔

سر آپ کو ایسی باتیں کہنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی نے کیس میں ملوث ہو جاؤں۔

تم ہم کو دھونس دیتا ہے۔

میں نے کوئی دھونس نہیں دی۔ الٹا آپ مجھے گالی دے رہے ہیں۔ آپ کو گالی دینے کا حق کس نے دیا ہے؟

ٹھیک ہے ہم انکوائری کلوز کرتا ہے۔ ہم کرنل صاحب کو تمہارے متعلق مکمل رپورٹ لکھ دے گا۔

بالکل ٹھیک ہے جناب۔

حوالدار میجر ہم دونوں کو وہاں سے اٹھا کر کوارٹر گارڈ واپس لے آیا۔ اور آتے ہی کال سیل میں بند کر دیا۔ آج میں نے پہلی دفعہ دیکھا کہ عزیز اکبر کچھ بیزار سا لگ رہا تھا۔ شاید اس کا حوصلہ پست ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

کیوں عزیز اکبر آج تم مجھے کچھ گھبرائے ہوئے اور پریشان سے نظر آ رہے ہو؟

نہیں گھبرایا تو نہیں ہوں۔ قدم قدم پر آپ نئی مشکلات پیدا کرتے جا رہے ہیں۔

کیوں حضور۔ خیریت تو ہے۔ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔

ملک صاحب آپ نے اس سندھی کپتان سے بھی بگاڑ پیدا کر لیا ہے۔ اس نے اگر ہمارے متعلق لکھ کر کرنل کو دے دیا کہ اِن جوانوں نے ان تمام جرائم کا ارتکاب کیا ہے تو مزید کسی انتظار کے بغیر وہ ہمارا کورٹ مارشل کر دے گا۔

عزیزاکبر جی! کورٹ مارشل ہو گیا تو پھانسی تو نہیں لگ جائیں گے۔

پھانسی تو نہیں لگیں گے۔ پہلے کچھ کم بے عزتی ہوئی ہے کہ ہر روز آپ ایک نیا قضیہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

حضور ملک صاحب۔ اگر آپ اظہارِ تابعداری بھی کرتے رہیں تو ہو گا تو وہی کچھ جو یہ بے وقوف کرنل چاہے گا۔

## ۵

ہم دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کر رہے تھے کہ کیپٹن شیخ جو غالباً ڈیوٹی آفیسر تھا۔ کوارٹر گارڈ کی انسپکشن کرنے کے لیے آیا۔ اس دوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

مَیں نے تمہاری سمری آف ایوی ڈینس کیپٹن شاہانی کے پاس دیکھی ہے۔ اس کو اگر دیکھا جائے تو تمہارے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا۔ آپ لوگوں نے کیپٹن شاہانی کے سوالات کے جوابات بالکل ٹھیک دیے ہیں۔

البتہ شاہانی صاحب نے کورٹ مارشل (CINVENE) کرنے کی سفارش غلط کی ہے۔

وہ تو سرِ یہیں پتہ تھا کہ وہ کورٹ مارشل کی سفارش کرے گا۔ چونکہ اُسے انصاف سے زیادہ کرنل کی خوشنودی کی ضرورت ہے۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر آپ کا کورٹ مارشل ہو تو آپ اپنا وکیل مجھے مقرر کروانا۔ مَیں آپ کا کیس لڑوں گا۔

بہت نوازش آپ کی جنابِ عالی! کیپٹن شیخ کوارٹر گارڈ سے واپس بٹالین آفس

کی طرف چلا گیا۔ اسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی ہوگی کہ حوالدار میجر ہمیں دوبارہ لینے کے لیے آیا۔ تیار ہو کر ہم بٹالین آفس گئے تو فوراً ہی صوبیدار میجر نے ہمیں کرنل کے سامنے پیش کر دیا۔ کرنل ہم سے کہنے لگا۔

ہم نے تمہارے کیسوں کی تمام رپورٹیں اور سمری آف ایوی ڈینس پڑھی ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تم دونوں نے متعدد جرائم جن کی تفصیلات سمری آف ایوی ڈینس میں دی گئی ہے، کا ارتکاب کیا ہے اور اس طرح انڈین آرمی ایکٹ کے تحت متعدد جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے ہم کل مورخہ ـــــ کو تم دونوں کا سمری کورٹ مارشل کنوین (CONVENE) کریں گے۔ سمری آف ایوڈینس۔ چارج شیٹ اور کنوینگ آرڈر کی نقول ابھی تھوڑی دیر کے بعد تم لوگوں کو مل جائیں گی۔

اس نے ایک لمبا سا اطمینان کا سانس لیا اور پھر بڑے فاتحانہ انداز میں ایک اُچٹتی سی نظر ہم دونوں پر ڈالی۔ اور پھر ہم دونوں کو کہنے لگا۔

ٹھیک ہے۔

میں نے اس کی آتشِ غضب کو مزید بھڑکانے کے لیے جان بوجھ کر بڑے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

سب ٹھیک ہے کرنل صاحب ـــ اور وہ بے وقوف انگریز مسکرا پڑا۔ صوبیدار میجر ہم دونوں کو مارچ کر کے باہر لے آیا اور پھر اسکواٹ کی نگرانی میں حوالدار میجر ہمیں کوارٹر گارڈ واپس چھوڑ گیا۔ آتے جاتے ہمارے ساتھ کوئی آدمی بھی بات چیت نہ کرتا تھا۔ شاید کرنل نے یہ انوکھی پابندیاں صوبیدار میجر کی وساطت سے ہم پر لاگو کی ہوئی تھیں۔ میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کبھی کوئی پرواہ نہ کی۔

۵

دوسرے دن میرا اور عزیز اکبر کا سمری کورٹ مارشل بٹالین آفس میں کنوین (CONVENED) ہوا۔ اس بے وقوف کرنل نے بہت زور مارا کہ ہم دونوں اپنی خطائیں

معافی لیں اور معافی کی درخواست پیش کریں۔ لیکن ہر بار میں نے کہا کہ جناب ہم نے اس طرح کے کسی جرم کا جب ارتکاب نہیں کیا تو معافی کس بات کی مانگیں۔ اس نے صوبیدار میجر کو کہا۔

صوبیدار میجر صاحب ان کو باہر لے جا کر سمجھائیں۔ یہ مفت کی اکڑ خانی میں خواہ مخواہ مارے جائیں گے۔

جیسا کہ انڈین آرمی کے صوبیدار میجروں کا طریقہ کار تھا۔ ہمارے محترم صوبیدار میجر صاحب نے بھی بڑی لچھے دار گفتگو کے ذریعے ہم دونو کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ ہم اپنے جرائم کے ارتکاب کا اقرار کر لیں اور پھر کرنل صاحب بہادر سے معافی کی درخواست کریں۔ جس کے لیے جناب صوبیدار میجر صاحب بہادر بھی ہماری بھرپور مدد فرمائیں گے۔

میں نے اس جوڑ توڑ سے تنگ آ کر اس خوشامدی صوبیدار میجر سے کہا۔

صوبیدار میجر صاحب ان تلوں میں تیل نہیں ہے آپ محض کرنل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہمیں قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہیں۔

بھئی اگر تم اپنا نفع نقصان نہیں سمجھتے تو میری طرف سے جاؤ جہنم میں۔ میں تو تمہارا مسلمان بھائی ہونے کی وجہ سے تم کو ایک نفع بخش مشورہ دینا چاہتا تھا۔

شکریہ۔ ہم اپنا نیک و بد خوب سمجھتے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ جاؤ جہنم میں۔

صوبیدار میجر ہمیں دوبارہ کرنل کے پاس لے گیا۔

کرنل نے صوبیدار میجر سے پوچھا۔

کیوں صاحب یہ لوگ مافی (معافی) مانگتا ہے۔

نہیں صاحب۔ یہ لوگ بولتا ہے کہ ہم نے اس طرح کا کوئی جرم نہیں کیا۔ مافی (معافی)، کس بات کی۔

آل رائٹ۔

کرنل کچھ دیر تک کچھ لکھتا رہا۔ پھر سر پر پگڑی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے سب لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ کرنل نے بڑی ہی عجلت میں ایک غیر قانونی فیصلہ سنایا۔

لانس نائیک احمد اور لانس نائیک عزیز اکبر کو رپورٹ کر کے سگنا مین بنایا جاتا ہے۔

اس غیر قانونی اور یک طرفہ فیصلے کے پیچھے تاج برطانیہ کے دو سو سالہ حکومت کا نشۂ اقتدار تھا۔ اس زمانے میں انگریز سمجھتے تھے کہ وہ سیاہ و سفید کے مالک ہیں فی الواقعہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ہمارے کورٹ مارشل ڈرے کوئی صحیح کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ پہلے فیصلہ سنا دیا گیا۔ ضروری کاغذات کی تکمیل بعد میں کی گئی۔

اس زمانے میں رنگ دار نسل کے لوگوں کے اندر ایک لاوا کھول رہا تھا۔ اور پھوٹ کر باہر آنے کے لیے بے قرار تھا۔ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ وقت کا انتظار تھا محض ہماری یہ چھوٹی چھوٹی انفرادی قربانیاں ان کے اقتدار کو ٹھیس پہنچانے کے لیے کافی تھیں۔ ہمارے عہد کا انگریز کلائیو۔ کارنوالس اور کرزن نہ تھا۔ اس طرح کے قومی شعور کا اب ان میں بھی فقدان ہوتا جا رہا تھا۔

## ۵

صوبیدار میجر ہمیں مارچ کر کے باہر برآمدے میں لے آیا۔ پھر اس نے ریزر بلیڈ منگوا کر ہمارے سٹرپ ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچ کر اتار لیے۔ اُس کی فتح تھی اس کے گورے آقاؤں کی فتح تھی۔ لیکن میں شکست ماننے والا نہ تھا۔ ہم اُدھر سے سیدھے کوارٹر گارڈ آئے۔ اپنا اپنا سامان سمیٹا اور اپنی بیرک میں آ گئے۔ کئی پرانے دوستوں نے بڑی پذیرائی کی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم بیرک میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ دفتر اردلی آیا اور مجھے اور عزیز اکبر کو ایک ماہ کی چھٹی کا سرٹیفکیٹ اور ریلوے وارنٹ دے کر ہمارے دستخط لے کر واپس چلا گیا۔

ہماری سیکشن کے لوگ جو جالندھر سے ہم سے الگ ہوئے تھے پہلے ہی ایک

ماہ کی چھٹی پر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اب وہ واپس آنے والے تھے۔ میں نے عزیز اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

حضور کیا خیال ہے۔ چھٹی جانا ہے یا کیس کی پیروی کرنا ہے۔

خدا کا نام لو یار۔ احمد۔ شکر کرو اس مصیبت سے جان چھوٹی ہے۔ تم پھر نئے سرے سے لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اُترنے کی سوچ رہے ہو۔

نہیں عزیز اکبر۔ تم اگر چھٹی جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکتا۔ میں تو برگیڈ کمانڈر صاحب کے پاس یہ کیس ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس بے وقوف انگریز نے سراسر ناانصافی کی ہے۔ قانونی تقاضے پورے ہی نہیں کیے۔ کیس بنتا ہی نہ تھا۔ زبردستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں اور چار پانچ دن یہاں رہوں گا۔

تمہاری مرضی۔ لیکن میرے تو گھریلو حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ میں جلد از جلد گھر جاؤں۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔

کوہاٹ سے رات کو دس بجے راولپنڈی کے لیے ٹرین چلتی تھی۔ آنے جانے والے ڈیولی ٹرک استعمال کرتے۔ چنانچہ عزیز اکبر بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ رات کی گاڑی سے اپنے گاؤں جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں شام کا کھانا کھا کر کوہاٹ شہر چلا گیا۔ عزیز اختر وارثی۔ اخگر سرحدی۔ آذر سرحدی۔ محمود شوکت۔ راز بنگش اور یاسین فوق وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ان شعرائے کرام کے بیٹھنے کی جگہ مقرر تھی۔ شام کو یہ سب حضرات وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ رات گئے تک شعر و شاعری کی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ میں نے اپنی شاعری کی ابتدا ۱۹۴۱ء میں کوہاٹ کے قیام کے دوران ہی کی تھی۔ اب مجھے شعر کہتے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ ہوگیا تھا۔ اس عرصے میں میں اپنا کلام باقاعدگی سے حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی جو مدارس یونیورسٹی میں

علوم شرقیہ کے ذہین بھتے کو بغرض اصلاح بھیجتا رہا۔ اور وہ اصلاح فرما کر واپس ارسال کر دیتے۔ میں حضرت علامہ کے حلقہ تلمذ میں تقریباً چار پانچ سال رہا۔ میں اپنی ذہنی اُپج اور رجحانِ طبع کے باعث لکھنؤ سکول کے روایتی شعری ورثے سے استفادہ نہ کر سکا۔ پھر بھی شعر و ادب میں جدید عصری تقاضوں کا تقابلی مطالعہ جاری رکھا۔

میں اپنی فوجی ملازمت کے دوران جہاں کہیں بھی گیا۔ وہاں کے شاعر اور ادیب حضرات سے سب سے پہلے میں نے ملاقات کی اور پھر آج تک اُن میں سے بیشتر حضرات کا میں نیاز مند ہوں۔ کوہاٹ کے دوستوں کے اسمائے گرامی کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اسی طرح جب میں پشاور پوسٹ ہو گیا تو جن احباب کا حلقہ نصیب جاں رہا ان میں سید ضیا جعفری منظر گیلانی۔ فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی۔ خاطر غزنوی۔ مرزا محمود سرحدی۔ شوکت واسطی۔ مسعود انور شفقی۔ محمد شفیع صابر۔ کلیم جلیسری۔ جلیل حشمی۔ ڈاکٹر طاہر فاروقی زیبی جار چوی وغیرہم۔ راولپنڈی میں عبدالعزیز فطرت۔ سید عبدالحمید عدم۔ انجم رضوانی باقی صدیقی۔ ایوب محسن۔ حضرت حاجی سرحدی۔ قتیل شفائی۔ صادق نسیم۔ جمیل ملک کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔

لاہور کے قیام کے دوران احسان دانش۔ احمد ندیم قاسمی۔ سعادت حسن منٹو پروفیسر وقار عظیم۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ن۔ م راشد صاحب سے نیاز مندی رہی۔ قیام ہند کے زمانے میں الٰہ آباد صرف پروفیسر گورکھپوری سے ملا تھا۔ ایک دفعہ جبلپور جاتے ہوئے ساتھیوں نے آگرہ میں سفر کے دوران بریک جرنی (BREAK JOURNEY) کیا تو سب کے سب پتھر اور مٹی کا بنا ہوا تاج محل دیکھنے چلے گئے۔ میں اُردو ادب کا زندہ تاج محل دیکھنے قصرالادب آگرہ چلا گیا۔ وہاں تاج محل سے بھی زیادہ عظیم اور شہرت کا حامل ایک زندہ انسان، حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ ان کے عظیم فرزند جناب اعجاز صدیقی اور حضرت ماہر القادری سے بھی وہاں ملاقات ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد ڈھاکہ گیا تو پروفیسر عندلیب شادانی

پروفیسر نذیر صدیقی سے ملا اور پھر بنگالی زبان کے ایک عظیم شاعر قومی جسیم الدین کو بھی ملا۔ شادانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین تھے اور جسیم الدین سے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہم دونوں ریڈیو پروگراموں کے سلسلے میں اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ قومی جسیم الدین سے میری ملاقات میرے ایک نہایت ہی عزیز ترین دوست سید ظل الرحمان جو ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے نے کرائی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض آدمی اچانک ملتے ہیں لیکن اپنی اُس مختصر سی ملاقات کے بھی کچھ ابدی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ سید ظل الرحمان کی بھی ایسی ہی شخصیت تھی۔

پاکستان آرمی کی ملازمت کے دوران میں نے فوج میں چند بڑے اچھے شاعر دیکھے۔ جن میں سرفہرست سید جعفر طاہر کا نام نامی ہے۔ دوسرے دو دوست شفیع ضامن اور مقرب آفندی تھے۔ یہ دونوں حضرات میرے ساتھ پاکستان سگنل کور میں رہے ہیں۔ جناب شفیع ضامن صاحب اسلام آباد کالج برائے طلباء میں اردو کے اُستاد ہیں۔

شاعر اور ادیب دوستوں سے ملاقات کا ذکر چلا تو جن حضرات سے میری اٹک میں ملاقات ہوتی رہی ہے تو ان کا ذکر بھی اگر یہاں نہ کروں تو قرین انصاف بات نہ ہوگی۔ اٹک میں جمیل یوسف۔ ڈاکٹر سعد اللہ کلیم۔ احمد وحید اختر۔ شیخ احسن حجازی۔ سردار محمود دلبسمل۔ پروفیسر برق۔ پروفیسر عزیز۔ پروفیسر فاروقی۔ پروفیسر فروغ۔ اعجاز سلیم۔ مرزا اقبال بیگ نعیم۔ حکیم حیدر واسطی۔ عبداللہ راہی نذر صابری۔ مشتاق عاجز۔ محسن۔ ابرار حسن شاکر اور جناب آس صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد جن شعرائے کرام اور ادبا سے میری ملاقات ہوئی، اُن میں حضرت نوح ناروی۔ قاضی محمد عمر قضا (یہ دونوں حضرات داغ کے شاگرد تھے)، حفیظ جالندھری۔ جگر مرادآبادی، ناصر کاظمی۔ صوفی تبسم۔ مجاہد لکھنوی۔ پروفیسر

شرر نعمانی۔ پروفیسر اشرف بخاری ۔ حافظ الفر لدھیانوی ۔ شہرت بخاری ۔ یونس ظفر۔ قیوم نظر۔ مختار صدیقی ۔ تابش دہلوی ۔ تابش صدیقی۔ سید عطا حسین کلیم ۔ ضیا جالندھری ۔ الطاف گوہر۔ احمد فراز ۔ محسن احسان ۔ شاد امرتسری ۔ مجید شاہد۔ یوسف رجا چشتی ۔ ایوب صابر اور پشتو زبان کے نامور شاعر جناب یونس خلیل ۔

میں نے ایک یادگار شعری محفل ۱۹۵۱ - ۵۲ء کے موسم سرما میں جناب سید عبدالحمید عدم صاحب کے دولتکدے پر جہلم میں دیکھی ۔ ان دنوں میں اپنی فوجی ملازمت کے سلسلے میں جہلم میں قیام پذیر تھا ۔ جناب جگر مرادآبادی پشاور سے واپسی پر عدم صاحب سے ملنے کے لیے جہلم تشریف لائے۔ عدم صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ جگر صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ اور سید جعفر طاہر دونو شام کو ضرور تشریف لائیں ۔ جعفر طاہر صاحب بھی ان دنوں اپنی فوجی ملازمت کے سلسلے میں جہلم ہی میں قیام پذیر تھے ۔ میں اور جعفر طاہر صاحب سر شام ہی عدم صاحب کے دولتکدے پر پہنچ گئے ۔ جگر صاحب اور عدم صاحب خوش گپیاں کر رہے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد ہم لوگ عدم صاحب کے ڈرائینگ روم میں گاؤ تکیوں کے سہارے نیچے چاندنی پر بیٹھ گئے ۔ اس رات جگر صاحب اور عدم صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا ۔ تمام رات جعفر طاہر پر ایک عجیب دیوانگی کی سی کیفیت طاری رہی ۔ جعفر طاہر نے اپنا کلام نہ سنایا۔ نہ جانے جگر صاحب اور عدم صاحب نے اُن سے اس کی فرمائش کیوں نہ کی۔ حالانکہ جعفر طاہر بھی بڑا شاعر تھا ۔ البتہ غزل گوئی میں وہ اِن دونو حضرات کا ہم پلہ نہ تھا ۔ اس کی کئی کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں اور پاکستان کے معروف شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔

یہ محفل رات دیر تک جاری رہی ۔ اُن دنوں جگر صاحب نے مے نوشی ترک کر دی تھی ۔ البتہ عدم صاحب شغل فرماتے تھے ۔ وہ اکیلے اس محفل میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ جام پی لیتے اور پھر جھومنا شروع کر دیتے ۔ میں نے

اس رات میں نے دیکھا کہ جناب جگر نے عدم صاحب کے کلام پر انہیں دل کھول کر داد دی۔ کوئی صبح چار پانچ بجے تک یہ یادگاری نشست جاری رہی۔ جگر صاحب اٹھ کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ عدم صاحب، جعفر طاہر صاحب اور میں وہاں ہی قالین پر رضائیاں لپیٹ کر سو گئے۔

## ۵

شاعری کی لطیف اور حسین دنیا سے مراجعت کرتے ہوئے اب میں پھر زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ جب تک انسان زندہ ہے اُسے تلخ حقیقتوں سے مفر نہیں۔ آنکھیں بند کر لینے سے تو زندگی کی تلخیاں کم نہیں ہو جاتیں بلکہ مردانہ وار مقابلہ ہی ان کی راہ میں سدِ راہ ہو سکتا ہے۔

کوہاٹ سگنل کی وہی گھٹی گھٹی فضا ہے جس میں میرے جیسے آزاد منش لوگوں کے لیے سانس لینا مشکل ہے۔ اس بے وقوف کرنل اور خوشامدی صوبیدار میجر نے بزعم خود مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ لیکن میں بھی شکست تسلیم کرنے والا نہ تھا۔ پھر سے ایک نئے عزم اور ایک نئے ولولے کے ساتھ میں نے ایک نئے دن کا آغاز کیا۔

آج میری ایک ماہ کی چھٹی کا پہلا دن تھا۔ دوسرے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ لیکن میں ایک نئی مہم شروع کرنے کی تیاری میں مصروفِ عمل تھا۔ اس دن میں سویلین کپڑے پہنے یونٹ لائن میں پھر رہا تھا کہ صوبیدار میجر کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ فوراً مجھے اپنے پاس بلا کر پوچھنے لگا۔

تم اب تک کیوں سویلین کپڑوں میں پھر رہے ہو۔ صوبیدار میجر نے تحکمانہ انداز میں نہایت ہی ترشروئی سے مجھ سے پوچھا۔

جناب میں چھٹی پر ہوں۔

کتنی چھٹی!

ایک ماہ کی۔

فوج میں چھٹی گھر جانے کے لیے ملتی ہے یا یونٹ لائینز میں گذارنے کے لیے۔

سر میں نے کچھ سودا سلف گھر کے لیے لینا ہے۔ کچھ زیور بنوانے ہیں اس لیے دو تین دن لگ جائیں گے۔

اچھا ٹھیک ہے اور صوبیدار میجر مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا آگے کو نکل گیا۔

میں یونٹ کینٹین پر گیا اور وہاں جا کر چائے پی اور دو تین سفید کاغذ لے کر وہاں ہی بریگیڈ کمانڈر کے لیے ایک درخواست ڈرافٹ کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے درخواست میں جملہ حالات و واقعات تحریر کیے۔ اُسے بار بار پڑھا۔ اس کی نوک پلک درست کی اور پھر بیرک میں واپس آ کر کپڑے بدل کر شہر چلا گیا۔ تاکہ کہیں سے یہ درخواست میں ٹائپ کروا سکوں۔ تلاش بسیار کے بعد ایک بوڑھا سا ہندو ناک کے آخری حصے پر عینک جمائے جو ایک دھاگے کے ساتھ اس کے سر کے پچھلے حصے میں کہیں بندھی ہوئی تھی، بیٹھا ایک پرانے سے بھینچر قسم کے ٹائپ رائٹر پر ایک ایک انگلی دیکھ بھال کے انداز میں مارتے ہوئے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ میں دکان کے اندر داخل ہوا تو اس نے چشمہ آنکھوں سے اُوپر اُٹھا کر مجھے ایک نظر دیکھا اور بغیر کچھ بات چیت کیے وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

آداب عرض کرتا ہوں۔ لالہ جی۔ میں نے جھینپتے جھینپتے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

ہاں بھیا کہو۔ کیا بات ہے۔ اس نے اچھی خاصی بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

لالہ جی! میں نے ایک درخواست ٹائپ کروانا ہے۔

کسی اور سے کروا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔

یہاں اور کوئی ٹائپ کرنے والے کی دکان ہے۔
آگے چلے جاؤ۔ وہاں ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں تین چار دکانیں چھوڑ کر ٹائپ کرنے والے کی دکان تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں ایک ہنس مکھ سا ہندو نوجوان بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے دکان کے اندر جا کر مُدعا بیان کیا تو وہ میرا کام کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ ایک روپیہ اُجرت طے ہوئی۔ میں نے ڈرافٹ اس کو نکال کر دیا۔ وہ نوجوان کافی ذہین اور پڑھا لکھا تھا۔ میری اجازت سے اس نے میری درخواست میں دو تین گرامر کی غلطیاں درست کیں اور پھر کاغذ میں کاربن لگا کر ٹائپ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کی ٹائپنگ کی سپیڈ بھی اچھی خاصی تھی۔ ٹائپ رائٹر بھی نیا تھا۔ غرضیکہ اس نے تھوڑی ہی دیر میں اس درخواست کی تین کاپیاں مجھے ٹائپ کر دیں اور اپنی اُجرت مجھ سے وصول کرلی۔ میں نے ٹائپ شدہ درخواست لے کر اسے بار بار پڑھا تاکہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ درخواست ہر لحاظ سے ٹھیک تھی۔ اس نے وہ ٹائپ شدہ درخواست مجھے ایک فائل کور میں رکھ کر دی۔ جس کے اس نے مجھ سے مزید دو آنے وصول کیے۔ میں وہاں سے فارغ ہو کر یوسف کے ہوٹل پر آکر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ جلد ہی چائے آگئی۔ اور مزے لے کر چائے پینے میں مصروف ہوگیا۔
میں سوچنے لگا یہ درخواست میں بریگیڈیئر صاحب کو ان کے دفتر میں تو نہ دے سکوں گا۔ فوج میں نچلے رینکس کا اتنے بڑے افسر تک براہ راست رسائی حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ شام کو غروب آفتاب کے قریب ان کے بنگلے پہ یہ درخواست ان کو دینے کی کوشش کروں گا۔ میں چائے پی کر یوسف کے ہوٹل سے واپس یونٹ لائینز میں آگیا۔ فوج میں دوپہر کا کھانا عام طور پر ایک بجے ہوتا ہے۔ ابھی ایک بجنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ اگرچہ میں رخصت پہ تھا لیکن پھر بھی فوج کے رسم و رواج کے مطابق اوقات کار میں بیرک میں سو نہ سکتا،

تھا میرے لیے یہ دو گھنٹے گذارنے مشکل ہو گئے۔ میں تھوڑی دیر کینٹین پر بیٹھا گانے سنتا رہا۔ خدا خدا کر کے ایک بجا اور سب لوگ کھانے کی چھٹی کر کے اپنی اپنی بیرکوں میں آ گئے۔ میں نے بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اپنی بیرک میں آ کر سو رہا۔

میں غروبِ آفتاب سے تھوڑا پہلے بیدار ہوا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چائے پی اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر بریگیڈیر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ دن میں میں نے بریگیڈیر صاحب کی کوٹھی کا پتہ کر لیا تھا۔ فوج کا یہ دستور ہے کہ کوئی بھی نچلے رینکس کا آدمی اتنے بڑے افسر کو ڈائریکٹ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ میں اس بنگلے سے ہٹ کر تھوڑی دور سڑک کے کنارے ایک لان میں بیٹھ گیا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔ اس دوران اُس بنگلے کی طرف کسی کا آنا جانا نہ ہوا اور نہ ہی بریگیڈیر صاحب کی کوٹھی میں مجھے کوئی آدمی ہی نظر آیا۔ میں مایوسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اُدھر سے ایک بڈھا سا پٹھان جو ظاہری شکل و صورت سے مجھے کوئی بیرا خانساماں نظر آتا تھا، آؤٹ گیٹ کی طرف سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس سے سلام دُعا کی اور پھر اسے ایک سگریٹ پلایا۔ وہ خانساماں تھا جو بازار سودا سلف خریدنے کے لیے جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ خان بابا کافی دلچسپ اور زندہ دل آدمی تھا۔ تمام راستے وہ مجھے انگریز صاب لوگوں اور میموں کے معاشقوں کے جھوٹے سچے قصے سناتا رہا۔ میں نے دل میں اندازہ لگا لیا کہ اس آدمی کی معرفت میری بریگیڈیر صاحب تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔ بازار سے واپسی پر میں نے سامان اُٹھانے میں بھی اس کی مدد کی اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ کچن میں لے آیا۔ آتے ہی مجھے فوراً چائے پلائی اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

بیٹا جب کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔

میں نے اظہارِ مدعا کے لیے یہ وقت مناسب سمجھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

خان بابا آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ میرا ایک چھوٹا سا کام کردیں۔

چھوٹا کیا ہے مارٹا۔ تم جو کچھ بولے گا ہم کرے گا۔ ہم جنرل صاحب کا نمبر ون آدمی ہے۔ جو بولو کیا بات ہے۔

خان بابا آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ بریگیڈیر صاحب سے میری ملاقات کرادیں۔

مارٹا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے تم کیا بات بولے گا۔

بس خان بابا اتنی سی بات ہے۔

اچھا تم ہمارے پاس بیٹھو۔ ابھی صاب سو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اٹھے گا۔ غسل کرے گا۔ اس کے بعد باہر لان میں آئے گا۔ لان میں جب آتا ہے تو ہم سے کھلا گپ شپ کرتا ہے۔

وہ شب وغیرہ میں تو نہیں جایا جائے گا۔

کلب میں جاتا ہے لیکن کبھی کبھی۔ روزانہ نہیں جاتا ہے۔

آج اس کا کیا پروگرام ہے؟

میرا خیال ہے چونکہ وہ کل کلب میں گیا تھا۔ آج نہیں جائے گا۔

خان بابا۔ جنرل صاحب کیسا آدمی ہے۔ غصیل آدمی ہے یا نرم خو۔

بھئی قسم سے بڑی ہی میٹھی طبیعت کا صاب لوگ ہے۔ ایسا انگریز لوگ کم ہی ملے گا۔

اس نے لکڑی کی ایک بوسیدہ سی کرسی کچن کے باہر رکھ دی اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آکر کوئی نہ کوئی ہنسی مذاق کی بات کرکے کچن کے اندر چلا جاتا۔ اب ہلکا ہلکا اندھیرا چھانا جارہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے صرف ایک ہلکی سی گرم جرسی پہن رکھی تھی۔ اس لیے ٹھنڈک محسوس کررہا تھا۔ ابھی تک صاحب کے باہر آنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں مایوسی

سے عالم میں دُور اُفق پر نگاہیں جمائے سلسلۂ کوہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پرندے اپنے اپنے بسیروں کو قطار اندر قطار واپس آ رہے تھے۔ ایسے میں چچا گل شیر نے مجھے چائے کا ایک گرم گرم پیالہ لا کر دیا۔ میں نے اُسے غنیمت جانا۔ انگریز لوگوں کی چائے ہم دیسی لوگ پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں نہ دودھ ہوتا ہے اور نہ ہی شکر۔

میں ابھی چائے پی ہی رہا تھا کہ ایک بڈھا سا انگریز کوٹھی سے باہر لان میں نکل آیا۔ اس نے ایک خوشنما گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اور مزے لے لے کر سگار پی رہا تھا مجھے دیکھا تو کچن کی طرف آ گیا۔

ہیلو - گل شیر خان! کیسا ہے۔

ٹھیک ہوں صاحب بہادر۔ ایک دم نمبر وَن۔

یہ نوجوان کون ہے؟

صاب یہ میرے جگری دوست کا بیٹا ہے۔ ابھی ابھی لڑائی سے واپس آیا ہے تو ہم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

او۔ ویل۔ ڈن ینگ مین۔ بہوت اچا، تم لڑائی میں کدھر تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

سر! میں برما میں تھا۔

او۔ بوت اچا۔ (بہت اچھا)

صاب ہمارے اسی بیٹے کے ساتھ اس انگریز پٹھان نے بہت زیادتی کی ہے۔ (ہمارے کرنل کو افسروں کے حلقہ میں انگریز پٹھان کہتے تھے)

کیوں کیا ہوا ہے؟ بریگیڈیر صاحب نے چچا گل شیر سے پوچھا۔

صاب بڑے ظلم کی بات ہے۔ یونٹ میں آتے ہی اس نے ہمارے اس بیٹے کا کورٹ مارشل کر دیا ہے۔

کورٹ مارشل؟

جی صاب۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ لڑکا خود ہی آپ کو پوری کہانی نہایت تفصیل سے بتائے گا۔

برگیڈیر صاحب مجھے اپنے ساتھ اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ نہایت عمدگی اور سلیقے سے یہ کمرہ سجایا گیا تھا۔ برگیڈیر صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے کے بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اس کی میم بھی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس خاتون کی عمر کوئی پچاس پچپن کے لگ بھگ تھی۔ انگریزوں میں میں نے ایک بڑی عجیب بات دیکھی ہے۔ اور وہ یہ کہ جب یہ پچاس کے پیٹے میں پہنچتے ہیں تو یہ بڑے ہی گریس فل نظر آتے ہیں لیڈی رائیٹ بھی بڑی ہی گریس فل خاتون تھی۔ برگیڈیر جان رائیٹ نے لیڈی رائیٹ سے میرا تعارف یوں کرایا۔

یہ نوجوان - گل شیر کا بھتیجا ہے۔ وہ خاتون مجھ سے بڑی شفقت اور مروت سے پیش آئی۔

جب برگیڈیر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں انگریزی اچھی طرح سمجھ اور بول سکتا ہوں تو انہوں نے میرے ساتھ انگلش میں بات چیت کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے مجھ سے کورٹ مارشل ہونے کی وجہ پوچھی۔ میں ان کو ۹۲ ٹرانزٹ سے لے کر بدتمیز حجام تک کو مارنے کی مکمل داستان سنائی۔ وہ دونوں میاں بیوی بڑے غور اور دلچسپی سے میری سب باتیں سنتے رہے۔ بیچ بیچ میں میری کارکردگی کی مجھے داد بھی دیتے رہے۔ برگیڈیر صاحب میری پوری باتیں سن چکے تو مجھ سے کہنے لگے

کل آپ میرے دفتر آئیں اور ایک درخواست کی شکل میں یہ پوری باتیں مجھے تحریری طور پر دیں تاکہ میں آپ کی درخواست پر مزید قانونی کارروائی کر سکوں۔

میں نے جو مفصل درخواست صبح ٹائپ کروائی تھی۔ جیب سے نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے درخواست میرے ہاتھ سے لے لی۔ چونکہ اس درخواست کی اور ٹائپ شدہ نقول میرے پاس تھیں اس لیے میں نے اپنی درخواست کی ایک نقل لیڈی رائٹ کو بھی دی۔ وہ دونوں میاں بیوی میری درخواست پڑھ چکے تو برگیڈیر صاحب کے منہ سے سب سے پہلے جو الفاظ نکلے وہ تھے۔ "سٹوپڈ" (STUPID) بیوقوف

احمق۔ لیڈی رائٹ نے برگیڈیر صاحب سے کہا۔

"اس بے وقوف سے آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔" اس کا اشارہ ہمارے کرنل کی طرف تھا۔

آر۔ یو۔ اے۔ کوالیفائیڈ۔ لائیر (کیا آپ سند یافتہ وکیل ہیں۔) برگیڈیر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

نو۔ سر۔ (نہیں جناب)۔

یہ درخواست کس نے لکھی ہے؟

سر۔ میں نے خود لکھی ہے۔

تم اتنی طرح ملٹری لا کیسے جانتے ہو؟

سر میں ایک عرصے تک کلرک رہا ہوں اور یہیں باقاعدگی سے انڈین آرمی ایکٹ پڑھا جاتا ہے۔

اچھا ٹھیک ہے۔ میں کل تمہارے کورٹ مارشل کے کاغذات نظر ثانی کے لیے منگواؤں گا۔

تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سر۔ میں کل سے ایک ماہ کی چھٹی پر ہوں۔ صوبیدار میجر مجھے یونٹ لائن میں رہنے نہیں دے گا۔

کنٹونمنٹ گورنمنٹ کا ہے یا صوبیدار میجر کے باپ کا ہے۔ تم جاؤ کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔

## ۵

دوسرے دن صبح اوقات کار شروع ہونے کے ساتھ ہی میری تلاش شروع ہو گئی۔ میں پرکینٹین میں بیٹھا گانے سن رہا تھا کہ حوالدار میجر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

آپ کو صوبیدار میجر صاحب بلا رہے ہیں۔

اچھا چائے پی کر آتا ہوں۔

یار خدا کے لیے جلدی کرو۔ پہلے دفتر اردلی تمہیں بیرک میں دیکھ آیا ہے۔ وہاں تم نہیں ملے۔ صوبیدار میجر صاحب میری بڑی بے عزتی کر رہا ہے۔

اچھا چلو اور میں اس کے ساتھ چائے پیے بغیر بٹالین آفس چلا گیا۔ صوبیدار میجر میرے انتظار میں دفتر کے باہر برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ جس سے اس کی بیقراری کا پتہ چل رہا تھا۔ میں جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شاوٹ (SHOUT) کیا "ڈبل اپ" مجھے اس کی یہ بات بالکل اچھی نہ لگی۔ میں اسی رفتار سے چلتا رہا۔ البتہ حوالدار میجر جو میرے ساتھ تھا اس نے ڈبل رمچانگا شروع کر دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میری بھی منت سماجت کرنے لگا۔ "یار خدا کے لیے تم بھی ڈبل کرو"۔ لیکن میں نے ان دونوں کی باتیں سنی ان سنی کر دیں۔ جب میں صوبیدار میجر کے بالکل قریب جا پہنچا تو وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو کر مجھ سے کہنے لگا۔

اچھا یونٹ کا نام روشن کیا ہے۔

کیوں سر۔ پھر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے جو آپ اس قدر غصے ہو رہے ہیں۔

اچھا ابھی تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ چلو کرنل صاحب کے سامنے۔

سر۔ میں وردی پہن آؤں۔

کوئی ضرورت نہیں ہے وردی کی۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کرنل کے دفتر میں لے گیا۔ میں نے کرنل کو دیکھا وہ غصے میں پھنکا جا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

تم کل رات برگیڈ کمانڈر کے پاس ان کے بنگلے پر گیا تھا۔

نہیں جناب۔

جھوٹ کیوں بولتے ہو

سَر آپ کو کس نے کہا ہے کہ مَیں بریگیڈ کمانڈر صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔
تم نہیں گئے تو تمہارے کیس کا ان کو کیسے پتہ چلا۔ ابھی انہوں نے کیس کے سب کاغذات منگوائے ہیں۔
سَر مجھے تو پتہ نہیں۔
تم بہت چالاک آدمی ہو۔ یونٹ کا نام تم نے بدنام کر دیا ہے۔ تم کو ایک ماہ کی چھٹی ملی ہے تم گھر کیوں نہیں گئے۔
سَر مَیں نے گھر کے لیے کچھ سامان خریدنا ہے۔
ٹھہرا ہوا کدھر ہے؟
یونٹ لائنز میں۔
تم ہماری یونٹ کو پوری انڈین آرمی میں بدنام کر کے چھوڑے گا۔ اچھا تم بھی چلو میرے ساتھ۔
کرنل نے یونٹ سٹاف کار منگوائی۔ مجھے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ صوبیدار میجر کہنے لگا۔
سَر میں اس کو وردی پہنوا کر لاتا ہوں۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو اسکورٹ ESCO‍RT بھی ساتھ بھیج دوں۔ مَیں صوبیدار میجر کی اِن چھچھوری باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔ کرنل نے اس کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کرنل نے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر کرنل بیٹھ کر میرے کورٹ مارشل کے کاغذات پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ہماری یونٹ سے کوئی زیادہ دور نہ تھا۔ کوئی چار پانچ منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ کرنل نے مجھے حکم دیا۔
جوان تم اِدھر ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھو۔ کہیں جانا نہیں۔
بہت اچھا۔ سَر۔
کرنل کار سے اُتر کر میرے کیس کے کاغذات سنبھالتا ہوا بریگیڈ میجر کے دفتر

میں چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے گذر گئے۔ نہ تو کرنل ہی باہر آیا اور نہ ہی مجھے کسی نے اندر بلایا میں گاڑی میں بیٹھا ڈرائیور کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ ہماری یونٹ کی ایک جیپ آ کر رُکی۔ اس میں سے ایڈجوٹنٹ اور کیپٹن شاہانی اُترے اور وہ دونوں بھی برگیڈیر میجر کے دفتر میں چلے گئے۔

ان ڈرائیوروں کے لیے یہ سب ایک معمہ تھا۔ ان کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد انگریز برگیڈ میجر مجھے بلانے کے لیے ہماری سٹاف کار کے پاس آیا۔ اس نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

تم دونوں میں احمد کون ہے۔

میں ہوں جناب۔ میں نے کار سے باہر آ کر اٹن شن ہو کر اُسے جواب دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا اور پھر اپنے ساتھ دفتر کے اندر لے گیا۔

ہم دونوں برگیڈ میجر کے دفتر سے گذر کر اندر برگیڈ کمانڈر صاحب کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ ہمارا کرنل۔ ایڈجوٹنٹ اور کیپٹن شاہانی یہ تینوں وہاں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برگیڈیر صاحب نے مجھے بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اُس نے برگیڈ میجر کو کہا۔

میرے سٹینو کو بلاؤ۔

ایک نوجوان گورا کارپورل ہاتھ میں کاپی پنسل لیے اندر آیا۔ برگیڈیر صاحب نے برگیڈ میجر اور اس سٹینو کو بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ بیٹھ گئے تو برگیڈیر نے سر پر ٹوپی رکھی اور مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

پرسوں کرنل پراوڈ ننک نے اس جوان کا جو سمری کورٹ مارشل کیا ہے۔ میں اپنی ریویو کی پاور استعمال کرتے ہوئے کرنل پراوڈ ننک کا یہ فیصلہ منسوخ (SET - ASIDE) کرتا ہوں۔ اس کورٹ مارشل کی تمام کارروائی مروجہ فوجی قانون کے مطابق قانونی تقاضوں کو مدنظر

رکھ کر نہیں کی گئی ہے۔ یہ فیصلہ بالکل یک طرفہ ہے جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ پریذیڈنٹ نے تعصب سے کام لیا ہے۔ اور اپنی کسی ذاتی رنجش کی بنا پر دو بے گناہ جوانوں کو اتنی سخت سزا دی ہے۔ ملزموں کا یہ مؤقف درست ہے کہ جن لوگوں نے یہ رپورٹیں لکھی ہیں وہ کورٹ کے سامنے آکر بیان دیں تاکہ ملزمان اُن پر قانونی طریقے سے جرح کرنے کا اپنا حق استعمال کر سکیں۔ اس نہایت اہم قانونی نکتے کو مدِنظر نہیں رکھا گیا۔ آخر میں یونٹ کے باربر کو جو لانس نائیک احمد نے مارا ہے اس ضمن میں باربر کے بیان کی تصدیق کسی غیر جانب دار گواہ نے کی۔ بدیں وجہ اُس باربر کی رپورٹ پر لانس نائیک احمد کو اتنی کڑی سزا دینا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ فاضل عدالت کو یہ بات پیشِ نظر رکھنا چاہیئے تھی کہ کہ یہ دونوں جوان سیدھے لڑائی کے میدان سے واپس آرہے تھے اور نرم برتاؤ کے مستحق تھے۔

میں ان دونوں عہدیداروں کا سابقہ رینک ریسٹور (RESTORE) کرتا ہوں اور سمری کورٹ مارشل کے پریذیڈنٹ اور کیپٹن شاہانی جس نے اس کیس کی سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کی ہے۔ ان دونوں افسران کے خلاف (CENSURE) (ملامت کرنا) کے ریمارکس پاس کرتا ہوں جس کا اندراج ان کے سروس ریکارڈ میں کیا جائے۔

بریگیڈیر صاحب نے کرنل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس جوان کی چھٹی منسوخ کر کے آج ہی اس موٹل بریگیڈ سگنل سیکشن میں بھیج دو۔ میں ابھی بریگیڈیر روڈھم سے بات کرتا ہوں۔ وہ اس جوان کی وہاں لُک آفٹر (LOOK AFTER) کرے گا۔

وہاں بریگیڈ میں سگنل آفیسر کون ہے۔؟ بریگیڈیر صاحب نے کرنل سے پوچھا۔

سَر کیپٹن لنگھم بر لے وہاں او۔سی ہے۔

ٹھیک ہے مَیں اس سے بھی بات کروں گا۔ اِن جوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اب اس کا مداوا ہونا چاہیئے۔

سَر۔ اُس جوان کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کرنل نے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے کرنل۔ لیکن آپ اپنے صوبیدار میجر اور ٹل برگیڈ سگنل سیکشن کے ۵۔ ٥۔ ۷ صاحب کو بھی بتا دیں۔ اگر کسی نے اس کے ساتھ معمولی سی بھی زیادتی کی تو مَیں اس کے ساتھ بڑی طرح پیش آؤں گا۔

نہیں سَر۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ اس لڑکے کو بھی سمجھا دیں۔ یہ بھی بڑا لڑاکا ہے۔ کرنل نے بڑے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

کرنل۔ کوئی اس کے ساتھ پہلے زیادتی نہ کرے تو یہ بہت سیدھا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ غلط رویوں کے خلاف ہی یہ صرف آواز اُٹھاتا ہے۔

سَر۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔

کرنل تمہیں پتہ ہے جنگ عظیم میں اس کے والد نے کوتل العمارہ کے مورچوں میں لڑتے ہوئے گیلینٹری ایوارڈز حاصل کیے تھے۔

نہیں سَر۔ مجھے پتہ نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے آدمیوں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ خدا کے لیے سب کو ایک ہی لاٹھی سے مت ہانکا کرو۔

سَر یہ یونٹ میں ابھی تو آیا ہے۔ آتے ہی کورٹ مارشل میں ملوث ہو گیا ہے۔

اس لیے کورٹ مارشل میں ملوث ہوا ہے چونکہ اس نے آپ کے لیے جاسوسی کرنے والے بار بر کی پٹائی کی ہے۔ ورنہ مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کی پچھلی

کارکردگی سے تو آپ بہت خوش تھے اور آپ نے جب اس کے خلاف آمدہ رپورٹ دیکھیں تو یہ کہا تھا۔ "ہماری یونٹ میں بھی ایک بہادر آدمی آرہا ہے۔" کیا یہ بات ٹھیک ہے یا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

سر۔ ٹھیک ہے۔

پھر برگیڈیر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

سنو میرے بیٹے۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف ہوئی ہے۔ تم کل ٹل برگیڈ سگنل سیکشن میں چلے جاؤ۔ وہاں رپورٹ کرنے کے بعد وہ تمہیں ایک ماہ کی چھٹی دے دیں گے۔ وہاں کے برگیڈ کمانڈر برگیڈیر روڈھم صاحب کو ضرور ملیں۔ جب چھٹی پر جانے لگیں اور کوہاٹ آئیں تو مجھ سے اور میم صاحب سے ضرور مل کر جائیں۔ اسی طرح جب چھٹی گذار کر آئیں تو واپسی پر بھی ہمیں ضرور ملیں۔ بلکہ ایسا کریں کہ میں روڈھم کو کہتا ہوں کہ وہ ٹل سے کوہاٹ تک تمہیں سرکاری گاڑی سے بھیج دیں۔ تم یونٹ میں جانے کی بجائے سیدھا ہمارے بنگلے پر آنا۔ میم صاحب اور گل شیر خان تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ دن ہمارے ہاں گذارنا۔ رات کو کھانا وغیرہ کھا کر ہم سب آپ کو سٹیشن پر چھوڑ کر آئیں گے۔

بہت اچھا سر

اچھا۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ برگیڈیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سب اُٹھ کر برگیڈیر میجر کے کمرے میں آگئے۔ میں وہاں سے نکل کر یونٹ لائینز کی طرف چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ پیچھے سے کرنل نے شاف کار لا کر روکی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر کیپٹن شاہانی بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے والی سیٹ پر کرنل اور ایڈجوٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ کار کرنل کے دفتر کے باہر جا کر رُکی۔ ڈرائیور نے لپک کر دروازہ کھولا وہ تینوں اُتر کر کرنل کے دفتر کے اندر چلے گئے۔ میں اپنی بیرک کی طرف چلا گیا۔ ابھی

راستے ہی میں تھا کہ پیچھے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

تم کو کرنل صاحب نے بلایا ہے۔

مجھ کو بلانے کے لیے تم کو کس نے بھیجا ہے؟

صوبیدار میجر صاحب نے

میں اس سپاہی کے ساتھ واپس بٹالین آفس آ گیا۔ صوبیدار میجر باہر برآمدے میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو میں نے اسے سلام کیا۔ وہ جلا بھنا کھڑا تھا۔ بغیر بات کیے مجھے کرنل کے دفتر کے باہر برآمدے میں جا کھڑا کیا۔ وہ وہاں مجھ سے پریڈ کروانے لگا تو کرنل غصے سے باہر نکل آیا۔

صوبیدار میجر صاحب اس جوان کو ایک دم اندر بھیجو۔ پریڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے ہی آپ کی ان پریڈوں نے سب کام خراب کیا ہے۔

میں خود بخود اندر چلا گیا اور صوبیدار میجر کھسیانا سا ہو کر واپس اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ میں اندر گیا تو کرنل نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔

"شیر کا بچہ ہے۔ ہم تم پر بہت خوش ہے۔"

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور دفتر اردلی کو چائے کا آرڈر دیا۔ اس زمانے میں انگریز افسروں کے لیے آفیسر میس کا ایک نوکر ضروری سامانِ خورد و نوش کے لیے ساتھ موجود رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے، کیک اور پیسٹری لے کر اندر آ گیا۔ اس نے سب کو چائے بنا کر دی۔ مجھے بھی دی لیکن میں نے معذرت کر لی۔

تم چائے کیوں نہیں پیتے۔ کرنل نے اچھے موڈ میں مجھ سے پوچھا۔

شکریہ۔ سر۔

کرنل نے مجھے زبردستی چائے پلائی۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

تم بریگیڈیر صاحب کے پاس ڈائریکٹ کیسے پہنچ گئے۔

سر۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کروں گا۔ ہوسکتا ہے آپ کے اور میرے درمیان پھر کوئی ناخوشگوار بات ہوجائے اور خواہ مخواہ بدمزگی ہو۔ تو پھر بریگیڈیر صاحب اور ان کی میم صاحبہ میرے ساتھ بھی ناراض ہوجائیں گے اور میں انہیں کسی قیمت پر بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا۔

تم بہت چالاک آدمی ہو۔ یہ سب باتیں جو تم نے بریگیڈیر صاحب کو درخواست کی صورت میں لکھ کر دی ہیں اگر مجھے دے دیتے تو میں بھی یہی کارروائی عمل میں لاتا۔

نہیں سر۔ جیل جانے کا زیادہ احتمال تھا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہے اُسے تم بھول جاؤ۔ اُس نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس نے صوبیدار میجر کو بلایا۔ وہ جب اندر آیا اور اس نے مجھے کرنل کے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

کرنل نے اس سے کہا۔ صاحب کل صبح لانس نائیک احمد کو آپ مل بریگیڈ سگنل سیکشن میں چھوڑ کر آئیں گے۔ اسے آپ کیپٹن بڑلے کے پاس لے جائیں اور اس کو بتائیں کہ وہ فوراً آپ کے ساتھ جاکر بریگیڈیر روڈھم جو کہ وہاں کا بریگیڈ کمانڈر ہے، اس کے پاس لے جائے۔ آپ نے بریگیڈیر روڈھم صاحب کو رپورٹ کرنا ہے۔ ایک بات کی میں وضاحت کردوں۔ اس جوان کے ساتھ کوئی بھی آدمی اس کیس کے سلسلے میں طنز بھری گفتگو نہ کرے۔ کوئی اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی بھی آدمی اس کے ساتھ بدسلوکی نہ کرے۔ میری ان باتوں پر عمل درآمد کو آپ یقینی بنائیں۔ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جوان بڑے اچھے فوجی خاندان کا فرد ہے۔ اگر آپ اس سے عزت سے پیش آئیں گے تو یہ ایک اچھا اور مثالی سپاہی ثابت ہوگا۔

بہت اچھا سر۔ صوبیدار میجر جو پہلے ہی اٹینشن کھڑا تھا۔ کرنل کو سلوٹ کیا اور

دفتر سے باہر نکل گیا۔ صوبیدار میجر کے جانے کے بعد کرنل مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

اچھا۔ احمد اب تم بھی جاؤ۔ ٹل جانے کی تیاری کرو۔ میں کیپٹن برے کو کہہ دوں گا وہ آپ کو ایک دو دن میں ایک ماہ کی چھٹی پر بھیج دے گا۔

شکریہ۔ سر۔ اور میں کرنل کو سلام کر کے بٹالین آفس سے اپنی بیرک کی طرف چلا گیا۔

میں کوہاٹ ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے محسن برگیڈیر جان رائٹ کی بات کو ٹھکرا نہ سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ برگیڈیر صاحب کو اسی جگہ پر یہ خیال ہو گا کہ یہاں سب آفیسرز اور سردار صاحبان (جے۔ سی۔ او) میری مخالفت پر کمر باندھ لیں گے اور میرا جینا دوبھر کر دیں گے۔ اس لیے انہوں نے میرا تبادلہ ٹل برگیڈ سگنل سیکشن میں کروا دیا تھا۔ اور پھر وہاں انہوں نے برگیڈیر رڈھم صاحب کو میری ضروری دیکھ بھال کرنے کی التجا بھی کی۔

۵

یونٹ کے بہت سے پنڈت اور پٹھے خانوں نے مختلف طریقوں اور حیلوں بہانوں سے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ یہ سب کچھ کیوں کر ہوا ہے۔ میں نے ہر آدمی کے سامنے لاعلمی کا اظہار کیا اور کسی کو بھی اس سب صورتِ حال اور اس کی جزئیات سے آگاہ نہ ہونے دیا

میرے پاس کوئی زیادہ سامان نہ تھا۔ اس لیے مجھے کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے میں سرِ شام ہی چچا گل شیر خان اور میم صاحبہ کو ملنے کے لیے چلا گیا۔ چچا نے مجھے دور سے دیکھا تو "زندہ باد" کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔ اور کچن کے برآمدے سے اُتر کر میرا استقبال کیا۔ بڑے ہی تپاک سے ملا۔ چائے پلائی اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

یارا تم نے تو ہم سے بات نہیں بولا۔ پر جرنیل صاب (برگیڈیر صاحب کو وہ جرنیل صاحب کہا کرتا تھا) نے خو ہم کو پورا بات بتایا ہے۔ خو۔ میم صاب تمہارا

ادھر سے جانے پر خوش نہیں ہے۔ وہ تم کو بالکل اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ اب میں جاتا ہوں اس کو بتاتا ہوں کہ آپ کا جو آپ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ خدا کی قسم وہ بہت خوش ہوگی۔ یار احمد۔ بے چاری کا اپنا کوئی بیٹا یا بیٹی نہیں ہے۔ وہ یہ کمی بہت شدت سے محسوس کرتی ہے۔ اگر تم ٹل نہیں جانا چاہتے تو میم صاحب سے کہہ دو۔ وہ سب انتظام خود کرلے گی۔

نہیں۔ نہیں چچا۔ اب جو کچھ ہو چکا ہے۔ وہی کافی ہے۔ مجھے برگیڈیر صاحب سے شرم آتی ہے۔ یہ سپاہیانہ شان کے خلاف بات ہے۔ نہ میں میم صاحبہ سے ایسی کوئی بات کروں گا اور نہ ہی آپ کریں۔

میں چائے پی چکا تو چچا مجھے میم صاحبہ کے پاس لے گیا۔ مجھے باہر برآمدے میں ٹھہرایا اور خود اندر میم صاحبہ کو اطلاع دینے کے لیے چلا گیا۔ میری آمد کا سن کر وہ نیک دل خاتون فوراً ہی باہر نکل آئی۔ اور پھر مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

برگیڈیر صاحب کہاں ہیں؟۔ میں نے لیڈی رائٹ سے پوچھا۔

جان۔ ابھی تک سو رہا ہے۔ وہ اپنے خاوند کو پیار سے جان کہتی تھی۔ ویسے نام بھی اُن کا جان رائٹ تھا۔ اِس مناسبت سے بھی جان ٹھیک تھا۔

میں آپ سے الوداعی ملاقات کرنے آیا ہوں۔ کل صبح سویرے میں ٹل چلا جاؤں گا۔

مجھے جان نے سب کچھ تفصیل سے بتایا ہے۔ چھٹی پر کب جاؤ گے؟

اُمید ہے دو تین دن لگ جائیں گے۔

ٹل سے جب چھٹی پر آؤ گے تو سیدھے اِدھر ہی آنا۔ یونٹ لائینز میں جا کر کیا کرو گے؟

بہت اچھا میڈم۔

ابھی ہم بیٹھے بات چیت کر رہے تھے کہ برگیڈیر صاحب گاؤن پہنے ہوئے

اور سگار پیتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

میں نے آگے بڑھ کر اُن کو سلام کیا اور ان سے مصافحہ کیا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں چچا گل شیر خان چائے کی ٹرالی لے آیا

بریگیڈیر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ احمد تم کل صبح ملتان جارہے ہو۔

جی جناب۔ جارہا ہوں۔

کرنل نے صوبیدار میجر کو کہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر آئے۔

میں نے بریگیڈیر رودھم سے آج آپ کے متعلق بات کی ہے۔ پھر بریگیڈیر صاحب نے تمہارے نئے او۔ سی۔ کیپٹن بَبّے سے بھی میری بات کروائی۔

میں نے اُسے بھی سمجھا دیا ہے۔

وہاں آپ ٹھیک رہیں گے۔ بریگیڈیر صاحب آپ کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے۔

سر۔ بہت شکریہ آپ کا۔ اگر آپ اس نازک موقعہ پر میری مدد نہ کرتے تو حالات مزید خراب ہو جاتے اور شاید نوبت سول جیل تک جا پہنچتی۔

تم چھٹی سے واپسی پر مجھ سے اور میم صاب سے مل کر ملتان جانا۔

سر ضرور مل کر جاؤں گا

۔۔۔

تھوڑی دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اُن سے اجازت طلب کی۔ میم صاحبہ نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ لیکن میں نے معذرت کر لی۔ ابھی مجھے اپنے شاعر دوستوں سے بھی ملنا تھا۔

بریگیڈیر صاحب نے چچا گل شیر کو آواز دی۔

چچا بھاگتا ہوا آیا۔

خان ذرا ڈرائیور کو بلاؤ۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبا تڑنگا خوبرو جوان صاف ستھرے پرائیویٹ

کپڑوں میں ملبوس برگیڈیر صاحب کے پاس آیا اور آتے ہی فوجی انداز سے ان کو سیلوٹ کیا۔

برگیڈیر صاحب نے اس ڈرائیور سے کہا۔ فتح خان۔ میم صاحب کے مہمان کو گنگ گیٹ کے پاس چھوڑ کر آؤ۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ فلیگ سٹاف کار لے کر آیا۔ میں برگیڈیر صاحب اُن کی میم صاحب اور چچا گل شیر خان سے مل کر رخصت ہوا۔

مَیں نے بجائے گنگ گیٹ جانے کے فلیگ سٹاف کار پر اپنی یونٹ لائینز آگیا۔ جونہی ہماری گاڑی یونٹ لائینز میں داخل ہوئی، ایک افراتفری سی مچ گئی۔ فتح خان مجھے میری بیرک کے سامنے اُتار کر واپس چلا گیا۔ میری یہ ایک نہایت ہی بچگانہ بلکہ احمقانہ حرکت تھی۔ مَیں بزعم خود یونٹ والوں پر ایک طرح کا رُعب جمانا چاہتا تھا۔ اب مَیں زندگی کے اِس مرحلے پر پہنچ کر سمجھتا ہوں کہ یہ میرا اچھوپن تھا۔ سنجیدہ لوگوں نے اس کا کوئی اچھا اثر نہ لیا ہوگا۔ حالانکہ مَیں نے سب لوگوں سے یہ کہا کہ سٹاف کار کا ڈرائیور میرا عزیز ہے جو مجھے چھوڑنے آیا تھا۔

## ۵

دوسرے دن صبح سویرے ڈیوٹی ٹرک آگیا۔ میں نے اپنا سامان اٹھا کر ٹرک میں رکھ دیا۔ اور پھر لنگر سے چائے پینے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں صوبیدار میجر بھی آگیا۔ اس کے ساتھ حوالدار محمد یعقوب اور نائیک سردار خان بھی تھے۔ میں نے صوبیدار میجر کو سلام کیا۔ اُس نے بڑی بے دلی سے مجھے جواب دیا۔ میرے ساتھ اس نے کوئی بات چیت نہ کی۔ مَیں بھی ایک متکبر آدمی سے بات چیت نہ کرنا چاہتا تھا۔ صوبیدار میجر ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم تینوں پیچھے بیٹھ گئے۔ وہاں سے چلے تو گاڑی یونٹ کوت کے پاس جا کر رُکی۔ میرے سوا ان تینوں نے اپنے اپنے ہتھیار کوتوں سے اشو کروائے۔ مل جانے والے

فوجی سفر میں اپنے ہتھیار اپنے پاس ہی رکھتے تھے۔ چونکہ ہنگو سے آگے دوآبہ کے ایریا میں کئی دفعہ پہلے پٹھان آنے جانے والے فوجیوں پر حملہ کر چکے تھے۔ ہتھیار لینے کے بعد ہم ٹرک میں بیٹھ کر ٹل کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹل کوہاٹ سے جانب غرب ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ دریائے کرم کے کنارے پر ایک چھوٹا سا تجارتی مرکز ہے۔ شہر کے نزدیک ہی ایک بڑے مضبوط قلعے میں فوج رہتی ہے۔ دریائے کرم ٹل کے پاس شمالاً، جنوباً بہتا ہے۔ دریا کے مغرب میں علاقہ غیر ہے۔ قلعہ سے باہر بھی تھوڑی سی فوج رہتی ہے۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر قلعہ کے اندر ہی تھا۔ سگنل سیکشن بھی قلعہ کے اندر تھی۔

ہم راستے میں تھوڑی دیر کے لیے ہنگو میں رُکے۔ ان تینوں نے ایک قہوہ خانے سے چائے پی۔ میں ٹرک ہی میں بیٹھا رہا۔ نہ ہی انہوں نے مجھے بلوایا۔ اور نہ ہی میں خود گیا۔ تقریباً ساڑھے دس بجے صبح ہم ٹل کے قلعہ کے مین گیٹ پر جا پہنچے۔ وہاں سنتری نے ہمیں روکا۔ قلعہ کے گیٹ سے ملحق اندر کی طرف گارڈ روم تھا۔ سنتری نے گارڈ روم میں اطلاع کی۔ گارڈ کمانڈر گیٹ پر آیا۔ یہ گارڈ پنجاب رجمنٹ کی تھی۔ اس گارڈ کمانڈر نے ہم سب کی پے بکس (PAY BOOKS) اور دیگر متعلقہ کاغذات چیک کیے اور پھر اُس نے سگنل سیکشن میں ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے اجازت ملنے پر گارڈ کمانڈر نے ہمیں قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اور ہمیں ایک پرمٹ جاری کر دیا۔ مین گیٹ کے نزدیک جانب غرب تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر سگنل سیکشن کی لائینز تھیں اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا دو منزلہ دفتر تھا۔ ہمارا ٹرک اُسی دفتر کے سامنے جا کر رُکا۔ صوبیدار میجر کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ صوبیدار عدالت خان عرف بابا ڈورا ان کو لے کر بڑے صاحب کے دفتر میں چلے گئے۔ میں ان دوسرے آدمیوں کے ساتھ وہاں ٹرک کے پاس ہی کھڑا رہا۔ البتہ اپنا سامان اُتار کر ملحقہ بارک کے برآمدے میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار میجر، کیپٹن بڑے اور بابا ڈورا دفتر سے باہر آئے۔ میرے قریب آ کر صوبیدار

میجر نے اُسی انگریز کپتان کو بتایا۔

سَر۔ یہ ہے وہ جوان جسے مَیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ مہربانی سے ہمارے ساتھ چلیں۔ کرنل صاحب نے ہدایت کی تھی کہ اس جوان کو سب سے پہلے برگیڈیر روڈھم صاحب کے سامنے مَیں لے جا کر پیش کروں۔

ٹھیک ہے صاب۔ مجھے پتہ ہے۔ کرنل صاحب نے اور دونو برگیڈیر صاحبان نے میرے ساتھ اس جوان کے متعلق تفصیل سے بات کی ہے۔ آئیے آپ چلیں۔ کیپٹن بَرے برگیڈ دفتر کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہوئے ہمارے آگے آگے چل پڑا۔

کیپٹن کنگھم بَرے۔ صوبیدار میجر اور مَیں ہم تینوں برگیڈ ہیڈ کوارٹر چلے گئے جو ہماری لائینز کے بالکل قریب تھا۔ کیپٹن بَرے برگیڈ میجر کے دفتر کی چِک اُٹھا کر اندر چلے گئے۔ کوئی زیادہ دیر نہ گذری ہو گی کہ انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ برگیڈیر روڈھم بڑا ہی بارعب انگریز تھا۔ اس نے بڑی بڑی سفید مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ برگیڈیر صاحب نے بَرے صاحب کو اور مجھے اپنے دفتر میں کرسیوں پر بٹھایا۔ چائے پلائی اور پھر کیپٹن بَرے سے کہنے لگے۔

کیپٹن۔ ٹو۔ مک۔ آفر۔ دِس بوائے۔ ہی۔ از۔ سَن آف مسٹر جان ایٹ پلیز سینڈ۔ ہم۔ آن۔ لیو۔ ٹو۔ ڈے۔

آل رائیٹ سَر۔

برگیڈیر صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ڈونٹ۔ وری۔ مائی ڈیر۔ احمد۔

اور پھر ہم دونو سلام کر کے واپس ہو آئے۔ بیرکس میں آئے تو بابا ڈورا کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو اور صوبیدار میجر کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگا۔ بابا ڈورا بڑا ہی جہاندیدہ آدمی تھا۔ بڑی دیر تک مجھے متجسسانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ صوبیدار میجر کو بابا ڈورا اپنے ساتھ لے گیا۔ حوالدار یعقوب اور نائیک سردار کو حوالدار چراغ علی لے گیا۔ میں اور ڈرائیور رہ گئے۔ ہمارا کوئی واقف کار نہ تھا کہ جو ہمیں ساتھ لے جا کر میس پر کھانا کھلاتا۔

فوج میں کھانے کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کے پاس اپنی پلیٹ اور مگ ہوتا ہے۔ وہ فوج میں جہاں کہیں بھی جائے وہاں کے لنگر پر جا کر اپنے لیے کھانا لے سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اپنے لیے اور ڈرائیور کے لیے میں کھانا لے آیا۔ اور بیرک کے برآمدے میں پڑے ہوئے بنچوں اور میزوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

اس سیکشن کی سو کے قریب نفری تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اتنے آدمیوں میں میرا کوئی بھی جاننے والا نہ نکلا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی بعد صوبیدار میجر اور اس کے ساتھی واپس کوہاٹ چلے گئے۔ چلتے وقت صرف ڈرائیور نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے بھی دوسرے کی کمی کی پرواہ نہ کی۔ صوبیدار میجر کے چلے جانے کے بعد کیپٹن کننگھم بڑے نے مجھے بلایا۔ حوالدار چراغ علی اور بابا ڈورا مجھے مارچ کر کے اندر لے گئے۔ اس نے مجھ سے دو چار رسمی سی باتیں پوچھیں۔ پھر ان دونوں کو کہا کہ اب آپ لوگ جائیں۔ اپنا کام کریں۔ وہ دونوں جب او۔ سی کے دفتر سے چلے گئے۔ تو مجھے کیپٹن بڑے صاحب نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔ بڑے صاحب بڑا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا انگریز تھا۔ نہایت مہذب طریقے سے گفتگو کرتا تھا۔ مجھ سے میرے پورے حالات پوری تفصیل سے سنے۔ اس دوران وہ کبھی کبھی ہلکا سا مسکرا دیتا۔ جب مجھ سے بات چیت کر چکا تو پھر بابا ڈورا کو بلایا۔

صوبیدار صاحب۔ کل آپ امجد کو ایک ماہ کی چھٹی پر بھیج دیں۔ اس کو ایک ماہ کی تنخواہ بطور ایڈوانس آج ہی دے دیں اور حوالدار چراغ علی کو کہیں کہ اس کا سامان سٹورز میں جمع کرے۔ آپ ایک حوالدار یا نائیک اور تین سپاہی اس کے ساتھ بھیجیں جو اسے یونٹ کی گاڑی میں لے جا کر کوہاٹ کے بریگیڈ کمانڈر صاحب

کے بنگلے پر چھوڑ آئیں۔ میں نے اس کی رپورٹ یہاں اپنے بریگیڈ کمانڈر صاحب بریگیڈیر روڈھم صاحب کو دینا ہے۔

سر۔ کل تو سکیم باہر جا رہی ہے۔ اس کو بھی میں ایک وائرلیس سٹیشن کے ساتھ باہر بھیجوں گا۔ سکیم سے واپس آکر پھر اسے چھٹی پر بھیج دوں گا۔

صاحب اپنے کرنل صاحب اور کوہاٹ کے بریگیڈ کمانڈر صاحب نے کہا ہے۔ ان کی بات تو ماننی پڑے گی۔

سر یہ لانس نائیک ہے۔ اس کو اس کے سٹیٹس (STATUS) کے مطابق ہی ڈیل (DEAL) کیا جانا چاہیئے۔ اس طرح تو یہ سر پر چڑھ جائے گا۔

میرا خیال ہے صوبیدار میجر صاحب آپ کو پوزڈ (POSED) کر گیا ہے۔

ہاں سر۔ اس جوان کے متعلق انہوں نے مجھے بھی خصوصی ہدایات دی ہیں۔

صاحب۔ آپ میری بات سنیں۔ کیپٹن برے نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے سر۔ آپ جو بھی حکم دیں گے۔ اس کی تعمیل ہوگی۔

بابا ڈورے نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایڈوانس تنخواہ دی۔ جو سامان میں نے سٹورز میں جمع کروانا تھا، وہ الگ کر لیا۔ اسی شام میری چھٹی کا پارٹ ون آرڈر ہو گیا۔ ساتھ ٹرک اور گارڈ جنہوں نے مجھے کوہاٹ تک لانا تھا ان کا بھی آرڈر ہو گیا۔ رات میں نے جوں توں کر کے کاٹی۔ صبح سویرے میں نے اپنا سامان جوالدار چراغ علی کے پاس جمع کرا دیا۔ اور سویلین کپڑے پہن کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے لنگر سے اپنا ناشتہ کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر میں ان ساتھیوں کی معیت میں کوہاٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کوئی دس بجے کے لگ بھگ ہم کوہاٹ پہنچ گئے۔ وہ آدمی مجھے بریگیڈیر جان رائٹ صاحب کے بنگلے پر چھوڑ کر واپس پلٹ گئے۔ ٹل سے چلے تو راستے میں انہوں نے مجھ سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں؟ میرے ساتھ یہ خصوصی طور پر امتیازی برتاؤ کیوں

کیا جا رہا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے۔ آپ نے بہادری کا کوئی تمغہ حاصل کیا ہے۔ آپ جہاں بھی جاتے ہیں آپ سے خصوصی طور پر اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

میں نے ہر بات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ مجھے برگیڈ ہاؤس کے گارڈ میں اتار کر چلے گئے۔ وہاں نئے سرے سے گارڈ والوں نے چھان پھٹک شروع کر دی۔ میں نے گارڈ کمانڈر کو بتایا کہ میں چچا گل شیر خان کا بھتیجا ہوں۔ ان کو ملنے کے لیے آیا ہوں۔" "ذرا ان کو بلا دیں" ایک سپاہی چچا کو بلا لایا۔ چچا نے مجھے دور دیکھا تو ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ پاس آیا تو مجھ سے گلے ملا۔ اور پھر میرا سامان اٹھا کر بجائے سرونٹ کوارٹر کی طرف جانے کے بنگلے کے اندر لے چلا۔ میں برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اندر گیا اور میم صاحبہ کو ساتھ لے آیا۔ اس خاتون نے بڑے پیار اور محبت سے میرے دونوں گال تھپتھپائے اور پھر اپنے ساتھ مجھے اندر لے گئی۔ وہ مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر چچا گل شیر کو چائے کے لیے کہنے چلی گئی۔

میم صاحبہ واپس آئی تو میں نے پوچھا۔

میڈم۔ برگیڈیر صاحب دفتر گئے ہیں۔

جی ہاں۔ میم صاحبہ نے نہایت مروت سے جواب دیا۔

کتنے بجے آئیں گے۔

اب لنچ پر ہی آئیں گے۔ کیوں آپ کو کوئی جلدی ہے۔؟

نہیں کوئی جلدی نہیں۔ ویسے پوچھا ہے۔

تمہاری گاڑی رات کو کتنے بجے جاتی ہے۔

دس بجے رات کو جاتی ہے۔

پنڈی سے پھر آپ کس طرف جائیں گے!

نہیں میڈم میں پنڈی نہیں جاؤں گا۔ کوہاٹ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے

پوجنڈ ایک چھوٹا سا جنکشن ہے۔ یہ گاڑی تقریباً بارہ بجے رات وہاں پہنچ جاتی ہے وہاں میں اس گاڑی سے اُتر جاؤں گا۔ ایک گاڑی کیمبل پور سے ملتان جاتی ہے اس پر سوار ہو کر کوئی ساتھ بجے کے لگ بھگ میانوالی پہنچ جاؤں گا۔

آپ کا ریلوے سٹیشن میانوالی ہے۔

جی ہاں۔

پھر وہاں سے تمہارا گاؤں کتنی دور ہے۔ پھر گاؤں کس طرح جاؤ گے۔ گاؤں کا نام کیا ہے؟

میڈم۔ میرے گاؤں کا نام وندہ شاہ بلاول ہے۔ جو میانوالی سے تیس میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ ایک پرانی پھٹیچر سی لاری چلتی ہے۔ جس میں بڑی مشکل سے جگہ ملتی ہے۔ وہ لاری ہمارے گاؤں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر پہنچ کر پھر ایک بڑے سے قصبہ کی طرف مڑ جاتی ہے۔ وہاں ایک ڈھوک ہے جو آدمی بھی اُس لاری سے اُترتا ہے اس ڈھوک پر اپنا سامان رکھ کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ وہاں سے پھر کوئی آدمی آتا ہے اور گدھے پر سامان لاد کر گاؤں لے آتا ہے۔

احمد۔ یہ ڈھوک کیا چیز ہوتی ہے۔؟

میڈم۔ لوگ گاؤں سے دُور اپنی زرعی زمینوں ہی میں اپنے رہائشی مکانات بنا لیتے ہیں۔ تاکہ اُن زمینوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں۔ کھیتوں میں بنے ہوئے اُن گھروں کو ڈھوک کہتے ہیں۔

احمد۔ وس۔ اِز۔ ونڈر فل۔ میں سوچ رہی تھی کبھی تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں جاؤں گی۔ تمہارے ماں۔ باپ اور تمہاری میم صاب (بیوی) سے ملوں گی لیکن اِن حالات میں تو جانا بہت مشکل ہے۔

میڈم۔ میں دو سال کا تھا کہ میری ماں مر گئی اور اٹھارہ سال کا ہوا تو باپ بھی مر گیا۔ اب میرے گھر میں میری بیوی اور ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ میڈم ہمارے

گاؤں میں زندگی کی سب بنیادی سہولتیں مفقود ہیں۔ اوّل تو آپ میرے گاؤں تک پہنچ ہی نہیں سکتیں اور اگر کسی طرح پہنچ بھی جائیں تو آپ وہاں ایک دن بھی نہیں رہ سکتیں۔ وہاں زندگی اتنی سخت ہے کہ آپ لوگ وہ سختیاں نہیں جھیل سکتے۔

وہ کیوں۔ لیڈی رائٹ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے دھوئیں سے اَٹے ہوئے کچے مکان ہوتے ہیں۔ وہاں نہ غسلخانہ ہوتا ہے اور نہ ہی لیٹرین۔

تو آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔؟

رفع حاجت کے لیے ہم لوگ باہر کھیتوں میں چلے جاتے ہیں اور نہانے کے لیے گاؤں کے قریب ایک نالہ ہے اس پر جاکر نہا لیتے ہیں۔

لیڈیز (LADIES) کیا کرتی ہے!

وہ بھی یہی ذرائع استعمال کرتی ہیں۔ صدیوں سے یہی طریقہ چلا آرہا ہے۔ اسے ہم کوئی پرابلم ہی نہیں سمجھتے۔

نو۔ نو۔ احمد۔ یہ سب کچھ بہت مشکل ہے۔ تو میں پھر آپ کے ساتھ نہیں آسکوں گی۔

میں اور میم صاحبہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے خشک میوہ جات کھا رہے تھے کہ باہر سٹاف کار آکر رکی۔ بریگیڈیر صاحب کار سے اُتر کر اندر ڈرائینگ روم میں آگئے۔ جونہی ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

"او۔ ونڈرفل۔ احمد۔ از۔ ہیر۔"

وہ مجھ سے مصافحہ کرکے اندر چینج (CHANGE) کرنے کے لیے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ گاؤن پہنے واپس آگئے۔ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھنے لگے۔

"ہاں تو میرے بیٹے کیسی گذری!"

سر۔ حالات بالکل ٹھیک رہے۔ آپ کے سیٹل کیے ہوئے پروگرام کے مطابق سب کچھ بخیر و خوبی احسن طریقے سے انجام پذیر ہوا۔ یہاں سے صوبیدار میجر مجھے وہاں چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں پر کیپٹن کنگھم بڑے نے بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ مجھے برگیڈیر روڈھم صاحب سے بھی ملا لائے۔ برگیڈیر صاحب بھی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے سب متعلقہ لوگوں کو میرے متعلق ہدایات دیں۔ البتہ وہاں ایک بابا ڈورا نام کا صوبیدار ہے اس کا رویہ معاندانہ رہا۔ لیکن ایک موقعہ پر بڑے صاحب نے اس کو بھی جھاڑ پلائی تو وہ بھی ٹھیک ہو گیا سر صحیح صورت حال تو تب واضح ہو گی جب میں چھٹی گذار کر واپس آؤں گا۔

او۔ ڈونٹ وری۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

چچا گل شیر اور بیرا دونوں اندر آئے اور انہوں نے میم صاحبہ سے کھانا لگانے کی اجازت طلب کی۔ میں نے برگیڈیر صاحب سے کہا۔

سر۔ میں چچا گل شیر کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ انگریزی طرز کا کھانا نہ مجھے کھانے کا سلیقہ آتا ہے اور نہ ہی یہ کھانا مجھے اچھا لگتا ہے۔

درمیان میں میم صاحبہ بول اٹھیں۔ احمد۔ تمہارے لیے گل شیر خان نے الگ دیسی حلال کھانا پکایا ہے۔ صرف ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر تم کھانا کھا لو۔

نہیں میڈم۔ مجھے شرم آتی ہے۔

کیوں کس سے شرم آتی ہے۔!

میں نے آج تک کبھی کسی خاتون کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔

تم اپنی میم صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا اکٹھے نہیں کھاتے۔

نہیں میڈم۔ ہمارا یہ کسٹم نہیں ہے۔ ہم عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔

میز پر سب اکٹھے بیٹھ کر نہیں کھاتے۔

نہیں میڈم۔ ہمارے ہاں کھانے کی کوئی میز نہیں ہوتی۔ مکانوں

کے باہر ایک کھلا چولہا نہ رباورچی خانہ) ہوتا۔ اس میں سب خاندان کے افراد پیڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ گھر کی جو بڑی عورت ہوتی ہے وہ مردوں کو الگ کھانا دیتی ہے اور بچوں کو الگ۔ جب مرد اور بچے کھا لیتے ہیں تو عورتیں بعد میں کھاتی ہیں۔

دِس - اِز - سٹرینج (یہ عجیب و غریب ہے)

چچا گل شیر اور بیرے نے کھانا لگا دیا۔ میرے لیے ایک صاف ستھرے سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی دو تین توے کی پتلی پتلی سی چپاتیاں تھیں۔ نہ جانے چچا نے آٹے کا انتظام کہاں سے کر لیا تھا۔ میرے لیے ایک حلال مرغ پکا ہوا ایک الگ ڈونگے میں رکھا تھا۔ میں نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا شوربا الگ نکال لیا اور کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چپاتی نکال کر دوسری پلیٹ میں رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے باورچی ہندوستانی کھانے کچھ نہیں پکاتے چچا گل کا پکایا ہوا مرغ مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ نہ اس میں لال مرچ نہ گرم مصالحہ جب تک کھانا چٹپٹا نہ ہو ہم لوگوں کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

میم صاحبہ نے مجھے گوشت کھانے کی ترغیب دی لیکن میں نے ان کو بتا دیا کہ میں گوشت نہیں کھاتا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر میرا منہ تکنے لگ گئی۔

تم کیسے مسلمان ہو۔ حلال گوشت بھی نہیں کھاتے۔ لیڈی رائٹ نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

میڈم میں بچپن سے گوشت نہیں کھاتا۔

وہ کیوں۔

بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔

اس کی کوئی خاص وجہ ہو گی۔

میں نے اس بات کا کبھی سنجیدگی سے نفسیاتی تجزیہ تو نہیں کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک چھوٹے سے واقعہ کا ایک منطقی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہ

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب میں چھوٹا سا بچہ تھا تو ایک دن میرے والد نے میری موجودگی میں ایک مرغ ذبح کیا۔ ذبح کرنے کے بعد جب اسے چھوڑا تو وہ بہت دیر تک تڑپتا رہا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اس دن سے مجھے گوشت کھانے سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اب جب کبھی میرے سامنے کوئی ایسی ڈش آتی ہے تو فوراً میری آنکھوں کے سامنے وہ تڑپتا ہوا مرغ آجاتا ہے۔ جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تڑپنا شروع کر دیتا ہے۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ میرے خیال میں تم نے یہ تجزیہ خوب ٹھیک کیا ہے اس طرح تمہارا یہ کمپلیکس ڈیولیپ ہو گیا ہے اور تمہاری مستقل عادت بن گیا ہے۔

کھانا کھا چکے تو چچا گل شیر ایک بڑے سے ٹرے میں انواع و اقسام کے پھل رکھ کر لے آیا۔ سب نے اپنی اپنی چوائس کا پھل ٹرے سے اٹھایا اور اس طرح کھانے سے ہم نے فراغت پائی۔

## ۵

احمد اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ بریگیڈیر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

سر میری گاڑی رات کو دس بجے جاتی ہے۔ اب میں اپنی یونٹ میں اپنے ساتھیوں سے ملنے جاؤں گا۔ رات کا کھانا وہاں سے کھا کر کوئی آٹھ بجے کے لگ بھگ یہاں واپس آجاؤں گا۔

کھانا تم ادھر آکر کھانا۔ بریگیڈیر صاحب نے تاکید کے انداز میں کہا۔

نہیں سر۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ میں رات کا کھانا وہاں دوستوں کیساتھ کھاؤں گا۔

اچھا تمہاری مرضی۔

گل شیر خان، فتح خان کو بلاؤ۔

بہت اچھا سر۔

فتح خان آگیا تو بریگیڈیر صاحب نے اس سے کہا۔

فتح خان تم سٹاف کار پر احمد کو کوہاٹ سگنل میں چھوڑ کر آؤ۔

بہت اچھا سر۔ فتح خان تھوڑی دیر کے بعد سٹاف کار لے آیا۔

میں سٹاف کار میں بیٹھ کر میکوین لائینز میں جا پہنچا۔ دوستوں نے میرے ٹھاٹھ دیکھے تو وہ حیران رہ گئے۔ البتہ صوبیدار میجر نے مجھے بڑے غصے اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ میں نے دستور کے مطابق اس کو سلام کیا۔ تو اس کا جواب بھی اس نے بے دلی سے دیا۔

۵

ہم فوجی سر شام ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اکثر دوست مجھ سے میرے کورٹ مارشل کے متعلق سوالات کرتے رہے۔

۱۔ یہ سب کچھ آن کی آن میں کیسے ہو گیا۔

۲۔ بریگیڈیر صاحب سے تم نے کیسے واقفیت نکال لی۔

۳۔ سنا ہے اپنے کرنل صاحب اور کیپٹن شاہانی صاحب کو بریگیڈیر صاحب نے خوب جھاڑ پلائی ہے۔

۴۔ کوئی کہتا۔ سنا ہے۔ بریگیڈیر صاحب تمہارے والد صاحب کے دوست ہیں۔ ان دونوں نے جنگِ عظیم اول میں ایک ہی یونٹ میں نوکری کی ہے۔

لیکن میں نے ان کو بتایا یہ سب غلط ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور پھر میں نے ان کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا دیا۔

آٹھ بجے رات بریگیڈیر صاحب کا ڈرائیور فتح خان سٹاف کار لے کر میکوین لائینز مجھے لینے کے لیے آ گیا۔ میں دوستوں سے مل کر کار میں جا کر بیٹھ گیا اور

تقریباً پانچ منٹ کے بعد فلیگ سٹاف ہاؤس پہنچ گئے۔ میم صاحبہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ برگیڈیر صاحب کلب گئے ہیں۔ ساڑھے نو بجے واپس آ جائیں گے اور پھر ہم سب آپ کو گاڑی پر بٹھانے کے لیے ریلوے سٹیشن آئیں گے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ڈرائینگ روم میں لے گئی اور ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چچا گل شیر خان ہم دونو کے لیے کافی لے آیا۔

ساڑھے نو بجے برگیڈیر صاحب کلب سے واپس آ گئے۔ اور پھر ہم سب اسی کار میں ریلوے سٹیشن کے لیے روانہ ہو گئے۔ اگرچہ میرا سامان مختصر سا تھا لیکن چچا نے وہ سامان مجھے اُٹھانے نہ دیا۔ ہم سب سیڑھیاں چڑھ کر بڑے ہال میں آ گئے۔ برگیڈیر صاحب تین پلیٹ فارم کے ٹکٹ لے آئے اور پھر مجھ سے ریلوے وارنٹ لے کر متعلقہ کاؤنٹر پر ٹکٹ لینے گئے۔ ریلوے کے عملہ میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ سٹیشن ماسٹر دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی برگیڈیر صاحب کو سلام کیا اور کہا۔

سر۔ آپ ویٹنگ روم میں بیٹھیں میں ٹکٹ بنوا کر لے آتا ہوں۔

بہت شکریہ آپ کا۔ میں خود یہاں سے ٹکٹ لے لوں گا۔

کاؤنٹر کلرک نے ترجیحی بنیادوں پر ٹکٹ اشو کر دیا۔

سر یہ تو تھرڈ کلاس کا لگتا ہے۔ سٹیشن ماسٹر نے کہا۔

ہاں یہ میرے بیٹے کا ہے۔ برگیڈیر صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

برگیڈیر صاحب ٹکٹ لے کر آئے تو ہم سب اندر پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر بہت پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ اس لیے سب ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ہم سب نے پوری گاڑی کا چکر کاٹا۔ کہیں بھی کوئی خالی نشست نظر نہ آئی۔ سٹیشن ماسٹر نے یہ بات نوٹ کی۔ اس لیے وہ برگیڈیر صاحب

کے پاس آیا۔

سَر۔ آپ کے اس آدمی کو میں گارڈ کے ڈبے میں بٹھا دیتا ہوں۔

پلیز سٹیشن ماسٹر۔ آپ کا شکریہ۔ جگہ مل جائے گی۔ آپ اپنا کام کیجئے۔

بہت سے فوجی جوان جو پہلے سے ڈبوں میں نشستوں پر قبضہ کیے ہوئے تھے، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے آپس میں کچھ صلاح مشورہ کیا کہ ان میں سے ایک چھرتیلا سا فوجی جوان اُتر کر ہمارے پاس آیا۔ بریگیڈیر صاحب کو اٹن شن ہو کر سلام کیا اور کہنے لگا۔

سَر۔ آپ کے اس آدمی کے لیے ہم اپنے ڈبے میں جگہ بنا لیتے ہیں۔

بہت شکریہ آپ کا۔ مہربانی سے ہمارے بیٹے کے لیے آپ ایک سیٹ بنا دیں۔

سَر۔ مَیں ابھی دو منٹ میں بندوبست کر دیتا ہوں۔

وہ جوان لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا اور سب ساتھیوں کو تھوڑا تھوڑا آگے پیچھے کھسکایا اور میرے لیے ایک سیٹ خالی کرا دی۔

وہ نیچے آ کر بریگیڈیر صاحب سے کہنے لگا۔

سَر۔ آپ کے آدمی کے لیے جگہ بن گئی۔

بہت مہربانی آپ لوگوں کی۔ بریگیڈیر صاحب نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا۔

چچا گل شیر نے میرا مختصر سا سامان اُٹھا کر اندر سیٹ پر رکھ دیا۔ مَیں پلیٹ فارم پر کھڑا بریگیڈیر صاحب اور ان کی میم صاحبہ کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی نے وسل دی اور بریگیڈیر صاحب نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ مسز رائٹ نے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور چچا گل شیر خان میرے ساتھ گلے ملا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ مَیں دوڑ کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ مَیں کھڑکی میں کھڑا رہا۔ جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں

ہوئی وہ تینوں ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے سلام کرتے رہے ۔ گاڑی تاریکی میں ڈوب گئی ۔ اور جھلملاتی ہوئی روشنیوں کا وہ شہر مجھ سے دور ہوتا چلا گیا ۔ ٹرین کے باہر چارسُو اندھیرے کا راج تھا ۔ ڈبے کے اندر بیٹھے ہوئے فوجی پیس کوٹ کھیلنے میں مصروف تھے ۔ ایک منچلا سپاہی بڑے ہی پُرسوز انداز میں ہیر وارث شاہ گا رہا تھا ۔ ان ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا ۔

یہ بریگیڈیر صاحب آپ کو کیوں گاڑی پر بٹھانے آئے تھے ۔

کوئی خاص وجہ نہیں ۔ میرے والد صاحب کے دوست ہیں ۔ میں نے بے پر کی اُڑائی ۔ اور اس طرح انہیں مطمئن کر دیا ۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ تاش کھیلنے میں شامل کر لیا ۔ ان جوانوں میں دو جوان میانوالی کے تھے جب انہیں پتہ چلا کہ میں نے بھی میانوالی جانا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے ۔

تھوڑی دیر کے بعد جنڈ کا ویران اور سنسان جنکشن آ گیا ۔ نہ کوئی پلیٹ فارم نہ کوئی دکان ۔ ٹرین سے اُتر کر ہم ریلوے لائنوں کو پھلانگتے ہوئے ریلوے سٹیشن کی طرف آئے ۔ روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ مٹی کے تیل سے جلنے والے دو لیمپ جو کھمبوں پر نصب تھے ۔ آہستہ آہستہ ٹمٹما رہے تھے اور دور سے انسانی آبادی کا پتہ دیتے تھے ۔ ریلوے سٹیشن سے باہر جا کر چائے پی ۔ تھوڑی دیر کے بعد کیمبل پور سے ملتان جانے والی ریل گاڑی آ گئی ۔ ہمیں اس گاڑی میں سوار ہونا تھا ۔ ہم نے سامان اُٹھا کر پوری گاڑی کا ایک چکر کاٹا ۔ ڈبوں کے اندر لوگ سو رہے تھے اور دروازے اندر سے بولٹ کر رکھے تھے ۔ لاکھ کھٹکھٹانے پر بھی کسی نے دروازہ نہ کھولا ۔ ہم میانوالی جانے والے تین فوجی جوان تھے ۔ آخر کار تنگ آ کر ہم نے ایک کھڑکی توڑنے کی کوشش کی ۔ اس پر ایک آدمی نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ڈبے کا دروازہ کھول دیا ۔ اندر کافی گنجائش تھی ۔ میں نے آسانی سے اپنے لیے جگہ بنا لی ۔ اور اپنے فوجی کمبل لپیٹ کر سیٹ پر لیٹ گیا ۔ جنڈ ریلوے سٹیشن پر غضب کی سردی پڑتی ہے ۔ غالباً اس وجہ سے

کہ وہ دریائے اٹک کے کنارے پر واقع ہے اور مغرب کی سمت سے ہر وقت یخ بستہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہ آئی۔ اور ہم صبح سات بجے تک نہ سو سکے۔ خدا خدا کر کے میانوالی کا ریلوے سٹیشن آیا اور ہم ٹرین سے اتر کر ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئے۔ وہ دوسرے جوان، میانوالی کے گرد و نواح کے رہنے والے تھے۔ اس لیے مجھ سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد اب میں نے اپنے سفر کے مشکل ترین مرحلے کا آغاز کرنا تھا۔

ایک پرانی سی چھٹیچر سی لاری میانوالی سے لاوہ کے لیے کوئی ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ اس کے لیے ٹکٹ حاصل کرنا اس سفر کا سب سے زیادہ مشکل مرحلہ تھا۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور قریب ہی واقع اڈے پر پہنچ گیا ابھی ملتان اور لاہور کی گاڑیاں نہیں آئی تھیں۔ اس لیے رش نہ ہونے کی وجہ سے سیٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور اس طرح میں ٹکٹ لے کر لاری میں بیٹھ گیا اور سامان سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور خود ناشتہ کرنے قریب ہی واقع ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملتان اور لاہور سے آنے والی گاڑیاں بھی یکے بعد دیگرے آ گئیں۔ میں ہوٹل میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ مسافر اپنا اپنا سامان اٹھا کر ریلوے سٹیشن سے باہر آنا شروع ہو گئے۔ میں ناشتہ سے فارغ ہو کر لاری اڈا پر پہنچا تو لاری میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ڈرائیور نے لاری کو ہینڈل کی مدد سے سٹارٹ کیا اور پھر خود آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے میں مشغول ہو گیا۔ ٹکٹوں والی کھڑکی کے سامنے بڑی دھکم پیل دیکھنے میں آئی۔ ٹکٹ کے حصول کے لیے لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا اور لاری نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو لاری میں جگہ نہ مل سکی۔ اب اس کا ان کے پاس کوئی متبادل انتظام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ میانوالی سے تانگہ پر بیٹھ کر چھپیل دبیل تک جائیں اور پھر وہاں سے پندرہ

سولہ میل کا بقایا سفر پیدل طے کریں۔ یا راستے میں موسیٰ خیل اُتر کر کوئی ٹٹو یا بھاڑے کا ٹٹو ہی لیں اور پھر اپنی اپنی منزلِ مقصود کی راہ لیں۔

۵

لاری چل پڑی اور ہم کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب ڈھوک مرچو خیل پر جا پہنچے۔ مجھے یہاں ہی اُترنا تھا۔ میرے ساتھ ایک اور آدمی بھی یہاں اُترا۔ اس کے پاس سامان زیادہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا سامان کسی کے حوالے کرنے کے لیے گیا۔ اور میں اپنا سامان اُٹھا کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ہمارا گاؤں یہاں سے تقریباً پانچ چھ میل شمال مشرق کی جانب تھا۔ میں جس زمانے میں میانوالی میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس وقت بھی ہم اسی راہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ اس لیے یہ راستہ کوئی زیادہ تکلیف دہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں تقریباً بارہ بجے اپنے گاؤں جا پہنچا۔ ہمارے گھر میں میری بہن (بھاوج) اس کے دو بیٹے۔ میری بیوی اور ہماری ایک چھوٹی سی بچی، کل یہ پانچ نفوس مستقل طور پر رہائش پذیر تھے میری آمد پر میرے گھر والوں نے بہت خوشی منائی۔

میں دوپہر کا کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کو اُٹھا تو منہ ہاتھ دھو کر معرکہ نواب خان میں چلا گیا۔ ہمارے ہاں گاؤں میں لوگ فرصت کے اوقات معرکوں (چوپالوں) میں گذارتے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو سب بزرگوں اور دوستوں سے میری ملاقات ہوئی۔ میری یہ ایک ماہ کی رُخصت روزانہ کے انہی معمولات کے مطابق گذرتی رہی۔ آخر کار وہ دن بھی آپہنچا جب میں نے کوہاٹ واپس جانے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ میرا خالہ زاد بھائی اکبر خان اور میرا ایک اور عزیز فتح خان مجھے اڈا مرچو خیل پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ لاوہ سے آنے والی لاری میں بیٹھنے کی اچھی خاصی گنجائش ہوتی تھی۔ اسی لیے مجھے آسانی سے لاری میں جگہ مل گئی۔ کوئی دس بجے کے قریب ہم میانوالی پہنچ گئے۔ دن تھرڈ کلاس کے کھلے مسافر خانہ میں بسر کیا۔

آخر کار شام کو سات بجے کے قریب کیمبل پور جانے والی گاڑی آگئی ہے۔ اور میں اس پر سوار ہو کر بارہ بجے نصف شب کے قریب جنڈ ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا اب میں نے راولپنڈی سے کوہاٹ جانے والی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ کوہاٹ سے میانوالی آنے جانے والوں کے لیے جنڈ ریلوے سٹیشن پر ہمیشہ سیٹوں کے حصول کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چونکہ جب گاڑیاں یہاں پہنچتی ہیں تو مسافر ڈبے بند کر کے سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ لاکھ سر پٹخیں وہ دروازے نہیں کھولتے۔

میں بڑی مشکل سے پھلانگتا ہوا ڈبے کے اندر جا پہنچا۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہ ملی۔ لہٰذا میں نے اپنا فوجی کمبل ڈبے کے فرش پر بچھا دیا اور اس پر مزے سے سو گیا۔ حسبِ معمول گاڑی چار بجے صبح کوہاٹ چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی۔ چونکہ مجھے ٹل جانا تھا جو کوہاٹ سے ساٹھ میل جانب غرب واقع ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کر ریل گاڑی کے ذریعے ہی ٹل چلا جاؤں اس لیے ریلوے سٹیشن سے باہر نہ آیا۔ بلکہ اپنا سامان اٹھا کر ٹل جانے والی چھوٹی پٹڑی کی گاڑی جو ہماری گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی اس میں جا پہنچا۔

کوہاٹ چھاؤنی کا ریلوے سٹیشن ویران ہو گیا۔ ٹل جانے والی گاڑی میں بڑی مشکل سے کوئی بیس پچیس آدمی بیٹھے ہوں گے۔ جس ڈبے میں میں نے اپنا سامان رکھا تھا۔ اس میں کوئی ایک آدمی بھی سوار نہ ہوا۔ میں اس ڈبے سے اتر کر اپنا سامان اٹھا کر اس ڈبے میں جا پہنچا۔ جس میں وہ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آدمی دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پشتو زبان میں اتنی اونچی آواز میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ تقریباً وہ سب کے سب مسافر نسوار کا شوق فرماتے تھے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر ڈبے کے فرش اور دیوار کے زیریں حصے پر جو ان کے نقش و نگار ظہور پذیر ہو رہے تھے وہ دیکھنے سے مجھے گھن آتی تھی۔ لیکن ان نیک بخت لوگوں کو میرا خیال ہے اس کا احساس تک نہ تھا۔ ایک منچلے نے تو ایک چٹکی بھر کر نسوار

اپنے منہ میں رکھی تو مجھے بھی آفر دی کہ میں بھی اس جنتی چیز سے متمتع ہوں۔ میرے مسلسل اسرار پر وہ کہنے لگا۔

" خوبد قسمت آدمی ہے جو نسوار نہیں کرتا۔"

اس پورے ڈبے میں ایک آدمی اکیلا تھا جو اُن سب سے الگ تھلگ بیٹھا اپنے رباب کے تاروں کو درست کر رہا تھا۔ اُسے میری بے چارگی پر رحم آرہا تھا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیتا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔

" ترڑے ماشے "

لیکن میں پشتو زبان سے قطعاً نابلد تھا۔ البتہ اس کے لہجے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس نے کوئی خیر مقدمی کلمات ہی کہے ہیں۔

میں نے جواباً وعلیکم السلام کہا۔

وہ مسکرا پڑا اور مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کوئی فنکار تھا تھوڑی دیر تک اپنے ساز کے تاروں کو درست کرتا رہا۔ کسی کسی وقت وہ اُن تاروں سے کوئی نہایت ہی میٹھی اور کومل سُر نکالتا تو پھر میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگ جاتا۔ میں فنِ موسیقی سے قطعاً نابلد ہوتے ہوئے بھی اس کے فن پر اُسی کو داد دے رہا تھا۔ جس سے وہ بہت خوش ہو جاتا۔ وہ تمام راستے میں رباب بجانے میں محو رہا۔ اور میں نے اس کی کمپنی کو غنیمت جانا۔

ہماری گاڑی کوئی گیارہ بجے دن ٹل قلعہ سے ملحق ریلوے سٹیشن پر جا رکی سب لوگ گاڑی سے اُتر کر ٹل کے بازار کی طرف چلے گئے۔ جو وہاں سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک برساتی نالے کے اس پار شمال مغرب کی جانب واقع ہے۔ اس رباب نے جاتے وقت میرے ساتھ مصافحہ کیا اور ان آدمیوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور میں اپنا

سامان اُٹھا کر قلعہ کے مین گیٹ پر آ گیا۔ گارڈ کمانڈر نے میری چھٹی کے کاغذات اور پے بک (PAY BOOK) وغیرہ دیکھی اور مجھے قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ میں اپنا سامان اُٹھا کر سگنل سیکشن کی بیرک میں آ گیا۔ کوئی جان پہچان والا آدمی نظر نہ آیا۔ میں نے کوارٹر ماسٹر سٹورز سے اپنا سامان برآمد کروایا۔ چارپائی اور کٹ بکس اسٹور کروایا اور پھر سیکشن حوالدار کو چھٹی سے واپس جانے کی اطلاع دینے چلا گیا۔ میں نے سیکشن حوالدار کو سلام کیا اور عرض کی۔

جناب میرا نام احمد ہے۔ میں لانس نائیک ہوں۔ ایک ماہ کی چھٹی گزار کر آج ہی واپس آیا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں اپنا بستر کس کمرے میں لگاؤں۔

ہمارا سیکشن حوالدار چراغ علی تھا جو سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ بھلا مانس آدمی تھا۔ بڑے ہی نرم لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔

میں صوبیدار صاحب سے پوچھ لوں۔

یہ معمولی سی بات ہے۔ صوبیدار صاحب سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟

ضرورت ہے۔ بھئی آپ کو پتہ نہیں۔ وہ کئی دفعہ تمہارے متعلق مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ احمد کب واپس آ رہا ہے؟

ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟

بھئی مجھے تو کچھ خبر نہیں۔

اچھا آپ جا کر پوچھ آئیں۔ میں اپنا سامان لیے اِدھر ہی بیٹھتا ہوں۔ اور پھر حوالدار چراغ علی چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابا ڈورا صوبیدار عدالت خان آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی قصائی کسی بکرے کو دیکھتا ہے اور پھر اندازہ کرنا چاہتا ہے کہ اس میں کتنا گوشت ہے۔

اچھا تو تم چھٹی گزار کر واپس آ گئے ہو۔ بابا ڈورا نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

جناب عالی! آ گیا ہوں۔

چھٹی ٹھیک ٹھاک گذری ہے۔

ٹھیک گذری ہے جناب۔

وہاں تو کوئی جنگ نہیں لڑی۔

جناب میں نے تو کبھی بھی کسی آدمی سے لڑائی نہیں کی۔

تو یہ برما سے لے کر دہلی۔ جالندھر اور کوہاٹ پہنچنے تک تم نے جو کچھ کیا ہے یہ سب کیا ہے؟

جناب عالی!۔ ان سب قضیوں کا تو فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں ہر الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا گیا ہوں۔

اس لیے کہ تم بہت چالاک ہو۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں تمہاری چالاکی نہیں چلے گی۔ اپنا کام سولہ آنے ٹھیک کرنا ورنہ مجھے بابا ڈورا کہتے ہیں۔ میں اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیتا ہوں۔

ٹھیک ہے سر۔ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے بابا ڈورا کی یہ اشتعال انگیز باتیں برداشت کیں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ مجھے محض اس لیے اشتعال دلا رہا ہے کہ میں اس کے گلے پڑ جاؤں اور وہ مجھے کیپٹن کنگھم برے اور بریگیڈیئر روڈھم کی نظر میں ذلیل و رسوا کرا سکے۔ میں سر جھکائے چپ چاپ کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔

اب بولو نا، میں نے سنا ہے تم بڑے پھنے خان ہو۔

نہیں سر۔ میں کوئی پھنے خان نہیں ہوں۔ قسمت کا مارا ہوا ہوں۔ ہر جگہ ناخوشگوار اور ناقابل برداشت حالات و واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتا ہوں، انتہائی مجبوری کے تحت کرتا ہوں۔

تم یہ ڈائریکٹ جرنیلوں اور بریگیڈیروں تک کیسے رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ تم نے تو پوری کور آف سگنل کو بدنام کر دیا ہے۔

سر خدا کے لیے آپ نئے سرے سے میرے زخموں کو نہ چھیڑیئے۔ میرا سامان باہر برآمدے میں پڑا ہے۔ چارپائی لگانے کے لیے جگہ ابھی تک نہیں ملی۔ اب مجھے ہم

اشتعال دلانا چاہتے ہیں تاکہ میں پھر کسی نئے جُرم کا ارتکاب کروں۔ ٹھیک ہے، میں اپنی چارپائی یہاں برآمدے ہی میں لگالیتا ہوں۔ آپ از راہ کرم مجھ سے مزید کوئی بات نہ کریں۔

اور پھر میں بغیر اُس کی اجازت کے اپنا سامان اٹھاکر باہر برآمدے میں لے گیا۔ بابے ڈورے کو شاید اس بات کی توقع نہ تھی کہ میں اس قدر قوتِ برداشت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہوں۔ وہ کھسیانا سا ہوکر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ حوالدار چراغ علی نے دو جوانوں کو آواز دے کر بُلایا اور وہ میرا سامان۔ چارپائی اور کِٹ بکس اُٹھاکر بیرک کی اُوپر والی منزل میں لے گئے۔ اور ایک کمرے میں میرا سامان رکھ کر واپس چلے گئے۔ البتہ حوالدار چراغ علی وہاں کھڑا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صوبیدار میجر صاحب جس دن آپ کو یہاں چھوڑنے آئے تھے، انہوں نے ہمارے صوبیدار صاحب کو بڑی سختی سے یہ حکم دیا تھا کہ اس جوان کو ذرا کھینچ کر قابو میں رکھنا۔ اس کا ڈسپلنگ (ڈسپلن) ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا ڈائریکٹ کسی بھی برٹش آفیسر سے رابطہ نہ ہونے دینا۔ یہ کوشش کرنا کہ یہ جوان کیپٹن بڑے کی نظروں میں گر جائے۔ کسی صورت میں بھی اسے اپنے برگیڈیر صاحب تک رسائی نہ حاصل کرنے دینا۔ یہ جو کچھ بھی اب صوبیدار صاحب نے آپ کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ جب بابا ڈورا آپ سے باتیں کر رہا تھا تو میں ڈر رہا تھا کہ اس مرحلے پر آپ دونوں کی لڑائی ضرور ہو کر رہے گی۔ لیکن آپ نے اچھی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ نے اس کی ہر بات کو برداشت کیا ہے۔ آپ نے خیال نہیں کیا کیپٹن بڑے صاحب آپ کی اور صوبیدار صاحب کی تمام باتیں اپنے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا سن رہا تھا۔

میں نے اس برگیڈ سگنل سیکشن میں بحیثیت اوپریٹر وائرلیس اپنا کام شروع کر دیا۔ دو تین دفعہ کیپٹن بڑے صاحب مجھے سرِراہ ملے تو انہوں نے میری خیریت پوچھی اور اس سے زیادہ کچھ بات چیت نہ کی۔ مجھے ابھی اس سیکشن میں آئے ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ایک دن برگیڈیر سوڈھم صاحب بڑے صاحب کے دفتر میں آئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دفتر اردلی مجھے بلا کر بڑے صاحب کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر اوپر کی منزل پر تھا۔ کیپٹن بڑے اپنے دفتر کے باہر سیڑھیوں کے پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں جونہی اوپر پہنچا وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر کے اندر لے گیا۔ میں نے برگیڈیر صاحب کو دیکھا تو میری کچھ دھیر بندھی۔ برگیڈیر صاحب نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے کرسی پر بٹھایا اور پھر بڑے صاحب کو کہا۔

کیپٹن چائے کا انتظام کرو۔ تھوڑی ہی دیر میں چائے آگئی۔ برگیڈیر صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

احمد۔ معافی چاہتا ہوں میں تمہاری خیریت دریافت کرنے یہاں تک نہیں آسکا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے مسز رائٹ نے مجھے ٹیلی فون کیا ہے کہ میں تمہاری خیریت معلوم کر کے ان کو بتاؤں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ چھٹی سے واپسی پر تم ان سے مل کر نہیں آئے۔

سر وقت کم تھا۔ کوہاٹ پہنچا تو ٹل آنے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ فوراً ہی اس میں بیٹھ گیا۔

اچھا تمہیں یہاں تو کوئی تکلیف نہیں۔

نہیں سر کوئی تکلیف نہیں۔ آپ کا برگیڈیر اور مسز رائٹ کا بہت بہت شکریہ۔

یہ تمہارا او۔ سی۔ اور (۷.۲.۵) تمہیں تنگ تو نہیں کرتا۔

نہیں سر۔

نہیں تم صحیح بات نہیں بتلاتے ہے۔ یہ انڈین افسر (سردار صاحبان) کہاں چاہتے ہیں کہ ان کے کسی ماتحت کا کسی سینئر برٹش آفیسر سے ڈائریکٹ رابطہ ہو۔

نہیں سر۔ صوبیدار صاحب نے کبھی بھی اس موضوع پر میرے ساتھ بات چیت نہیں کی۔

ٹھک کیپٹن۔ یو۔ ٹک آفر ڈیس لوائے۔ ہی۔ از سن آف مسز رائیٹ آل رائیٹ سر۔ یو ڈونٹ وری۔ آئی، ہیو آل سو۔ رسیلوڈ۔ اے رنگ (جناب عالی! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ اس کے متعلق مجھے بھی فون آیا ہے۔)

تھوڑی دیر برگیڈیر صاحب بیٹھے اور پھر برگیڈ ہیڈکوارٹر کی طرف واپس چلے گئے۔ کیپٹن صاحب ان کو نیچے سڑک تک چھوڑ کر واپس آئے۔ میں ابھی تک ان کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ جب وہ واپس کمرے میں آئے تو میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے دفتر اردلی کو کہا کہ صوبیدار صاحب کو بلا کر لے آؤ۔ صوبیدار صاحب آ گئے تو کیپٹن صاحب نے ہم دونو کو بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر وہ صوبیدار صاحب سے کہنے لگے۔

صاحب آپ نے دیکھا ہے کہ برگیڈیر صاحب احمد کو ملنے کے لیے آئے تھے انہوں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو سردار صاحب تنگ تو نہیں کرتے لیکن اس نے نفی میں جواب دیا۔ جس دن احمد چھٹی گذار کر آیا تھا اور آپ اس کے ساتھ برآمدے میں کھڑے کوئی گھنٹہ بھر اشتعال انگیز گفتگو کرتے رہے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنے کانوں سے سُنا۔ آج مجھے پختہ یقین تھا کہ اب جبکہ برگیڈیر صاحب نے اس سے آپ کے متعلق پوچھا ہے کہ سردار صاحب تم سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں تنگ وغیرہ تو نہیں کرتے۔ تو یہ اس دن کی پوری رام کہانی لفظ بہ لفظ ان کے سامنے بیان کر دے گا۔

میں اس جوان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کے باربار کے اصرار

کے باوجود بھی اس نے کسی کی کوئی شکایت نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس کی اعلیٰ ظرفی کی نشانی ہے۔ اس کی اعلیٰ مردانہ خصوصیات کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ آج سے میرے دفتر میں کام کرے گا۔ میرا کلرک دو ماہ کی رخصت پہ جا رہا ہے۔ اس کا چارج آپ اس کو دلوا دیں۔ آپ آئندہ کے لیے اسے کسی قسم کی ڈانٹ ڈپٹ یا سرزنش وغیرہ نہ کریں۔ بریگیڈیر صاحب نے مجھے خصوصی طور پر یہ ہدایت دی ہے کہ "کوئی اسے تنگ نہ کرے۔"

نہیں حضور۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ کوئی اس برخوردار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

ٹھیک ہے اب آپ جائیں۔ حوالدار چراغ علی کو بھی سمجھا دیں۔ اس کا سلوک بھی اچھا ہونا چاہیے۔

حضور آپ فکر نہ کریں۔ بابے ڈورے نے کیپٹن صاحب کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

میں اور بابا ڈورا کیپٹن صاحب کو سلیوٹ کر کے ان کے دفتر سے باہر آگئے بابا ڈورا مجھے اپنے ساتھ دفتر میں لے آیا اور بڑی میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری باتیں کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا۔

منافق آدمی کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں۔ میرے جیسے سادہ لوح آدمی تو ایسے لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی زہریلی باتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ صوبیدار صاحب قبلہ نے اسی میں بھلائی سمجھی کہ وہ مجھ سے سمجھوتہ کر لے اس نے مجھے ہر طرح سے یقین دلایا کہ اب میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔

شام کو پارٹ وَن آرڈر ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ ہماری سیکشن کا کلرک دو ماہ کی چھٹی پہ جا رہا ہے اور اس کی جگہ پہ اس کی عدم موجودگی میں میں کلرک کے فرائض سرانجام دوں گا۔

فوج میں کلرک کو بڑی عزت و تکریم کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے میں بھی اپنی جگہ پر مطمئن ہو گیا کہ چلو دو ماہ تو آرام سے کٹیں گے۔ بعد میں بھی اللہ مالک ہے۔ میں دوسرے دن صبح سویرے پی۔ ٹی کرنے کے بعد وردی پہن کر دفتر چلا گیا۔ سابقہ بابو صاحب بیٹھے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میری کوئی خاص پذیرائی نہ کی۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں ایک قسم کا حسد کرنے لگے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ یہ صاحب مجھے دفتر کی روٹین وغیرہ سمجھائیں گے۔ لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ ہی نہ دی۔ اور وہ بدستور ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ایک انگلی سے دیکھ بھال کے انداز میں ٹھونگے مارتا رہا۔ جب ادھر سے فارغ ہوئے تو میری طرف بے التفاتی سے دیکھتے ہوئے فرمانے لگے۔

میاں تم نے پہلے بھی کہیں کلرکی کی ہے؟

جی نہیں۔

پھر تو بڑا مشکل ہے۔ تم یہ کام ہرگز نہ کر سکو گے۔ خواہ مخواہ سزا پاؤ گے۔ پڑھے ہوئے کتنے ہو۔؟

آٹھ جماعت۔

میاں یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم جاؤ اپنی وائرلیس اوپریٹری کرو۔ کلرکی کسی پڑھے لکھے آدمی کو کرنے دو۔

جناب۔ جیسے آپ کی مرضی۔ مجھے کلرکی کرنے کا کوئی خاص شوق تو نہیں ہے۔ پارٹ ون آرڈر ہوا۔ اس لیے حکم کی تعمیل میں حاضر ہو گیا ہوں۔ اگر آپ ارشاد فرماتے ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔

ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو۔ مجھے ایک درخواست لکھ کر دے دو کہ جناب عالی! میں کلرکی کا کام نہیں کر سکتا چونکہ نہ تو یہ میرا ٹریڈ ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کلرکی کا کام کیا ہے اور نہ ہی میرا کوئی سابقہ تجربہ ہے۔" تمہاری یہ درخواست میں کیپٹن صاحب کو دے دوں گا۔ اور ساتھ ہی صاحب بہادر سے تمہاری سفارش

بھی کروں گا۔

بابو جی کیپٹن صاحب ناراض ہو جائیں گے اور مجھے کہیں سزا نہ دے دیں۔

نہیں تم گھبراؤ نہیں۔ تم صرف درخواست لکھ کر مجھے دے دو۔ باقی میں سب سب سنبھال لوں گا۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بابا ڈودرا دفتر میں داخل ہوا۔ بابو جی نے اُن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بابو کے ریمارکس اور اُس کی ترغیبات سے بابے ڈودرے نے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ کلرک نہیں چاہتا کہ احمد اس کی جگہ اس کی عدم موجودگی میں کلرک کے فرائض سرانجام دے۔ بابا ڈودرا بڑا جہاندیدہ آدمی تھا۔ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ بابو سے کہنے لگا۔

بابو۔ شرافت سے اسے چارج دے دو۔ ورنہ بے عزت ہو کر نکلو گے۔ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ ویسے ہی تمہیں الو بنا رہا ہے۔ اچھا پڑھا لکھا آدمی ہے اور شروع میں جبل پور ایک عرصے تک کلرک رہا ہے۔

دفتر اردلی نے مجھے آکر کہا کہ کیپٹن صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ کاغذ پنسل لے کر آئیں۔ میں نے ایک ڈرافٹ لکھوانا ہے۔

میں کاغذ پنسل لے کر اندر چلا گیا۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ڈرافٹ لکھوانا شروع کر دیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں شارٹ ہینڈ تو جانتا نہیں۔ پہلا ہی دن ہے۔ خدا خیر کرے۔ لیکن کیپٹن صاحب سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ لکھواتے رہے۔ جو میں نے آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھ لیا۔ اُس نے تھوڑے سے توقف کے بعد مجھ سے کہا۔

احمد جو کچھ لکھا ہے ذرا پڑھ کر سناؤ۔

میں نے سب ڈرافٹ ان کو پڑھ کر سنا دیا۔ سب صحیح تھا۔ کیپٹن صاحب میری اس کارکردگی سے مطمئن ہو گئے اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔

احمد یہ لیٹر ابھی ٹائپ کر کے لے آؤ۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ بابو صاحب ٹائپ رائٹر پر بیٹھے حسب سابق ٹھونگا بازی کر رہے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔

جناب عالی! مجھے کیپٹن صاحب نے ایک ارجنٹ لیٹر ٹائپ کرنے کے لیے دیا ہے۔ اگر آپ مجھے ٹائپ رائٹر مرحمت فرمائیں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔

بابو صاحب۔ برہم ہو گئے۔ دیکھتے نہیں ہو میں بھی سرکاری لیٹر ٹائپ کر رہا ہوں۔ تم میرے کام میں مخل نہ ہو۔

میں چپ کر گیا اور خاموشی سے اپنی کرسی پہ جا کر بیٹھ گیا۔ کوئی زیادہ دیر نہ گزری ہوگی کہ کیپٹن صاحب دفتر کے کمرے میں آ گئے۔ مجھے دیکھ کر غصے سے کہنے لگے آج تمہارا پہلا دن ہے اور تمہارا یہ رویہ ناقابل برداشت ہے۔

سر میں نے آتے ہی بابو جی کو کہا تھا کہ کیپٹن صاحب نے مجھے ایک ارجنٹ لیٹر ٹائپ کرنے کے لیے دیا ہے۔ اس لیے آپ مہربانی سے مجھے ٹائپ رائٹر دے دیں لیکن جناب عالی۔ بابو صاحب میری یہ گذارش سن کر سخت برہم ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ تم دیکھتے نہیں ہو میں بھی تو ارجنٹ کام ہی کر رہا ہوں تم خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ جب ٹائپ رائٹر خالی ہوگا مل جائے گا۔

یہ سن کر کیپٹن صاحب کا پارہ بھی چڑھ گیا اور انہوں نے بابو صاحب کو فوراً ہی دفتر سے نکال باہر کیا اور پھر مجھے آرڈر دیا کہ تم وہ لیٹر فوراً ٹائپ کر کے لے آؤ۔

میں نے اس کی توقع سے زیادہ صاف اور ستھرا اور کم وقت میں وہ لیٹر ٹائپ کر لیا۔ اس نے وہ چٹھی بار بار پڑھی۔ اس کا لے آؤٹ (LAY OUT) دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے اس پہ دستخط کر دیے اور مجھے ہدایت دی کہ یہ لیٹر فوراً ہی بریگیڈ کوارٹر میں بھجوا دو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ لیٹر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا۔ کیپٹن صاحب نے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بابو محمد شفیع دو ماہ کی چھٹی پہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اسی شام ہی چھٹی پہ

بھیج دیا گیا اور میں مکمل طور پر ایک با اختیار کلرک بن گیا۔ اب بابا ڈورا اور حوالدار چراغ علی بھی میرے ساتھ بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں فطرتاً بڑا صلح جو آدمی ہوں اگر کوئی مجھے نہ چھیڑے تو میں اس طرح کے کسی بھی معاملے میں پہل نہیں کرتا۔ میں حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی آدمی کو کوئی اذیت نہ پہنچے

## ۵

بابا ڈورا بڑا گھاگ تھا۔ اس کو اب پتہ لگ گیا تھا کہ میں نے دو ماہ کے لیے یہ ڈیوٹی کرنا ہے تو وہ اب میرے ساتھ بڑی مروت اور صلح جوئی سے بات کرتا تھا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد کیپٹن کنگھم بڑے صاحب کا تبادلہ بٹالین ہیڈ کوارٹر کوہاٹ میں ہو گیا اور وہ ایڈجوٹنٹ بن کر کوہاٹ چلے گئے۔ بڑے صاحب کے چلے جانے کے بعد بابے ڈورے کا رویہ پہلے کی طرح کا سا نہ رہا۔ لیکن پھر بھی اسے یہ ڈر تھا کہ برگیڈیر رروڈھم صاحب ابھی ٹل میں موجود ہیں اور اگر میں نے ان کے پاس جا کر میری شکایت کر دی تو میری خیر نہ ہو گی۔

دن گذرتے گئے۔ میں بھی محتاط ہو گیا۔ آخر کار دو ماہ گذر گئے اور ہمارا کلرک دو ماہ کی چھٹی گذار کر واپس آ گیا۔ جس دن اس نے دفتر میں رپورٹ کی۔ اسی دن بابے ڈورے نے آفیسر کمانڈنگ سے کہہ کر مجھے دفتر سے فارغ کروا دیا اور میں پھر اپنے کام پر واپس چلا گیا۔ اب بابا ڈورا مجھ سے سختی سے پیش آنے لگ گیا لیکن میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور بحیثیت وائرلیس اوپریٹر کے اپنا کام کرتا رہا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں نے برگیڈ کی سکیموں میں وائرلیس سیٹ پر کام کیا اور کسی طرح بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈویژن لیول کی ایک سکیم ہوئی۔ جس میں ڈویژن کمانڈر۔ برگیڈیر رروڈھم اور کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل کے کرنل ہلٹن نے اس میں شرکت کی۔ اپنے کرنل کے ہمراہ کیپٹن کنگھم بڑے بھی اس سکیم میں شریک ہوئے۔ بسر دل یا

کے دن تھے کہ ہمیں دریائے کُرم عبور کرنے کا حکم دیا گیا۔ جس جگہ سے ٹروپس نے دریا کو عبور کرنا تھا وہاں سب سینئر آفیسرز آ کر اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ جب ہماری کا سیکشن دریا عبور کر کے ان کے پاس سے گذری تو بڑے صاحب نے مجھے دیکھا اور پھر پوچھا۔

احمد تم نے دفتر میں کام کرنا ترک کر دیا ہے؟

ہاں سر۔ ہمارا کلرک دو ماہ کی چھٹی گذار کر واپس آ گیا ہے۔ اس لیے میں اپنے کام پر واپس آ گیا ہوں۔

تم اپنے طور پر تیار ہو جاؤ۔ میں واپس جا کر تمہارا پوسٹنگ ہیڈکوارٹرز میں کر دوں گا۔ اور کسی دفتر میں تمہاری تعیناتی کر دوں گا۔

سر۔ یہ کام بھی ٹھیک ہے۔

کام تو اچھا ہے لیکن اس میں تمہاری زیادہ لوگوں سے ڈیلنگ (DEALING) رہے گی اور پھر تم کسی نہ کسی کے ساتھ اُلجھ پڑو گے۔

ہاں۔ سر۔ یہ بات تو ٹھیک ہے۔

تم تیار رہنا۔

بہت اچھا سر۔ اور پھر میں ڈبل کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ بابے ڈورے نے طنزاً کہا۔ ”پھر کوئی نیا جیک لگا رہے ہو۔“

نہیں سر۔ بڑے صاحب نے صرف میرا حال احوال دریافت کیا ہے۔

ہاں بڑے صاحب تمہارا چاچا لگتا ہے نا —— مجھے بڑا غصہ آیا۔ اگر میں نے دو تین دن کے اندر اندر واپس نہ چلا جانا ہوتا تو بابا ڈورا کے ساتھ جنگ کرنے کا یہ اچھا موقعہ تھا۔ وہ مجھے طیش دلانا چاہتا تھا کہ میں طیش میں آ کر اس کے ساتھ لڑ دوں۔ اور وہ مجھے قرار واقعی سزا دلوا سکے۔ اور اس طرح صوبیدار میجر کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

سکیم بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی اور ہم قلعہ میں واپس آ گئے۔ دو دن تک

اپنا وہ سامان جو سکیم کے دوران استعمال کیا تھا اس کی صفائی اور دیکھ بھال کرتے رہے۔

تیسرے دن بٹالین کے پارٹ وَن آرڈر میں میرا پوسٹنگ ٹل برگیڈ سگنل سیکشن سے نمبر ۲ کمپنی میں کر دیا گیا تھا۔ بابا دُورا نے پارٹ ون آرڈر پڑھا تو مجھ سے کہنے لگا۔

مَیں نے اُس دن نہیں کہا تھا کہ تم کوئی جیک لگا رہے ہو۔

مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ "جوابِ جاہلاں باشد خموشی"

دو دن کے بعد مَیں نے واپس کوہاٹ آنا تھا۔ واپسی سے پہلے مَیں برگیڈیر روڈھم صاحب کو الوداعی سلام کرنا چاہتا تھا۔ مَیں برگیڈیر ہیڈ کوارٹر چلا گیا۔ یوں عام روٹین میں برگیڈ صاحب سے میرا ملنا مشکل تھا۔ فوج کا یہ دستور ہے کہ کوئی بھی جونیئر آدمی اپنے سے سینئر آدمی کو ڈائریکٹ نہیں مل سکتا۔ اس لیے مَیں اس تاک میں تھا کہ جب وہ لنچ بریک پہ دفتر سے باہر آئیں گے تو اُن سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ مَیں ان کی سٹاف کار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں برگیڈیر صاحب اپنے دفتر سے باہر آئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی، مَیں نے اُن کو سیلوٹ کیا۔ وہ کار میں بیٹھنے کی بجائے سیدھے میرے پاس آگئے۔

ہیلو۔ مائی۔ سَن۔ ہاؤ۔ آر۔ یو۔

تھینک یو سَر۔ فائن۔

اینی۔ سروس — نو تھینک یو سَر۔ مَیں نے ان کو بتایا کہ سَر میں پوسٹ ہو کر کوہاٹ واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو سلام کرنے کے لیے آیا ہوں۔

او۔ بوت (بہت) مہربانی۔ آؤ میرے ساتھ لنچ کرو۔

بہت شکریہ سَر۔ مَیں نے لنچ کر لیا ہے۔

اور پھر برگیڈیر صاحب نے میرے ساتھ الوداعی مصافحہ کیا اور کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اور مَیں واپس اپنے سیکشن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے ساتھی

میرا سامان اُٹھا کر قلعہ سے باہر واقع ریلوے سٹیشن پر لے آئے اور میں اس طرح بعد از خرابی بسیار یونٹ ہیڈ کوارٹر واپس آ گیا۔ شام کو گاڑی کوہاٹ پہنچی۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میں اپنا سامان اُٹھا کر ایک ٹانگے میں بیٹھ کر میکوہن لائینز پہنچ گیا۔ عزیز اکبر مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ وہ میرا سامان اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے کھانا کھایا۔ پھر رول کال پر گیا۔ اپنا موومنٹ آرڈر اور متعلقہ دوسرے کاغذات حوالدار میجر کو دیے۔ رول کال ختم ہوئی تو وہ مجھے صوبیدار میجر کے پاس لے گیا۔ صوبیدار میجر نے مجھے دیکھا تو اس کے تیور بدل گئے۔ مجھ سے کہنے لگا۔

تم پھر واپس آ گئے ہو۔

اپنی مرضی سے نہیں۔ سرکاری حکم سے میں نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

مجھے پتہ ہے پرسوں تمہارا پارٹ ون آرڈر ہوا تھا۔ کیوں وہاں بھی نہیں بنی تمہاری۔

نہیں سر۔ میرا تو وہاں کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ جناب عالی۔ میں غریب سپاہی ہوں۔ بچوں کی روٹی کمانے کے لیے فوج میں آیا ہوں۔ اپنا کام ایمانداری اور محنت سے کرتا ہوں۔ میں فوج میں لڑنے جھگڑنے کے لیے تو نہیں آیا۔

بہت دیر کے بعد اس حقیقت کا علم ہوا ہے جناب کو۔ صوبیدار میجر نے طنز میں بجھا ہوا زہریلا وار کیا۔

شکر ہے ہو گیا ہے۔ دیر ہی سے سہی۔

اب یہاں تم اپنا کام ٹھیک کرنا۔ ان بڑے بڑے افسروں کے ساتھ ٹانکہ (NK/K) لگانے کی کوشش مت کرنا۔ صوبیدار میجر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

میں چپ رہا۔ اس نے کوئی مزید حجت بازی نہ کی اور میں واپس اپنی بیرک

میں آگیا۔ فوج میں بس اتنی سی بات ہوئی ہے۔ میرے سر جتنی بھی بلائیں آتی رہی ہیں۔ وہ سب مجھ پر ضبط اور قوتِ برداشت کے فقدان کے باعث آتی رہی ہیں۔ میں بیرک میں واپس آیا تو ساتھیوں کو منتظر پایا۔ تھوڑی دیر سب وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر سب اکٹھے یونٹ کینٹین کی طرف چلے گئے۔ وہاں تقریباً دس بجے رات تک بیٹھے چائے پیتے رہے اور ریڈیو پر گانے سنتے رہے فوج میں دس بجے رات کو لائیٹ آؤٹ کے بگل کے ساتھ سب لوگ اپنے اپنے بستروں میں جاکر سو جاتے ہیں۔ میں بھی دوستوں کے ساتھ دس بجے واپس بیرک میں آگیا اور اپنا بستر بچھا کر سو گیا۔ میں نے صبح وردی پہن کر نمبر ۲ کمپنی کے حوالدار میجر کو جاکر رپورٹ کی۔ اس نے پہلے تو کسی ماہر پولیس آفیسر کی طرح مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ شاید وہ میرے متعلق سن چکا تھا۔ اس لیے اس نے میرے ساتھ کوئی بات چیت نہ کی۔ وہ مجھے مارچ کر کے نمبر ۲ کمپنی کمانڈر کے دفتر کے برآمدے میں لے گیا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا ابھی تک میجر صاحب نہ آئے تھے۔ اس لیے وہ مجھے وہاں ہی کھڑا کر کے واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر گذری کہ مین گیٹ کی طرف سے دو برٹش آفیسرز سائیکلوں پر آتے ہوئے نظر آئے۔ اس زمانے میں بہت کم فوجی افسروں کے پاس کاریں ہوتی تھیں۔ عام طور پر صرف کرنل کے پاس کار ہوا کرتی تھی۔ باقی تمام آفیسرز سائیکلیں استعمال کرتے تھے۔ وہ دونو آفیسرز نمبر ۲ کمپنی کے دفتر کے سامنے آکر رک گئے۔ ان میں ایک کیپٹن کنگھم برلے تھا۔ جو کہ برگیڈ سگنل سیکشن سے پوسٹ ہو کر ہیڈ کوارٹر میں آیا تھا اور مستقل طور پر ایڈجوٹنٹ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ دوسرا سفید بالوں والا ایک بڈھا سا میجر تھا۔ کیپٹن برلے کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو چلاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

او۔ احمد۔ یو۔ آر۔ ہیر اور پھر وہ دونو چل کر میرے پاس برآمدے میں آ

گئے۔ بڑے صاحب اور اُس بڈھے میجر دونوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ
لیا۔ میجر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔
تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔
سَر۔ حوالدار میجر مجھے یہاں لے آیا ہے۔
کہاں ہے۔ وہ۔
سَر۔ دفتر کے اندر چلا گیا ہے۔
سَر یہ ہے وہ جوان۔ جس کے متعلق مَیں نے آپ سے بات کی تھی۔ ایک
A-T-م قسم کا کلرک ہے۔ آج اس کا میں پارٹ ون آرڈر کر دوں گا۔ کرنل
صاحب نے اُس کی کنورشن (CONVERSION) کی اجازت دے دی
ہے۔ اس کو آج ہی حوالدار کلرک پر وموٹ کر کے بطور کمپنی کلرک آپ کی کمپنی
میں پوسٹ کر دوں گا۔
ٹھیک ہے۔ میرے پاس جو کلرک ہے اسے آپ بٹالین آفس میں لے
لیں۔ یہ لڑکا مجھے ہوشیار نظر آتا ہے۔
ہوشیار ہے اور قابل بھی۔ لیکن ایک کمزوری اس میں ہے اور یہ کہ اگر کوئی
آدمی اس پر سختی کرے گا تو یہ بگڑ جائے گا۔ اس سے اگر اچھا سلوک کیا جائے تو
یہ ایک بہترین سپاہی ہے۔
یہاں اس کے ساتھ کس نے سختی سے پیش آنا ہے۔
سَر۔ اس لیے تو مَیں نے اس کو آپ کے پاس پوسٹ کیا ہے۔ آپ
مہربانی سے اس کو انڈین آفیسرز سے پروٹیکشن دیں۔ یہ لوگ اس سے خدا
واسطے کا بَیر رکھتے ہیں۔
او۔ نو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اسکی ہر طرح سے دیکھ بھال کر دوں گا

ہمارے اس کمپنی کمانڈر کا نام میجر۔ کے۔ ٹی۔ جے سنوز K.T.J. SNOWS تھا جو نہایت ہی رحمدل اور شریف النفس انگریز تھا۔ وہ دونو صاحبان اپنے اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔

حوالدار میجر باہر آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

میجر صاحب اور ایڈجوٹنٹ صاحب تم سے کیا باتیں کر رہے تھے۔

پوچھ رہے تھے کہ جوان تم کدھر سے پوسٹ ہو کر آیا ہے۔

حوالدار میجر مجھے انٹرویو کے لیے مارچ کر کے کمپنی کمانڈر صاحب کے سامنے لے گیا۔ میرا موومنٹ آرڈر میجر صاحب کے سامنے رکھا۔ میجر صاحب نے کچھ باتیں انگریزی زبان میں میرے ساتھ کیں۔ شاید وہ میرا امتحان لے رہے تھے پھر انہوں نے حوالدار میجر کو کہا کہ کلرک کو بلا لاؤ۔

ایک دُبلا پتلا نحیف و نزار آدمی اندر آیا۔ میجر صاحب نے اس سے کہا۔

نائیک تم ہمارے دفتر کا چارج اسی وقت اس جوان کو دے دو اور پھر بٹالین آفس میں جا کر ایڈجوٹنٹ صاحب کو رپورٹ کرو۔ اس کلرک نے تقریباً ایک گھنٹے میں مجھے چارج دے دیا اور پھر وہ بٹالین آفس میں چلا گیا۔

دفتر میں جو بھی آدمی آتا مجھے حیران کن نظروں سے دیکھنے لگ جاتا اور بغیر کوئی بات کیے دفتر سے واپس چلا جاتا۔ جس سیکشن کے ساتھ میں برما سے آیا تھا وہ سیکشن اسی کمپنی میں تھی۔ میری سیکشن کے آدمیوں کو جب پتہ چلا کہ میں نمبر ۲ کمپنی میں بطور کمپنی کلرک کے پوسٹ ہو کر آ گیا ہوں تو تقریباً سب آدمی باری باری میرے پاس دفتر میں مجھے ملنے کے لیے آئے۔ سب سے آخر میں لیفٹیننٹ کیرانی صاحب آئے جو مجھ سے گلے ملے اور مجھے یہاں بامراد دیکھ بہت خوش ہوئے۔

برٹش آفیسرز ساڑھے دس بجے چائے کے لیے بریک کرتے تھے۔

کیپٹن برے صاحب جتنا عرصہ بھی ہماری یونٹ میں رہے ان کے ایک

سٹینڈنگ آرڈر کی تعمیل میں روزانہ کینٹین والے دو آدمیوں کے لیے چائے اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے دفتر میں میرے لیے لاتے۔ میں اس شخص کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ وہ اپنے دفتر میں چائے نہ پیتے بلکہ جتنا عرصہ بھی رہے میرے دفتر میں آکر میرے ساتھ چائے پیا کرتے اور کبھی کبھی میجر سلو کو بھی بلا لیتے اور وہ بھی ہمارے ساتھ چائے پیتے۔

کوہاٹ سگنل میں آج میرا پہلا دن تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دفتر میں بریگیڈیئر جان رائٹ صاحب۔ کرنل ہملٹن اور میجر سلو اندر آگئے۔ میں ان سب کو اکٹھا دیکھ کر بوکھلاہٹ کے عالم میں جو بدحواس ہو کر اٹھا تو سیاہی کی بوتل میز پر پڑے ہوئے کاغذوں پر الٹ گئی اور میری اس بدحواسی پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بریگیڈیئر صاحب نے اور پھر کرنل ہملٹن صاحب نے باری باری میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر بریگیڈیئر صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

ابھی ابھی مجھے بریگیڈیئر رودھم نے تمہارے متعلق بتایا ہے۔ میں نے میم صاحب کو بھی بتا دیا ہے۔ وہ یہ سن کر بے حد خوش ہوئی ہے۔ شام کو تم آ رہے ہو نا میم صاحب سے ملنے۔

نہیں سر میں اب نہ آسکوں گا۔

کیوں۔

ہمارے انڈین افسر صاحبان ناراض ہوتے ہیں۔ کل رات صوبیدار میجر صاحب نے خصوصی طور پر مجھ سے کہا تھا کہ تم بڑے بڑے افسروں سے ملنا چھوڑ دو۔ ورنہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہو گا۔

اس کو کیا تکلیف ہے۔ بریگیڈیئر صاحب نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

معلوم نہیں سر۔

جان۔ یو۔ پلیز سارٹ آؤٹ۔ بریگیڈیئر صاحب نے کرنل جان ہملٹن کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

آل رائٹ سر۔

احمد میم صاب نے کہا ہے کہ تم شام کو ضرور ہمارے بنگلے پر آنا ہے۔ برگیڈیر صاحب نے مجھ سے کہا۔

بہت اچھا۔ سر۔

اور پھر وہ سب افسر صاحبان وہاں سے بٹالین آفس کی طرف چلے گئے اور میں نے اپنا میز صاف کیا۔ جن کاغذوں پر سیاہی گر گئی تھی وہ سب اٹھا کر میں نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ اس دن پارٹ ون آرڈر میں میرا پروموشن ہو گیا اور میں حوالدار کلرک بن گیا۔ مجھے فیملی کوارٹر بھی الاٹ ہو گیا اور میں چند دنوں کے بعد اپنے بیوی بچوں کو بھی کوہاٹ لے آیا۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ یہاں میں نے امن اور سلامتی سے گذارا۔ چونکہ جنگِ عظیم دوم ختم ہو چکی تھی اس لیے انگریز آفیسرز بھی جلدی جلدی ولایت واپس جانے شروع ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں برگیڈیر جان رائٹ صاحب میجر جنرل بن کر الیسٹرن کمانڈ میں چلے گئے کرنل ہیلٹن واپس انگلینڈ چلے گئے۔ کیپٹن برے ترقی پا کر میجر بن کر رسالپور چلے گئے اب ہیڈ کلرک پیارا سنگھ کو مجھے پوسٹ آؤٹ کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ چنانچہ اس نے صوبیدار میجر کے ایما پر مجھے راولپنڈی پوسٹ کر دیا۔ اب اس سے بازپرس کرنے والا کوئی بَبے نہ تھا۔ کوئی جان رائٹ نہ تھا۔ انجمن ترقی اردو کوہاٹ کے احباب کو میرے تبادلہ کا پتہ چلا تو سب نے اظہار افسوس کیا۔ ان دوستوں نے مجھے ایک الوداعی پارٹی دی۔ جانے سے پہلے میں نے جناب عزیز اختر وارثی صاحب سے التجا کی کہ وہ مجھے پنڈی کے کسی نامور شاعر کے نام ایک تعارفی خط دیں۔ تاکہ وہاں کے ادبی حلقوں میں آسانی سے شمولیت کر سکوں۔ چنانچہ انہوں مجھے جناب عبد العزیز فطرت صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا۔

کوہاٹ سگنل میں موجود میرے دوستوں نے بھی مجھے ایک چائے پارٹی دی۔ چنانچہ

۱۹۴۲ء کے وسط میں میں تبدیل ہو کر پنڈی پہنچ گیا۔ میں جب بھی کسی نئی یونٹ میں پوسٹ ہو کر جاتا تھا تو مجھ سے پہلے میرے افسانے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جس کے باعث مجھے وہاں جاتے ہی ایک اچھی خاصی مخالفین کی تعداد سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ میں جس یونٹ میں پوسٹ ہوا تھا وہ ویلسٹر ریج میں رہتی تھی۔ میں جب اس یونٹ میں پہنچا تو میں نے مومنٹ آرڈر اور دوسرے متعلقہ کاغذات بٹالین حوالدار میجر کے سپرد کیے۔ جس یونٹ میں میں پوسٹ ہوا تھا اس میں ہمارا ہیڈ کلرک ضلع راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ بٹالین حوالدار میجر بھی راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ شاید میری آمد سے پہلے ان دونوں کے درمیان میرے متعلق کوئی متفقہ لائحہ عمل طے پا چکا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کا رویہ میرے ساتھ نہایت ہی معاندانہ تھا۔ میں نے اوقات کار کے دوران اپنا مومنٹ آرڈر بٹالین حوالدار میجر کو دیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھے رہنے کی کوئی جگہ نہ دی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو نہایت بے اعتنائی سے وہ کہنے لگا۔

جہاں جگہ ملتی ہے وہاں بستر لگا لو۔

میں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ اگر کسی عہدیدار کے ساتھ سائیڈ روم میں کوئی جگہ ہے تو مجھے دلوا دیں۔

نہیں۔ کوئی سائیڈ روم خالی نہیں ہے۔ بیرک ہی میں کہیں بستر لگا لو۔

آپ کی یونٹ کے حوالدار کلرک اگر بیرک میں رہتے ہیں تو میں بھی رہ لوں گا۔ لیکن اگر وہ سب سائیڈ رومز میں رہتے ہیں تو میں بیرک میں ہرگز بستر نہ لگاؤں گا۔

بحث کرنا بے کار ہے۔ کہیں کوئی جگہ خالی نہیں ہے تو میں کیا کروں۔

ہماری یہ بات میانوالی کا ایک جوان سن رہا تھا۔ اس نے میرا سامان اٹھا کر مسجد سے ملحقہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جا کر رکھ دیا۔ اس کوٹھڑی میں مسجد کی پرانی چٹائیاں اور کوزے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ جوان میرے

لیے کہیں سے ایک چارپائی بھی تلاش کر کے لے آیا۔ اس نے اپنا بستر اُسی کوٹھڑی میں لگایا ہوا تھا۔ اس نے پہلے سے پڑی ہوئی چارپائی پر سے اپنا بستر سمیٹ کر میرا بستر اس پر بچھا دیا اور اپنے لیے دوسری چارپائی بچھالی اور بستر اٹھا کر بیرک میں چھوڑ آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

آپ اپنا بستر کیوں لے گئے ہیں۔ دوسری چارپائی ہے۔ یہاں ہی گذارا کر لیں گے۔

نہیں آپ کو تکلیف ہوگی۔ کل کرنل صاحب کے انٹرویو کے بعد آپ کا پوسٹنگ کسی کمپنی میں ہو جائے گا۔ پھر آپ وہاں چلے جائیں گے۔ آپ کو وہاں رہنے کے لیے اچھی جگہ مل جائے گی۔

کیا اس یونٹ میں نئے آنے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔

نہیں۔ جس نئے آنے والے کے گرائیں اس یونٹ میں ہوں تو وہ تو اپنے آدمیوں کو آتے ہی سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جن کا کوئی والی وارث نہ ہو ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ویسے میں حیران ہوں۔ آپ کا سب انتظام ہیڈ کلرک صاحب کو کرنا چاہیئے تھا۔

دوسرے دن بٹالین حوالدار میجر مجھے سٹاف پریڈ پر بٹالین آفس میں لے گیا۔ سب کلرکوں نے اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل کر مجھے ایک نظر دیکھا جیسے میں دنیا کا کوئی عجوبہ ہوں اور پھر وہ سب کے سب واپس اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیڈ کلرک صاحب باہر آئے تو مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مجھے ڈرانے دھمکانے اور نصیحتیں کرنے لگ گئے۔ دیکھو احمد تمہاری شہرت اچھی نہیں ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے لوگ تمہاری پچھلی داستانیں سُن سُن کر تمہارے مخالف ہو چکے ہوئے ہیں۔ اب یہاں تم اچھا کام کرنا۔

کام تو میں ہر جگہ ہی کرتا ہوں۔ البتہ مجھ سے کسی کی چاپلوسی نہیں ہو سکتی۔

جس کی وجہ سے میں ہر جگہ مار کھا جاتا ہوں۔

نہیں۔ تمہارا اندازِ گفتگو بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم ہر کسی سے بغیر کسی وجہ کے لڑ پڑتے ہو۔

سٹاف پریڈ کا وقت ہو چکا تھا۔ صوبیدار میجر اپنے دفتر سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا تھا۔ بٹالین حوالدار میجر نے پریڈ میں موجود لوگوں کو اٹین شن کر کے صوبیدار میجر کو رپورٹ دی۔ جس نے اندر جا کر ایڈجوٹنٹ کو سٹاف پریڈ کی تیاری کی رپورٹ دی۔ ایڈجوٹنٹ ایک نوجوان سکھ کپتان تھا۔ اس نے سب سے اُن کے سروس کے کوائف وغیرہ دریافت کیے۔ جب میں نے اپنا نام بتایا تو وہ سکھ کپتان صوبیدار میجر کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا پڑا۔ ایڈجوٹنٹ نے اندر جا کر کرنل کو رپورٹ دی۔ اس یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر کرنل ایلیٹ تھا۔ مدبر قسم کا انگریز نظر آتا تھا۔ میرے پاس آیا تو مجھ سے میرا نام اور ٹریڈ پوچھا۔

سر۔ میرا نام احمد ہے اور میں کلرک ہوں۔ کوہاٹ ڈسٹرکٹ سگنل سے پوسٹ ہو کر آیا ہوں۔

وہ ایڈجوٹنٹ سے کہنے لگا۔ سنگھ! اسے نمبر ۳ کمپنی میں میجر پارکر کے پاس بھیج دو۔ وہ اپنے موجودہ کلرک سے نالاں ہیں۔

بہت اچھا سر۔ سٹاف پریڈ ختم ہو گئی۔ ایڈجوٹنٹ نے مجھے حکم دیا کہ تم او۔ سی۔ نمبر ۳ کمپنی کو جا کر رپورٹ کرو۔ میں اُسے ٹیلی فون کر کے سب کچھ بتا دیتا ہوں اور پھر میں وہاں سے نمبر ۳ کمپنی میں چلا گیا۔ وہاں ایک صوبیدار ایک حوالدار میجر اور ایک کلرک ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے صوبیدار صاحب کو جا کر رپورٹ دی۔

سر مجھے ایڈجوٹنٹ نے بھیجا ہے کہ میجر پارکر صاحب کو جا کر رپورٹ کروں میں حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ مہربانی سے میجر صاحب کو اطلاع فرما دیں۔ صوبیدار صاحب

کوئی ماکڑ خان قسم کا آدمی نہ تھا۔ اس نے نہایت ہی شرافت سے مجھ سے میرے کوائف پوچھے اور ایک رجسٹر میں درج کر کے اندر میجر صاحب کے پاس چلا گیا تھوڑی ہی دیر میں درمیان والا دروازہ کھلا اور صوبیدار صاحب نے مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔ میں نے اندر جا کر نہایت چستی سے میجر کو سلوٹ کیا۔ اس نے چند ایک باتیں انگریزی زبان میں مجھ سے دریافت کیں۔ وہ میرے جوابات سے مطمئن ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

حوالدار ممتاز حسین سے چارج لے لو اور اُسے فوراً فارغ کر دو۔

بہت اچھا سر۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ممتاز حسین کو فارغ کر دیا اور پھر وہ بٹالین آفس میں چلا گیا۔ میں نے صوبیدار صاحب کو بتایا کہ میرا ذاتی سامان مسجد کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔ سب سے پہلے آپ ازراہ کرم میری رہائش کا کوئی انتظام کر دیں۔ انہوں نے حوالدار میجر کو حکم دیا کہ

دو سپاہی لے جاؤ اور بابوجی کا سامان مسجد کی کوٹھڑی سے اٹھوا کر لے آؤ اور جس سائیڈ روم میں ممتاز حسین رہتا ہے۔ اسی کمرے میں ان کا سامان رکھوا دو۔ ممتاز حسین آج یا کل ہیڈ کوارٹر کمپنی میں پوسٹ ہو جائے گا۔ تو کمرہ خالی ہو جائے گا۔

میں حوالدار میجر کے ساتھ گیا۔ وہ سپاہی میرا سامان اٹھا کر لے آئے۔ حوالدار میجر نے فوری طور پر میرے لیے ضروری فرنیچر کا انتظام کیا۔ میں اپنا سامان کمرے میں رکھوا کر واپس دفتر آ گیا۔ صوبیدار صاحب نے مجھے اور حوالدار میجر کو چائے پلائی۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ میجر پارکر صاحب اپنے دفتر سے نکل کر ہمارے پاس آ گئے اور مجھے بتانے لگے کہ میں ایم۔ ٹی گیراج میں جا رہا ہوں۔ میجر صاحب نے بھی ہمارے ساتھ اس مختصر سی ٹی پارٹی میں شرکت کی۔ نمبر ۳ کمپنی کا ماحول مجھے اچھا نظر آیا۔ میجر صاحب نرم طبیعت کے آفیسر تھے۔ عام انگریز افسروں کی طرح

بدمزاج اور تند خو نہ تھے۔ میں نے دل میں سوچا۔ یہ سب اچھے آدمی ہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ گذارا کر لوں گا۔

## ۵

میں جب اپنے دفتر اور یونٹ میں سیٹ ہو گیا تو عزیز اختر وارثی کا خط جو میں جناب عبدالعزیز فطرت صاحب کے نام لایا تھا، اب ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ دو دن کے بعد اتوار تھا۔ اتوار کی صبح کو میں نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر فطرت صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اختر صاحب کی ہدایات کے مطابق پہلے راجہ بازار آیا۔ پھر جامع مسجد۔ پھر گلی امام باڑہ کرنل مقبول حسین میں جا پہنچا۔ وہاں سے آگے مجھے فطرت صاحب کا دولتکدہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں نے ان کا مکان تلاش کر لیا۔ چونکہ اس دن چھٹی کا دن تھا اس لیے اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ موصوف گھر پر ہی ہوں گے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی جس کے سر کے بال کھچڑی تھے باہر آیا۔ اس آدمی کی عمر اس وقت کوئی پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ نہایت ہی نرمی اور ہمدردانہ انداز میں گویا ہوئے۔

فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

جناب عالی۔ مجھے جناب عبدالعزیز فطرت صاحب سے ملنا ہے۔

اچھا۔ ایک منٹ۔ اور پھر اس خوش خلق آدمی نے پلٹ کر بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ اور مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔

تشریف لائیے۔

شکریہ۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھک نہایت ہی سادہ۔ چند کرسیاں۔ کچھ کتابوں اور رسالوں کے سوا وہاں اور کچھ نہ تھا۔

میں نے عزیز اختر وارثی صاحب کا خط نکال کر ان کی خدمت میں پیش کیا

وہ خط پڑھتے جاتے اور ان کا چہرہ کسی باطنی خوشی اور مسرت کے ساتھ چمکتا جا رہا تھا۔ انھوں نے خط پڑھنے کے بعد اسے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔

کیا حال تھا وارثی صاحب کا۔

ٹھیک تھے جناب۔

آپ فوج میں ملازمت کرتے ہیں۔

جی جناب۔

آپ کب سے شعر کہہ رہے ہیں۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔

کسی سے مشورۂ سخن بھی کرتے ہیں۔

جی ہاں۔ علامہ محوی صدیقی لکھنوی سے۔

وہ تو بھوپال کے استاد ہیں۔ اُن کے حلقۂ تلمذ میں آپ کیسے شامل ہوئے۔

جناب میں اپنی فوجی ملازمت کے سلسلے میں بنگلور میں تھا کہ وہاں علامہ صاحب کے ایک بڑے نامور شاگرد جناب عزیز بنگلوری صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ اُن کے توسط سے میں نے علامہ صاحب کی شاگردی اختیار کی۔

علامہ صاحب بھی بنگلور ہی تشریف فرما ہیں۔

جی نہیں۔ وہ مدراس یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین ہیں۔

تو پھر کوئی اپنا تازہ کلام سنائیے۔

میں نے فطرت صاحب کی خدمت میں اپنی ایک تازہ غزل پیش کی۔ جس پر انھوں نے دل کھول کر مجھے داد دی۔ اس طرح فطرت صاحب کے توسط سے میں پنڈی کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔ سب سے پہلے فطرت صاحب کے دولتکدے پر پنڈی کے دو نامور شعرا سے تعارف ہوا۔ ان کے اسمائے گرامی جناب محمد ایوب محسن اور جناب صادق نسیم ہیں۔ انہی دنوں میری فطرت صاحب

کی معرفت ہی غزل کے زندہ جاوید شاعر جناب عبدالحمید عدم۔ قتیل شفائی۔ باقی صدیقی حضرت حاجی سرحدی۔ انجم رضوانی اور اکرم حیدری صاحب سے ملاقات ہوئی اسی زمانے میں میں نے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد رشید حضرت نوح ناروی اور برصغیر کے شعلہ بیاں شاعر جناب نفیس خلیلی کو گارڈن کالج کے ایک مشاعرے میں سنا تھا۔ اسی زمانے میں پنڈی کے نوجوان شاعر جمیل ملک اور احمد ظفر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

## ۵

میجر سی۔ ڈبلیو پارکر میرے کام سے بہت خوش تھا۔ ان کی وجہ سے میں انڈین آفیسرز (I.O.W.C) کی سرزنش سے محفوظ رہا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے اُس یونٹ سے چیف سگنل آفیسر صاحب کے دفتر میں پوسٹ کر دیا گیا۔ یہاں ہر ایک کو اپنے کام سے کام تھا۔ کوئی کسی دوسرے کے کام میں مداخلت نہ کرتا تھا۔ کام کرنے اور رہنے سہنے کی آزادی تھی لیکن اپنی یونٹ نہ ہونے کے باعث رہائش اور کھانے پینے کا کوئی تسلی بخش انتظام نہ تھا۔ اس لیے میں نے میجر چوہدری سے کہہ کر اپنا پوسٹنگ ایر سپورٹ سگنل یونٹ میں کروا لیا جو اُن دنوں راولپنڈی میں مقیم تھی۔ اس یونٹ میں زیادہ تعداد مدراسیوں کی تھی کوئی چالیس پچاس کے قریب سکھ بھی تھے۔ اس یونٹ میں صرف اکیلا مسلمان تھا۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے کھانے کے لیے مجھے ساتھ کی ایک یونٹ کے ساتھ اٹیچ (ATTACH) کر دیا تھا اور اس طرح دن خیریت سے گذر رہے تھے اسی یونٹ میں کمانڈنگ آفیسر ایک انگریز میجر تھا۔ اور دوسرا آفیسر ایک نوجوان سکھ لیفٹیننٹ سندھو تھا۔ یہ دونو شریف آفیسرز تھے۔ اپنے ماتحتوں کو خواہ مخواہ تنگ نہ کرتے تھے۔ وائسرائے کمیشنڈ آفیسر ایک مدراسی تھا اور میں ہیڈ کلرک تھا میرے ساتھ میرے ماتحت دو مدراسی کلرک تھے۔ مدراسی اچھے سمارٹ اور ڈی نیٹ ہوتے

ہیں۔ احکام کی بجاآوری میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

## ۵

برصغیر میں آزادی کے چرچے ہونے لگے۔ اب کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر پورے ہندوستان میں طوفانی دورے کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی نسبت ہندو زیادہ منظم تھے۔ اس لیے ہماری نسبت وہ زیادہ طاقتور تھے۔ مسلمانوں کی کئی سیاسی جماعتیں کانگرس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ جن میں جمعیت علمائے ہند۔ خاکسار۔ احرار۔ یونینسٹ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگرس کے ساتھ تھی۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، آصف علی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر قدوائی اور خان برادران وغیرہ۔ ان سب لوگوں نے آخر دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ پاکستان معرض وجود میں نہ آئے لیکن ان سب کو منہ کی کھانا پڑی اور پاکستان تقریباً یقینی نظر آنے لگا۔ قائداعظم کے رفقا میں سے سوائے ایک آدھ کے کوئی بھی مخلص اور امور سلطنت چلانے کے قابل نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جن برٹش آفیسرز کو افواج پاکستان میں خدمات کے لیے منتخب کیا گیا۔ ان برٹش آفیسرز نے بھی پاکستان کو نقصان پہنچایا۔ میں اس کی ایک چھوٹی سی حقیقت پر مبنی مثال پیش کرتا ہوں۔ جب برصغیر کی تقسیم عمل میں لائی گئی تو دفاعی ساز و سامان کی تقسیم کا کام بھی شروع ہوا۔ یہ بندر بانٹ برٹش آفیسرز کی زیر نگرانی ہوئی۔ دو حصے سامان ہندوستان کو ملتا تھا اور ایک حصہ پاکستان کو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ تقسیم ایئرسپورٹ سگنل یونٹ میں دیکھی۔ جب ہندو سکھ چلے گئے تو سامان کی تقسیم کے لیے جنرل ہیڈکوارٹرز (جس میں اس وقت تک برٹش آفیسرز کی بھرمار تھی) نے سگنل کے تین چار برٹش آفیسرز کا ایک بورڈ تشکیل دیا۔ جس نے اس سامان کی تقسیم کرنا تھی۔ وہ بورڈ ہماری یونٹ میں آیا۔ انہوں نے نیا اور اچھا اچھا سامان چھانٹ کر ہندوستان کے حصے میں کر دیا اور پرانا اور کنڈم

سامان پاکستان کے حصے میں۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ انہی ایام میں ایک دن کمپنی باغ موجودہ لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس سے محترم راجہ غضنفر علی خان جو کہ اس وقت مرکزی وزیر تھے، نے عوام کو خطاب کیا۔ راجہ صاحب جب تقریر ختم کر چکے تو میں سٹیج پر چڑھ گیا اور میں نے محترم راجہ صاحب کو فوج کے سامان کی بندر بانٹ کی پوری تفصیل بتائی۔ راجہ صاحب فرمانے لگے۔

بھائی مجھ سے کیا کہتے ہو۔ جاؤ اپنے کمانڈر انچیف کو جا کر بتاؤ۔ میرا وقت مت ضائع کرو۔ محترم راجہ صاحب کو فوجی رسم و رواج کی کیا خبر۔ میرے جیسے ایک معمولی سا سپاہی تو ڈائریکٹ اپنے صوبیدار تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ چہ جائیکہ میں انگریز کمانڈر انچیف جنرل میسوری کے پاس سینئر انگریز افسروں کی شکایت کروں۔ چنانچہ ان انگریز افسروں کی لوٹ کھسوٹ اور بندر بانٹ جاری رہی اور وہ تقسیم شدہ سامان جلد از جلد ہندوستان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہماری یونٹ کی دس بھری ٹن لاریاں انڈین آرمی کا تقسیم میں ملا ہوا سامان لے کر جالندھر کے لیے روانہ ہوئیں۔ ہر لاری کے ساتھ دو ڈرائیور تھے۔ کانوائے انچارج ایک مسلمان صوبیدار تھا اور اس کا نائب ایک حوالدار تھا۔ یہ کانوائے جب جالندھر پہنچا تو وہاں کی سگنل یونٹ والوں نے ان گاڑیوں سے اپنا سامان اتار لیا۔ جوانوں نے کھانا وغیرہ کھایا واپسی کی تیاری کرنے لگے تو اتنے میں اس یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر کرنل بترہ آگیا۔ اس نے پاکستانی صوبیدار کو بلا کر کہا کہ آپ یہ ٹرک بھی یہاں چھوڑ کر جائیں گے۔ صوبیدار نے دبے دبے الفاظ میں کچھ احتجاج کیا۔ لیکن جب کرنل بترہ نے فوجی انداز میں گھن گرج کے ساتھ اس سے بات کی تو وہ خاموش ہو گیا۔ سب پاکستانی جوان یہ واقعہ دیکھ اور سن رہے تھے۔ صوبیدار کے حکم پر سب نے اپنی اپنی گاڑی سے اپنا ذاتی سامان نکال لیا اور خود گاڑیوں سے اتر کر نیچے آگئے۔ یہ ڈرائیور جو جالندھر گئے تھے ان میں ایک غلام محمد نام کا سپاہی بھی تھا۔ جو یونٹ میں کسی شمار و قطار میں

یہ تھا۔ دُبلا۔ پتلا۔ مریل سا۔ چھوٹے سے قد کا زرد رو بیمار سا چہرہ۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا رہا۔ کرنل بترہ نے اس کو حکم دیا۔

جوان تم بھی نیچے آجاؤ۔

مَیں نیچے نہیں آؤں گا۔

کیوں۔ کیا وجہ ہے۔

یہ وہیکل حکومتِ پاکستان کا ہے۔ مَیں جیتے جی اسے غیروں کے سپرد نہیں کروں گا۔

تم مفت میں مرنا چاہتے ہو۔ کرنل نے شیر کی طرح گرجتے ہوئے کہا۔

اپنے ملک کے لیے جان دینا میرے لیے عزت کی بات ہوگی۔

تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تھوڑے سے توقف کے بعد کرنل نے پاکستانی صوبیدار کو آواز دی۔

صوبیدار صاب۔

جی حضور۔ صوبیدار دوڑتا ہوا آیا۔

اس جوان کو آرڈر دو کہ یہ اپنا وہیکل چھوڑ کے نیچے آجائے۔

غلام محمد تم کرنل صاحب کا حکم نہیں سُن رہے۔ فوراً نیچے آجاؤ۔ صوبیدار نے غصے سے کہا۔

میں مرنے سے پہلے تمہیں واصلِ جہنم کروں گا۔

ہوش میں تو ہو۔

بالکل بہ قائم ہوش و حواس ہوں۔ اس نے ڈرائیور سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اپنی سٹین گن لوڈ کرلی۔ کرنل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

غلام محمد نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرلیا اور گاڑی کی سیٹ سے منہ باہر نکال کر کہا۔ جو آدمی بھی میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا۔ مَیں اُسے اپنی گولیوں کا نشانہ بناؤں گا۔ وہ اپنی گاڑی کو بترہ صاحب کی یونٹ سے نکال کر

باہر لے آیا۔ صوبیدار اور اس کے ساتھ باقی جوان وہاں ہی رہ گئے اور وہ جانباز اکیلا اپنی گاڑی کو جالندھر سے واپس پاکستان لے آیا۔ کرنل بترہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ میں اس سرفروش سپاہی غلام محمد کو سلام کرتا ہوں۔ اس پر اللہ پاک کی رحمت اور سلامتی ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دم قدم سے قوموں کی عظمت قائم رہتی ہے۔ یہ جوان غالباً موضع ڈھوڈا علاقہ ونہار ضلع چکوال کا رہنے والا تھا۔

صوبیدار بمع اپنے جوانوں کے مرتا کھپتا دوسرے دن شام کو واپس راولپنڈی پہنچا۔ دوسرے دن دفتر میں صوبیدار کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ دینے آیا کہ کرنل بترہ نے ان کی گاڑیاں چھین لی ہیں۔

سپاہی غلام محمد کیسے اپنی گاڑی واپس لے آیا۔ کرنل بترہ نے اس کی گاڑی کیا نہیں چھینی۔

سر اس نے کرنل بترہ کی اور میرے حکم کی پرواہ نہیں کی اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ اب میں اس کی چارج شیٹ بناؤں گا۔

اس کی چارج شیٹ کی بجائے آپ کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے۔ کمانڈنگ آفیسر نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

صوبیدار شرمندہ ہو کر وہاں سے نکل کر میرے پاس آ گیا۔

میں نے صوبیدار کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھا رہا۔ پھر شرمندہ سا ہو کر اٹھ کر چلا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اب منظم طریقے سے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ پورے برصغیر میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔

فوجوں کی دوبارہ آرگنائزیشن کا کام شروع ہوا۔ نئی نئی یونٹیں معرض وجود میں آئیں۔ حالات اور زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے وہ شیر دل صوبیدار جو پاکستان کے نو تھری ٹن ٹرک کرنل بترہ کی خدمت میں پیش کر کے اور جان بچا کر بھاگ کر پاکستان میں آ کر دم لیا تھا۔ اسے انہی دنوں ترقی مل گئی اور وہ صوبیدار میجر بن گیا اور غلام محمد جوان پر

کھیل کر اپنی گاڑی جالندھر سے راولپنڈی لے آیا تھا اسے فوج سے سبکدوش کر دیا گیا کہ "مزید سروس کے قابل نہیں ہے۔" UN-FIT FOR FURTHER SERVICE) نہ جانے بے چارہ غلام محمد اب کس حال میں ہوگا۔ اللہ پاک اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ ہم نیچے والے لوگ اس طرح کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

## ۵

برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو اس کے ساتھ کشمیر میں بھی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہندوستانی ریاستوں کے متعلق کیبنٹ مشن نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس ریاست میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان کے ساتھ شامل ہوگی اور جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرے گی۔ ریاست کشمیر کا حکمران ہندو تھا۔ رعایا کی اکثریت مسلمان تھی۔ اصولاً اس ریاست کو پاکستان میں شمولیت اختیار کرنا چاہیے تھی۔ لیکن جواہر لعل نہرو۔ ماؤنٹ بیٹن اور مہاراجہ کے شرمناک گٹھ جوڑ سے یہ ریاست ہندوستان میں شامل کر لی گئی۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی۔ پاکستان کی جانب سے انگریز کمانڈر انچیف اور عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں نے اپنی گھناؤنی سازشوں سے یہ جیتی ہوئی جنگ بھی ہروا دی۔ کشمیر کے اسی جہاد میں سرحد کے قبائلیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن کی کوششوں اور قربانیوں سے مجاہدین سری نگر کے مضافات تک جا پہنچے تھے لیکن گھناؤنی سازش کے باعث ان کی پیش قدمی رک گئی اور پھر ہندوستانی پاؤں جمانے کے قابل ہو گئے۔ اور اس طرح مجاہدین کشمیر کو مکمل طور پر فتح نہ کر سکے۔

انہی دنوں میں جناب سردار محمد ابراہیم خان نے حکومت آزاد کشمیر کی بنیاد رکھی۔ میں ان دنوں ایئر سپورٹ سگنل یونٹ راولپنڈی میں تھا۔ میں نے دو ماہ کی چھٹی کی درخواست دی۔ میرا کمانڈنگ آفیسر مجھ سے کہنے لگا۔

احمد۔ آج کل ایمرجینسی ہے۔ تم چھٹی کیوں جاتے ہو۔ تمہارے گھر میں کوئی خاص تکلیف ہے۔

نہیں سر۔ گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔

تو پھر کیا بات ہے۔

سر۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کشمیر میں جاکر جہاد میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ شاید وہ انگریز صلیبی جنگوں کی وجہ سے "جہاد" سے کچھ الرجک تھا۔ چلا اٹھا۔

او۔ نو۔ نو۔ تم اپنا کام ادھر کرو۔ ادھر ہم کو بھی جہاد کی ضرورت ہے۔

ان دنوں آزاد کشمیر گورنمنٹ سید پور روڈ راولپنڈی کے ایک بنگلے میں قائم ہو چکی تھی۔ میں نے دوسرے دن اپنا سب سامان مقفل کر دیا اور کچھ سامان ساتھ لے کر یونٹ سے بھاگ کر لڑائی میں شرکت کرنے کے لیے سید پور روڈ جا پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت عزت مآب سردار محمد ابراہیم خان اور دوسرے وزراء۔ سید علی احمد شاہ۔ خواجہ غلام شمیم صاحب۔ سید نذیر حسین شاہ وغیرہ یہ سب حضرات وہاں موجود تھے۔ میں نے پاکستان آرمی کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اپنا سامان کندھے سے اتار کر نیچے رکھا اور ان حضرات کو اسلام علیکم کہا۔ انہوں نے یک زبان ہو کر سلام کا جواب دیا۔ محترم سردار صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

فرمائیے کیا حکم ہے!

جناب میں افواج پاکستان کا ایک ادنےٰ سپاہی ہوں۔ جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لیے آیا ہوں۔

آپ وہاں سے چھٹی لے کر آئے ہیں۔ سردار صاحب نے بڑے شفقت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

جی۔ نہیں۔

تو پھر کیسے آئے ہو۔

بھاگ کر آیا ہوں۔ آپ از راہ کرم مجھے کل ہی محاذ جنگ پر بھیج دیں۔

آپ کس لڑاکا یونٹ کے ہیں۔ سردار صاحب نے مجھ سے پوچھا۔
جناب ہر مسلمان عسکری طور پر مکمل تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ میں اعوان قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ پشتہا پشت سے ہمارا پیشہ سپہ گری ہوتا ہے۔
ویسے آپ کس یونٹ کے ہیں۔
میں کور آف سگنل کا ہوں۔
کیا ٹریڈ ہے آپ کا۔
بدقسمتی سے کلرک ہوں۔
ہمیں کلرکوں کی بھی تو ضرورت ہے۔
نہیں سر۔ میں کلرکی کرنے کے لیے یہاں نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں سینہ سپر ہو کر دشمن کا مقابلہ کروں اور اپنے جوان سینے پر گولیاں کھاؤں۔
اچھا جذبہ ہے۔ لیکن اس جذبے کی یہاں بھی ضرورت ہے۔ ہمارے دفتر میں کام کرنے والا کوئی آدمی نہیں ہے۔ آپ یہاں کام کر کے ہماری بہتر طور پر مدد کر سکتے ہیں۔
اچھا سر۔ مجھے سوچنے دیں اور پھر سردار صاحب مجھے اندر اپنے دفتر میں لے گئے۔ چائے منگوائی اور مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے۔
آپ چائے پئیں اور میری گذارش پر غور کریں۔
بہت اچھا سر۔ اور پھر سردار صاحب باہر جا کر ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔
میں نے سردار صاحب کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ چائے پی کر میں بھی اٹھ کر باہر اُن کے پاس آگیا۔ سلام کر کے سردار صاحب کے پاس پڑی ہوئی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔
کیوں جناب کیا فیصلہ کیا ہے۔ سردار صاحب نے بڑے ہی خوش کن موڈ میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
جناب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ لیکن میری

ایک گذارش ہے۔

ہاں۔ہاں۔فرمائیے۔

سر بات یہ ہے کہ میں اپنی یونٹ سے بھاگ آیا ہوں۔ ہماری یونٹ بھی پنڈی ہی میں ہے۔ یونٹ کا کوئی نہ کوئی آدمی کبھی نہ کبھی مجھے دیکھ ہی لے گا اور اس طرح مجھے فوج والے گرفتار کر کے یہاں سے لے جائیں گے اور میرا مقصد فیل ہو جائے گا۔

اس کے لیے میں نے ایک آسان سی ترکیب سوچ لی ہے۔ سردار صاحب نے فرمایا۔

کیا سر۔

ترکیب یہ ہے کہ آپ اپنی یونٹ میں واپس چلے جائیں۔ جب دفتر سے آپ کو چھٹی ہو جایا کرے گی تو آپ کپڑے تبدیل کر کے ادھر آجایا کریں۔ اس مقصد کے لیے روزانہ آپ کی بتائی ہوئی جگہ پر آپ کو لانے کے لیے گاڑی موجود ہوگی۔

میں اسی رات یونٹ میں واپس آگیا۔ میں نے اس واقعہ کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا۔ چند ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں گیا تھا۔ لیکن میں نے ان کو مطمئن کر دیا۔ دوسرے دن ایک بجے دفتر ختم ہوا۔ میں نے فوراً کھانا کھایا اور لباس تبدیل کر کے دو بجے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور گاڑی لے کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم جلد ہی سیدپور روڈ پر پہنچ گئے۔ آزاد کشمیر کے صدر کا دفتر بڑی بے سروسامانی کے عالم میں ایک ویران سی کوٹھی میں واقع تھا۔ صدر صاحب کے بیٹھنے کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک معمولی سی میز اور ایک سادہ سی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ دفتر میں کوئی الماری۔ میز یا کرسی نام کی چیز نہ تھی۔ ایک پرانا سا ٹائپ رائٹر ایک سٹول پر پڑا تھا۔ ٹائپ کرنے والا آدمی لکڑی کے ایک کھوکھے پر بیٹھ کر ٹائپ کرتا۔ دو بوسیدہ سے لکڑی کے بنچ ایک طرف کو پڑے ہوئے تھے۔ لکڑی کے دو کھوکھوں میں چند فائلیں پڑی ہوئی تھیں۔ دفتر کے اسی کمرے میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر لپیٹے ہوئے دو بستر رکھے تھے۔ غالباً یہ بستر ان مجاہدوں کے تھے جو مجھ سے پہلے

اس دفتر میں بطور کلرک کام کر رہے تھے۔ میں نے تقریباً ایک ہفتے میں دفتر کو اچھی طرح آرگنائز کر لیا۔ وہ دونوں مجاہد پڑھے لکھے آدمی تو تھے لیکن کلرکی کا کام نہ جانتے تھے۔ میں نے کوئی سات آٹھ ماہ تک سردار ابراہیم صاحب کے ساتھ کام کیا۔ سردار صاحب کی عمر اس وقت میرے اندازے کے مطابق کوئی تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ نہایت وجیہہ اور مردانہ حسن کا ایک مکمل نمونہ تھے۔ سردار صاحب نہایت ہی خوش لباس آدمی تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ وکیل تھے۔ سیاست کے داؤپیچ سے زیادہ آگاہی نہ رکھتے تھے لیکن وہ اپنے جذبے اور سچی لگن کی وجہ سے مشکل سے مشکل کام کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے لیتے تھے۔

## ۵

بے سروسامانی اور مشکل وقت میں جبکہ مجاہدین کے پاس ہتھیار، راشن کپڑے اور طبی سہولتوں کا فقدان تھا اور جن لوگوں نے اس کٹھن مہم کو احسن طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ یقیناً پورے عالم اسلام کی طرف سے دادوتحسین کے مستحق ہیں۔ یہ سیاست بھی عجیب کھیل ہے مجھے آج یہ کتاب لکھتے وقت رہ رہ کر جناب طالب قریشی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

طالب عجیب تر ہے سیاست کا معجزہ

جو تیرگی کے ساتھ تھے اب آفتاب ہیں

انہی کسمپرسی کے دنوں کا ایک مختصر سا رقعہ جو سردار محمد ابراہیم خان نے میرے نام لکھا تھا اتفاق سے مجھے اپنے کاغذات میں پڑا ہوا مل گیا ہے جس کا عکس پیش خدمت ہے۔

مکرمی شفیقی حمید اللہ صاحب

[illegible] السلام علیکم - میرے

1) یہاں بہت سی کتابیں ہیں کہ اُن کی [illegible] انگریزی
نہیں مل سکتا - تدریس کی توقع [illegible] جاتے - اُن
کا وقت ضائع ہو رہا ہے - تدریس اُن کی دلچسپی کی
مجھے [illegible] ہے - بہرحال کس قدر صحیح ہیں اُن کی آپ
[illegible] ارسال کر دوں گا - تاکہ معاملہ جلدی طے ہو سکے -

2) [illegible] معاملہ میری [illegible] کی اُن سے [illegible] امید
آپ [illegible] ہیں [illegible] کیجیے - صرف پاکستان
[illegible] العقاب [illegible]

3) [illegible] Transcript [illegible] ضرور [illegible] - جس قدر جلد ممکن ہو
ارسال کریں [illegible] گزارش کی -

4) آپ کا مشفق یہ عرض ہے کہ یہاں امریکہ [illegible] اچھے
[illegible] - [illegible] آپ [illegible] تشریف لے آئیں [illegible]
[illegible] حاضر ہے - بہرحال میری کوشش ہے
کہ [illegible] میں [illegible] مقصود ہے
جناب [illegible] -

باقی [illegible]

خادم
ابراہیم

اس مختصر سے خط سے اس وقت کی صحیح صورتحال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں جن لوگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر کشمیر کے ایک بڑے حصے کو ہندوستان کے خون آشام پنجوں سے آزاد کرایا۔ آج اسی آزاد کشمیر کے باسیوں نے اپنے ان محسنوں کو بھلا دیا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سردار محمد ابراہیم خان وزارت عظمیٰ کے اُمیدوار تھے لیکن آزاد کشمیر کے لوگ ۱۹۴۷ء کے سردار ابراہیم کو بھول کر شعبدہ بازوں کی صفوں میں شامل ہو کر اپنے ماضی کو بھول گئے۔ ہماری قوم ایک ناشکری قوم ہے وہ ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرتی ہے چاہے وہ گہنایا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

O

میں جس یونٹ میں تھا وہ ایر سپورٹ سگنل یونٹ تھی۔ اس کا زیادہ تر کام ایر ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے ہماری یونٹ کو پنڈی سے پشاور تبدیل کر دیا گیا۔ میں نے سردار صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تو فرمانے لگے۔
"وہ کام بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ یہ۔ اس لیے آپ اپنی پوسٹ کے ساتھ پشاور چلے جائیں۔ اب ہم اپنا کام یہاں چلائیں گے۔ آپ کی مہربانی۔"

اسی طرح میں اپنی یونٹ کے ساتھ ۱۹۴۸ء کے شروع میں پشاور آگیا۔ میں اس سے پہلے ۱۹۴۶ء میں بھی پشاور رہ چکا تھا۔ اس لیے پشاور کے ادبی حلقوں سے اچھی طرح متعارف تھا۔ ہماری یونٹ کو صدر بازار کے نزدیک خیبر بیرکس میں رہنے کے لیے جگہ ملی۔ پشاور چھاؤنی میں فوجیوں کی سب سے اچھی رہائش گاہ خیبر بیرکس ہیں۔ صدر بازار کے نزدیک ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ چند روز میں جب ہماری یونٹ اس سٹیشن پر سیٹ ہو گئی تو میں نے بھی پشاور کے ادبی حلقوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔

یہ میری عادت ہے کہ میں جس نئے سٹیشن پر پوسٹ ہو کر جاتا ہوں تو سب سے

پہلے وہاں کے ادبی کتب فروشوں سے واقفیت پیدا کرتا ہوں۔ چنانچہ ارباب روڈ پشاور صدر میں واقع لنڈن بک کمپنی میں میرا آنا جانا شروع ہوگیا۔ میں اپنا زیادہ وقت اس کتاب گھر میں گذارتا۔ میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں لیکن مجھے شروع ہی سے کتابوں سے بڑی محبت رہی ہے۔ مجھے جب تنخواہ ملتی میں اخراجات کے لیے معمولی سی رقم رکھ لیتا باقی سب پیسوں کی کتابیں خرید لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک معمولی اور کم حیثیت آدمی ہونے کے باوجود میرے پاس ہزاروں ادبی قسم کی کتابیں ہیں۔ جن میں اب کئی کتابیں ناپید ہیں۔ اس کے علاوہ مخطوطے بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

ایک دن میں ارباب روڈ سے آگے ایک چھوٹی سی سڑک کی جانب غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ وہاں میں نے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان دیکھی۔ جس پر "اردو محل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں غیر ارادی طور پر اندر چلا گیا۔ وہاں ایک خوبرو نوجوان کتابوں کی ترتیب اور تزئین میں مصروف تھا۔ اس نے بڑے خوب صورت فنکارانہ بال رکھے ہوئے تھے۔ میں جب اس کے قریب گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور کہا۔

"فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

نوازش آپ کی۔ میں ادھر سے گذر رہا تھا۔ "اردو محل" کا بورڈ دیکھا تو اندر چلا آیا۔

تشریف رکھیے۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پئیں۔

یہ اس نوجوان کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ ہم چائے پی رہے تھے، اور ادبی گفتگو کیے جا رہے تھے۔ یہ نوجوان بڑا ہی پڑھا لکھا اور علوم شرقیہ کا عالم تھا۔ اس نوجوان نے میری ادبی زندگی پر انمٹ ادبی نقوش چھوڑے۔ یہ صاحب تھے۔ سید حبیب مصطفےٰ زینی جارچوی یہ صاحب مشہور غزل گو شاعر جناب نخشب جارچوی کے عزیزوں میں سے تھے۔ میرا اب یہ روز کا معمول بن گیا کہ میں شام

کو نہاد معو کرزیبی صاحب کے اُردو محل پہنچ جاتا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسلامیہ کالج پشاور کے اقبالیات کے ایک نامور اُستاد پروفیسر طاہر فاروقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ طاہر صاحب ایک سینئر ادیب اور مشہور نقاد تھے۔ آپ نے اقبال پر کئی تنقیدی کتابیں رقم فرمائیں۔ نہایت وجیہہ، ہنس مکھ اور ملنسار شخص تھے۔ آپ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ پشاور صدر کے اس اُردو محل میں شاعروں اور ادیبوں کی نشستیں ہونے لگیں۔ جن میں طاہر فاروقی۔ محمد شفیع صابر۔ یوسف رجا چشتی۔ مجاہد لکھنوی۔ انصر لدھیانوی۔ جلیل حشمی۔ شاد امرتسری۔ مسعود قریشی افضل ڈیروی۔ صدیق خلیل۔ زیبی جارچوی۔ خلش ہمدانی۔ شوکت واسطی۔ مسعود انور شفقی۔ منظر گیلانی اور مرزا محمود سرحدی شرکت کرتے۔

تھوڑے دنوں بعد ہم نے حلقۂ ارباب ذوق (پشاور شاخ) کا افتتاح کیا۔ مجھے حلقۂ اربابِ ذوق پشاور کا پہلا جنرل سیکرٹری بننے کا اعزاز نصیب ہوا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک حلقہ کے تنقیدی اجلاس بڑی باقاعدگی سے ہوتے رہے حلقۂ اربابِ ذوق کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبران۔ جناب سید فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی۔ خاطر غزنوی۔ ضیا جعفری۔ فراز۔ محسن۔ مجید شاہد۔ فرید عرش وغیرہ بھی شرکت کرتے۔ حلقہ کے اجلاس صدر میں اور ترقی پسند مصنفین کے پشاور شہر میں منعقد ہوتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک بار ہم نے ایک آل پاکستان مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ جس میں پشاور کے شعرائے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں سے تشریف لانے والے شعرائے کرام سید عابد علی عابد۔ سید عبدالحمید عدم۔ احمد ندیم قاسمی۔ قیوم نظر۔ یوسف ظفر۔ قتیل شفائی۔ حافظ لدھیانوی۔ خمار بارہ بنکوی۔ عبدالعزیز فطرت۔ عزیزا ختر وارثی۔ کلیم جلیسری اور دوسرے متعدد شعرائے نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ پشاور کے ٹاؤن ہال میں ہوا جس کی صدارت محترم سید جعفر شاہ صاحب وزیر تعلیم صوبہ سرحد نے فرمائی۔ پشاور کی ادبی تاریخ

میں یہ مشاعرہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

۵

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پشاور کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں اپنے کمرے (واقع خیبر بیرکس) سے نیچے آیا۔ اور پشاور شہر میں ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے کیا دیکھا کہ برآمدے میں سیڑھیوں کے ساتھ ایک ۳۰۳ رائفل پڑی ہوئی ہے کوئی آدمی وہاں موجود نہ تھا۔ میں نے احتیاطاً وہ رائفل اٹھا کر اپنے کمرے میں پلنگ پر رکھ دی۔ اور کمرہ بند کر کے مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے شہر چلا گیا۔ وہاں جا کر میں یہ بھول گیا کہ میں نے ایک سرکاری رائفل بغیر کسی کی اطلاع کے اپنے کمرے میں بند کر دی ہے۔

مشاعرہ رات بارہ بجے ختم ہوا۔ شہر سے خیبر بیرکس آنے تک مجھے مزید تقریباً آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ میں تقریباً ساڑھے بارہ بجے شب واپس آیا۔ جونہی میں یونٹ کے مین گیٹ پر پہنچا تو میں نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ پوری یونٹ مارچنگ آرڈر پہنے ہوئے فالن کھڑی ہے۔ کمانڈنگ آفیسر میجر ظہور الحق ملک (جو نیوی کے موجودہ کمانڈر انچیف جناب یسطور الحق ملک کے بڑے بھائی تھے) بڑی بے قراری کے عالم میں کوارٹر گارڈ کے سامنے والی سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ اس وقت مجھے اپنی نالائقی کا بڑی طرح احساس ہوا۔ میں نہایت شرمندگی اور پشیمانی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میجر صاحب کے پاس آیا اور ان کو سلام کر کے اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

تم کہاں تھے؟

سر۔ شہر ایک مشاعرہ تھا میں وہاں گیا ہوا تھا۔

واہ نیرؔ صاحب۔ یہاں روم جل رہا ہے اور آپ بیٹھے چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔ یہاں یونٹ میں رائفل گم ہو گئی ہے اور یہاں قیامت کا سماں ہے اور آپ مشاعروں

میں شرکت کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ کس سے اجازت لے کر یونٹ لائینز سے غیر حاضر ہوئے ہیں۔

نہیں سر۔ کسی سے بھی اجازت نہیں لی۔

چلو میرے ساتھ دفتر۔ بڑی ایمرجینسی ہے۔

کیوں سر کیا ہو گیا ہے۔

یونٹ سے ایک رائفل گم ہو گئی ہے۔ جلدی کرو۔ جنرل ہیڈکوارٹرز کو فوراً سگنل دو۔

میں اور میجر صاحب دفتر میں آ گئے۔ وہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہ تھا۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میجر صاحب کے کمرے میں گیا۔

سگنل تیار ہو گیا ہے۔ میجر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

نہیں سر۔

کیوں۔

آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہاں کہو۔

سر۔ شام کو جب میں اپنے کمرے سے نیچے آیا تو برآمدے میں سیڑھیوں کے ساتھ ایک رائفل ان۔ اٹینڈڈ (UN - ATTENDED) پڑی ہوئی تھی وہ میں نے وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ دی تھی۔

یہ بات صوبیدار محمد شفیع صاحب نے بھی مجھ سے کہی تھی کہ اسے سگنل مین محمد بشیر نے بتایا ہے کہ وہ جب مین گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا تھا تو اُدھر سے اُس نے تمہیں رائفل اُٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ صوبیدار صاحب نے تمہارے کمرے کا تالا توڑ کر وہاں اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہاں ان کو کوئی رائفل نہیں ملی۔

یہ بات سُن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ صوبیدار شفیع اور میجر

تعلقات اچھے نہیں تھے ہم دونو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کبھی کوئی موقعہ ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ میں سوچنے لگا آج صوبیدار شفیع مجھے مات دے گیا ہے۔ رائفل میں خود اپنے ہاتھوں سے وہاں رکھ کر گیا تھا۔ اب رائفل وہاں موجود نہ تھی۔ میں نے میجر صاحب سے کہا۔ سر سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے رائفل وہاں سے اس لیے اٹھائی تھی کہ کوئی غلط آدمی رائفل اٹھا کر لے ہی نہ جائے۔ کیا صوبیدار شفیع نے آپ کی اجازت سے میرے کمرے کا تالا توڑا تھا۔

نہیں میں نے ایسی کوئی اجازت اسے نہ دی تھی

سر۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح پتہ ہے کہ ہم دونو کے تعلقات آپس میں خوشگوار نہیں ہیں۔ اب اگر میرے کمرے میں رائفل نہیں ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صوبیدار شفیع نے وہاں سے نکلوا کر کہیں چھپا کر رکھ دی ہوئی ہے۔ تاکہ اس کا خمیازہ میں بھگتوں۔ بہرحال آپ میرے ساتھ میرے کمرے میں چلیں۔ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ مجھے شرمسار ہونے سے بچائے گا۔ میں اور میجر صاحب دفتر سے اٹھ کر دوسری منزل پہ واقع میرے رہائشی کمرے کی طرف چل پڑے۔ میرے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا پاس ہی پڑا تھا۔ دروازے کی کنڈی کھول کر ہم دونو اندر چلے گئے۔ میں نے لائٹ آن کی تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے دیکھا میرے کمرے کا سب سامان بکھرا ہوا پڑا تھا۔ پلنگ پر میں نے مچھر دانی لگا رکھی تھی۔ میں جاتے وقت رائفل مچھر دانی کے اندر رکھ کر گیا تھا۔ کسی نے احتیاطاً مچھر دانی کو آگے پیچھے ہلایا جلایا تھا۔ رائفل بدستور مچھر دانی میں دیوار والی سائیڈ پر لپٹی ہوئی اب بھی پڑی تھی۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے میجر صاحب کو بتایا۔

سر۔ رائفل تو یہ پڑی ہے۔

کہاں ہے۔ وہ لپک کر میرے پاس آگئے۔ میں نے مچھر دانی سے رائفل نکال کر ان کے حوالے کی۔ ان کے چہرے پر رونق آگئی۔ فوج میں اس طرح کا واقعہ اگر ہو جائے تو اس کے مضمرات سے کمانڈنگ آفیسر ہرگز نہیں بچ سکتا۔ رائفل

میجر صاحب نے ہاتھ میں اُٹھالی اور پھر ہم دونوں اُتر کر نیچے آئے جہاں کہ اب تک یونٹ فالن کھڑی تھی۔ میجر صاحب نے صوبیدار کو کہا کہ یونٹ کو ڈسمس کر دیں۔ جب جوانوں نے ان اذیت ناک لمحوں سے چھٹکارا پایا تو نعرے لگاتے ہوئے اپنے آرمز جمع کرانے کے لیے کوتوں کی طرف چلے گئے۔

یونٹ میں میرے طرفدار زیادہ تھے۔ رات کے اندھیرے میں وہ نعرے لگا رہے تھے۔ میجر ملک صاحب۔ زندہ باد۔ احمد صاحب زندہ باد۔ صوبیدار شفیع مردہ باد شیم شیم۔ دوسرے دن میجر ملک نے صوبیدار شفیع کو اور مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ دونوں کو پاس بٹھایا اور پھر صوبیدار شفیع سے کہنے لگے۔

صوبیدار صاحب آپ نے احمد کے کمرے کا تالا کس کے حکم سے توڑا تھا۔

سَر مجھے رپورٹ ملی تھی کہ گارڈ والوں کی رائفل احمد نے اُٹھائی ہے اور اپنے کمرے میں بند کر کے خود شہر چلا گیا ہے۔ مَیں نے رائفل برآمد کرنے کے لیے ایسا کیا۔

آخر کس کے حکم سے۔

سَر۔ مَیں نے حکم تو کسی سے نہیں لیا سب کچھ اپنے طور پر کیا۔

آپ نے یہ جرم کیا ہے۔ پھر رائفل وہاں سے برآمد کیوں نہیں کی۔

سَر۔ مَیں نے اور حوالدار میجر نواب خان ہم دونوں نے وہاں جا کر تلاشی لی۔ رائفل وہاں نہیں تھی۔

تو اب کہاں سے آگئی ہے۔

سَر۔ اُس نے کہیں اور چھپا کر رکھی ہوگی۔ کمرے میں تو نہیں تھی۔

صوبیدار صاحب۔ خدا کے غضب سے ڈریں۔ یونہی الزام تراشی نہ کریں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مَیں احمد کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا اور میرے سامنے اس نے اپنے پلنگ پر لگی ہوئی مچھر دانی سے رائفل نکالی۔

سَر۔ اس کے پلنگ اور مچھر دانی کی تو مَیں نے خود تلاشی لی تھی۔ رائفل مچھر دانی میں

نہیں تھی۔

میجر ملک کو غصہ آ گیا۔ وہ صوبیدار شفیع سے کہنے لگے۔ صاحب آپ احمد سے معافی مانگیں۔ ورنہ میں آپ کے خلاف ڈسپلینری ایکشن لوں گا۔ صوبیدار شفیع کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے میجر صاحب سے کہا۔ سر صوبیدار صاحب نے جو کچھ بھی کیا ہے نیک نیتی سے کیا ہے۔ مجھے اب ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اس قصے کو یہاں پر ہی ختم فرمائیں۔ صوبیدار صاحب کے اظہار تاسف سے میری دادرسی ہو گئی ہے۔

تمہاری مرضی۔ اگر تم اس بات پر مزید زور نہیں دیتے تو میری طرف سے یہ چیپٹر کلوز سمجھیے۔

تھینک یو سر۔ میں نے میجر صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے یونٹ میں مزید بدمزگی ہو۔

میجر صاحب نے دفتر اردلی کو بلایا اور اسے چائے لانے کے لیے کہا۔ ہم تینوں نے اکٹھے وہاں بڑی پر تکلف چائے پی۔ میں چاہتا تھا کہ صوبیدار صاحب اس واقعہ کو بھول جائیں اور آئندہ کے لیے ہم دونوں کے تعلقات خوشگوار رہیں۔ میں فوج میں جہاں کہیں بھی رہا ہوں۔ جونیئر کمیشنڈ آفیسرز صاحبان نے کبھی بھی مجھے مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے شاکی رہے کہ میرا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ یونٹ لائینز سے باہر جاتا ہوں تو آؤٹ پاس لے کر نہیں جاتا۔ صبح پی۔ ٹی پریڈ پر نہیں آتا۔ رات کو دس بجے اپنے کمرے میں حاضر نہیں ہوتا جو فوجیوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اپنے سینئر لوگوں کی عزت نہیں کرتا۔ سوٹ پہنتا ہوں لیکن وردی اچھی نہیں پہنتا۔ دفتری خط و کتابت سے سینئر سردار کو آگاہ نہیں رکھتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہرکیف میجر صاحب نے میرا اور صوبیدار محمد شفیع کا راضی نامہ کروا دیا۔ اور ہم دونوں ہنسی خوشی کمانڈنگ آفیسر کے دفتر سے باہر آ گئے۔ اس کے بعد ہماری یونٹ پشاور سٹیشن پر دو سال تک رہی۔ سب

کاروبار ٹھیک چلتا رہا۔

مَیں بدستور حلقہ اربابِ ذوق پشاور کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اور پروفیسر طاہر فاروقی اور زیبی صاحب حلقہ کے سرپرست تھے۔ جون ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں امرجینسی کا نفاذ ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے سرحدوں پر آگئیں۔ اس سلسلے میں ہماری یونٹ بھی منبر اکورر کے ساتھ جہلم آگئی۔ منبر اکورر دریائے جہلم کے کنارے خیمہ زن ہوگئی۔ ہماری یونٹ نے جس جگہ ڈیرے ڈالے وہ بڑا ہی پُرفضا سپاٹ تھا۔ ہماری یونٹ جہلم ہیڈ پوسٹ آفس اور گرجا گھر کے درمیان واقع درختوں کے ایک جھنڈ میں خیمہ زن تھی۔

جہلم آکر چند دن تک تو مَیں کیمپ ہی میں رہا۔ آخر کھلی فضاؤں میں اُڑتے والے شاہین کو یہ فضا کہاں راس آسکتی تھی۔ آخر ایک دن مَیں نے لباس تبدیل کیا اور جہلم شہر کا رُخ کیا۔ یونہی بے مقصد بازار میں پھرتا رہا۔ نہ کوئی واقف نہ دوست۔ نہ جان نہ پہچان۔ جہلم میں کوئی کتابوں کی دکان بھی دکھائی نہ دی کہ دل بہلانے کے لیے کوئی کتاب ہی خرید لیتا۔ چنانچہ کیمپ میں واپس آگیا۔ اسی روز جنرل ہیڈ کوارٹرز سے میرے پروموشن کا سگنل موصول ہوا اور مجھے جونیئر کمیشنڈ آفیسر بنا دیا گیا۔ دو تین دن ہماری یونٹ میں بڑی گہماگہمی رہی۔ ایک دن مَیں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک کلرک نے مجھے بتایا کہ آپ کا ٹیلی فون ہے۔ مَیں فون پر گیا تو پتہ چلا کہ جناب سید جعفر طاہر کا ٹیلیفون ہے۔ سید صاحب اُن دنوں منبر اکورر کی ایک یونٹ میں ایجوکیشن آفیسر تھے۔ سید صاحب مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اُن دنوں سید صاحب آرمی ایجوکیشن کور میں صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی یونٹ سرائے عالمگیر سے جانب شمال چند میل کے فاصلے پر تھی۔ سید صاحب نے اب ٹیلی فون پر مجھے کمیشن ملنے پر مبارک باد دی تھی۔ مَیں نے اُن سے گزارش کی کہ کبھی جہلم آئیں تو میرے پاس ضرور تشریف لائیں۔ فرمانے لگے ضرور آؤں گا۔ لیکن تم پہلے سید عبدالحمید عدم صاحب سے بھی مل لینا اور ان کو زحمت دینا کہ کسی دن شام کو ایک مختصر سی شعری محفل کا اہتمام کریں۔ مَیں نے ان سے پوچھا۔

شاہ صاحب عدم صاحب کہاں ہوتے ہیں۔

بھئی تمہارے بالکل قریب ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے والے بنگلے میں ان کا دفتر ہے۔ وہ وہاں آپ کو ملیں گے۔

عدم صاحب وہاں کیا ہیں۔

بُدھو ہی رہے تم۔ پاکستان میں جو آدمی عَدم کو نہیں جانتا وہ پاکستان کو ہی نہیں جانتا۔

حضور! میں عَدم صاحب کا نیاز مند ہوں لیکن یہ پتہ نہیں وہ اس دفتر میں کیا ہیں۔

اس لیے تو میں نے تمہیں بدھو کہا ہے۔ سُنو۔ عَدم صاحب ملٹری اکاؤنٹس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ اور آج کل اس ایریا اور آزاد کشمیر کے لوکل آڈٹ آفیسر ہیں۔

حضور۔ مَیں اُن سے آج ہی ملوں گا اور پھر جو بھی پروگرام بنا اس سے آپ کو مطلع کروں گا۔

بہتر ہے۔ آپ آج ہی جائیں۔ ابھی تو دس بجے ہیں۔

طاہر صاحب کام کا وقت ہے۔ مجھے کام کرنے دیں۔ شاعری سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔

مجھے پتہ ہے تم جتنا کام کرتے ہو۔ سوائے لڑنے مرنے کے اور تمہارا کام ہی کیا ہے۔ تم اپنے کمانڈنگ آفیسر سے میری بات کراؤ۔

مَیں نے میجر ملک سے سید صاحب کی بات کرا دی۔ تھوڑی دیر تک دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میجر ملک صاحب جعفر طاہر صاحب کے ملنے والے ہیں۔ جب ٹیلی فون ختم ہوا تو میجر ملک صاحب نے مجھے بُلایا اور کہا۔

احمد صاحب۔ جعفر طاہر صاحب نے جو کام آپ کے ذمہ لگایا ہے ان کا وہ کام ابھی جا کر کریں۔

سر۔ میں نے اُن سے گذارش کی ہے کہ شام کو اس کام کا پتہ کر دوں گا۔ ابھی میرے کام کا وقت ہے

نہیں صاحب۔ وہ بضد ہیں۔ آپ اپنا کام پھر کر لیں۔ پہلے سید صاحب کا کام کریں۔ میجر صاحب نے توقف کے بعد مجھ سے پوچھا۔ صاحب آخر کام کیا ہے۔

سر۔ یہاں لوکل آڈٹ آفیسر ہیں سید عبدالحمید عدم صاحب ان سے مل کر ایک مختصر سی ادبی نشست کا انتظام کرنا ہے۔ جس میں جعفر صاحب بھی شرکت کریں گے۔

میجر صاحب ہنس پڑے۔ صاحب آپ نے یہ شعر و شاعری والا قصہ یہاں بھی آتے ہی شروع کر دیا ہے۔

نہیں سر۔ یہ تو جعفر طاہر صاحب کی پروپوزل ہے۔

اچھا۔ آپ ابھی جائیں اور عدم صاحب سے مل کر پروگرام ترتیب دے لیں۔ پھر مجھے بتا دیں تاکہ میں طاہر صاحب کو ٹیلیفون کر کے ان کو مطلع کر دوں۔

سر۔ تھوڑی دیر کے بعد جاؤں گا۔ ابھی میں بہت ہی ضروری کام کر رہا ہوں۔

کیا ضروری کام کر رہے ہیں آپ۔

سر۔ کور ہیڈ کوارٹر میں ایک ضروری ریٹرن بھیجنی ہے۔ وہی چیک کر رہا ہوں۔

آپ ایسا کریں وہ مجھے دے دیں میں چیک کر لوں گا صادق شاہ سے ٹائپ کروا کر کور ہیڈ کوارٹر بھجوا دوں گا۔

بہت اچھا سر۔ اور میں عدم صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سید جعفر طاہر نے مجھے جو لوکیشن بتائی تھی وہ میرے دفتر کے بالکل قریب تھی۔ مشکل سے تین چار منٹ کا راستہ تھا۔ ٹیلیفون ایکسچینج کے سامنے والے بنگلے میں لوکل آڈٹ آفس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس بنگلے کے برآمدے میں بنچ پر ایک چپڑاسی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے سلام دعا کے بعد عدم صاحب کا پوچھا۔ چونکہ میں یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ چنانچہ وہ مجھے محض ایک فوجی افسر سمجھ کر

سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گیا۔ میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے نہایت ہی بے رخی سے جواب دیا۔ میں خاموشی سے اُن کے سامنے پڑی ہوئی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جاہل سپرنٹنڈنٹ بدستور کاغذات کی چھان پھٹک میں مصروف رہا۔ اُسے یہ ہوش ہی نہ رہا کہ وہ میرے آنے کا سبب پوچھے۔ کافی دیر کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

آپ کا کیا کام ہے۔

میں نے عدمؔ صاحب کو ملنا ہے۔

کوئی کام ہو تو مجھے بتائیے۔

انہی سے کام ہے۔

بھائی صاحب جو بھی دفتر کا کام ہو وہ میرے ہی سپرد کریں گے۔

نہیں جناب دفتر کا کوئی کام نہیں ہے۔

تو کیا آپ ان کی صورت دیکھنے آئے ہیں۔

جناب صورت دیکھنے نہیں۔ زیارت کرنے آیا ہوں۔

وہ آپ کے پیر ہیں۔

پیروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔

کیا آپ کوائٹر ماسٹر ہیں۔

جی نہیں۔ میں ہیڈ ماسٹر ہوں۔

یار۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ کوئی آڈٹ آبجیکشن ہے تو مجھے بتاؤ۔ فوجیوں کا آڈٹ والوں کے ساتھ اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ سیدھی طرح بات کرو۔ پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔

حضور والا خان۔ میں نے آپ کی خدمتِ اقدس میں عرض کی ہے کہ میرا کوئی سرکاری کام نہیں ہے۔ میں صرف اُن سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔

آپ کی یونٹ یہاں ہے۔

جی۔ فی الحال تو ہے۔

کیا آپ اپنے کمانڈنگ آفیسر کی چِٹھی لوکل آڈٹ آفیسر (L.A.O) کے نام لائے ہیں۔

کس غرض کے لیے۔

اس غرض کے لیے کہ آپ کو کمانڈنگ آفیسر کی طرف سے L.A.O صاحب کو ملنے کی اجازت ہے۔

بھئی آپ مجھے گھسیارا سمجھتے ہیں جو اجازت نامہ لکھوا کر لے آؤں۔ آپ دیکھتے نہیں میں پاکستان آرمی کا کمیشنڈ آفیسر ہوں۔ آپ مجھے بتائیں وہ ہیں کہاں۔ بھئی اتنے بڑے افسر سے ڈائریکٹ کیسے مل سکتے ہیں۔

وہ بزرجمہر ابھی مجھ سے بحث کر ہی رہا تھا کہ ایک بھاری بھرکم سا آدمی ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ بال اُلجھے ہوئے۔ کپڑے قیمتی پہنے ہوئے تھے لیکن صاف نہ تھے سگریٹ درمیان کی دو انگلیوں میں دبائے ہوئے لمبے لمبے کش لیتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ وہ جاہل سپرنٹنڈنٹ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پہلی نظر میں اس آنے والے آدمی کو نہ پہچانا۔ جب اس نے سپرنٹنڈنٹ سے بات کی۔

اصغر صاحب۔ سب ٹھیک ہے۔

ٹھیک ہے سر۔

یہ صوبیدار صاحب کیوں آئے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا ہے کہ اگر کوئی سرکاری کام ہے تو مجھے بتائیں لیکن یہ نیک بخت ایک ہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ میں نے عدمؔ صاحب سے ملنا ہے اس آدمی نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور کہنے لگا۔ حضور میں ہوں آپ کا خادم سید عبدالحمید عدمؔ۔ کوئی حکم ہو تو فرمائیے۔

جناب عالی! مجھے خلشؔ ہمدانی کہتے ہیں۔ میں ایئر سپورٹ سگنل یونٹ میں صوبیدار ہیڈ کلرک ہوں۔ سید جعفر طاہرؔ میرے کرم فرما ہیں۔ وہ اس ایمرجینسی میں

سرائے عالمگیر کے نزدیک ایک فوجی کیمپ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے مجھے فون کیا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی مختصر سی ادبی نشست کا پروگرام بناؤں۔

کہاں کے لیے۔

یہاں جہلم کے کسی ہوٹل میں مل بیٹھیں گے۔

جعفر طاہر صاحب کو آپ کہہ دیں وہ آج شام ہی کو آجائیں۔ مقامی شعرا حضرات کو میں اطلاع کر دوں گا۔

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ مجھے آج سے تین چار سال پہلے کا راولپنڈی کا ایک مشاعرہ یاد آگیا۔ جو راولپنڈی صدر کے ایک سینما ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اور جس کی صدارت اس وقت کے ڈپٹی کمشنر جناب شیخ انوار الحق صاحب نے فرمائی تھی۔ محترم انوار الحق صاحب اب سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان کے چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے غالباً یہ دسمبر ۱۹۴۷ء یا جنوری ۱۹۴۸ء کے دن تھے۔ یہ مشاعرہ بڑا ہی کامیاب اور ہنگامہ خیز تھا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد سے میں نے بھی اپنا کلام اس طرح کے بڑے مشاعروں میں سنانا شروع کر دیا تھا۔ اس مشاعرے میں میں نے خصوصی طور پر شرکت جناب سید عبدالحمید عدم سے ملاقات کی غرض سے کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے عدم کو نہ دیکھا ہوا تھا۔ ان کا کلام پڑھتا تھا اور ان کا بے حد شیدائی تھا۔ اُس رات میرے ذہن میں تھا کہ عدم کوئی بڑا خوش پوش اور بارُعب شخصیت کا مالک ہوگا۔

سٹیج پر بیٹھے بیٹھے جناب عبدالعزیز فطرت نے عدم صاحب سے میرا تعارف کروایا۔ جتنے اس کے شعر خوب صورت ہوتے تھے اتنا خوبصورت وہ خود نہ تھا۔ وہ سب لوگوں سے ہٹ کر الگ تھلگ سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ بال اُلجھے ہوئے۔ حجامت بڑھی ہوئی۔ کوئی زیادہ صاف کپڑے بھی نہ پہن رکھے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا تو

بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ میری بیاض پر اپنا ایک قطعہ (میری التجا پر) تحریر فرمایا اور اپنا آٹوگراف بھی عنایت فرمایا۔ یہ تھی جناب عدم سے میری پہلی ملاقات۔

آج میں نے چار سال کے بعد ان کو ایک دوسرے ماحول میں دیکھا تو مشکل سے پہچانا۔ عدم صاحب بھی مجھے نہ پہچان سکے۔ میرے جیسے ہزاروں معتقدی اور مداح ان کو ملتے ہیں وہ کس کس کو یاد رکھیں۔ انہوں نے گھنٹی بجاکر چپڑاسی کو بلایا اور پھر اسے چائے لانے کے لیے کہا۔ ہم ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ وہ سپرنٹنڈنٹ اندر آیا۔ وہ میری اس طرح کی خاطر مدارت دیکھ کر جھینپ سا گیا۔ عدم صاحب کو کچھ کاغذات دکھائے اور واپس چلا گیا۔ ہم ابھی تک چائے پی رہے تھے اور ادبی گفتگو کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عدم صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا۔

ہیلو۔ جناب میں لوکل آڈٹ آفس سے بول رہا ہوں۔

جی۔ لوکل آڈٹ آفیسر ہوں۔ جی جناب میں سید عبدالحمید عدم ہوں۔

کیا فرمایا آپ نے۔ آپ کمانڈنگ آفیسر ار سپورٹ سگنل یونٹ میجر ملک صاحب بول رہے ہیں۔

جناب عالی!۔ آپ کا کوئی صوبیدار میرے پاس نہیں آیا۔

صبح کا میرے دفتر کی طرف آیا ہوا ہے۔

جناب ملک صاحب۔ میرے پاس صوبیداروں کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کو کہیں لیفٹ رائٹ کروا رہے ہوں گے۔

کیا کہا آپ نے۔ اس صوبیدار کا نام خلش ہمدانی ہے۔ میجر صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ وہ بڑا ہی پیارا شاعر ہے۔ اس کی پہچان صوبیداری نہیں بلکہ شاعری ہے یہ حضرت بالکل میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ کو کیا جلدی ہے۔ ایسے آدمی کوئی روز روز تو نہیں ملا کرتے۔ اسے میرے پاس بیٹھنے دیں۔ ہاں آپ جعفر طاہر کا فرما رہے تھے۔ میرا ٹیلی فون نمبر اسے دے دیں۔ اور اس سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ خود بات کرے۔ خلش صاحب بھی یہاں ہی ہیں۔ جعفر طاہر کی ان سے بھی بات ہو جائے

گی۔ اور پھر عدم صاحب نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ہیلو۔ جی ہاں میں عدم بول رہا ہوں۔ بھئی جعفر طاہر کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم مزید کسی توقف کے فوراً میرے دفتر میں آجاتے یہاں ایک بڑا ہی پیارا آدمی بیٹھا ہوا ہے اس سے بھی تمہاری ملاقات ہو جاتی۔

کون ہے وہ۔ چلو بتائے دیتا ہوں۔ یہ ہیں خلش ہمدانی صاحب۔ تمہارے پیٹی بند بھائی ہیں۔ پہلے مجھے پتہ نہ تھا کہ یہ حضرت بھی فوج میں ملازمت کرتے ہیں۔

آپ نے ہی ان کو میرے پاس بھیجا ہے۔ بھیجا ہوگا۔ لیکن یہ کریڈٹ آپ کو نہیں جاتا۔ بہت پہلے جناب عبدالعزیز فطرت صاحب نے انہیں مجھ سے ملایا تھا۔

سنو جعفر۔ کیا کہا۔ شام کو آؤ گے۔ کتنے بجے آؤ گے۔ ؟ سات بجے۔ چلو ٹھیک ہے۔ میں مقامی شعرائے کرام کو مطلع کر دوں گا۔

اسی دن شام ہی کو ایک مقامی ہوٹل میں ایک یادگار ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں جہلم کے مشہور شعرا اور ادبائے شرکت کی۔ چند ایک دوستوں کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ جن میں پنجابی زبان کے نامور شاعر استاد اللہ دتہ جوگی جہلمی۔ سید امداد ہمدانی۔ آغا افتخار احمد خان یوسف زئی۔ عبدالرؤف ظفر۔ عزیز دہلوی۔ شیخ احسان الحق۔ راجہ حمید کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ آپ ایک لمحے کے لیے کسی اجنبی آدمی کو ملتے ہیں اور وہ مختصر سی ملاقات پھر آپ کا سرمایہ حیات بن جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس ملاقات کو کم و بیش چالیس سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ لیکن افتخار یوسف زئی اور رؤف ظفر سے ہر ملاقات یوں معلوم ہوتی ہے جیسے ان سے ابھی ابھی ملا ہوں اور ان سے باتیں کرتے ہوئے جی بھرتا ہی نہیں۔ ان کے علاوہ میں شیخ احسان الحق جو اپنی جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے ان کو میں زندگی بھر کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ مرحوم شاعر اور ادیب تو نہ تھے۔ لیکن ادیب اور شاعر نواز ضرور تھے۔ عدم صاحب کی اور میری بڑی خدمت کیا کرتے تھے۔ عدم صاحب کے عاشق تھے۔ یو۔پی کے

رہنے والے تھے۔ نہایت شستہ اُردو بولتے تھے اور فنِ شاعری کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہ محفل شعر و سخن رات گئے تک ایک مقامی ہوٹل میں جاری رہی۔ شعرا اور سامعین کو ملا کر تقریباً چالیس آدمیوں نے اس نشست میں شرکت کی۔ یہ محفل رات کو تقریباً بارہ بجے اختتام پذیر ہوئی۔

جہلم میں میرا قیام کوئی دو سال کے لگ بھگ رہا۔ عدم صاحب مجھ پر بیحد شفقت فرماتے۔ اپنے گھر سے دفتر آتے روزانہ مجھ سے مل کر آگے جاتے۔ اُن کے گھر اور دفتر کے درمیان ہمارا کیمپ تھا اس لیے انہیں کوئی خاص زحمت نہ اُٹھانا پڑتی۔

ایک دن نمبر ۳ کور سگنل رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر اور میرے کمانڈنگ آفیسر ہمارے دفتر کے باہر کھڑے کچھ باتیں کر رہے تھے کہ جناب عدم تشریف لائے۔ ان دونو صاحبان نے اُن کی بڑی پذیرائی کی۔ کرنل نے عدم صاحب سے کہا۔

آئیے عدم صاحب میرے دفتر چل کر بیٹھتے ہیں۔ ایک کپ چائے کا پئیں گے۔

نہیں کرنل صاحب۔ آپ کا بے حد شکریہ۔

کیوں بیٹھتے کیوں نہیں۔ جناب

میں خلش ہمدانی کے پاس آیا ہوں۔ اسی کے پاس بیٹھوں گا۔

او جی عدم صاحب چھوڑیئے اُسے وہ آپ کے سٹیٹس (STATUS) کا نہیں ہے۔

کرنل صاحب دوستی میں کوئی سٹیٹس نہیں ہوتے۔ سب برابر ہوتے ہیں۔

اور۔ لو۔ شاہ جی۔ ہی۔ از۔ جسٹ۔ اے۔ جی سی او۔

کرنل صاحب یہ عہدوں کی درجہ بندی آپ کے ہاں ہے۔ میرے مشرب میں یہ حرام ہے۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک اچھا شاعر ہے۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کرنل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

کیوں نہیں پڑتا۔ کرنل۔ میجر تو کوئی آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر آدمی شاعر

نہیں ہو سکتا۔

شاعری کوئی بڑی چیز ہے۔

اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے: آپ اور آپ کے تمام آفیسرز مل کر مجھے ایک مصرعہ تو موزوں لکھ دیں۔ شعر تو خونِ جگر مانگتا ہے۔

اور پھر وہ کرنل صاحب کھسیانا سا ہو کر ہیڈ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ عدم صاحب میرے دفتر کے خیمے میں تخت پوش کے ایک سٹول پر بیٹھ گئے اور اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ پیتے رہے۔ تھوڑی دیر میں دفتر اردلی چائے لے آیا۔ اتنے میں میجر ملک صاحب بھی آگئے۔ ملک صاحب اگرچہ شاعر نہ تھے لیکن شاعروں اور ادیبوں کی بڑی قدرومنزلت کرتے تھے۔ وہ بھی آ کر عدم صاحب کے ساتھ ایک خالی سٹول پر بیٹھ گئے۔ اور ہمارے ساتھ چائے پینے میں مشغول ہو گئے۔ عدم صاحب کا تکیہ کلام تھا وہ ہر آدمی کو چاہے کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ہر ایک کو "حضور" کہہ کر مخاطب کرتے تھے چائے سے فارغ ہوئے تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور میجر صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

حضور! میں اس غلش ہمدانی کو ساتھ لیے جا رہا ہوں۔

قبلہ شاہ صاحب۔ ضرور لے جائیے۔ میجر صاحب نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

اور پھر عدم صاحب دفتری اوقات میں مجھ سے کام چھڑوا کر اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گئے۔ میں اکثر فوجی یونیفارم پہنے عدم صاحب کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ عدم صاحب بڑے ہی بلانوش تھے۔ وہ روز اپنی نجی محفلوں میں جن میں ان کے پینے والے ساتھی ہوتے تھے مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ اتنا بلانوش ہونے کے باوجود بہکتے نہ تھے۔ وہ حدِ اعتدال میں رہ کر نہ پیتے تھے بلکہ جس قدر مل جاتی، پی جاتے تھے۔ شراب پی کر یا شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر میں نے ان کو کبھی شعر کہتے نہیں دیکھا کئی لوگوں سے میں نے اُن کے متعلق سُن رکھا تھا کہ عدم صاحب پی لینے کے بعد جب سرور میں آتے ہیں تب شعر کہتے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ میں نے کم از کم ان دو سالوں میں اُن کو شراب پی کر شعر کہتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ پی کر اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہتے۔

اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ پیتے رہتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ وہ غل غپاڑہ بالکل نہ کرتے تھے۔

جہلم میں ان کے پینے کے کئی اڈے تھے۔ لیکن زیادہ تر وہ راجہ اکرم صاحب جن کی ریلوے پل کے پاس موٹروں کی ورکشاپ تھی کے ہاں ہی آتے تھے۔ آٹھ دس آدمی اس محفل کے مستقل ممبر تھے جو سب کے سب شغل مے نوشی کرتے تھے۔ میں ہی اُن میں ایک ایسا لوگرفتار تھا جسے شراب سے سخت نفرت تھی۔ لیکن پھر بھی عدم صاحب کی وجہ سے میں روز اُن کی معیت میں وہاں جا پہنچتا۔ ان دوستوں میں دو دوست ایسے بھی تھے جو تھوڑی سی بھی پی لیتے تو واہی تباہی بکنے لگتے۔ ان لوگوں نے بارہا یہ کوشش کی کہ حدِ اعتدال میں رہ کر میں بھی تھوڑی سی پی لیا کروں۔ لیکن میں نے کبھی ایسا نہ کیا۔

ــــــ

ایک کار میرے پاس ایک دھچکے سے آ کر رُکی۔ بریکوں کی خوفناک چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ اُس کار میں ایک مرد اور ایک خاتون فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ یہ تو کوئی آدمی سڑا پڑا ہے۔ عورت نے مرد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ مرد گاڑی سے اتر کر میرے قریب آیا۔

او۔ نو۔ ہی۔ از ناٹ۔ ڈیڈ۔ بٹ ڈیڈ ڈرنک۔ اُس خوش پوش مرد نے کہا۔

کوئی کھاتے پیتے گھر کا آدمی ہے۔ دیکھو کتنا اچھا سوٹ پہنے ہوئے۔ اُس خاتون نے قریب آ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس مرد نے اس خاتون کو کہا۔ ”تم اسے ٹانگوں کی طرف سے پکڑ د۔ تاکہ اسے اُٹھا کر گاڑی میں ڈال لیں۔ یہاں یہ بے چارہ سردی سے ہی ٹھٹھر کر مر جائے گا۔ نمونیہ ہو جائے گا اسے۔“

اُن دونوں نے مجھے اُٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور گاڑی چل دی۔ تھوڑی ہی دور ان کا بنگلہ تھا۔ گاڑی پورچ میں جا کر رُکی۔ اس آدمی نے ایک لمبا سا ہارن بجایا۔ ایک جوان آدمی بھاگتا ہوا آیا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے گاڑی سے باہر نکالا اور پھر وہاں سے اُٹھا کر اندر کمرے میں لے گئے۔ وہ خاتون ہم سے پہلے اندر چلی گئی تھی۔ میرے ہوش و حواس ٹھیک تھے۔ لیکن نشے کی وجہ سے اس قدر غنودگی چھائی ہوئی تھی کہ میں دو چار سیکنڈ کے لیے آنکھیں کھولتا اور بند کر لیتا۔ ایک الگ کمرے میں اس خاتون نے میرے لیے بستر لگایا تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے مجھے اُٹھا کر اس بستر پر ڈال دیا۔ اور پھر اس خاتون نے رضائی مجھ پر ڈال دی۔ اُس مرد کے کہنے پر وہ

عورت ایک الیکٹرک (ELECTRIC) ہیٹر لے آئی۔ اور میری چارپائی کے قریب رکھ کر اُسے جلا دیا۔ وہ آدمی کوئی ڈاکٹر تھا چونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اپنا ایتھٹسکوپ لے کر میرا معائنہ کرنے لگ گیا۔ اُس نے اچھی طرح سے چیک اپ کیا اور پھر اس خاتون کو مخاطب ہو کر کہنے لگا نو۔ ڈینجر (NO DANGER) یعنی کوئی خطرے کی بات نہیں ہے اور پھر وہ لائٹ آف کر کے دونوں اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سوٹ پہنے ہوئے جوتوں سمیت ایک صاف ستھرے بستر پر پڑا سو رہا تھا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو روشندان سے سورج کی سنہری کرنیں سامنے والی دیوار کو جگمگا رہی تھیں۔ میں چونکہ رات کو اچھی طرح سویا تھا اس لیے موڈ اچھا خاصا خوشگوار تھا۔ میں ان سنہری جھلملاتی ہوئی کرنوں کی دلفریبی میں کھویا ہوا تھا کہ آہستہ سے درمیان والا دروازہ کھلا اور وہ خاتون شب خوابی کے لباس میں ملبوس میرے لیے بیڈ۔ ٹی (BED TEA) لے کر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں رات والے واقعہ سے بیحد شرمندہ تھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور اپنی نظریں شرم کے مارے جھکا لیں۔

کیوں جناب! آپ اتنی پیتے ہیں کہ فٹ پاتھ پر گر جاتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میڈم! میں نے کبھی پی نہیں۔ رات کو میری شامت آئی اور دوستوں نے زبردستی پلا دی۔

میں نے پہلی دفعہ اس خاتون کو قریب سے دیکھا۔ وہ بلا کی حسین عورت تھی۔ کالے رنگ کے لباس میں وہ اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے خدوخال بالکل یونانی تھے۔ ایسے خدوخال جو کسی بھی مصوّر کے شاہکاروں کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ مگر حقیقی زندگی میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی دلفریب تھیں۔ ان میں بلا کی گہرائی تھی۔ اور ان میں ہمالیہ کی جھیلوں کی نیلاہٹ سمٹ کر آ گئی تھی۔ اگر آپ کو وہ کہیں غیر متوقع طور پر مل جائے جیسے مجھے ایک حادثہ کے نتیجے کے طور پر ملی تو آپ کو فوراً یہ خیال گزرے گا کہ شاید روم کی دیوی ڈیانا آسمان کی بلندیوں سے ہمیں مسحور کرنے

کے لیے زمین پر اتر آئی ہے۔

وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ وہ مرد فوجی وردی میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ وہ لیفٹننٹ کرنل تھا۔ اس نے آرمی میڈیکل کور کا بیج لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے فوجی وردی میں ملبوس دیکھا تو میرا تو خون ہی خشک ہو گیا۔

سعید تم تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ یہ ناشتہ کر لیں پھر ان کو بھی ساتھ لے جانا۔ یہ جہاں کہیں ان کو وہاں ڈراپ کر دینا۔

ٹھیک ہے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھتا ہوں جب یہ ناشتہ کر لیں تو مجھے بتا دینا۔

بہت اچھا۔ میں سرونٹ سے کہتی ہوں کہ وہ ہم دونوں کا ناشتہ لگا دے۔

اس خاتون نے اور میں نے ڈرائنگ روم میں اکٹھا ناشتہ کیا۔ وہ بات بات پر ہنس پڑتی اور ہر طرف پھول کھل اُٹھتے۔ وہ خاتون کوئی تیئس چوبیس کے پیٹے میں ہو گی۔ اس کا میاں البتہ اس سے سات آٹھ سال بڑا ہو گا۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔

اس کے خاوند نے آواز دی۔

بھئی جلدی کرو میرا آفس کا ٹائم ہو رہا ہے۔

تم چلے جاؤ۔ میں ان کو چھوڑ آؤں گی۔

پھر مجھے گاڑی واپس بھیجنی پڑے گی۔

بھیج دینا ویسے بھی گاڑی مجھے چاہیئے تھی۔ میں نے بازار جانا ہے۔

تمہاری مرضی۔ لیکن تمہارے گیسٹ (GUEST) نے اگر کام پر جانا ہوا تو پھر کیا ہو گا۔

چلا جائے گا۔ یہ جہاں کہے گا میں اس کو وہاں چھوڑ آؤں گی۔

وہ صاحب اپنی ٹوپی اور چھڑی اُٹھائے باہر پورچ میں آ گئے۔ چونکہ مجھے بھی جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس خاتون نے مجھے بازو سے پکڑ کر بیٹھنے

کے لیے اصرار کیا - میں بیٹھ گیا - وہ کہنے لگی سعید کی یہی بات مجھے سخت ناپسند ہے - یہ اب تک مجھ پر بھروسہ نہیں کرتا - نہ جانے اسے کیا شک پڑا ہوا ہے - عورت کوئی میٹھی گولی تو نہیں کہ جو چاہے گا اُسے ہڑپ کرے گا - عورت اگر چاہے تو وہ بپھرے ہوئے دریاؤں کی شوریدہ لہروں پر کچے گھڑے کے سہارے بھی کود پڑتی ہے اور اگر اس کی مرضی نہ ہو تو بڑے سے بڑا شہزور اور طاقتور مرد بھی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا - یہ موضوع کافی دلچسپ تھا - لیکن مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی - میرا رویہ اس خاتون کے لیے کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا - اس لیے اس نے پسپائی اختیار کر لی - شاید وجہ یہ ہو کہ وہ سمجھتی تھی کہ نہ وہ سوہنی ہے اور نہ میں مہینوال -

ڈرائیور گاڑی جلدی لے آیا - ہم دونوں گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے - اور گاڑی شہر کی طرف روانہ ہو گئی - تھوڑی ہی دیر میں ہم جہلم کے بازار میں جا پہنچے - اس نے اپنے لیے کچھ چیزیں خریدیں اور پھر مجھ سے کہنے لگی - آپ کو کیا خرید کر دوں -

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا - محترمہ! بہت شکریہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے - آپ کی پہلے ہی کچھ کم مہربانیاں ہیں مجھ پر -

نہیں جناب! یوں تو اچھا نہیں لگتا - میں نے اپنے لیے چیزیں خریدی ہیں تو آپ بھی تو کچھ لیں - بے منٹ میں کروں گی -

بے منٹ کی بات نہیں جناب - مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے -

چھوڑیے بھی تکلف کو - اور پھر وہ مجھے کپڑے کی ایک دکان میں لے گئی -

آپ نے جو سوٹ پہن رکھا ہے - یہ خراب ہو گیا ہے - اسے اب ڈرائی کلین کے لیے آج ہی دے دیں - نیا سوٹ آج ہی ٹیلر کو دیں - بلکہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی اور ٹیلر کو کہوں گی کہ وہ یہ سوٹ جلد تیار کر دے -

نہیں میڈم اس کی ضرورت نہیں - میں نے جھجکتے ہوئے اس سے کہا کہ مجھے جلدی دفتر جانا ہے - میری تو غیر حاضری لگ چکی ہو گی - مجھ پر تو بڑا سخت ایکشن ہو گا - اور پھر ہم وہ کپڑے ٹیلر کو دیے بغیر واپس چلے گئے -

آپ کس دفتر میں کام کرتے ہیں۔
جناب میں فوجی سپاہی ہوں۔
آفیسر ہیں آپ؟
جی نہیں۔
تو پھر کیا ہیں؟
مَیں جونیئر کمیشنڈ آفیسر ہوں۔
آپ بتلاتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں۔ یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے۔ آپ ان سب سے اچھے ہیں۔ شاید اُس نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ کہا۔

اس نے زبردستی مجھے ایک گرم سوٹ، قمیض، ٹائی، اعلیٰ قسم کا جوتوں کا ایک جوڑا۔ تاول بنیانیں، ٹائیلٹ کا کچھ سامان خرید کر دیا۔ پیک کروایا اور پھر خود ہی اُٹھا کر باہر لے آئی۔ ڈرائیور کو آواز دی اور وہ سامان اس کے حوالے کر دیا۔

آپ کی کون سی یونٹ ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔
ایر سپورٹ سگنل یونٹ
جس کا آفیسر کمانڈنگ میجر ظہور الحق ملک ہے
جی ہاں۔

مَیں ابھی ان سے ٹیلی فون پر بات کرتی ہوں اور پھر وہ مجھے ساتھ لے کر ایک دکان کے اندر ٹیلی فون کرنے چلی گئی۔ اس نے ٹیلی فون ایکس چینج سے ہماری یونٹ کا نمبر مانگا۔

ہیلو کون صاحب ہیں۔ میجر ملک صاحب ہیں۔ ان کو ٹیلی فون دیں۔
ہیلو ملک صاحب کیا حال ہے آپ کا۔ مَیں زاہدہ حنا بول رہی ہوں۔ جی ہاں ٹھیک ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں۔
دیکھئے آپ کی یونٹ کے احمد صاحب کو کل رات کسی موٹر والے نے ہماری کوٹھی کے قریب ٹکر ماری ہے۔ یہ گر گئے اور فینٹ (FAINT) ہو گئے۔ ہمارے نوکر نے مجھے

بتایا۔ میں ان کو اٹھوا کر اندر لے آئی۔

اب یہ ٹھیک ہیں۔ کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ان کو فرسٹ ایڈ رات کو کرنل صاحب نے دے دی تھی۔ اب میں تھوڑی دیر کے بعد ان کو ناشتہ کروا کر آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گی۔

جی ہاں۔ آپ نے بجا فرمایا۔ آپ کو ضرور تشویش رہی ہو گی کہ کہیں دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے ہوں گے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم آپ کے پاس آجائیں گے۔

اب تو ٹھیک ہے نا۔ میں نے آپ کے آفیسر کمانڈنگ کو بتا دیا ہے۔

شکریہ۔

ہم بازار سے واپس ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ڈرائیور سامان اُٹھا کر اندر لے گیا۔ میں کار ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خاتون پورچ میں آکر مجھ سے کہنے لگی۔

آپ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔

کیا کروں۔

آپ اندر آجائیں۔

نہیں میڈم مجھے پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔

میں نے میجر ملک کو آپ کے متعلق تفصیل سے بتا دیا ہے۔

یہ تو نہیں کہا کہ میں آج دن بھر نہیں آؤں گا۔

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گئی وہ ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی اور پھر اس نے نوکر کو آواز دی۔

عارف ادھر آؤ۔

جی بیگم صاحبہ۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بڑے ہی مودبانہ انداز میں اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

غسل کے لیے گرم پانی باتھ روم میں رکھو۔

بہت اچھا بیگم صاحبہ ۔ اور پھر وہ جلدی سے واپس چلا گیا۔

آپ ایسا کریں یہ کپڑے اب اُتار دیں ۔ غسل کر کے کپڑے بدل لیں پھر میں آپ کو چھوڑ آتی ہوں ۔

نہیں اس کی ضرورت نہیں ۔ میں اپنے کیمپ میں جا کر یہ سب کچھ کروں گا۔

نہیں یہاں سے ان میلے کپڑوں میں آپ کیسے جائیں گے ۔

ہم ایک دوسرے سے کچھ ذاتی باتیں محض آگاہی کے لیے پوچھ لیں ۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا ۔

پوچھ لیں ، اس میں کیا حرج ہے ۔

لیکن چھوڑیئے یہ باتیں بڑی تفصیل طلب ہوتی ہیں ۔ اگلی سیٹنگ (SITTING) تک یہ اٹھا رکھتے ہیں ۔ اب میں آپ کو صرف اپنا نام بتائے دیتی ہوں تاکہ آپ مجھے بار بار بیگم صاحبہ یا میڈم کہہ کر نہ بلاتے رہیں ۔ میرا نام زاہدہ حنا ہے ۔ میں کرنل سعید کی دوست ہوں ۔

آپ نے ٹھیک کہا یہ باتیں تفصیل طلب ہیں ۔ پھر کسی فرصت کے وقت ڈسکس (DISICUSS) کر لیں گے ۔

عارف نے آ کر بتایا کہ غسل تیار ہے ۔ حنا اُٹھ کر اندر گئی ۔ میرے لیے ایک لٹھے کی شلوار اور بوسکی کی قمیص لے کر آ گئی ۔ عارف سے کہا

بابا ایک نیا ٹاول (تولیہ) اور صابن بھی رکھ دو ۔ بڑا صاف ستھرا غسل خانہ تھا ۔ ہم نچلے درجے کے فوجیوں کو اسی طرح کی سہولتیں کہاں میسر تھیں ۔ حنا نے عارف کو کہا کہ صاحب کے بوٹ بھی صاف کر دو اور ان کے لیے کرنل صاحب کی جرابوں میں سے ایک صاف دُھلا ہوا جوڑا جراب بھی لے آنا ۔ میں غسل کر کے باہر آیا تو سب چیزیں بڑے سلیقے سے تیار رکھی تھیں ۔

حنا مجھے پکڑ کر اپنے سنگھار میز پر لے گئی اور بالوں پر لگانے والی کریم دی ۔ میں بالوں میں کنگھی کر کے باہر آیا تو بڑا فریش (FRESH) محسوس کر رہا تھا ۔ حنا نے میرا

سوٹ ایک کپڑے میں بند حفاظت سے رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

حضور! میرے سوٹ کا یہ حشر؟

اسے اب جاتے ہوئے ڈرائی کلین والے کو دے کر جائیں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ وہ اسے کل تیار کر دیں۔ میرا خیال ہے نیا سوٹ بھی ٹیلر کو دیتے آئیں گے۔

جیسے آپ کی مرضی۔

ہم بیٹھے تھے کہ عارف چائے لے آیا اور ہم نے چائے کا ایک ایک کپ پیا اور پھر جانے کی تیاری کرنے لگ گئے۔ ڈرائیور پورچ میں گاڑی لے آیا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ صبح جب شہر گئے تھے تو میں فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اب حنا نے مجھے اپنے ساتھ پیچھے بٹھایا۔ جیسے صدیوں کا ان جانی راہوں کا سفر ہم نے طے کر لیا ہو۔ اور ہم میں جو اجنبیت تھی وہ دور ہو گئی ہو۔ میں جس دیہاتی معاشرے کا فرد تھا اس میں ہم کسی غیر عورت کے ساتھ یوں نہیں بیٹھتے کہ دونوں کا جسم آپس میں مس کرے۔ لیکن میرا خیال ہے حنا کو اس بات کا کوئی احساس ہی نہ ہوا ہو گا۔

ہم جلد ہی شہر پہنچ گئے۔ حنا نے گاڑی سے اتر کر ڈرائی کلین والے کو میرا سوٹ دیا اور اس سے پرچی لے کر واپس آ گئی۔ پھر ٹیلر کی ایک بڑی سی دکان پر گئے۔ حنا نے وہ سوٹ کا کپڑا بڑے ماسٹر کو دیا۔ اس نے میرا ماپ لے لیا اور ایک ہفتے کے بعد سوٹ دینے کا وعدہ کیا۔ واپس آنے سے پہلے حنا نے میرے لیے کچھ پھل، بسکٹ کے دو ڈبے لیے اور پھر ہم واپس چھاؤنی کی طرف چل پڑے۔

***

اب آپ کو مجھے بتانا پڑے گا کہ آپ کی یونٹ کس طرف ہے۔ حنا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بڑا آسان ہے۔ ہیڈ پوسٹ آفس کے ساتھ مغرب کی طرف پہلی سڑک جو دریا کی طرف مڑتی ہے۔ اس پر بائیں ہاتھ پر پہلی یونٹ ہماری ہے۔ وہاں سنتری کھڑا ہوتا

ہے جو ہر اجنبی کو روکتا ہے۔

ڈرائیور کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ یہ جگہ ان کی کوٹھی سے کوئی زیادہ دور نہ تھی۔ جونہی کار ہیڈ پوسٹ آفس سے ملحقہ سڑک پر مڑی۔ سنتری نے گاڑی کو روکا۔ میں نے سر باہر نکالا۔ سنتری نے مجھے دیکھا تو سیلوٹ کیا اور جانے کا اشارہ کیا۔ پوسٹ آفس کی دیوار کے ساتھ پہلا میرا اپارٹمنٹ تھا۔ میں نے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ سامنے ہی میرا اردلی اللہ یار خاں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو خوشی کے مارے دوڑتا ہوا آگیا اور مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔

نیک بخت آدمی ہم سب رات بھر کتنے متفکر رہے۔ شہر میں سب جگہوں پر آپ کو تلاش کر آئے۔

یہی ڈر تھا کہ آپ دریا میں دور دور تک تیرتے رہتے ہیں۔ خاکم بدہن "کہیں ڈوب نہ گئے ہوں۔" میجر صاحب نے پوری یونٹ کو رات بھر دریا کے کناروں پر دور دور تک آپ کی تلاش میں لگا رکھا۔

لیکن اللہ یار تمہیں تو پتہ تھا میں سوٹ پہن کر شہر گیا تھا۔

حنا کو میں نے بتایا کہ یہ میرا اپارٹمنٹ ہے میں اس میں رہتا ہوں۔ آپ اگر کبھی آئیں تو سنتری کے پاس گاڑی روک لیں اور اسے کہیں کہ وہ مجھے بلا کر لے جائے۔

کیوں میں اندر نہیں آسکتی۔

حضور والا! لیڈیز کو فوج کی بیرکوں یا ان کے کیمپوں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

شام کو تم کس وقت آرہے ہو۔

آج تو آنا مشکل ہے۔

کیوں کیا مشکل ہے؟

ابھی آپ کے جانے کے بعد انکوائری شروع ہو جائے گی۔ "میں کہاں گیا تھا۔ کیوں گیا تھا۔ کس سے پوچھ کر گیا تھا۔" وغیرہ وغیرہ

اچھا آپ پر بھی اس قدر پابندیاں ہیں ؟

کیوں حضور میں فوجی سپاہی نہیں ہوں۔ مجھ پر فوجی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اچھا آپ یہ بتائیں، آپ کب آئیں گے۔

حنا اوقات کار میں تو آنا مشکل ہے۔

آپ کو اوقاتِ کار میں آنے کے لیے کس نے کہا ہے۔ آپ شام کو آرام سے آجائیں۔

شام کو وہاں کرنل صاحب ہوں گے۔

کرنل صاحب ہوں گے تو کیا ہوگا۔ وہ آپ کو کیا کہیں گے۔

انہیں میرے آنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

وہ کون ہوتا ہے اعتراض کرنے والا۔ آپ مجھ سے ملنے آئیں گے۔ کرنل سے تو نہیں۔

آپ ان کی بیگم ہیں۔ انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی غیر مرد کو آپ سے یوں کھلے بندوں نہ ملنے دیں۔

میں نے آپ کو پہلے بتا دیا ہے کہ میں کرنل کی اس قدر پابند بھی نہیں۔ وہ کون ہوتا ہے میرے معاملات میں مداخلت کرنے والا۔

لیکن اگر وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو میرے لیے تو اچھی خاصی پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔

اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔

حنا آپ نہیں سمجھتی میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ ان کرنیلوں، جرنیلوں کا ایک دھچکا بھی برداشت نہ کر سکوں گا۔

آپ ڈریں نہیں۔ یہ باتیں ہم بعد میں ڈسکس (DISCUSS) کریں گے

میں ابھی جاتی ہوں۔

حنا گاڑی لے کر واپس چلی گئی اور اللہ یار خاں میرا سامان اُٹھا کر ٹینٹ کے اندر لے گیا۔ مَیں نے اللہ یار خان کو کہا کہ وہ صوبیدار نذیر حسین شاہ کو بتا دے کہ مَیں آگیا ہوں وہ میجر کو بھی بتا دیں۔" مَیں اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا اور رضائی اوڑھ لی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے سب دوست میرے ٹینٹ میں آگئے۔ ان لوگوں نے میری مزاج پُرسی کی اور گذشتہ رات کے خدشات کا اظہار کرتے رہے۔

نذیر حسین شاہ صاحب آئے اور بتایا کہ میجر صاحب کہہ رہے ہیں کہ اگر طبیعت ٹھیک ہو تو آجائیں ورنہ ٹینٹ ہی میں آرام کریں۔ مَیں نے اُن کو بتایا کہ مَیں تھوڑی دیر میں دفتر آرہا ہوں۔ اللہ یار خان کو وردی تیار کرنے کے لیے کہا اور پھر تھوڑی دیر میں تیار ہو کر دفتر جا پہنچا۔ سیدھا میجر صاحب کے پاس گیا۔ انہیں سلوٹ کیا۔ وہ اُٹھ کر بڑے تپاک سے ملے۔

کیوں صاحب زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔

سر میں چوٹ لگی تھی جس کے باعث میں فینٹ (FAINT) ہو گیا تھا۔

کرنل سعید کی بیوی نے مجھے ٹیلی فون کر کے سب بتا دیا تھا۔ ورنہ ہمیں بڑی فکر تھی۔ اگر طبیعت ٹھیک ہو تو تھوڑی دیر بیٹھیں۔ لڑکوں کو کام سمجھا دیں اور اگر تکلیف ہو تو چلے جائیں اور آرام کریں۔ شام کو آپ عدم صاحب کے ساتھ جاتے ہیں تو ذرا جلدی واپس آجایا کریں۔ میجر صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

ٹھیک ہے سر۔ اور مَیں اپنے دفتر میں آکر بیٹھ گیا۔ نمبر ا کور سگنل کے دوستوں کو میرے حادثے کا پتہ چلا تو آنا شروع ہو گئے۔ مَیں کوئی بارہ بجے تک دفتر میں بیٹھا۔ ڈاک دیکھی اور حوالدار صادق کو ضروری ہدایات دے کر واپس اپنے ٹینٹ میں آگیا۔ یونیفارم اُتارا۔ اللہ یار خان میس (MESS) سے کھانا لے آیا۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔

شام کو سورج غروب ہو رہا تھا۔ مَیں ابھی تک سویا ہوا تھا کہ اللہ یار نے مجھے جگا کر بتایا۔

مگر باہر عدم صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔
ان کو کہو۔ اندر آجائیں۔ انہوں نے یہ سُن لیا۔ کہنے لگے۔
نہ بھئی میں جیتے جی قبر میں نہیں جانا چاہتا ـــــ فیلڈ ایریا میں فوجیوں کے خیمے تقریباً تین چار فٹ زمین کھود کر اس پر لگائے جاتے ہیں۔ ایک تو بمباری کی صورت میں بچاؤ ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا اس سے جگہ گرم رہتی ہے۔ عدم صاحب کا اشارہ اس طرف تھا۔
چار و ناچار مجھے ہی اُٹھ کر باہر آنا پڑا۔
حضور آپ ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔ عدم صاحب نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
سر آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
تم کپڑے بدلو۔ ابھی چلتے ہیں۔ گھومو پھرو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔
میں نے دوبارہ معذرت کی۔ لیکن وہ نہ مانے اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔
عدم صاحب کی معیت میں روز شام کو شہر اپنے اڈے پر جانا ہمارا روز کا معمول تھا۔ شام کو جاتے تھے رات کو گرتے پڑتے بارہ ایک بجے واپس آتے تھے۔ عدم صاحب چونکہ بلانوش تھے۔ اس لیے گھر واپس نہ جا سکتے تھے۔ میں چونکہ پیتا نہ تھا اس لیے میری یہ ڈیوٹی تھی کہ ان کو گھر چھوڑ کر میں اپنے کیمپ جاؤں۔ کور ہیڈ کوارٹر کے بیشتر آفیسر کو میری اس روٹین (ROUTINE) کا علم تھا۔ لیکن میجر ملک صاحب چونکہ میرے مہربان تھے۔ اس لیے کبھی کسی نے باز پُرس نہ کی۔
اس رات بھی ہم بارہ بجے لوٹے۔ میں عدم صاحب کو ان کی کوٹھی پر چھوڑ کر واپس کیمپ پہنچا تو اللہ یار نے کھانا گرم کیا۔ اکثر شام کا کھانا میں باہر ہی کھایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میس میں بھی کھا لیتا تھا۔ اس رات میں نے کھانا باہر نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اللہ یار کا لایا ہوا کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔
سر وہ کاردار والی بیگم صاحب دو دفعہ آپ کا پوچھنے آئی تھی۔ اللہ یار نے دبے دبے

الفاظ میں کہا۔
تم نے کیا کہا۔
سر میں نے اس کو بتا دیا کہ عدم صاحب آئے تھے۔ وہ اُن کو زبردستی ساتھ لے گئے ہیں۔
کیا وہ عدم صاحب کو جانتی ہے۔!
ہاں سر۔ جانتی ہے۔ کہنے لگی۔ عدمؔ صاحب وہ پاکستان کا بڑا شاعر۔
میں نے کہا۔ جی ہاں۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔ تمہارے صاحب بھی شاعر ہیں۔
" جی ہاں "۔
سر وہ جاتی دفعہ کہہ گئی ہے۔ اپنے صاحب کو کہنا کل صبح نو بجے وہ میرے پاس آئیں۔ ضروری کام ہے۔
میں کھانا کھا کر سو گیا۔ دوسرے دن یونیفارم پہن کر دفتر گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ کام کیا اور پھر میجر ملک صاحب کو بتا کر واپس اپنے ٹینٹ میں آگیا۔ یونیفارم اُتار ا سویلین کپڑے پہنے۔ ابھی ٹینٹ ہی میں تھا کہ اللہ یار نے آکر بتایا۔
صاحب جی وہ بیگم صاب بیریر (BARRIER) کے پاس کار لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ سنتری بتا کر گیا ہے کہ وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔
میں آہستہ آہستہ فاتحانہ انداز سے چلتا ہوا بیریر کی طرف آیا۔ سنتری نے مجھے سیلوٹ کیا۔
بڑے ٹھاٹھ ہیں حضور کے۔ جدھر جائیں۔ راجے مہاراجوں کی طرح لوگ سلامیاں پیش کرتے ہیں۔ حنا نے طنزیہ انداز میں کہا۔
حنا سلامیوں سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔
وہ ہنس پڑی۔
حنا کار خود چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور کوئی آدمی نہ تھا۔ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھولا۔ اور میں اسے سلام کر کے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر

بیٹھ گیا۔ اس نے آج بھرپور میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کا اُوپر کا بٹن کھلا ہوا تھا اور گردن کے نیچے اونچی گھاٹیوں کے نیچے کی گہرائی اپنی حیرت انگیز سپیدی، ناز کی اور کانچ کی سی خوبصورتی لیے نظر آ رہی تھی۔ جیسا آسمان پر اُجالا تھا۔ ویسا ہی اُجالا حنا نے اپنی قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔

وہ مجھے لے کر اپنی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ عارف اور ڈرائیور کے سوا اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں میرے ساتھ صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کل رات تم نے بڑا انتظار کروایا۔ جب تم نہیں آئے تو میں خود تمہارے پیچھے گئی۔ لیکن تمہارے اردلی نے بتایا کہ شام کو عدم صاحب آئے تھے اور آپ کو ساتھ لے گئے۔ میں پھر کوئی ایک گھنٹہ بعد گئی تو اللہ یار خان نے بتایا کہ آپ بارہ بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

یہ شرابیوں کی محفل میں اگر تم بھی بیٹھو گے تو تھوڑے عرصے کے بعد تم بھی پکے شرابی بن جاؤ گے۔ اور پھر ایسی زندگی عزیزوں کے لیے، اپنے لیے اور ملنے والوں کے لیے ایک لعنت بن جاتی ہے۔

حنا میں نے توبہ کر لی ہے۔ وہ جو اس دن میں نے پی لی تھی۔ وہی پینا میرے لیے ایک سبق ثابت ہوا۔ شرابی جو یہ کہتے ہیں کہ پی لینے میں ایک گونہ سرور حاصل ہوتا ہے اور آدمی وقتی طور پر غموں سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ یہ سب غلط ہے۔ حنا میں سمجھتا ہوں کہ ایک ذی ہوش انسان کے لیے اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرور اس کا ہوش میں رہنا ہے۔ یہ کوئی زندگی ہے۔ آدمی فٹ پاتھوں پر پڑا تے کر رہا ہو۔ ایسے لوگ اپنے لیے خاندان کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے کلنک کا ٹیکہ ہوتے ہیں۔

شکر ہے آپ نے جلدی اس بات کا احساس کر لیا۔

میری توبہ ہے حنا۔ اب زندگی بھر شراب کو منہ نہ لگاؤں گا۔

عارف چائے لے آیا اور ہم چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے حنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ حنا یہ نیا کھیل جو ہم نے شروع کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے لیے

بے حد نقصان دہ ثابت ہو گا۔

احمد۔ کوئی دنیا کھیل نہیں ہے۔

کیا کرنل صاحب کو ہماری ملاقاتوں پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ کرنل کون ہوتا ہے میرے معاملات میں دخل دینے والا۔

وہ آپ کا خاوند نہیں ہے۔

نہیں تو۔ میں حیرانگی کے عالم میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

تو آپ کا اور ان کا کیا رشتہ ہے؟

ہم دونوں آپس میں دوست ہیں۔

کرنل صاحب نے شادی نہیں کی ہوئی۔

میں نہیں جانتی۔

آپ دونوں کب سے یوں اکٹھے رہ رہے ہیں۔

تقریباً چار سال سے۔

آپ دونوں کا آپس میں کوئی نکاح نہیں ہوا۔

جی نہیں۔

پھر اکٹھا رہنے کا کیا مقصد ہے۔ یہ تو سراسر حرامکاری ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ تو کھانا پینا بھی حرام ہے

تو کیا آپ میرے ساتھ اس طرح کی زندگی گذارنے کے لیے تیار ہیں؟

ہرگز نہیں ـــــ اور اس کا چہرہ کسی انجانے خوف کی وجہ سے زرد پڑ گیا۔

میں نے تو آپ سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ حنا نے بڑا پُر امید ہو کر کہا۔

حنا۔ میں آپ کی ہر مدد کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اخلاقی حدود کے اندر رہ کر۔

احمد صاحب۔ اخلاق کا درس شکست خوردہ لوگ دیتے ہیں۔

حنا اپنے اپنے ماحول کی بات ہے۔ مجھے بچپن ہی سے اس طرح کی تربیت دی گئی ہے۔ ہم سادہ لوح دیہاتی زندگی بھر انسانی تقدیس کا لحاظ کرتے ہیں اور انسانی تقدیس کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔

کیا آپ زندگی کے ہر مرحلہ پر میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں؟ حنا نے استفسا بھرے لہجے میں کہا۔

نہیں حنا صاحبہ مجھے افسوس ہے۔ میں گھر گرہستی والا آدمی ہوں۔ میری بیوی ہے دو بچیاں ہیں۔ میں فوج میں ملازمت کرتا ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بغیر نکاح کے ایک غیر عورت کے ساتھ یوں ازدواجی زندگی گذاروں۔

احمد صاحب میرے راستے میں تو بڑے بڑے افسر بھی آنکھیں بچھاتے ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کو ترستے ہیں۔ نہ جانے میں آپ پر کیوں مہربان ہو گئی ہوں۔

حنا صاحبہ۔ وہ بڑے افسر یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں ان کے سوشل سٹیٹس یا (SOCIAL STATUS) اتنے ہوتے ہیں کہ وہ اس طرح کی چھوٹی موٹی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ میرے کوئی STATUS نہیں ہیں۔ میں بہت ہی معمولی آدمی ہوں جو کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

احمد میں نے ان افسران کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی زندگی بھی بڑی کھوکھلی ہوتی ہے۔ اس نے بڑے تیقن آمیز لہجے میں کہا۔

حنا مجھے اجازت دیں۔ میں نے جلدی واپس جانا ہے۔

ابھی تو تم آئے ہو۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں تھوڑی دیر کے لیے اجازت لے کر آیا تھا۔ آپ نے غور فرمایا میں کس قدر مجبور آدمی ہوں نہ اپنی مرضی سے کہیں آجا سکتا ہوں۔ نہ اپنی مرضی سے کسی کو مل سکتا ہوں۔ ابھی تو ہماری ملاقات کو صرف دو دن ہوئے۔ اگر یہ ملاقاتیں اسی باقاعدگی سے جاری رہیں تو لوگ ہمارا جینا دوبھر کر دیں گے۔ مجھے یہ فوجی افسر قیدی بنا کر کیمپ میں رکھیں گے اور ہم ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بھی ترستے رہیں گے۔

تو آپ یہ ملازمت چھوڑ دیں۔
چھوڑ دوں تو کھاؤں گا کیا۔ بیوی بچے بھوک کے مر جائیں گے۔
کتنی تنخواہ ملتی ہے آپ کو
جتنی آپ اپنے خانساماں کو دیتی ہیں۔
او۔ ویری پوور (VERY POOR)۔ آفل (AWFUL)

⁂

وہ صوفہ سے اُٹھ کر میرے سامنے قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔ میں اپنے مستقبل سے ڈر رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ میں غلط کر رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی ایک سحر زدہ آدمی کی طرح حنا کی اقلیم حسن سے باہر نہ آنا چاہتا تھا۔
وہ ایک ماہر عامل کی طرح اپنی تمام تر حُسن کی مسحور کن قوتوں کے ساتھ مجھے اپنے قبضہ قدرت میں لے چکی تھی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ اس بات کا اسے اچھی طرح احساس ہے۔
حنا آپ مجھے یہ بتائیں کہ کرنل صاحب کے پاس آنے سے پہلے آپ کہاں تھی۔
جناب آپ نے پوچھ ہی لیا تو آپ کو تفصیل سے بتائے دیتی ہوں۔ شاید ان حالات کی روشنی میں آپ بہتر طور پر اپنے لیے کسی صحیح راستے کا انتخاب کر سکیں۔
میں پہلے آپ کو مختصر طور پر اپنی فیملی ہسٹری بتانا مناسب سمجھتی ہوں۔
" میرے والد یو۔ پی کے ایک بڑے جاگیر دار تھے۔ میری ماں لکھنؤ کے ایک کالج میں پروفیسر تھیں۔ میرے والد نے ان کے ساتھ شادی کی تو اُن سے ملازمت چھڑوا دی اور وہ بالکل ایک گھریلو خاتون بن گئیں۔ ان کی شادی کے کوئی دو سال بعد میں پیدا ہوئی۔ میرا اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ نواب صاحب نے نرینہ اولاد کی خاطر چار شادیاں کیں۔ لیکن میرے سوا ان کا کوئی بچہ نہ ہوا۔ مجھے میرے والد نے لکھنؤ کے ایک اقامتی انگریزی سکول میں داخل کروا دیا۔ جب میری عمر بارہ سال کی ہو گئی تو میری ماں اور باپ کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر میری والدہ نے

نواب صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر جلد ہی ان کو بمبئی کے ایک گرلز کالج میں پڑھانے کی جاب مل گئی۔ اور ہم دونوں ماں بیٹی بمبئی منتقل ہو گئیں۔ اس کے بعد نواب صاحب نے ہماری کوئی خبر نہ لی۔ مجھے تمام عمر یہ رنج رہا کہ میرے باپ نے کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ نہ ہی مجھے اپنے پاس کبھی بلوایا ہے۔ بہر حال بمبئی میں میری ماں نے اپنی جاب پر خوب محنت سے کام کیا اور وہ جلد ہی اس کالج کی پرنسپل بن گئیں۔

میں نے بی۔ ایس۔ سی فائنل کر لیا تھا اور اب ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ لینے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن میں اپنی ماں کے ساتھ تاج محل ہوٹل کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے وہاں گئی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی ایک بڑی ریاست کے مہاراجہ تھے۔ تقریب کے اختتام پر باہر لان میں چائے پی رہے تھے کہ مہاراج چائے کی پیالی اُٹھائے ہمارے قریب آ گئے۔ میری امی نے ان کو سلام کیا پوچھنے لگے۔

پرنسپل صاحبہ کیا حال ہے آپ کا۔

خیریت سے ہوں مہاراج۔

یہ لڑکی کون ہے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

مہاراج یہ میری بیٹی ہے۔

کیا نام ہے۔ ان کا۔

مہاراج اس کا نام زاہدہ حنا ہے۔

مہاراج نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نہایت ہی قیمتی ہار نکال کر میرے گلے میں ڈال دیا۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

تقریب ختم ہو گئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ مہاراج کی دو بیٹیاں میری امی کے کالج میں پڑھتی تھیں۔ مہاراج کی ریاست وہاں سے کافی دور تھی۔ لیکن جب بھی وہ بمبئی آتے اپنی بیٹیوں کو دیکھنے کالج ضرور آتے اور پھر میری ماں کے ساتھ تحائف کا انبار اُٹھوائے وہ ہمارے فلیٹ میں ضرور آتے اور ہر دفعہ میرے

لیے بیش قیمت ہیرے جواہرات، عمدہ اور اعلیٰ قسم کے کپڑے لاتے۔
ایک دن میری ماں نے مجھے بتایا کہ مہاراج تمہیں مہارانی بنانا چاہتے ہیں۔
میں یہ سن کر شل ہو گئی۔ مہاراج کی عمر اس وقت کوئی پچپن سال ہو گی۔ میری عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دونوں کی عمروں کا بڑا فرق تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

میں اب ہر وقت سوتے جاگتے اپنے آپ کو مہارانی کے روپ ہی میں دیکھتی مہاراج کوئی خوب صورت آدمی نہ تھے بلکہ سچ پوچھیے تو بدصورت آدمی تھا۔ اس کے حرم میں پہلے بھی دس رانیاں تھیں۔ اس کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ ہر نئی عورت کو مہارانی کا خطاب دیتا۔ صرف خطاب ہی نہ دیتا بلکہ پروٹوکول بھی دیتا۔ اتفاق سے ان دس عورتوں میں سے ایک دو کے سوا کسی سے بھی اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ ہر نئی شادی اس اُمید کے ساتھ کرتا کہ شاید نئی بیوی سے مجھے ریاست کا کوئی جانشین مل جائے۔ اُس وقت میری ماں نے کوئی مخالفت نہ کی۔ لیکن بعد میں میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس شادی سے خوش نہ تھیں۔ وہ اب کہتی ہیں۔ ان نوابوں اور راجوں مہاراجوں کی نجی زندگی بڑی ہی گھناؤنی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں اپنا ساتھی نہیں سمجھتے بلکہ اپنی ہوس رانی کی تکمیل کا محض آلۂ کار بنالیتے ہیں۔ میری ماں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ ہم مسلمان ہیں اور مہاراج کٹر ہندو۔ میری ماں نے ان خدشات کا اظہار پہلے نہ کیا اور میری شادی ہو گئی۔ جس میں بے شمار والیانِ ریاست۔ ان کی بیگمات، سرکاری افسران۔ حتیٰ کہ گورنر تک نے شرکت کی۔ مجھے اتنے قیمتی تحائف ملے کہ جن کی بدولت میں اب تک شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔

میں مہاراج کے ساتھ چار سال تک رہی۔ اس عرصے میں ہمارا کوئی اشوع نہ ہوا۔ مہاراج بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ وہ جنسی طور پر کمزور آدمی تھا۔ اس نے دو تین اچھے معالج۔ ڈاکٹر، حکیم اور وید ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جو شام ہی سے اُسے مختلف قسم کے ٹیکے لگاتے۔ مالش کرتے اور کھانے

کی دوائیاں دیتے۔ مہاراج رات کو ایک بوڑھے ریچھ کی طرح مجھے آدبوچتے اور رات بھر روئی کی طرح دھنتے رہتے۔ اس وقت میں اپنے کیے پر بہت پچھتائی تھی۔ بارہا سوچا کہ خودکشی کرلوں تاکہ اس اذیت ناک زندگی سے ایک ہی دفعہ جان چھوٹ جائے۔

دوسری سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجھے مہاراج سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ وہ دانتوں کو برش نہ کرتا تھا۔ ایک پتلی سی لکڑی سے کبھی کبھار دانت صاف کرلیتا تھا۔ سوتا تھا تو اس کا منہ کھلا رہتا تھا جس پر مکھیاں بھنبھناتی اور منہ کے اندر داخل ہو لی رہتی تھیں۔ سوتے میں اس کے منہ سے مستقل طور پر لعاب بہتا رہتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگتی تھی۔

میں تقریباً چار سال مہاراج کے پاس رہی۔ اس عرصے میں اس نے مجھے بے شمار زروجواہر تحفے میں دیے۔ جو اس وقت سے میں نے اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں۔

٭ — ٭

کرنل سعید کا والد مہاراج کے پاس بطور ڈاکٹر ملازم تھا۔ یہ اپنے باپ کے پاس آتا تو اس سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہ اس وقت میجر تھا۔ میرے حسن سے مسحور ہو کر اس نے مجھے پروپوزل (PROPASAL) دی کہ تم مہاراج سے علیحدگی اختیار کرلو۔ مسلمان نوابوں کی طرح یہ ہندو راجے مہاراجے اس معاملے میں اتنے رجڈ (REGID) نہیں تھے کہ وہ اپنی بیویوں کو اپنے سے الگ نہ کریں۔ میں اس کم بخت کے بھرے میں آگئی اور ایک دن میں نے مہاراج سے کہا۔

مہابلی! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ایم ایس سی میں داخلہ لے رہی تھی کہ آپ سے میری شادی ہوگئی۔ اگر آپ اب مجھے اجازت دیں تو میں دوبارہ بمبئی یونیورسٹی میں جاکر داخلہ لے لوں۔

حنا! اس کے لیے تمہیں مجھ سے علیحدگی اختیار کرنا پڑے گی۔

ٹھیک ہے مہاراج۔ جی ان چھوٹنے کی تو مجھے اجازت ہوگی نا۔ میں نے ان کی دلجوئی کے لیے یہ جھوٹی تسلی دی۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہم دو اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہیں گے۔ تم ایسا کرنا۔ ریاست میں مت آنا۔ میں بمبئی آیا کروں گا تو ملاقات کر لیا کروں گا۔

اس طرح میں نے اُس سے گلو خلاصی کرائی۔ میں بمبئی واپس چلی گئی۔ میری ماں نے بھی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ انہیں ریٹائر ہونے پر کافی رقم یک مُشت ملی۔ میرے واپس آنے پر میری ماں بہت خوش ہوئی۔ اب وہ کہتی تھی۔ تم دل لگا کر پڑھو۔ ایم۔ ایس۔ سی (M.Sc) کر لو پھر آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنا۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پڑھائی شروع کر دی۔

انہی دنوں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ ہندوستان اور پاکستان دو خود مختار مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ایک دن میری ماں بازار گئی اور پھر واپس نہ آئی۔ میں نے اُن کی بڑی تلاش کی لیکن ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں اس جانکاہ حادثے سے بہت دل برداشتہ ہو گئی۔ میری ماں اور میرا جائنٹ اکاؤنٹ تھا۔ کراچی کے حبیب بنک کے لیے میں نے کافی رقم کا ڈرافٹ بنوا لیا۔ وہاں لاکرز میں میری کروڑوں روپے کی جیولری تھی۔ وہ بھی میں نے لے لی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور میں چپکے سے کراچی شفٹ ہو گئی۔ ڈرافٹ جمع کرایا۔ جیولری لاکرز میں رکھی اور پھر اپنے ہوٹل واپس چلی گئی۔

میں اسی سوچ بچار میں رہنے لگی کہ ایم۔ ایس۔ سی کر لوں۔ زندگی کے کسی مرحلے پر یہ پڑھائی کام ہی آئے گی۔ ایک دن شام کو میں کلفٹن کی سیر کو گئی۔ وہاں سعید سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ اب وہ کرنل ہے اور یہاں کسی فوجی ہسپتال کا کمانڈنگ آفیسر ہے۔ تھوڑی دیر ہم دونوں وہاں گھومتے پھرتے رہے۔ ٹھنڈی گیلی ریت پر بیٹھ کر بچوں کی طرح گھروندے بناتے رہے۔ یکایک سعید نے چلنے کو کہا۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ٹیکسی سٹینڈ کے پاس آ گئے۔ سعید مجھ سے کہنے لگا۔

حنا چلو گی میرے ساتھ۔

نہیں پھر کبھی۔

اور وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ جہاں تم نے کہا وہاں ڈراپ کر دوں گا۔

نو۔ تھینک۔ یو (NO THANK YOU)

وہ چلا گیا اور میں پھر واپس ساحلِ سمندر پر گھونگھے چننے کے لیے لوٹ آئی۔ پاکستان میں میں نے ایک بات اچھی نہیں دیکھی۔ یہاں اکثر مرد چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے ہر غیر عورت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے جسم کے تمام خدوخال کا اچھی طرح جائزہ لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اکثر نوجوان گھورتے ہوئے گزر جاتے۔ اور کئی پیچھے ارد گرد منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے کسی کو لفٹ ہی نہ دی اس لیے وہ ڈس کرج (DISCOURAGE) ہو کر چلے جاتے۔ میں کوئی گھنٹہ بھر وہاں پھرتی رہی۔ کراچی میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر کوئی عورت اکیلی سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کوئی بیسوا ہے۔ شکار کی تلاش میں بیٹھی ہے۔ یہ بات مجھے جلد پتہ چل گئی۔ میں واپس اپنے ہوٹل آگئی۔

میں تھکی ہاری سو رہی تھی کہ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ ناک (KNOCK) کیا۔ میں نے اندر آنے کے لیے کہا۔ دیکھا تو آنے والا سعید تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ انٹر کام (INTER - COM) کے ذریعے نیچے چائے کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیرا چائے لے آیا۔ ہم بیٹھے چائے پیتے رہے اور مہاراج کی اور اس کی ریاست کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے سعید سے ہنستے ہوئے کہا کہ تمہارے والد کی وہاں ڈیوٹی مہاراج کو رات کی جنگ کے لیے تیار کرنا ہے۔ وہ ہنس پڑا۔ سعید کو اس بات کا علم تھا کہ میرے پاس بے انداز اور بیش قیمت جیولری ہے جس کی قیمت کروڑوں روپے بنتی ہے۔ سعید مجھ سے کہنے لگا۔

آپ ریاست واپس جائیں گی یا بمبئی۔

میں نے اب وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ میری امی بمبئی کے فسادات میں ماری گئیں۔ ایک دن گئیں اور پھر واپس نہ آئیں۔

تو پھر اس ہوٹل میں کب تک رہنے کا ارادہ ہے۔

جب تک قسمت رکھے گی۔ رہوں گی۔

میرے پاس اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ میں اس میں اکیلا رہ رہا ہوں۔" آپ میرے ساتھ آجائیں۔"

تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے۔

میں نے کہا ہے نا۔ کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ سوائے میرے ڈرائیور۔ اردلی اور کک کے اور کوئی آدمی نہیں۔

تمہارے بیوی بچے نہیں۔

جی نہیں۔ میں نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔

کب کروگے۔ یہی تو عمر ہے تمہاری شادی کی۔ کتنی عمر ہوگی تمہاری۔

کوئی چالیس سال کے لگ بھگ

اور کتنے سال شادی نہ کرنے کا ارادہ ہے تمہارا۔

جب کوئی مناسب رشتہ ملے گا۔ کروں گا۔

مناسب سے کیا مراد ہے تمہاری۔

یعنی اچھا۔ میری مرضی اور پسند کے مطابق۔

ہم دونوں سگریٹ پیئے جارہے تھے۔ فضا سگریٹ کے دھوئیں سے بوجھل ہوگئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے دل کی بات کہتے ہوئے ایک گونہ جھجک محسوس کر رہے تھے۔ یکایک اس نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر کہنے لگا۔

حنا میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ میری کوٹھی میں رہائش رکھ لیں۔

کتنے دنوں کے لیے۔

جب تک آپ کا جی چاہے۔

ٹھیک ہے میں چلی آؤں گی لیکن ایک بات کی وضاحت میں کردوں۔

فرمائیے۔

مَیں تم سے شادی نہیں کروں گی۔

نہ کرنا۔ ہم دو اچھے دوستوں کی طرح اکٹھے تو رہ سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ اس موضوع پر تم بھی سوچ لینا۔ مجھے بھی سوچنے کا موقع دو۔ سوچے سمجھے بغیر اتنا بڑا قدم اُٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

میری یہ آفر (OFFER) سُن کر وہ بے حد خوش ہوا اور یکایک اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

مَیں رات بھر سوچتی رہی۔ مَیں سعید سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ عمر میں مجھ سے اچھا خاصا بڑا ہے۔ کوئی زیادہ خوبصورت آدمی بھی نہیں۔ خاندانی بیک گراؤنڈ بھی بھی نہیں۔ ایک معمولی سے عطائی ڈاکٹر جس کی تمام تر پریکٹس ایک ہوس پرست حکمران کی ہوس رانی کو تقویت دینے تک موقوف ہے۔ بقول اس کے وہ فوج میں کرنل ضرور ہے۔ لیکن تمام عمر فوج میں تو نہیں رہے گا۔ کبھی تو فوج سے واپس بھی آئے گا۔ اس کی اتنی عمر ہو گئی ہے اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی۔ چلیے کوئی بہت آئیڈیل لڑکی اُسے نہ مل سکی ہو گی۔ لیکن کسی عام سی لڑکی ہی سے شادی کر لیتا۔ وہ جتنا اس مسئلے پر سوچتی یہ اتنا ہی اُلجھتا جاتا۔

وہ سوچنے لگی۔ آخر میں اس اجنبی جگہ پر کب تک یوں اکیلی قیام پذیر رہوں گی جب بھی کسی کو اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ مَیں ایک امیر لیڈی ہوں تو یہ جاہ و ثروت میرے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گی۔ کرنل کی اس پرپوزل (PROPOSAL) کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ مَیں اس کے ساتھ دوست کی حیثیت سے رہوں۔ لیکن اس میں ایک پرابلم (PROBLEM) ہو گی۔ نہ ہم ایک دوسرے کو میاں بیوی ظاہر کر سکیں گے اور نہ ہی کسی دوسری حیثیت سے ہم زیادہ دیر تک اکٹھے رہ سکیں گے۔

اسی اُدھیڑ بن میں میری آنکھ لگ گئی۔ اور مَیں سو گئی۔

۴ــ۴

دوسرے دن کرنل بڑا بن ٹھن کر آیا۔ کرنل کی وردی زیب تن کیے ہوئے فوجی گاڑی

پر سوار۔ ساتھ فوجی سپاہیوں کا ایک لاؤ لشکر۔ وہ سپاہی اسے میرے کمرے تک چھوڑنے آئے۔ پھر کرنل نے ان میں سے ایک کو کچھ پیسے دیے اور یہ کہا کہ تم لوگ نیچے گاڑی کے پاس رہو۔ چائے وغیرہ پیو۔ اگر بازار کا چکر لگانا چاہو تو بے شک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھوم پھر لینا اور پھر وہ فوجی سلام کر کے چلے گئے۔

کرنل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سکھ کا سانس لیا۔ سگریٹ کیس نکالا۔ مجھے آفر کیا اور پھر خود ایک سگریٹ سلگا لیا۔ وہ آج اچھے موڈ میں تھا۔

ہاں تو یور ہائی نیس (YOUR HIGHNESS) آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے یور ہائی نیس پر زور دیتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ چلی آؤں گی۔ لیکن آنے سے پہلے میں اپنی کچھ شرائط پیش کرنا چاہتی ہوں۔

بسر و چشم۔ یور۔ ہائی نیس

سعید صاحب بات یہ ہے کہ جب تک آپ چاہیں میں آپ کے ساتھ ایک دوست کی حیثیت سے رہ سکتی ہوں لیکن بیوی بن کر نہیں۔

کیوں بیوی بن کر رہنے میں کیا حرج ہے۔

سعید صاحب میری کچھ پرابلمز (PROBLEMS) ہیں۔ جن کا میں سر دست اظہار نہیں کر سکتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کو خود پتہ چل جائے گا۔ میں آپ کی کوٹھی۔ نوکر چاکر اور گھر کے سب اخراجات برداشت کروں گی۔ میں ایک نئی کار جلد خرید لوں گی۔ آپ بھی اگر چاہیں تو اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ مجھ پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

تو جنا! یہ پہاڑ سی زندگی تم کیسے گزارو گی۔ یہ حسن۔ یہ جوانی۔ ان کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ لیکن ایک والئے ریاست کی مہارانی بن کر رہنے کے بعد میں کسی عام سے آدمی کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔

میں نے آپ سے پہلے عرض کی ہے کہ اس ہوشربا جوانی کے اپنے کچھ تقاضے ہیں ان سے آپ منہ نہ موڑ سکیں گی۔

نہیں سعید صاحب میرے اندر کی عورت مر چکی ہے۔ اب میں کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات استوار نہیں کر سکتی۔

نہیں حنا ایک وقت آئے گا کہ تم اپنے اذیت ناک ماضی کو بھول کر مستقبل کے خوشگوار منصوبے بناؤ گی اور پھر نئے سرے سے تم میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو گی۔

سعید صاحب میں آپ کے ساتھ جانے سے پہلے آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ ہم دو اچھے دوستوں کی طرح رہیں گے۔ آپ مجھ سے جنسی تعلقات استوار کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ مجھ پر کسی قسم کی کوئی کمانڈ ایکسر سائز EXERCISE نہ کریں گے۔ سوسائٹی میں آپ کسی کے سامنے بھی اس بات کا اظہار نہیں کریں گے میں آپ سے اخراجات وغیرہ کے لیے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔ آپ میرے مالی معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ اگر یہ باتیں آپ کو منظور ہوں تو میں آپ کے ساتھ چل چلتی ہوں۔ میں آپ پر شادی کی کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتی۔ آپ جب چاہیں شادی کر لیں۔ میں پھر اپنی الگ رہائش اختیار کر لوں گی۔ اس طرح اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور میں سمجھوں کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے تو آپ میری راہ میں مزاحم نہ ہوں گے۔

مہارانی صاحبہ کے ہر حکم کی تعمیل ہو گی۔

نہیں سعید تم یہ باتیں مذاق میں نہ اڑاؤ۔ میں سیریس (SERIOUS) ہوں۔
میں بھی سیریس (SERIOUS) ہوں۔ آپ کی بتائی ہوئی ہر بات مجھے بسر و چشم منظور ہے۔

⁂

سعید میرا مختصر سا سامان اٹھوا کر نیچے لے گیا۔ میں ہوٹل کے دفتر میں گئی۔ وہاں تمام

بل ادا کیے اور ان سے کلیرنس (CLEARANCE) لی اور پھر سعید کے ساتھ اس کی سرکاری گاڑی میں آکر بیٹھ گئی اور وہ مجھے اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ میرے لیے بیڈ وغیرہ کا انتظام کیا اور میری ہدایت پر میرا بیڈ ایک الگ کمرے میں لگایا گیا۔ تاکہ سعید کے ذہن میں یہ بات گھر نہ کرے کہ ایک جوان اور خوبصورت عورت اس کے پہلو میں سو رہی ہے اور اس طرح وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ (UP SET) نہ ہو۔ شروع شروع میں تو سعید کئی روز تک تابعداری کرتا رہا۔ لیکن بعد میں جب اس نے دیکھا کہ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے سب مٹ (SUBMIT) نہیں کرتی تو وہ کچھ کچھا کچھا سا رہنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی چونکہ یہ سب باتیں میں نے پہلے ہی بہت وضاحت سے اس کو بتا دی تھیں۔

کراچی میں میں سعید کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سال رہی ہوں گی۔ وہ میری قربت سے کافی محظوظ ہوتا رہا۔ اس نے کئی بار مجھ سے لپٹنے چپٹنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن میں نے اسے کوئی لفٹ نہ دی۔ میں نے بارہا اسے کہا کہ تم شادی کر لو لیکن کسی موہوم سی اُمید کے سہارے اس نے ایسا نہ کیا اور وہ بدستور ایک انجانی سی آگ میں جلتا رہا۔ ڈیڑھ سال کراچی رہنے کے بعد اس کا پوسٹنگ لاہور ہو گیا۔ وہاں اس کو میرڈ اکاموڈیشن (MARRIED ACCM) نہ مل سکی۔ اس لیے ہم چھ ماہ کے لیے فلیٹیز میں رہے۔ فلیٹیز بڑا مہنگا ہوٹل ہے۔ اگر سعید کو بلوں کی ادائیگی کرنا پڑتی تو اس کی پوری تنخواہ بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی جتنا عرصہ وہ میرے ساتھ فلیٹیز میں رہا ٹھیک بی ہیو (BEHAVE) کرتا رہا۔ وہاں اس کی پوسٹنگ ایک فیلڈ ایمبولینس یونٹ میں ہوئی تھی۔ چھ ماہ بعد اُسے جہلم پوسٹ کر دیا گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہم یہاں رہ رہی ہیں۔

یہاں آکر بنگلہ میں نے کرائے پر لیا۔ ڈرائیور۔ خانساماں۔ بیرا اور ایک مائی میں نے ملازم رکھے جن کی تنخواہ میں دیتی تھی۔ گھر کے تمام اخراجات میں برداشت کرتی ہوں سعید کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔

وہ اب ہسپتال سے ایک نرس کو کبھی کبھی اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ جو دو تین گھنٹے رہ کر واپس چلی جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ نرس مجھے دیکھ کر بڑی اپ سیٹ ہوتی

لیکن شاید سعید کے سمجھانے بجھانے پر اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور بعد میں وہ خود اکیلی بھی کبھی کبھار آجاتی۔ ایک دو دفعہ اس نے رات بھی سعید کے کمرے میں بسر کی۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور نہ ہی میں نے بُرا مانا۔ البتہ جس دن وہ نرس آتی سعید مجھ سے آنکھ نہ ملا سکتا۔ یہ کاروبار اسی طرح چلتا رہا۔ ایک دن رات کو سعید نے مجھے ریپ (RAPE) کرنے کی کوشش کی۔ وہ میرے کمرے میں آیا۔ بجائے صوفے پر بیٹھنے کے میرے پاس پلنگ پر آکر بیٹھ گیا اور پھر مجھ سے لگا پیار جتانے میں نے پہلے کی طرح کوئی نوٹس نہ لیا۔ اس نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے کس (KISS) کر لیا۔ میں اُس کی اس بچگانہ حرکت پر ہنس پڑی۔ شاید اس سے اُسے مغالطہ ہوا اور اس نے میرے ساتھ زبردستی کرنا شروع کر دی۔

احمد صاحب میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ میں اس طرح کے حالات وواقعات سے کبھی دوچار نہیں ہوئی۔ میں اسے منع کرتی رہی۔ سمجھاتی رہی۔ لیکن شاید وہ اسے میری نیم رضامندی سمجھا۔ اس نے ہاتھا پائی کرنا شروع کر دی۔ جس سے میری قمیص پھٹ گئی۔ اور پھر اس نے مجھے زبردستی چارپائی پر گرا لیا۔

عورت اگر فزیکلی بہت کمزور بھی ہو اور اس کا مدِمقابل شہ زور اور تنومند جوان بھی ہو تو وہ اس نحیف و نزار عورت کی عصمت دری نہیں کر سکتا جب تک عورت کی اپنی مرضی نہ ہو ــــــ یکایک میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ اس کے دل میں نفس پرستی کی تیز آگ مشتعل ہو گئی ہے اور اس کا سارا وجود اور اس کے سارے حواس اس کی رغبت ایک عجیب مہلک جذبے سے متحرک ہو اُٹھے ہیں۔ درندوں کی آنکھوں میں شکار کے وقت جو چمک آجاتی ہے۔ ویسی ہی چمک اس وقت میں نے سعید کی آنکھوں میں بھی دیکھی۔ اس وقت اس کی دونوں آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ یہ باطنی مسرت کی تاباں اور خوشگوار روشنی نہ تھی بلکہ شکاری کا خونخوار مقصد تھا۔

میں نے مدد کے لیے عارف کو آواز دی۔ لیکن سعید نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایک اچھا موقعہ ملا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں لے کر اتنے زور

سے چباڈالیں کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اُس نے مجھے زور سے لات ماری اور میں دور جا گری۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میری مدد کو کوئی نہ آیا۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ شاید تمام لوگ آرام کر رہے تھے ایسے پتہ چلتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے کپڑے بدل کر دروازے بولٹ کر دیے اور لیٹ گئی۔ میں نے اس دن ہی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس ذلیل انسان سے اب الگ ہی رہوں گی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اور کوئی اس میں بیٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی کہ کون تھا۔ کہاں گیا ہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ کرنل صاحب بہادر تھے۔ اُن کا ہاتھ دروازے میں آکر کچلا گیا تھا۔ وہ سی۔ ایم۔ ایچ گئے تھے۔ سرجیکل سپیشلسٹ نے جناب کی ایک انگلی کاٹ دی اور دوسری پر پٹی کر کے انہیں سک۔ ان۔ کوارٹر کر دیا۔ میں اس کی اس چالاکی اور مکاری پر حیران تھی۔ میں سوچنے لگی ایسے لوگ جو ظاہر میں نیکی اور اخلاق کی باتیں کرتے تھکتے نہیں۔ حقیقت میں کتنے بڑے کمینے اور بدکار ہوتے ہیں دوسرے دن اُس نے فزیکلی گڑگڑاتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لیے اور معافی مانگنے لگ گیا۔ گذشتہ رات جو کچھ ہوا تھا میں اُسے بھول کر اُس سے راضی ہو گیا۔ اس نے خوشی سے میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے دل میں کہا چلو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں نے اس واقعہ کو دل میں جگہ نہ دی۔

کوئی آٹھ نو ماہ خیریت سے گذر گئے۔ اس عرصے میں ہم ایک دوسرے سے کم ہی بولتے تھے۔ کھانا وغیرہ الگ الگ کھاتے تھے۔ میں نے اس سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ میرا خیال تھا اس کیلیے یہ ایک تازیانہ ہوگا اور وہ آئندہ ایسی کوئی نازیبا حرکت نہ کرے گا۔ اس لیے میں اس کے ساتھ رہتی رہی۔ لیکن اب میں دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ اس سے الگ ہو جاؤں۔ تمہارے ملنے کے بعد اب مجھے سہارا ہو گیا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ہر مشکل وقت میں تم میری مدد کو آؤ گے۔ تمہارے ہی بھروسے پر میں نے اس کو بنگلہ خالی کرنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ وہ بے حد شرمندہ

ہے۔ مجھ سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ اس کو میری وجہ سے کم از کم دو ہزار روپے سے زیادہ ماہوار کی بچت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے۔ بنگلہ کرائے پر میں نے لے رکھا ہے۔ چار فل ٹائم نوکر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو تنخواہ میں دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ جز وقتی ملازم خاکروب، دھوبی اور مالی وغیرہ ہیں۔ گھر کا تمام خرچہ میں برداشت کرتی ہوں۔ گاڑی بھی وہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس نے کبھی ایک پیسے کا پٹرول اس میں نہیں ڈالا۔ اپنی تنخواہ سب کی سب بچت کرتا ہے کبھی کبھی تو جیب خرچ بھی مجھ سے لے لیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

وہ اٹھ کر میرے پاس صوفہ پر آکر بیٹھ گئی۔ ہم فوجی لوگ عورت کی قربت سے محروم ہوتے ہیں۔ میں نے عجیب سا محسوس کیا۔ ایک جوان اور حسین جسم کی قربت سے میں اپنے آپ میں ایک نئی زندگی اور روح میں ایک نئی تڑپ محسوس کر رہا تھا۔ حنا زندگی کے اس دور سے گذر رہی تھی۔ جب دل میں امنگیں اور دماغ میں منصوبے ہوتے ہیں۔ خود زندگی ہی ایک بہت دلچسپ اور رنگین کھیل معلوم ہوتی ہے۔ یکایک وہ بہت سنجیدہ ہوگئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ احمد میں نے مدد کے لیے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔

حنا پہلے بھی میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اخلاقی حدود کے اندر رہ کر جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکا کروں گا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چونک اٹھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

حنا میں تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔ میجر ملک میرا انتظار کر رہے ہوں گے دفتر کا سب کام یونہی چھوڑ کر آگیا تھا۔

پھر کب آؤ گے۔ حنا نے بڑے التجا بھرے انداز میں کہا۔

وعدہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عدم صاحب بھی میری تلاش میں ہمارے کیمپ میں آجاتے ہیں۔ اگر میں ان کو نہ ملوں تو وہ بہت ناراض ہوتے ہیں اور میجر ملک صاحب سے میری شکایت کرتے ہیں۔

آپ عدم صاحب کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں۔
حنا ایک تم پر ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر شے پر — یہ سُن کر وہ مایوس ہو گئی اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

ـــــــ

مَیں حنا سے اجازت لے کر واپس کیمپ میں چلا گیا۔ ملک صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔
کیوں خیریت تو ہے۔ اتنی دیر کیوں لگا دی۔ میجر ملک صاحب نے مجھ سے پوچھا
خیریت ہے سَر۔ ایک عزیز مل گئے تھے۔ اس لیے ذرا دیر ہو گئی۔ معذرت خواہ ہوں۔
نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ڈاک دیکھ لیں اور پھر مجھ سے آ کر بات کریں۔
میجر صاحب سے فارغ ہو کر مَیں اپنے ٹینٹ میں آیا۔ میرے اردلی نے مجھے بتایا کہ دس بجے عدم صاحب آئے تھے۔ آپ ملے نہیں تو ناراض ہو کر واپس چلے گئے جاتے وقت کہہ گئے ہیں کہ شام کو اڈے پر ضرور آنا۔ یہ سُن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ مَیں نے اپنے اردلی کو سٹینڈنگ آرڈر دے رکھا تھا کہ جب تیسری جنگ عظیم کا اعلان نہ ہو مجھے جگایا نہ کریں۔ مَیں ابھی سو رہا تھا کہ عدم صاحب کی آواز سے جاگ اُٹھا۔
اللہ یار خان (میرے اردلی کا نام تھا) احمد صاحب کہاں ہیں۔ عدم صاحب نے اس سے استفسار کیا۔
سَر ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ سوئے ہوئے ہیں۔
صبح تو ٹھیک تھا۔ دس بجے کہیں باہر حکر پر گیا ہوا تھا۔ اب اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔
نہیں سر وہ ہسپتال گئے تھے۔
اچھا ٹھیک ہے۔ جا کر ان کو جگاؤ اور میرا بتاؤ۔

عدم صاحب مجھے لے کر ساجد اکرم کی ورکشاپ جہاں ہمارا اڈا تھا جا پہنچے۔ سب دوست جوں جوں اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہوتے وہاں پہنچنا شروع ہو جاتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے خوش گپیاں کرتے چائے کا لطف اُٹھاتے۔ عدم صاحب سے شعر سُنتے اور تقریباً نو بجے ممبرانِ حلقۂ یاراں ناؤ نوش میں مصروف ہو جاتے ان دوستوں میں مَیں ایک ایسا ممبر تھا جو الگ سے بیٹھا کبھی چائے پیتا کبھی سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بناتا رہتا۔ وہ سب بڑی کوشش کرتے کہ مَیں بھی اُن کے ساتھ شریک ہوں لیکن اس دن جبکہ مَیں فٹ پاتھ پر گر پڑا تھا۔ اس دن کے بعد مَیں نے اس زہر کو پھر کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اب میرا یہاں بیٹھنے کو جی بنہ کرتا تھا۔ مَیں عدم صاحب کی وجہ سے وہاں جاتا تھا۔ مَیں عام طور پر انہیں رات کو تانگے پر بٹھا کر گھر چھوڑ کر واپس اپنے کیمپ آتا۔

حسبِ سابق اس رات بھی یہ محفل کوئی بارہ بجے ختم ہوئی۔ مَیں عدم صاحب کو ان کے گھر چھوڑ کر کیمپ واپس آیا تو مَیں نے دیکھا میرا اردلی میرے خیمے میں سویا ہوا ہے۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر وہ جاگ اُٹھا۔ مَیں نے بڑے ہی اچھے موڈ میں اس سے پوچھا۔

کیوں اللہ یار خیریت تو ہے۔ تم آج ادھر کیسے سو رہے ہو۔ اپنے ٹینٹ میں کیوں نہیں گئے۔

صاحب بڑی ضروری بات تھی۔ اگر اپنے ٹینٹ میں چلا جاتا تو آپ کے آنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔

خیریت تو ہے۔ مجھے کوارٹر گارڈ بند تو نہیں کرنا۔ مَیں مذاقاً کہا۔

ابھی تو نہیں سر۔ لیکن میرا خیال ہے نوبت آنے والی ہے۔

وہ کیوں۔ مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

صاحب وہ ایسے۔ یہ کہ یہ عورت جو آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یہ تو آپ کو برباد کر کے چھوڑے گی۔

کون سی عورت اللہ یار خان ۔ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔
صاحب وہی، کرنل کی بیگم۔ آپ کے جانے کے بعد تین دفعہ آ چکی ہے۔ آخری بار کوئی گیارہ بجے آئی اور رو رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ اللہ یار خان جہاں عدم صاحب اور احمد صاحب بیٹھتے ہیں تم مجھے وہاں چھوڑ آؤ۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ بیگم صاحبہ مجھے تو جگہ کا پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں ہوں گے اور پھر وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی اور جاتی دفعہ مجھ سے یہ کہہ گئی ہے کہ جس وقت بھی احمد صاحب آئیں ان کو کہیں کہ وہ اسی وقت میرے پاس آئیں۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ اگر وہ مجھ سے آج نہ مل سکے تو پھر زندگی بھر کبھی نہ مل سکیں گے۔
میں سر پیٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اللہ یار مجھے پریشان کن نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اپنا اٹیچی کھولا اور اس سے اپنا پسٹل نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ اللہ یار نے کوشش کی کہ میں نہ جاؤں لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور کیمپ کے بیرونی بیریر (BARRIER) کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے حنا کا بنگلہ تقریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ ان پر کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں حالات کے دھارے پر بہتا ہوا تلاطم خیز لہروں سے لڑتا بھڑتا کناروں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ میں ہیڈ پوسٹ آفس سے بائیں ہاتھ کو مڑ کر مین روڈ پر کچھ زیادہ دور نہ گیا ہوں گا کہ سامنے سے ایک کار آتی ہوئی مجھے نظر آئی۔ کار میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں نے دیکھا کار میں حنا تھی۔ اس نے کار ایک طرف کھڑی کی اور باہر نکل کر دھاڑیں مارتی ہوئی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کار میں لا کر بٹھایا۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور وہ کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ وہ رکتے رکتے سہمے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہنے لگی۔
احمد صاحب میں آپ کے ساتھ کیمپ میں چلتی ہوں۔ میں اب اپنی کوٹھی پر نہیں جا سکتی۔

کیوں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔
حادثہ! احمد صاحب مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ آپ حادثے کی بات کرتے ہیں۔
آخر پتہ تو چلے۔
آپ کو کیا ہے۔ آپ عدم صاحب کی محفلوں میں بیٹھ کر ساغر و مینا میں غرق رہیں میں تین دفعہ آپ کے پیچھے گئی ہوں۔ آپ کا اردلی کہتا ہے کہ اسے آپ کے ٹھکانے کا کچھ پتہ نہیں ہے۔
دیکھئے حنا فوجی کیمپ میں ویسے بھی کوئی عورت نہیں جا سکتی۔ اب رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ یہ وقت تو ویسے بھی ایسا ہے کہ اگر آپ میرے ساتھ میرے ٹینٹ میں جائیں تو دیکھنے والے اس کا اچھا تاثر نہیں لیں گے۔
تو پھر کیا کریں؟
آپ کی کوٹھی پر چلتے ہیں۔ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کسی قسم کا کوئی فکر نہ کریں۔

٭٭٭

حنا میری بات مان گئی اور ہم دونوں اس کی کوٹھی پر آگئے۔ وہاں کوئی بھی غیر معمولی چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک ہُو کا عالم تھا۔ سب ملازمین اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ میں نے حنا کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا سعید کے کمرے کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ آج سعید کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ اس لیے حنا کو کسی نے لوٹنے کی کوشش کی ہے۔
حنا نے اپنے کمرے کا تالا کھولا اور میں اس کے پلنگ کے سامنے پڑے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا اور اس کا موڈ خوشگوار بنانے کے لیے سگریٹ کیس نکالا ایک سگریٹ اُسے دیا اور دوسرا خود سلگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔
یور۔ ہائی نیس۔ اب ارشاد ہو۔ آپ کا یہ غلام بے دام خدمت کے لیے حاضر ہے۔

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہی لیکن پھر میری گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اس کے بری طرح اُلجھے ہوئے بالوں میں اپنی اُنگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔ وہ جب اچھی طرح رو چکی اور اُس کا جی کچھ ہلکا ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگی۔

احمد صاحب میں نے آپ کو کئی دفعہ کہا ہے کہ میں سعید کے ساتھ اب مزید نہیں رہ سکتی۔ آج اُس نے وہ کچھ کیا ہے جس کا کوئی مہذب شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

حِنا کھُل کر وضاحت سے بات بتاؤ۔

احمد صاحب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے کہہ کر گیا ہے کہ میں آج رات کو تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش کو جلا کر، راکھ دریا میں بہا دوں گا۔ اور پھر اُس پر ایک انجانا خوف طاری ہو گیا اور اب وہ کچھ کہتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

میں نے اپنی جیب سے پسٹل نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس سے اس کی کچھ ڈھیر بندھی۔ میں نے اُس سے کہا حنا کچھ بتاؤ گی بھی یا یونہی روتی رہو گی اور یہ وقت گذر جائے گا۔ ہم نے جو کچھ کرنا ہے وہ بھی نہ کر سکیں گے۔

بات یہ ہے احمد صاحب کل شام کو یکایک میرے سر میں بڑا شدید درد شروع ہو گیا۔ میں نے عام روایتی سی دوائیاں لیں لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا بلکہ درد بڑھتا ہی گیا۔ میری چیخ و پکار سن کر سعید میرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ کر میرا سر دباتا رہا۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ درد تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سعید نے مجھ سے کہا کہ میں ہسپتال جاتا ہوں اور آپ کے لیے دوائی لے کر آتا ہوں۔ چنانچہ وہ کار لے کر چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد آیا اس کے ہاتھ میں کئی قسم کی دوائیاں تھیں۔ اس نے سب ملازمین کو کہا کہ اب آپ لوگ آرام کریں۔ بیگم صاحبہ اب ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب ملازم اپنے اپنے کمروں کو چلے گئے۔ سعید نے مجھے دو گولیاں دیں جو میں نے پانی کے ساتھ لے لیں اور پھر فوراً ہی اس نے مجھے ایک انجکشن لگایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے درد میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ مجھ پر غنودگی

بھی طاری ہونے لگ گئی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا میری حالت کا جائزہ لیتا رہا تھوڑی ہی دیر میں مجھ پر مکمل غنودگی چھاگئی اور پھر مجھے کچھ خبر نہیں رہی۔

مَیں دوسرے دن شام تک اپنے بستر پہ بے ہوش پڑی رہی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے ہوش آتا تھا۔ پھر نیند آجاتی تھی۔ آخر کار پورے چوبیس گھنٹے کے بعد آج شام کو تقریباً سات آٹھ بجے مجھے اچھی طرح ہوش آیا۔ مَیں حیران ہوگئی۔ میری شلوار اُتری ہوئی تھی اور اس وقت مَیں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ کسی نے بے ہوشی کی حالت میں زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ شواہد سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ انسانیت سوز حرکت سعید نے کی ہے مَیں بستر سے اُٹھی۔ شلوار پہنی۔ شلوار کی آلودگی بھی اس فعلِ شنیع کا ایک بین ثبوت تھا مَیں نے عارف کو آواز دی۔

بابا ادھر آنا۔

جی آیا بیگم صاحب اور وہ جلدی سے میرے کمرے میں آگیا۔

بابا کرنل صاحب کہاں ہیں۔

بیگم صاحب وہ صبح ناشتہ پر بھی نہیں تھے۔ ان کا کمرہ بند تھا۔ ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام سے رات ہی کو پنڈی چلے گئے تھے۔

حِنا اتنا ذلیل کوئی مرد نہیں ہوتا کہ وہ کسی مردہ یا بے ہوش عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرے۔

احمد صاحب آپ سعید کو اچھی طرح نہیں جانتے یہ اخلاق کی سب حدود پھلانگ سکتا ہے۔

لیکن حنا اس معاملے میں اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کو جتنا ہوا دوگی۔ آپ ہی کی بے عزتی ہوگی۔ سب لوگ حتیٰ کہ جنرل صاحب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کرنل سعید کی بیگم ہیں۔ اگر آپ ان کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کریں گی تو اس امر سے کسی اچھائی کا توکوئی امکان نہیں ہے۔ سب یہی کہیں گے کہ حنا کرنل سعید کی کیپ (KEEP) تھی۔ مَیں سمجھتا ہوں اس سے مزید رسوائی ہوگی۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ آپ اس کو کمیں کردہ

آپ کوٹھی خالی کر دے۔ یا میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہاں سے شفٹ ہوکر کسی بڑے سٹیشن پر چلی جائیں۔ وہاں جاکر نئے سرے سے اپنا گھر بسالیں۔ اور اس کے بعد جو مناسب ہو کریں۔

ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں آپ کی مدد کی بھی ضرورت ہوگی۔

میں تیار ہوں۔ میں جس قابل ہوا آپ کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کروں گا۔

میرا یہ خیال ہے کہ آپ ایک ماہ کی چھٹی لے لیں اور میرے ساتھ لاہور فلیٹیز میں رہیں۔ پھر آئندہ کا لائحہ عمل ہم وہاں طے کریں گے۔

لیکن یور۔ ہائی نیس آپ از راہ کرم مجھے اس دلدل میں نہ گھسیٹیں۔

کیا آپ ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

حنا! آپ کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ میں بہت ہی معمولی اور چھوٹا سا فوجی افسر ہوں۔ میں اتنا بوجھ نہ اُٹھا سکوں گا۔

چلیں چھوڑیں آپ اس قصے کو۔ آپ کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ لاہور آئیں۔ وہاں اطمینان سے صلاح مشورہ کریں گے۔ میں نے جو بھی قدم اُٹھایا وہ آپ کے مشورے کے بعد ہی اُٹھاؤں گی۔

میں کتنی چھٹی لوں۔

کم از کم ایک ماہ تو ہو۔ حنا نے کہا

یہ بات تو دو چار دن ہی میں طے کی جاسکتی ہے۔

چلیں آپ بیس دن کی چھٹی لے لیں۔

٭ ٭

میں نے بیس دن کی ضروری چھٹی کی درخواست دے دی۔ پندرہ دن کی چھٹی منظور ہو گئی۔ اور میں حنا کے ساتھ اس کی کار میں لاہور چلا گیا۔ جانے سے پہلے جب میں سامان سنبھال رہا تھا تو میرے اردلی اللہ یار خان نے مجھ سے پوچھا۔

صاحب خیریت تو ہے آپ کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

اللہ یار میں نے لاہور جانا ہے۔

صاب لاہور کے لیے دو چار روز کی چھٹی ہی کافی ہے۔ آپ نے یہ پندرہ دن کی چھٹی کیوں لی ہے۔ اس سوہنی کُڑی کے ساتھ تو کہیں نہیں جا رہے۔

نہیں اللہ یار میرا ایک شاعر دوست میو ہسپتال میں سخت بیمار ہے۔ اس کے پاس رہوں گا۔ اس کا کوئی عزیز نہیں ہے۔ میں اس کی تیمارداری کروں گا۔ اور وہ ہنس پڑا۔ جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

شام کے چار بجے حنا کا ڈرائیور مجھے لینے کے لیے آ گیا۔ اللہ یار نے میرا اٹیچی اٹھا کر کار کی ڈگی میں رکھ دیا۔ اور میں کیمپ سے حنا کی کوٹھی پر چلا گیا۔ چائے پی تھوڑی دیر تک گپ شپ کی۔ حنا کہنے لگی۔

لاہور تو صبح سویرے جائیں گے۔ آئیے بازار سے کچھ شاپنگ کریں۔

اس نے بہت سا سامان اپنے لیے اور میرے لیے خریدا اور پھر ہم کچھ پھل وغیرہ لیکر واپس کوٹھی پر آ گئے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ عارف نے کھانا لگایا۔ میں نے اور حنا نے اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھایا۔ حنا کہنے لگی۔

احمد صاحب آپ یقین جانیے۔ اپنی امی اور ابو کے بغیر آج تک میں نے کسی آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔

اُس بڈھے مہاراجہ کے ساتھ بھی نہیں۔

نہیں اس کے ساتھ میں کھانا کھاتی ہی نہ تھی۔ میرا اُنک مسلمان تھا وہ میرے لیے حلال کھانا الگ پکایا کرتا تھا اور میں اکیلی ہی کھاتی تھی۔

سعید کے ساتھ بھی کبھی نہیں کھایا۔

روٹین میں کبھی نہیں کھایا۔ کبھی شاید کسی موقعہ پر گھر سے باہر کھا لیا ہو تو یاد نہیں پڑتا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے حنا کو کہا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ جلد سونا چاہتا ہوں میرا بستر اسی کمرے میں لگوا دیں جس میں آپ پہلے روز مجھے فرلے پاتھر سے اٹھا کر لائی تھیں تو سلایا تھا۔ وہ ہنس پڑی مجھے یوں لگا جیسے بہار کھلکھلا کر ہنس پڑی ہو اور میری حیات پُر نم

کے خزاں رسیدہ چمن میں نکہتوں کے کارواں اور رنگ و نور کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت اور خلوص کے جذبات دیکھے۔

حضور وہ کمرہ تو صاف نہیں ہو گا۔ آپ یہاں میرے کمرے ہی میں سو جائیں۔

یور۔ ہائی نیس۔ یہاں دوسرا پلنگ نہیں لگ سکتا۔ سپیس (SPACE) کم ہے۔

حضور والا۔ آپ میرے پلنگ پر سو جائیں۔ میں نیچے قالین پر سو جاؤں گی ویسے بھی مجھے کمر کا درد ہے۔

نہیں شکریہ۔ دو منٹ لگیں گے۔ میں اس کمرے کی صفائی کر لیتا ہوں اور پھر بستر وہاں ہی لگاؤں گا

جی نہیں۔ آپ یہاں ہی سوئیں گے۔ باتیں کریں گے۔ میں آپ کو میٹھی میٹھی کہانیاں سناؤں گی۔

میں کوئی بچہ ہوں کہ آپ مجھے کہانیاں سنائیں گی۔

بچے ہی کہانیاں سنتے ہیں۔ بڑے نہیں سنتے۔ اور تم تو مجھ سے چھوٹے ہو۔

لیکن حنا میں تھکا ہوا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔ یہاں تو رات بھر ہم باتیں ہی کرتے رہیں گے۔

احمد صاحب۔ یہ پیار کی باتیں ہی حاصل زندگی ہیں۔

آخر کار ہم دونوں میں یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں ہی نیچے قالین پر سوئیں گے۔ حنا نے دونوں بستر ساتھ ساتھ لگا دیے۔ میں نے اپنے بستر میں لیٹتے ہی رضائی لپیٹ لی۔ حنا مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی اور مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ میں ہوں ہاں ہی میں جواب دیتا رہا۔ حنا نے تنگ آ کر میرے اوپر سے رضائی کھینچ کر الگ کر لی۔

حنا مجھے خدا کے لیے سونے دو۔ سخت نیند آ رہی ہے۔

آپ سو جائیں گے یا لوری دوں۔

بابا آپ میری رضائی واپس کریں میں لوری کے بغیر ہی سو جاؤں گا۔

اُس نے اُٹھ کر اپنا بستر کھینچ کر میرے بستر کے بالکل ساتھ کر دیا۔ مجھ پہ رضائی ڈال دی۔

اور تھوڑی دیر تک میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھ سے میٹھی میٹھی، پیاری پیاری باتیں کرتی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تنفس میں تیزی آگئی ہے۔ میں جلد ہی سو گیا۔ نہ جانے وہ کب تک جنس کے دہکتے ہوئے جہنم کی آگ میں جلتی رہی۔ میں صبح نماز پڑھنے کے لیے اُٹھا تو وہ تھک ہار کر سو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر یاسیت اور محرومی کا ایک کربناک تاثر نہایت واضح تھا۔ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ بابا عارف میرے لیے بیڈ ٹی (BED TEA) لے آیا۔ میں نے بابا سے کہا۔

بابا بیگم صاحب کے لیے چائے نہیں لائے۔

سرکار وہ تو کہیں دس بجے جا کر اٹھیں گی۔ اس گھر میں میں نے آپ کو پہلا آدمی دیکھا ہے جس نے نماز پڑھی ہے۔ نہ کرنل صاحب نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی بیگم صاحب۔

ہماری باتیں سن کر حنا کی آنکھ کھل گئی۔

بابا میں سن رہی ہوں جو آپ حاجی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے لفظ حاجی پر زیادہ زور دیا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

بابا جھینپ گیا اور جلدی ہی واپس کچن کی طرف چلا گیا۔ حنا نے میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی اُچک لی اور خود پینے لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اُٹھ گئی۔ نہا دھو کر ہم لاہور جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ حنا نے اپنے لیے فلیٹیز میں ایک کمرہ بک کروایا تھا۔

ہم کوئی دس بجے کے قریب روانہ ہوئے اور دو بجے لاہور پہنچ گئے۔ ملازمین نے گاڑی سے سارا سامان اُتارا اور ہمیں استقبالیہ (RECEPTION) میں لے گئے۔ وہاں پہلے ہی ہمارے نام درج تھے۔ ہماری آمد پر انھوں نے ہمارا سیٹ کنفرم کر دیا اور وہی ملازم ہمارا سامان اٹھا کر وہاں لے گئے۔ دو صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے۔ نہایت صاف ستھرا ٹائیلٹ تھا کمروں میں نہایت اعلیٰ اور شاندار قالین بچھے تھے۔ غرضیکہ سب ضروری سہولتیں میسر تھیں۔ میں معمولی درجے کا ایک فوجی اور وہ بھی دیہاتی۔ میں نے اس اعلیٰ پائے کے ہوٹل کہاں دیکھے تھے۔ میں وہاں کے ایٹیکیٹس (ETIQUETTES) سے بھی واقف نہ تھا۔ اس لیے اپنے آپ کو اور بھی کمتر محسوس کرنے لگا۔

حضور گھبرائیے نہیں آپ ایک آدھ دن میں یہاں کے ماحول سے واقف ہو جائیں گے۔ حنا نے میری نفسیاتی کیفیات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تو اس طرح کی لائف میں بڑی گھٹن محسوس کرتا ہوں۔

حضور والا! میں آپ کو آؤٹ ڈور (OUT DOOR) میں زیادہ بزی (BUSSY) دیکھوں گی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا۔ حنا اپنے کچھ کاغذات سارٹ آؤٹ (SART OUT) کرتی رہی۔ مجھے تب پتہ چلا کہ اس نے اپنے نرم اور ملائم ہاتھوں سے میری گالیں تھپتھپائیں میں نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے اسے اسلام علیکم کہا

اٹھو واش (WASH) کر لو۔ چائے پی کر انارکلی چلتے ہیں۔ رات گئے تک ہم انارکلی میں پھرتے رہے۔ حنا نے کافی شاپنگ کی۔

میں نے وہاں سینکڑوں خوب صورت اور جوان عورتیں دیکھیں۔ لیکن حنا کے مقابلے میں وہ سب ہیچ تھیں۔ ہم جدھر سے گذرتے لوگ حنا کو دیکھتے رہ جاتے۔ ہم کوئی رات کو نو بجے ہوٹل واپس آئے۔ کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ گئے۔ کافی دیر تک حنا جو چیزیں لائی تھی ان کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ بچوں کی طرح خوش ہو جاتی۔ مجھے ایک ایک کر کے اس نے سب چیزیں دکھائیں۔ میری پسندیدگی پر اس نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔

ہم لباس تبدیل کر کے سونے کی تیاری کرنے لگ گئے۔ میں جب اپنے بستر میں لیٹ گیا تو وہ بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنی کے سہارے اس نے ٹیک لگاتے ہوئے اپنا چہرہ میرے منہ کے قریب کر لیا۔ ہم فوجیوں کو عام طور پر چونکہ عورت کی قربت میسر نہیں ہوتی اس لیے میں ذہنی طور پر بڑا اپ سیٹ (UP - SET) ہو گیا۔ چونکہ اس معاملے میں فطرتاً بڑا شرمیلا اور بزدل ہوں۔ اس لیے میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔

احمد صاحب میں آپ سے جو باتیں کرنا چاہتی تھی وہ ہم جہلم میں نہ کر سکتے تھے۔ آپ

کو اپنی ڈیوٹی پر جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ میری کوٹھی پر سعید ہمیں ڈسٹرب کرنے کے لیے ہر وقت موجود ہوتا تھا۔

فرمائیے ایسی کون سی بات ہے جو ہم نے اب تک نہیں کی۔

بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ شادی کر لیں۔

یہ بات تو ہم پہلے کر چکے ہیں۔

سرسری طور پر کی تھیں اب میں نہایت سنجیدگی سے یہ بات تم سے کہہ رہی ہوں۔

لیکن آپ تو کہتی تھیں کہ میرے اندر کی عورت مر چکی ہے۔

ٹھیک ہے مہاراجہ سے شادی کرنے کے بعد مر چکی تھی۔ سعید نے میری اس نفسیاتی اُلجھن میں مزید اضافہ کر دیا لیکن نہ جانے آپ سے ملنے کے بعد میں یکایک اپنے آپ کو کیوں جوان اور جذبات سے بھرپور عورت محسوس کرنے لگی ہوں۔

لیکن حنا میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے۔ میری بیوی ہے۔ دو بچیاں ہیں۔ میں بغیر کسی معقول وجہ کے کیسے اُن کو کرب و اذیت کے جہنم میں جھونک سکتا ہوں۔

احمد صاحب بات یہ ہے کہ آپ جس سٹیشن پر کہیں میں وہاں ایک بڑا سا پلاٹ لے کر دو الگ الگ رہائشی سیٹ تعمیر کرا دوں گی۔ ان دونوں کے درمیان میں آپ کا ایک الگ کمرہ اور ڈرائنگ روم ہو گا۔ آپ بے شک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہیں انشاء اللہ آپ کی بیگم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوں گی۔ آپ ملازمت چھوڑ دیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے پاس اتنی دولت ہے کہ اگر میں سو سال بھی اسے اس طرح خرچ کرتی رہوں تو ختم نہ ہو گی۔

حنا بات یہ ہے کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ ہماری کچھ اپنی علاقائی اور خاندانی روایات ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہمارے دیہی معاشرے میں مرد کام کرتا ہے۔ عورت گھر کا کام اور انتظام و انصرام کرتی ہے۔ عورت کی کمائی ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں کھاتا۔ دوسرا ہم شہروں میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ آپ میرے ساتھ گاؤں آ جائیں گی تو اس ضمن میں میں یہ عرض کروں گا کہ ایک ایسی عورت جو شاہی محلات میں پلی بڑھی ہو۔ تاج محل

فلیٹیڑ، اور فلیش مین میں قیام کرتی ہو۔ وہ گاؤں کی گندی گلیوں اور کچے مٹی کے گھروندوں میں اپنے آپ کو کیسے محبوس رکھ سکتی ہے۔

حضور والا جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ بڑی سے بڑی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ میں آپ کو فلیٹیڑ کی طرح کے دو عالی شان محلات نما مکان گاؤں میں تعمیر کروا دوں گی۔

جناب ات تو پھر بھی عورت کی کمائی پر منتج ہوگی۔

احمد میں کوئی بیسوا ہوں کہ آپ میرے جسم کی کمائی کھا رہے ہیں۔ مجھے حالات و واقعات نے ایسی ڈگر پر چلنے پر مجبور کیا کہ میں مہاراج کے حرم میں چلی گئی لیکن مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں اس سے الگ ہوگئی۔

جناب یہ بھی جسم فروشی کی ایک قسم ہے۔ اتنے ہیرے جواہرات مہاراج ایک عام سی عورت کو کیوں نہیں دیتے۔ تم میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ کیا سب عورتوں کی جسمانی ساخت ایک سی نہیں ہوتی۔

ہوتی ہے۔ کیا سب مرد جسمانی طور پر ایک سے نہیں ہوتے۔

بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔

پھر تم میں اور سعید میں کیا فرق ہے؟

کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی مرد ہے۔ میں بھی مرد ہوں۔

پھر میں اس سے کیوں شدید نفرت کرتی ہوں اور تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔

اس کیوں کا جواب آپ اپنے دل کی گہرائیوں میں تلاش کریں۔

حضور میرا تو جو دل چاہتا۔ وہی کرتی ہوں اور دل ہی کی راہنمائی قبول کرتی ہوں۔

☆☆☆

مجھے سردی لگ رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ میرے ساتھ بستر میں لیٹ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ذہنی طور پر بڑا اپ سیٹ ہوگیا۔

کیوں جناب آپ مجھ سے ڈرتے کیوں ہیں۔ آپ کو کھا تو نہیں جاؤں گی۔

کھا تو نہیں جائیں گی۔ لیکن حنا میری روح مجروح ہو جائے گی۔ میں آپ کے سامنے حلف اُٹھا کر کہتا ہوں کہ میں آج تک کسی غیر عورت کے ساتھ نہیں سویا۔ اور نہ سو سکتا ہوں۔

کسی بات پر آپ میرے ساتھ کمپرومائز (COMPROMISE) کر سکتے ہیں۔

کر سکتا ہوں۔

کس بات پر۔ کھُل کر بات کرو۔

آپ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اخلاق کی حدود کے اندر رہ کر آپ سے تعلقات استوار کر سکتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے ہم اس طرح دو اچھے دوستوں کی طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں۔

احمد صاحب ایسے تعلقات ناپائیدار ہوتے ہیں۔ میں نے اور سعید نے ساتھ رہ کر یہ تجربہ بھی کر لیا ہے۔

تو کیا آپ میرے ساتھ شادی کر کے گاؤں میں وہاں کی عورتوں کی طرح بود و باش اختیار کر سکتی ہیں۔

کیوں نہیں۔

کیا آپ کار۔ کوٹھی۔ ملازمین اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے بغیر وہاں رہ سکیں گی۔

کیا ان چیزوں کے ہوتے ہوئے میں آپ کے ساتھ وہاں نہیں رہ سکتی۔

ناممکن۔ ہماری عورتیں مرغ کی پہلی آذان کے ساتھ اُٹھتی ہیں۔ چکی پیستی ہیں۔ نالہ گنبھیر ہم سے دو میل دور ہے۔ وہاں سے پانی لاتی ہیں۔ گھر کی صفائی کرتی ہیں۔ دودھ بلوتی ہیں۔ کھانا پکاتی ہیں۔ پھر اپنے مردوں کو کھیتوں میں کھانا دینے جاتی ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر بیلوں کے لیے چارہ کاٹتی ہیں۔ شام کو گھر آتی ہیں۔ بیلوں کو چارہ ڈالتی ہیں بچوں کو نہلاتی دھلاتی ہیں۔ سب گھر والوں کے کپڑے نالے پر دھونے کے لیے جاتی ہیں۔ پھر واپس آ کر رات کا کھانا پکاتی ہیں۔ سب کو کھلاتی ہیں۔ پھر برتن دھوتی ہیں۔

اور پھر سب گھر والوں کے لیے چار پائیاں اور بستر باہر نکالتی ہیں۔ دودھ دوہتی ہیں۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ کہیں جاکر فارغ ہوتی ہیں۔ اس محنت و مشقت سے تھک ہار کر ان کا بدن چور چور ہو جاتا ہے۔ وہ کافی دیر کے بعد سوتی ہیں اور پھر دوسرے دن اسی روٹین میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ ان کی یہ جان لیوا روٹین زندگی بھر یونہی چلتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ قبروں میں چلی جاتی ہیں۔

اب تم ہی بتاؤ جو عورت یہ کام نہ کرے بلکہ صبح دس بجے سو کر اُٹھے۔ بیڈ ٹی پہ تو اس کی جان میں جان آئے۔ ملازم اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ ایسی عورت اُن عورتوں کے ساتھ کیسے مکس اپ (MIX-UP) ہو سکتی ہے۔ ہماری عورتیں عام شہری عورتوں کو اُن کے لباس، وضع قطع اور طور اطوار کی وجہ سے کبھی پسند نہیں کرتیں۔ وہ ایسی ہر عورت کو محض ایک نمائشی عورت سمجھتی ہیں۔ جو گھروں سے باہر اپنے جسموں، کپڑوں اور زیب و زینت کی نمائش کرتی ہیں۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے میں اگر کسی ایسی عورت کو ساتھ گاؤں لے جاؤں تو وہ مجھے بھی عزت کی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ ایک دن کی بات نہیں۔ گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا۔ بوڑھا۔ جوان۔ عورتیں۔ بچیاں سب یہی کہیں گے کہ میں بھی کسی بیسوا کو چکلے سے اُٹھا کر لے آیا ہوں۔ نہیں۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔

کیا چکلے والی عورتوں کو یہ سب سہولتیں میسر ہیں جو مجھے ہیں۔

اُن کا بھی اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔ میرے دوست بتاتے ہیں کہ لاہور ہیرا منڈی میں دو طوائفیں ایسی ہیں جو کسی زمانے میں ہندو مہاراجوں کی رانیاں رہی ہیں اور ان ہندو راجاؤں کو وہ محرم کے دنوں میں ننگے پاؤں تعزیے کے جلوسوں کے ساتھ میلوں پیدل چلاتی تھیں۔ اب آپ کیا سمجھتی ہیں ان کے اور وہاں ایک عام کوٹھے پر بیٹھنے والی عورت کا سٹینڈرڈ برابر ہوگا۔

احمد صاحب آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں بھی ایک ہندو مہاراجے کی مہارانی رہی ہوں۔ کیا میں بھی اب کوٹھے پر جا کر بیٹھوں گی۔

حنا میں آپ کے متعلق تو بات نہیں کر رہا۔ آپ کیوں الرجک (ALLERGIC) ہو گئی ہیں۔

چھوڑیئے اس قصّے کو۔ میں اب سمجھ گئی ہوں کہ آپ مجھے اپنانے میں محض اس وجہ سے پس و پیش کر رہے ہیں اور وہ اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ وہ کافی دیر تک بیقراری سے پہلو بدلتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے بات نہ کی۔ میں جلد ہی سو گیا۔

دوسرے دن صبح میں نے حنا سے کہا۔

آپ نے مجھ سے یہی بات کرنی تھی یا ابھی کوئی اور بات کرنا باقی ہے۔

نہیں بہت شکریہ آپ کا۔ بس یہی بات تھی۔ میں آپ کو ستارۂ رہبری سمجھتی تھی۔ وہ خود گہنا گیا ہے۔ میری کیا راہنمائی کرے گا۔ مجھے خود ہی اپنے لیے راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔

حنا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اب میرا چونکہ یہاں کوئی کام نہیں ہے اس لیے میں آج شام ہی کو واپس جہلم جانا چاہتا ہوں۔

آپ کی تو پندرہ دن کی چھٹی تھی۔ یہ چھٹی یہاں گزارو، سیر و تفریح کرو۔

نہیں شکریہ۔ اس چھٹی کا اب کوئی تعمیری مصرف نہیں ہے۔ یونٹ میں جاکر یہ چھٹی منسوخ کرادوں گا۔

اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ بیوی بچوں کو دیکھ آؤ اور اگر کہتے ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ چلی آتی ہوں۔ آپ کی بیگم اور بچیوں سے بھی مل لوں گی۔ مجھے بھی گاؤں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ مل جائے گا۔

نہیں حنا۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں میں ایک ماہ گاؤں میں گزار کر آیا ہوں۔ اب میرا وہاں کوئی خاص کام بھی نہیں ہے۔

اچھا تمہاری مرضی۔

***

ہم دونوں ناشتہ کرنے ڈائیننگ ہال کی طرف چل پڑے۔ کچھ لوگ ناشتہ سے فارغ

ہو کر واپس آ رہے تھے۔ کچھ ابھی جا رہے تھے۔ خاصی گہما گہمی تھی۔ ایک خالی میز پر ہم بھی بیٹھ گئے۔ بیرا ناشتہ لے آیا۔ ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف آ گئے۔ وہ کہنے لگی۔

احمد صاحب اب میں جلد ہی واپس بمبئی چلی جاؤں گی۔ یہاں کی سوسائٹی مجھے پسند نہیں۔ میں نے پاکستان میں تقریباً چار سال گذارے ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ پاکستان ہی میں رہوں۔ لیکن یہاں جو مرد بھی ملتا ہے وہ جنس زدہ اور لالچی ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ مجھ سے میری آخری کوڑی بھی چھین لے۔

خدا کے لیے مہارانی صاحبہ آپ مجھے اس زمرے میں شامل نہ کیجیے۔

ہاں! آئی۔ ایم۔ ساری — اور جو باقی ہیں وہ بیچارے ہیں۔ جو عورتوں کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔

بس۔ حنا اپنی اپنی تربیت کی بات ہے۔

ہم اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ بستر پر لیٹ کر اخبار دیکھنے لگ گئی اور میں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ وہ کسی کسی وقت چوری آنکھوں سے مجھے دیکھ لیتی اور ہلکا سا مسکرا کر اخبار پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔

میں نے اپنا لباس تبدیل کیا اور پھر اٹیچی کیس اٹھا کر حنا کے پاس آیا۔ اچھا حنا صاحبہ خدا حافظ۔ مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو کوفت اٹھانا پڑی۔

اس نے اخبار سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

احمد۔ مجھے اتنا پتہ نہ تھا کہ تم اتنے زود رنج ہو۔ بچوں کی طرح ذرہ ذرہ سی بات پر روٹھ جاتے ہو۔

نہیں حنا صاحبہ میں آپ سے روٹھا تو نہیں۔

روٹھے تو نہیں اور کیا مجھے پُر خطر راہوں پہ اکیلا چھوڑ کر تم خود زندگی کی گہما گہمی کی طرف واپس جا رہے ہو۔ دو تین دن اور رہو۔ پھر چلے جانا۔

اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے رویوں کی نفی کرتے ہیں

اور ذہنی طور پر آپ سیٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک انجانی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔

میں نے اب اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب پاکستان میں نہ رہوں گی۔

حضور یہ آپ کی ذاتی پسند یا ناپسند کی بات ہے۔ مجھ پر کسی قسم کا دوش نہ دیں۔

نہیں احمد صاحب۔ آپ کو کوئی دوش نہیں دیتی۔ اپنی قسمت ہی کو رو رہی ہوں۔

*_*

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ میرا دل پسیج گیا اور میں واپس آ گیا۔ وہ بڑی دیر تک مجھے گلے لگا کر روتی رہی۔ میں نے اس کو حوصلہ دیا۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے ناکردہ گناہ کی پاداش میں کرب کی سولی پر لٹک رہا تھا۔

تم آج رہ جاؤ کل میں بھی تمہارے ساتھ جہلم واپس چلی چلوں گی۔ لیکن ایک شرط پر، اس نے مسحور کن نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

شرط کیا ہے، کچھ پتہ تو چلے۔

حضور بہت ہی معمولی شرط ہے اور وہ یہ کہ آپ بقایا چھٹی میرے ساتھ میری کوٹھی پر گذاریں گے۔ پھر اس کے بعد بے شک آپ واپس اپنی یونٹ میں چلے جائیں۔

بات تو ایک ہی ہے جیسے چھٹی یہاں گذار لی ویسے ہی وہاں۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا اور پھر مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں حقیقت کی دلدل میں گر کر اپنی متاعِ حیات نہ گنوا بیٹھوں۔

کیا یہ اتنی بڑی بات ہے۔

جی ہاں۔ بہت بڑی اور نہایت اہم۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر شوریدہ جذبات کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن ایک وعدہ کریں۔ آپ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آ جایا کریں گے۔

حنا اس بے لذت گناہ سے جان چھڑائیں۔

کیسے۔ تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔

کوئی مناسب سا آدمی دیکھ کر اس کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاؤ۔

احمد۔ یہ زندگی تھوڑی ہے مناسب آدمی کی تلاش کے لیے۔ آپ بھی ایک حادثے کے نتیجے کے طور پر مجھے مل گئے تھے۔ میں خوش تھی کہ چلیے اب منجدھار سے نکل کر کنارے پر جا پہنچنے کی اُمید لگ گئی ہے۔ لیکن یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔

٭ — ٭

دوسرے دن ہم جہلم واپس آ گئے۔ حنا نے مجھ سے کہا کہ رات میرے پاس رہو۔ کل چلے جانا۔ لیکن میں نہ مانا اور وہ اپنی کوٹھی پر جانے سے پہلے مجھے کیمپ کے آفیسرز میس پر اُتار کر چلی گئی۔ اس وقت میس کے پاس بہت سے افسر اور سردار صاحبان کھڑے تھے۔ اُن میں سے اکثر نے مجھے بڑے ہی معنی خیز انداز میں دیکھا اور مسکرا دیئے۔

وہاں سے میرا ٹینٹ قریب تھا۔ اللہ یار ٹینٹ کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو دوڑ کر آ گیا۔ میرا اٹیچی اٹھا لیا اور ہم ٹینٹ میں آ گئے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

سر آپ تو پندرہ دن کی چھٹی لے کر گئے تھے۔ دو ہی دن میں واپس آ گئے ہیں۔

ہاں اللہ یار۔ وہ دوست جو بیمار تھا ہمارے جانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ پھر میرے رہنے کا کوئی مقصد نہ تھا

شکر ہے صاحب آپ بچ گئے۔ حالات تو ایسے تھے کہ آپ بھی اسی دوست کے ہمرکاب جاتے۔ اللہ نے آپ کو بچا لیا۔

اللہ یار خان میرے گاؤں کا تھا۔ مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ بڑا جہاندیدہ آدمی تھا اس نے اپنے اندازوں سے سب حالات کو صحیح طور پر بھانپ لیا تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کرنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ کپڑے بدل کر سونے لگا تو اللہ یار کہنے لگا۔

سر آپ کی عدم موجودگی میں صدم صاحب دو تین دفعہ آئے تھے۔ چونکہ آپ ان سے مل کر نہیں گئے۔ اس لیے وہ بہت ناراض ہیں۔

اچھا اللہ یار خان میں آج ان سے مل لوں گا۔ ان سے معافی مانگ لوں گا۔

ہاں سر اُن سے ضرور ملاقات کریں۔ ٹھیک ہے اور پھر میں سو گیا۔

٭ ٭ ٭

ایک دو دن تو حنا نہ آئی لیکن اس کے بعد اس نے پھر آنا شروع کر دیا۔ میں اُس کے قابو نہ آیا۔ جب وہ بالکل مایوس ہو گئی تو پھر اُس نے آنا چھوڑ دیا
ایک دن اس کا ایک خط مجھے ملا۔

"میں نے بمبئی واپس جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ کل میں کراچی کے لیے روانہ ہو رہی ہوں۔ اگر شام کو تم مجھ سے ملنے میری کوٹھی پر آجاؤ تو آخری بار ملاقات کر لیں۔"

میں شام کو اس کی کوٹھی پر نہ گیا۔ وہ ہمارے کیمپ آگئی۔ بریر پر متعین سنتری نے مجھے آکر بتایا کہ ایک بیگم صاحب کار میں گیٹ پر آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔ میں نے اُسے کہا۔ تم جاؤ۔ وہ واپس چلا گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پھر آیا اور کہنے لگا۔
سر وہ کہتی ہے۔ "میں کل صبح سویرے کراچی چلی جاؤں گی۔ دو منٹ کے لیے مجھ سے ملاقات کر جائیں۔"

میں اسی طرح سلیپنگ سوٹ اور گاؤن (GOWN) پہنے ہوئے بریر تک گیا۔ حنا مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ میرے جاننے والے مجھے دیکھتے اور مسکرا کر آگے کو بڑھ جاتے۔ وہ کہنے لگی۔

مجھے پاکستان چھوڑنے کا کوئی غم نہیں۔ لیکن تمہیں مس (MISS) کرنے کا بے حد غم ہے۔

حنا یہ فوجی کیمپ ہے۔ یہاں گیٹ پر آپ سے اس حالت میں ملنا جیسا کہ آپ زار و قطار رو رہی ہیں۔ میرے لیے رسوائی کا باعث بن جائے گا۔ اب آپ جائیے۔
اس نے فرنٹ سیٹ پر پڑا ہوا بادامی رنگ کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ اُٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔
"یہ میرا آخری ایک حقیر سا تحفہ ہے۔"

کیا ہے اس میں!

اس میں آپ کے لیے ایک گرم سوٹ۔ آپ کی بیگم اور بچیوں کے لیے کپڑے ہیں۔

اور ساتھ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا۔

اس لفافے میں کیا ہے! میں نے استفسار بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

احمد صاحب اس میں آپ کے نام کا دس ہزار روپے کا ایک چیک ہے۔ آپ یہ رقم لے لیں۔ آپ کا بنک بیلنس نہیں ہے۔ کبھی زندگی میں کام آئیں گے۔

نہیں حنا میں یہ تحائف قبول نہیں کر سکتا۔ وہ پیکٹ اور لفافہ میں نے کار کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیے اور خود کیمپ کی طرف واپس ہو گیا۔

خدا کے لیے آخری بار میری ایک بات مانیے۔

فرمایئے کیا حکم ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور رکتے ہوئے یہ بات کہی۔

یہ پیکٹ آپ رکھ لیں۔ چیک میں واپس لے لیتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کر لی۔ اور پیکٹ اٹھا کر میری طرف پھینک دیا اور خود جلدی سے واپس چلی گئی۔

***

حنا میری زندگی میں آئی تو میں ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت اپنے آپ میں محسوس کرتا تھا۔ پرسکون زندگی میں ایک عجیب سا تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ میری عجیب سی ذہنی کیفیت تھی۔ میں اس کی کمپنی میں رہنا بھی چاہتا تھا اور پہلوتہی بھی کرتا تھا۔ عجیب گومگو کا عالم تھا۔

وہ دوسرے دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کراچی چلی گئی۔ میری دنیا ویران ہو گئی۔ سورج طلوع ہوتا تھا۔ غروب ہوتا تھا۔ دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا تھا۔ لیکن میرے دل کی دنیا ویران تھی۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اسے آسانی سے مل جائے اس کی وہ قدر نہیں کرتا۔ اور جس کے حصول کے لیے وہ تڑپتا ہے۔ اس کے لیے کوہکنی کرتا ہے۔ بپھرے ہوئے دریاؤں سے لڑتا ہے۔ اور اس کے لیے جان بھی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

میں نے اسی وقت محسوس کیا کہ خوبصورت عورت خوشی کا ایک ایسا لمحہ ہے جو جنت

کی وادیوں سے اس سرزمین تک آتا ہے۔ انسان اس لمحے کو پانے کے لیے تمام عمر بیقرار رہتا ہے۔

میں واپس آکر کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ اللہ یار نے وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ "طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"سر کھانا کھائیے۔ ایسے معاملات میں طبیعت دو چار دن میں ٹھیک ہو ہی جاتی ہے۔"

میں نے سُنی ان سُنی کر دی اور بستر میں لیٹ گیا۔

٭ ـــ ٭

میں سو کر اُٹھا تو بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ٹینٹ سے باہر آگیا۔ سورج دور مغرب میں کسی مجبور حسینہ کی طرح منہ چھپائے دریائے جہلم میں غروب ہو رہا تھا۔ ہر طرف شفق پھیلی ہوئی تھی۔ شفق کی سُرخی مجھے یوں لگی۔ جیسے کوئی دوشیزہ سُتی کی آگ میں جل رہی ہو۔ میں نے حسین سپنوں سے جو دنیا بسائی تھی وہ اُجڑ چکی تھی۔ حنا کے حسین اور مرمریں جسم کی آنچ سے جو مسرت و شادمانی کی قندیلیں روشن ہوئی تھیں۔ وہ سب وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک ایک کر کے بجھا دی تھیں۔

اب میرے چاروں اور گھور اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری روح کی جوت بجھتی جا رہی ہے۔ جیسے میری تنہائیوں کے سب سہارے ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اور میں نے جو شمعِ اُمید روشن کی تھی۔ غم و اندوہ کی اتھاہ تاریکیوں میں اس کی لَو جھلملا رہی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب اس شب غم کی کبھی سحر نہ ہوگی۔

٭ ـــ ٭

میری چھٹی کے ابھی دس دن باقی تھے۔ میں نے کراچی جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن سوچتا۔ حنا کا پتہ بھی تو نہیں نہ جانے وہ کہاں ٹھہری ہوگی۔ ایک ایک ہوٹل میں تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن عشق لاجک (LOGIC) پر یقین نہیں رکھتا۔

مَیں دوسرے دن صبح کسی کو بتائے بغیر اٹیچی کیس اُٹھا کر ریلوے سٹیشن چلا گیا اور وہاں سے کراچی کا ٹکٹ لے کر ایک نئے سفر پر روانہ ہوگیا۔ راستے میں مَیں نے پروگرام بنایا تھا کہ پہلے تاج محل جاؤں گا۔ وہاں سے حنا کی تلاش شروع کروں گا۔

مَیں دوسرے دن صبح کراچی پہنچ گیا۔ مَیں کراچی میں نووارد تھا۔ میرے پاس زیادہ پیسے بھی نہ تھے۔ سوچا اگر یہ تھوڑی سی رقم حنا کو ملنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی تو پھر دِقت پیش آئے گی۔ کراچی کینٹ سٹیشن پر اُتر کر ایک رکشہ لیا اور تاج محل جا پہنچا استقبالیہ میں گیا۔ وہاں سے انکوائری کی تو انھوں نے بتایا کہ کمرہ نمبر ۴۸۹ میں زاہدہ حنا صاحبہ رہائش پذیر ہیں۔ مَیں نے ان سے گذارش کی کہ وہ ازراہِ کرم اُن کے کمرے میں فون کر کے معلوم کریں کہ کیا وہ اپنے کمرے میں تشریف رکھتی ہیں۔ ان کے انچارج نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور پھر اس نے ڈائل گھمانا شروع کر دیا۔

ہیلو

سر آپ کمرہ نمبر ۴۸۹ سے بول رہی ہیں۔ جی ہاں۔

زاہدہ حنا صاحبہ سے بات کرنا ہے۔ جناب مَیں زاہدہ حنا ہی ہوں۔

سر آپ سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں۔ کون ہیں کیا نام ہے ان کا۔

جناب آپ کا کیا نام ہے اور آپ کہاں سے آئے ہیں۔

میرا نام احمد ہے اور مَیں جہلم سے آیا ہوں۔ جناب احمد صاحب جہلم سے آئے ہیں۔

وہ انچارج مجھ پر بگڑنے لگا۔

"اُس عورت نے تمہارا نام سُنا ہے تو ٹیلی فون پٹخ دیا ہے اور کوئی بات ہی نہیں کی۔"

مَیں شرمندہ ہوگیا۔ مَیں نے اُس سے گذارش کی کہ جناب آپ مجھے اجازت دیں۔ مَیں خود ان کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ اس آدمی نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

یار تم شکل وصورت سے تو مجھے ٹھیک ٹھاک آدمی نظر آتے ہو۔ لیکن وہ عورت

تمہارا نام سُن کر پریشان کیوں ہو گئی ہے۔

جناب مَیں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھ سے کوئی ایسی غلطی تو نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے اس قدر ناراض لگ رہی ہو۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حنا دوڑتی ہوئی آئی اور روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اسے ان لوگوں کی موجودگی کا کوئی احساس نہ ہوا۔ اور اس نے مجھے چومنا شروع کر دیا۔ مَیں ان آدمیوں کی موجودگی میں شرما گیا۔ وہ سب لوگ تصویر حیرت بنے یہ ڈرامہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنسو تھمے اور کچھ دھیرج بندھی تو اس نے استقبالیہ کے انچارج سے کہا۔

ان کو میں اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے جا رہی ہوں۔ ان کا ایڈریس نوٹ کر لیں یہ اب کچھ دن میرے ساتھ ہی رہیں گے۔

بہت اچھا سر۔ اس مونچھوں والے انچارج نے تابعداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

حنا نے میرا اٹیچی اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ ہوٹل فلیٹیز سے زیادہ صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ کمرے میں سہولتیں بھی اس سے زیادہ تھیں۔ وہاں جا کر اس نے منیجر کو فون کیا کہ مجھے دس دن کے لیے ایک ڈبل روم کی ضرورت ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ وہاں جا کر مَیں نے لباس تبدیل کیا۔ اتنے تک حنا نے میرے لیے بریک فاسٹ منگوا رکھی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ وہ آج جتنی خوش تھی۔ اس سے پہلے مَیں نے اسے اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ ناشتہ کر کے مَیں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ہم پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ یہ دس دن ایک عجیب سی انجانی آگ میں ہم دونوں جلتے رہے۔ مَیں سمجھتا ہوں۔ یہی اَن دیکھی اور انجانی آگ ہم دونوں کی حاصلِ زندگی تھی۔ اس انجانی آگ کی تپش نے ہم دونوں کو ایک ان دیکھے بندھن میں باندھا ہوا تھا۔ اگر شوریدہ جذبات کی یہ آگ ٹھنڈی

پڑ جاتی تو پھر ہم دونوں کی چاہت کی موت واقع ہو جاتی اور ہم کبھی کے جُدا ہو چکے ہوتے۔

مَیں سوچتا ہوں ہماری خوشیاں، ہمارے رنج کتنے عارضی ہوتے ہیں۔ ہر رنج اور خوشی ناپائیدار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ دنیا کے ہنگاموں میں گم ہو جاتے ہیں۔ حنا جہلم سے چلی آئی تو مَیں اس سے بچھڑ کر یونہی ایک بے نام سی افسردگی محسوس کرنے لگا۔ مَیں سمجھتا تھا جیسے میری کوئی عزیز شے مجھ سے گم ہو گئی ہے۔ اس میں حنا کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ تمام تر غلطی میری ہی تھی۔ مَیں سمجھتا تھا کہ اب مَیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جرم کی پاداش میں مسرت اور خوشی کے پُر رونق ایوان سے نکال دیا گیا ہوں۔ اور اب حزن اور اذیت کے المناک بادل تھے جو میری زندگی کے اُفق کو لمحہ بہ لمحہ محیط کیے جا رہے تھے۔

مَیں نے بہت جلد اس ذہنی کش مکش سے چھٹکارا پا لیا۔ اور کراچی حنا کے پاس آگیا۔ مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کچھ اسی طرح کی ذہنی کش مکش سے حنا بھی دوچار رہی ہوگی۔ مَیں نے اس ذہنی خلفشار سے چھٹکارا پانے کے لیے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ دل کے کسی انجانے گوشے میں موہوم آرزوؤں کا ایک دیا جلنے لگ گیا۔ اس روشنی سے میری زندگی کی تاریک راہیں جگمگا اُٹھیں۔

روشنی زندگی ہے۔ اندھیرا موت ہے۔ ہم دونوں ایک دو دن تک تو ذہنی طور پر بڑے اپ سیٹ رہے۔ لیکن پھر ہم نے آہستہ آہستہ جنسی خلفشار کی شوریدگی پہ قابو پا لیا۔ مَیں سمجھتا ہوں حنا بڑے مضبوط قوا کی مالکہ تھی۔ اس نے باوجود جنس کے بے پایاں سمندر کی تلاطم خیزیوں کے، کبھی بھی تھک ہار کر اپنے آپ کو جذبات کے سپرد نہیں کیا۔ دو دن کے بعد یہ شوریدہ سری کچھ کم ہو گئی اور ہم ایک دوسرے پر زیادہ اعتماد کرنے لگ گئے۔ وہ گھنٹوں اپنا بازو میرے سَر کے نیچے رکھے میرے ساتھ بیٹھی میٹھی باتیں کرتی رہتی۔ ہم دونوں اکٹھا سوتے لیکن خدا کے فضل سے کبھی جنسی آلودگی کا مرحلہ نہ آیا۔ مَیں سمجھتا ہوں ہمارا یہی جذبہ ہے جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونے دیتا تھا۔ ایک رات وہ مجھ سے کہنے لگی۔

اگر تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے تو نہ کرو۔ ہم دو دوستوں کی طرح اسی طرح اکٹھے

تو رہ سکتے ہیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بڑے سٹرانگ نروز (STRONG NERVES) کے آدمی ہو اور اس منزل سے آگے ہرگز تجاوز نہیں کرو گے۔

لیکن حنا ہم دونوں کے لیے میڈیکلی (MEDICALLY) یہ بڑا نقصان دہ ثابت ہو گا۔ جنس کو دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک تند و تیز سیلاب ہے جو اپنے لیے خود راستہ بنا لیتا ہے اور اس کے راستے میں آنے والی ہر شے کو وہ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

تم بمبئی چلے آؤ میرے ساتھ۔ اس نے ایک التجا کے انداز میں کہا۔

حنا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایک گناہ بے لذت کی خاطر اپنا ملک چھوڑ دوں۔ پتہ نہیں ہم وہاں خوش رہ سکیں گے یا نہیں۔

میں تمہیں دنیا کی ہر نعمت مہیا کروں گی۔

حنا۔ اولاد سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہے جو اللہ نے مجھے یہاں عطا کر رکھی ہے۔

احمد تم نہیں جانتے میں تم سے جدا ہو کر ایک اذیت ناک جہنم میں جل رہی تھی۔ تم آئے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مجھے یقین تھا کہ تم یوں اتنی آسانی سے مجھے نہ بھول سکو گے۔ تمہاری اس بات سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ ہم دونوں جس اَن دیکھی آگ میں جل رہے ہیں۔ یہی ٹھنڈی اور میٹھی آگ ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ یہ آگ بجھ گئی تو ہماری محبت کی موت واقع ہو جائے گی۔ میں اس بات کو اب سمجھی ہوں۔ اس لیے تمہارے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں اور تمہیں ایسے حالات و واقعات سے دوچار نہیں ہونے دوں گی۔ جس سے اس آگ کی شوریدہ سری کے بجھ جانے کا خطرہ ہو۔ مجھے اس ٹھنڈی اور میٹھی آگ میں آہستہ آہستہ سلگتے رہنے میں بڑا مزہ آتا ہے تم سے ملنے سے پہلے میں اس جذبے کی باطنی قوت سے آگاہ نہ تھی۔ تم نے مجھے جینے کی ایک صحت مند راہ دکھائی ہے۔

حنا یہ صحت مند تب ہے کہ جب ہم میں جنسی جذبہ بیدار ہی نہ ہو۔

احمد میرا خیال ہے کہ اگر تم مستقل طور پر میرے ساتھ رہو تو ہم اسی پیمانہ جذبے

پر بھی قابو پالیں گے۔

لیکن حنا میں بمبئی تو تمہارے ساتھ نہیں آ سکتا۔

اگر تم کہو تو واپس چلی آتی ہوں۔ جس سٹیشن پر تم کہو میں وہاں اپنے لیے کوٹھی حزید لوں گی۔ تمہیں میری تمام آفرز (OFFERS) اب تک اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور میں آنسو پی جانے کی ایک ناکام سی کوشش کرنے لگا۔

کیوں خیریت تو ہے تمہاری آنکھیں کیوں بھر آئیں۔

حنا مجھے اپنی بے چارگی اور مجبوریوں پر رونا آ رہا ہے۔

احمد صاحب میں آپ کو مجبور نہیں کرتی۔ ہر آدمی کی اپنی اپنی لمی ٹیشن (LIMITA-TIONS) ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے حالات وواقعات کے مطابق ہی اپنے لیے مستقبل کی راہوں کا تعین کرتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے حنا کہ میں اپنے حالات سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتا اور نہ ہی تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔

احمد صاحب میں پہلی بار آپ سے جہلم میں ملی تھی اس وقت سے لے کر اب تک میں ایک موہوم اُمید کے سہارے ہی یہ دن کاٹتی آ رہی ہوں۔

حنا مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ موجودہ حالات وواقعات کے تحت نہ ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔

احمد جتنی کمپنی آپ کی مجھے یہاں میسر ہے اگر اتنی ڈی ووشن (DEVOTION) آپ مجھے دے سکتے ہیں تو میں جہلم واپس آنے کے لیے تیار ہوں۔

جہلم والی کوٹھی ابھی آپ نے چھوڑی نہیں ہے۔

کوٹھی چھوڑ دی ہے۔ ملازمین کو فارغ کر دیا ہے۔ وہ کم بخت سعید بھی اپنا سامان میس (MESS) میں اُٹھا کر لے گیا ہے۔

پھر نئے سرے سے آپ کو گھر بسانا پڑے گا۔

یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ کی رضا کی خاطر میں سب کچھ کر گزرنے کے لیے

تیار ہوں۔

حنا میری فوجی ملازمت آج ہے تو کل نہیں۔

تم یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔

کھاؤں گا کہاں سے۔ بیوی بچوں کی کفالت کیسے کروں گا۔

حضور آپ کی یہ خادمہ حاضر ہے۔

نہیں حنا جس معاشرے میں مَیں پلا بڑھا ہوں۔ اس میں عورت کی کمائی پر زندہ رہنا ایک لعنت سمجھا جاتا ہے۔ آئی۔ ایم۔ ساری

احمد صاحب۔ آپ اپنے متعلق اچھی طرح سوچ لیں۔ عجیب بات ہے۔ میرے ساتھ آپ آنا نہیں چاہتے۔ مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ ان حالات کے باوجود ہم ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ تو پھر یہ بیل کیوں کر منڈھے چڑھے گی۔

مَیں ایک عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ "نہ جائے رفتن۔ نہ پائے ماندن" مَیں نے چھٹی کے یہ باقی دن حنا کی کمپنی میں خوش و خرم رہ کر گذارے۔ میری چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ لیکن ہم دونوں ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ آئندہ کے لیے ہمیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

میری چھٹی ختم ہو گئی اور وہ مجھے ریلوے سٹیشن پر چھوڑنے آئی۔ دوران گفتگو کہنے لگی۔ مَیں چند روز یہاں رہ کر تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گی۔ میری روانگی سے پہلے وہ میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے بہت سے تحائف لائی تھی۔ وہ سب ایک الگ اٹیچی کیس میں بند کر کے اس نے مجھے دیے۔ اسے پتہ تھا کہ میرے پاس پیسوں کی بھی کمی ہے چنانچہ اس نے مجھے ایک ہزار روپے نقد اور دس ہزار روپے کا ایک چیک دیا۔ نقد روپے مَیں نے فوری ضرورت کے پیش نظر شکریے کے ساتھ قبول کر لیے اور چیک حنا کو واپس کر دیا۔ وہ لیتی نہ تھی لیکن میرے اصرار پر اس نے واپس لے لیا۔ جوں جوں گاڑی کے چلنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اس کی بے قراری اور میری بے چارگی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی نے وسل دی تو وہ مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگ گئی۔

گاڑی چل پڑی اور میں آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے بہت دور تک اسے ویو (WAVE) کرتا رہا۔ اور پھر گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ میری دنیا تاریک ہو گئی۔

میں دوسرے دن جہلم پہنچ گیا۔ کیمپ میں آیا۔ دوستوں نے خوب پذیرائی کی۔ البتہ اللہ یار خان میری کارکردگی سے ناخوش تھا۔ اس نے مجھ سے رسمی سی گفتگو کی اور عدم صاحب اور جعفر طاہر صاحب کا بتایا کہ وہ کئی مرتبہ آپ کا پتہ کرنے آئے تھے۔ اور ہر دفعہ کوستے ہوئے مایوس لوٹے۔

اب اگرچہ دریائے جہلم پہلے کی طرح رواں دواں تھا۔ عدم صاحب، جعفر طاہر، احسان الحق افتخار یوسف زئی، امداد ہمدانی، رؤف ظفر اور جوگی جہلمی اب بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں جہلم رہنے کو اب میرا جی نہ چاہتا تھا۔ میں سوچتا میرے وسائل اتنے تو نہیں ہیں کہ میں ہر ہفتے عشرے کے بعد کراچی کا چکر لگایا کروں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ حنا یہاں تھی تو جب جی چاہتا اس سے جا کر مل سکتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب حنا پاس تھی تو ناسمجھی کی وجہ سے میں اس کی کوئی قدر نہ کرتا تھا۔ اور اب اس کے لیے تڑپ رہا ہوں

٭ ٭ ٭

میں جہلم تقریباً ایک ہفتہ رہا ہوں گا کہ میری صحت خراب ہونا شروع ہو گئی۔ مجھے کسی کی کوئی بات اچھی نہ لگتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اکیلا ہی بیٹھا تصور ہی تصور میں حنا کو دیکھتا رہوں۔ اس سے باتیں کروں۔ یہ لوگ مجھے ڈسٹرب نہ کیا کریں۔ میں صبح دفتر جاتا۔ شام کو اٹھتا۔ اب میں بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ اب میں عدم صاحب اور افتخار یوسف زئی کے پاس بھی نہ جاتا تھا۔ میں ایک دن شام کو ٹہلتے ٹہلتے حنا کی پرانی کوٹھی کی طرف نکل گیا۔ وہ کوٹھی جس پہ بہاریں رشک کرتی تھیں سنسان پڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے سڑک پر ایک چھوٹے سے پل پر بیٹھ گیا۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے کوٹھی کو دیکھے جا رہا تھا۔ باہر گیٹ پہ تالا پڑا ہوا تھا۔ سڑک سے ہر گزرنے والا آدمی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا اور پھر آگے کو بڑھ جاتا ــــ میں اس کوٹھی کے مکینوں کو چلتا پھرتا

دیکھ رہا تھا۔

وہ عارف ہے۔

وہ مائی ہے۔

لو دیکھو وہ حنا پورچ میں برآمد ہوئی۔

اب میرا یہ معمول بن گیا تھا کہ میں فرصت کے وقت اس کوٹھی کے سامنے والے پل پر آ بیٹھتا۔ دیکھنے والے سمجھتے کوئی دیوانہ بیٹھا ہوا ہے۔ سچ ہے وادیٔ عشق میں قدم رکھنے والے لوگ دیوانے ہی ہوتے ہیں۔ ایک دن میں شام کو اس پل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ ایک فوجی جیپ میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں کرنل سعید بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے مخاطب کر کے اور کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ہوش کی دنیا میں واپس آؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

نصیحت کا شکریہ۔ میرا تو یہ معمول ہے میں روز یہاں آتا ہوں۔ اس کوٹھی کے مکینوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتا ہوں۔ کوٹھی میں حنا ہے عارف ہے بیرا ہے۔ مائی ہے۔ اگر کوئی نہیں ہے تو وہ آپ نہیں ہیں۔ میں نہیں ہوں۔

میرا خیال ہے اب تم نارمل نہیں رہے۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔

شکریہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شکر ہے کہ آپ اس خیالی جنت سے باہر آ کر نارمل زندگی گذارنے کے قابل ہو گئے ہیں —— وہ ہنستا ہوا مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

آج حنا کا خط آیا تھا۔ میں بہت اداس ہوں۔ تم تاج محل کو جنت نما ہوٹل کہتے تھے۔ اب اس ارضی جنت میں بھی میرا دل نہیں لگتا۔ اس سے تو جہلم کی ویران کوٹھی ہی اچھی تھی۔ جہاں رہتے ہوئے تم سے ملنے کی آس تو رہتی تھی۔ اگر تم کہو تو میں ایک ہفتے کے لیے جہلم آ جاؤں۔ تم نے لکھا ہے تم بیمار ہو۔ تمہاری تیمارداری کروں گی۔ لیکن ایک پرابلم ہے۔ جہلم میں ایسا کوئی ہوٹل نہیں جس میں میں دو چار روز کے لیے قیام کر سکوں۔

دن بدن میری صحت خراب ہوتی گئی۔ ایک دن میجر ملک نے مجھ کہا۔

احمد صاحب۔ آپ کی صحت تو ماشاء اللہ قابلِ رشک تھی، آپ کو یکایک یہ کیا تکلیف ہو گئی ہے۔

نہیں سر ٹھیک ہوں۔

ٹھیک کہاں ہو بھئی۔ آپ کو ہلکا ہلکا بخار رہتا ہے۔ ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے۔

سر کوئی خاص بات نہیں۔ معمولی بخار ہے۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

میجر ملک صاحب نے چیف سگنل آفیسر سے میرے متعلق بات کی۔ انہوں نے طے کیا کہ مجھے یونٹ ہیڈ کوارٹر پشاور واپس بھیج دیا جائے۔ یہاں لائف ذرا سخت ہے وہاں آرام کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجھے یونٹ والوں نے واپس پشاور بھیج دیا۔ وہاں یونٹ کے کل دس پندرہ آدمی اور رنگ (Rood) تھا۔ یونٹ لائنز ویران پڑی ہوئی تھیں۔ جہلم میں جو تھوڑی بہت کمپنی تھی وہ بھی یہاں میسر نہ تھی۔ جہلم میں عدم صاحب، جعفر طاہر۔ احسان الحق۔ افتخار یوسف زئی۔ رؤف ظفر۔ جوگی جہلمی۔ امداد ہمدانی اور عزیز دہلوی سے جب چاہتا ملاقات ہو سکتی تھی۔ پشاور کے ادبی حلقوں میں میں اگرچہ متعارف تھا لیکن ہماری یونٹ لائنز سے شہر کم از کم تین میل کے فاصلے پر تھا۔

☆ — ☆

میں پشاور آ کر اور زیادہ بیمار ہو گیا۔ چنانچہ سی۔ ایم۔ ایچ پشاور میں علاج کی غرض سے ایڈمٹ (ADMIT) ہو گیا۔ ڈاکٹر مجھے دیکھتے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ میں دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے تاج محل کے پتہ پر حنا کو خط لکھا اور اسے بتایا کہ میں واپس پشاور آ گیا ہوں اور پہلے زیادہ بیمار ہوں۔ اس لیے سی۔ ایم۔ ایچ پشاور میں ایڈمٹ (ADMIT) ہوں۔ میں نے خط میں اُسے اپنے وارڈ کا پتہ لکھا۔

ایک دن میں شام کو وارڈ سے باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہماری وارڈ نرس کے ساتھ حنا آ رہی ہے۔ جب میرے قریب آئی تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور سب لوگوں کے سامنے مجھے چومنے لگ گئی۔ نرس نے دو کرسیاں منگوائیں۔ ایک پر حنا

بیٹھی اور دوسری پر وہ نرس۔ تھوڑی دیر تک وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ نرس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اور فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نرس کے جانے کے بعد حنا نے پوچھا۔

حضور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے!

حنا اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہ رہ سکوں گا اور اسی طرح گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔

حوصلہ کرو۔ معمولی بخار ہے۔ نرس کہہ رہی تھی جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔

تم کب آئی ہو۔ کیا میرا خط آپ کو مل گیا تھا۔

حضور اسی خط پر تو بھاگی ہوں۔ کل تمہارا خط ملا۔ آج بائی ائر آگئی ہوں۔ اب انشاء اللہ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔

انشاء اللہ اب ضرور ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میری مسیحا تو آپ ہیں۔

اگر میں بمبئی چلی گئی ہوتی تو پھر بڑی پرابلم ہو جاتی۔

تم پرابلم کی بات کرتی ہو۔ میں تو مر گیا ہوتا۔

حنا تم کہاں ٹھہری ہو۔

جناب میں نے اپنا مختصر سا سامان ڈین ہوٹل میں رکھا ہے۔ وہاں ہی ایک کمرہ لیا ہے۔

کیسا ہے یہ ہوٹل۔ میں نے حنا سے پوچھا۔

بس ٹھیک ہے۔ تمہاری اس ارضی جنت "تاج محل" کی طرح کا تو نہیں ہے۔ بہرحال غنیمت ہے۔

حنا میں ٹھیک کہتا ہوں۔ تاج محل ایک ارضی جنت ہے۔ میں جتنا عرصہ وہاں رہا اللہ پاک نے انواع واقسام کے کھانوں کے ساتھ فی الحال ایک حور بھی میری خدمت پر مامور کر رکھی تھی۔

لیکن کہتے ہیں آپ جیسے ملاؤں کو تو وہاں ستر حوریں ملیں گی۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہنس

پڑی۔

لیکن حنا آدمی اُن میں کیسے برابری کا سلوک روا رکھ سکے گا۔ بس میرے لیے تو تاج محل والی ایک حور ہی کافی ہے۔

اس نے آہستہ سے میری گال تھپتھپائی اور کہنے لگی۔ "اگر وہ سچ مچ کی حور ہے تو اللہ میاں نے وہ حور بھی تم سے چھین لی ہے اور تمہیں دنیا کی صعوبتیں جھیلنے کے لیے جہلم اور پھر پشاور واپس بھیج دیا ہے۔

آپ کتنے دن یہاں قیام کریں گی۔

جب تک تم مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتے۔

اب تم آگئی ہو تو میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم نے نرس کو کیا کہا تھا کہ میں نے کس کو ملنا ہے۔

میں نے تمہارا نام بتایا تھا۔ وہ اپنے وارڈ کے سب مریضوں کو اچھی طرح جانتی ہے ہے۔ مجھے فوراً تمہارے پاس لے آئی۔

اس نے پوچھا نہیں کہ یہ تمہارے کیا لگتے ہیں۔

پوچھا تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ "احمد صاحب میرے دوست ہیں۔" میں کراچی سے ان کی بیماری کا سُن کر آئی ہوں۔

اب آپ ہوٹل میں واپس جائیں۔ آرام کریں۔ کل پھر آنا۔

رات کا کھانا کھا کر کہیں نہ آؤں۔

ملاقات کا وقت تین بجے دوپہر سے پانچ بجے شام تک ہوتا ہے۔ ان اوقات کے علاوہ اور کسی وقت نہیں آنے دیتے۔

آج تو ٹھیک ہے۔ کل میں کمانڈنگ آفیسر سے مل کر سپیشل پاس بنوالوں گی۔ دس بجے رات ہوٹل میں واپس چلی جایا کروں گی۔

دوسرے دن حنا نے سپیشل پاس بنوالیا۔ ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر واپس گیا تو وہ میرے پاس آگئی۔ اب اس کے ساتھ کمانڈنگ آفیسر۔ میٹرن۔ میڈیکل سپیشلسٹ اور ہمارے

وارڈ کا ڈاکٹر بھی تھا۔ سب نے میرا احوال دریافت کیا۔ میڈیکل سپیشلسٹ نے میرے کاغذات دیکھے، پیتھالوجی کے سب ٹیسٹ دیکھے اور پھر مجھے چیک کیا۔ حنا سے مخاطب ہو کر وہ کہنے لگا۔

میڈیم ۔ گھبرائیں نہیں۔ آپ کا مریض جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے گا اور پھر وہ سب چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے حنا سے پوچھا۔ اس پوری ٹیم کو تم نے کیسے رام کر لیا ہے۔

سعید کی وجہ سے یہ میٹرن اور کمانڈنگ آفیسر مجھے جانتے تھے۔

ڈین ہوٹل سی۔ ایم۔ ایچ کے بالکل قریب ہے۔ آپ کو آنے جانے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ صرف ایک بات کا خدشہ ہے کہ تم رات کو اگر دیر تک ہوٹل سے باہر رہی تو تمہارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔

کس طرح کا حادثہ۔ حنا نے مجھ سے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا۔

یہاں عورتوں کا کھلے بندوں گھومنے پھرنے کا رواج نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کوئی قبائلی تم کو اٹھا کر نہ لے جائے ۔۔۔ تم نے تاج محل کراچی والوں کو فون کر کے ڈین ہوٹل کا پتہ دیا ہے۔

جی ہاں ۔ دے دیا ہوا ہے۔

حنا پشاور میرے پاس دس دن رہی۔ اس تمام عرصے میں وہ میری بڑی اچھی طرح تیمارداری کرتی رہی۔ ناشتہ کر کے آتی۔ پھر دوپہر کو دو آدمیوں کا کھانا ڈین ہوٹل کا ایک ملازم میرے وارڈ میں حنا کے لیے لے آتا۔ چار بجے کی بڑی پرتکلف چائے حنا ہسپتال کی کینٹین سے منگواتی۔ وارڈ کے دوسرے مریضوں کے لیے وہ کچھ نہ کچھ لاتی۔ آٹھ بجے رات پھر ہوٹل کا ملازم ہم دونوں کے لیے کھانا لے کر آتا اور صبح کے برتن واپس لے جاتا۔ وہ تقریباً دس بجے رات ہوٹل واپس چلی جاتی۔

اب میں بالکل تندرست ہو گیا تھا لیکن ابھی ہسپتال سے ڈسچارج نہیں ہوا تھا۔

دوسرے دن وہ صبح کراچی آئی تو بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔ میں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو میں بھی پریشان ہو گیا۔

حنا خیریت تو ہے۔ تم آج مجھے کچھ زیادہ پریشان نظر آ رہی ہو۔

اس نے ایک خط میری طرف بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔

میں نے خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ لفافے پر بھارت کے ٹکٹ چسپاں تھے میں نے مہر کو غور سے دیکھا۔ بمبئی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خط نکال کر میں نے پڑھا۔ بمبئی سے یہ خط کسی سیف الدین صاحب نے حنا کو لکھا تھا۔

"پچھلے ماہ آپ سے تاج محل کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں مزید چند روز کراچی رہا پھر واپس بمبئی آ گیا۔ تمہاری والدہ کی گم شدگی کو اب چار سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ جس دن وہ بازار گئیں اور واپس نہ آئیں۔ اس دن بمبئی میں بڑا خونی فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ ہم سب نے آپ کی والدہ کو بہت تلاش کیا تھا۔ لیکن پتہ نہ چلا۔ چونکہ فسادات میں جو لوگ مارے جاتے تھے کارپوریشن والے فوراً ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگا دیتے۔ اس لیے ہمیں آپ کی والدہ کی لاش کا بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اب جب میں کراچی سے بمبئی واپس آیا ہوں تو اچانک آپ کی امی کا مجھے خط ملا جس میں تحریر ہے کہ میں نے حنا کے نام کئی خطوط لکھے ہیں لیکن نہ جانے وہ بے چاری کہاں اذیتیں سہنے کے لیے چلی گئی ہوگی۔ اگر آپ کو حنا کی کچھ خبر ہو تو میرا یہ خط برائے کرم اس تک پہنچا دیں۔"

سیف صاحب کے خط کے اندر حنا کی امی کا خط بھی تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ جس دن میں بازار گئی۔ اچانک وہاں نسلی فساد شروع ہو گیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں لاشیں خاک و خون میں تڑپنے لگیں۔ میں ڈر کر ایک ملحقہ گلی کی طرف پناہ لینے کے لیے بھاگ گئی۔ اس گلی میں بھی بلوائی آ گئے۔ ان کے سردار نے مجھے پکڑ لیا اور

ان طوائیوں کے ساتھ مجھے اپنی بستی میں لے گیا۔ اس سردار نے اس دن سے آج تک مجھے اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ لوگ مچھیرے ہیں۔ یہ پوری بستی ہی مچھیروں کی ہے جو ساحل سمندر پر واقع ہے۔ یہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں لیکن ان میں مسلمانوں والی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ اتنی بڑی بستی میں نہ کوئی مسجد ہے اور نہ کوئی آدمی نماز ہی پڑھتا ہے اور نہ ہی کوئی قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔

یہ جب بھی سمندر سے شکار کے بعد واپس آتے ہیں تو دن بھر تاڑی پیتے رہتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں اور دنگا فساد کرتے ہیں۔ ان بستیوں میں پولیس کبھی نہیں آتی۔ ان کے سردار ہی ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جس سردار نے مجھے بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے اس کا نام موجو ہے۔ یہ موجو بڑا ظالم آدمی ہے۔ مجھے بڑا ہی مارتا ہے۔ یہ بستیاں بمبئی سے ہٹ کر تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ہیں۔ جس بستی کا موجو سردار ہے اسے نجام (نظام) والی بستی کہتے ہیں۔

یہ خط اگر تمہیں مل جائے تو میری رہائی کی کوئی ترکیب نکالیں۔ لیکن سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان ظالموں کے چنگل میں پھنس جاؤ۔ میں اتنے طویل عرصے تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ جب تمہاری کوئی خبر نہ ملی تو میں نے ساتھ والے فلیٹ کے سیٹھ صاحب کو یہ خط لکھا ہے۔ اب آئندہ جو بھی قدم تمہیں اٹھانا ہے نہایت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔ رسک (RISK) بالکل نہیں لینا۔ میں نہیں چاہتی کہ میں اپنی رہائی کے لیے تمہیں بھی ایک ابدی مصیبت میں گرفتار کرا دوں۔

اچھا خدا حافظ
تمہاری امی

۵ — ۹

میں نے خط پڑھ کر یاس و حسرت کے عالم میں حنا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ محو حیرت، دنیا و مافیہا سے بے خبر دور خلاؤں میں گھورے جا رہی تھی۔

حنا خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تمہاری امی زندہ ہیں اور رنج اس بات کا ہے کہ وہ

ایک عرصے سے ایک جہنم زار میں مستقل طور پر جل رہی ہے۔ ظالم مُوجُو کے خونی پنجوں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی رہائی کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔

احمد آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حنا نے میری رائے معلوم کرنا چاہی۔

میرے خیال میں آپ آج ہی واپس کراچی چلی جائیں۔ دو تین روز میں راہداری کے ضروری کاغذات بنوا کر واپس بمبئی جا کر آپ سیف صاحب سے ملیں۔ وہاں جا کر ہی آپ کو صحیح صورتِ حال کا علم ہو گا۔

لیکن احمد میں تمہیں یوں بیمار چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

حنا میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ایک دو دن تک ہسپتال سے فارغ ہو جاؤں گا۔

نہیں احمد میرے جانے کے بعد تم پھر بیمار پڑ جاؤ گے۔

تو پھر کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

میرے خیال میں آپ ہسپتال سے فارغ ہو جائیں تو پھر دونوں کراچی جائیں گے۔ وہاں راہداری کے کاغذات بنوا کر دونوں بمبئی جائیں گے۔ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔

لیکن حنا میری تو یونٹ جہلم میں ہے۔ یہاں تو مجھے چھٹی بھی کوئی نہیں دے گا۔

چھٹی کی میری ذمہ داری ہے۔ میں تمہارے لیے ایک ماہ کی چھٹی کا انتظام کر لوں گی۔

حنا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈیفنس فورسز کے لوگ ایک دوسرے کے ملک میں ویسے بھی آ جا نہیں سکتے۔

اور وہ مایوس ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے۔ میں نے اُسے بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کراچی جا کر صحیح صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد بھارت جائے اور مہاراج سے مل کر ان کی مدد حاصل کرے۔

بات تو تمہاری معقول ہے لیکن نہ جانے مہاراج اس معاملے میں میری کوئی مدد کریں گے یا نہیں۔

ضرور کریں گے۔ وہ تمہیں دیکھیں گے تو باغ باغ ہو جائیں گے۔

احمد تم مجھے میرے ماضی کے جہنم زار میں پھر سے دھکیلنا چاہتے ہو۔ مہاراج کی قربت نے جو کچھ مجھ سے چھین لیا تھا وہ تمہاری بے لوث اور پُر خلوص رفاقت نے مجھے واپس لوٹایا ہے۔ تم چاہتے ہو اس گوہر نایاب سے میں پھر محروم کر دی جاؤں۔

نہیں اب تم ایک مہمان کی حیثیت سے واپس ریاست میں جاؤ گی۔ مشرقی معاشرے میں مہمان کا بڑا درجہ ہوتا ہے۔

نہیں احمد ان ہوس پرستوں کا اخلاقی معیار بہت پست ہوتا ہے۔ یہ موقع سے فائدہ اُٹھانے والے لوگ ہوتے ہیں۔

لیکن حنا اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ تم اس کی نیت میں اگر فتور دیکھو تو واپس بمبئی چلی آنا۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ہر روز خط لکھ کر حالات اور واقعات سے آگاہ کرتی رہوں گی۔

⁂

اور پھر وہ صبح کی سحر طراز کرن تھکے ہارے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی وارڈ سے باہر چلی گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنی اذیت اور کتنا کرب تھا۔ اس نے گیٹ پہ جا کر پلٹ کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ وہ دوپہر کی فلائٹ سے کراچی واپس چلی گئی۔ میں پہلے کی طرح کا بے نوا فقیر ایک ویران اور اُداس وارڈ میں بستر پر پڑا حالات و واقعات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اُس دن ہسپتال سے ڈسچارج لے لیا اور واپس اپنے میس (MESS) میں آگیا۔ ہمارا میس فنکشن (FUNCTION) نہیں کر رہا تھا۔ پیچھے کل دس پندرہ آدمی تھے۔ سب کے لیے ایک ہی کُک (COOK) تھا۔ اللہ یار خان میرے لیے بھی وہاں ہی سے کھانا لے آتا تھا۔

میں حسبِ سابق شام کو نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے کبھی پشاور صدر میں جناب پروفیسر طاہر فاروقی صاحب۔ زیبی جارچوی یا شاد امرتسری کے پاس چلا جاتا یا کبھی پشاور شہر میں جناب فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی۔ سید منظر گیلانی۔ مرزا محمود سرحدی خاطر غزنوی۔ جلیل حشمی اور حمید شاہد سے ملنے چلا جاتا۔ لیکن ان ملاقاتوں میں بھی میرا دل نہ لگتا۔ دل یہی چاہتا کہ میں اُڑ کر کراچی چلا جاؤں اور پھر حنا کے ساتھ بمبئی جاؤں اور اُس روایتی دیو کے قبضے سے حنا کی امی کی گلو خلاصی کراؤں۔ لیکن میری اپنی مجبوریاں تھیں۔ میں نہ کراچی گیا اور نہ ہی بمبئی جا کر اس دیو سے حنا کی امی کو چھڑانے کا کوئی جتن کیا۔

چار دن کے بعد حنا کا خط آیا۔

" میں اُس دن شام کو چھ بجے کراچی پہنچ گئی تھی۔ راہداری کے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں۔ میں کل صبح بمبئی جا رہی ہوں۔ جو بھی وہاں کے حالات ہوئے میں وہاں پہنچ کر آپ کو تحریر کروں گی۔ ابھی اپنے تمام بنک اکاؤنٹس یہاں پاکستان ہی میں رکھوں گی۔ تھوڑی سی جیولری ساتھ لے جا رہی ہوں تاکہ اپنا دیس جواب دیا، غیر ہے میں گذر بسر کر سکوں۔ آپ مجھے خط نہ لکھیں۔"

پھر پندرہ دن تک حنا کا کوئی خط نہ آیا۔ میں بہت فکر مند تھا۔ خدا خیر کرے۔ کہیں حنا بھی اُن ظالموں کے چنگل میں نہ پھنس گئی ہو۔ دو دن کے بعد مجھے اس کا خط ملا۔ میں نے خط کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی مہریں۔ اُن پر ثبت تاریخیں دیکھیں۔ خط تقریباً بارہ تیرہ دن پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں سنسر (CENSOR) اور سیکورٹی والے باہر سے آنے والے خطوط کو سنسر (CENSOR) کرتے ہیں۔ اس لیے یہ خط کافی تاخیر سے ملا۔ اس میں حنا نے لکھا تھا۔

" میں بمبئی اسی دن پہنچ گئی تھی۔ میرا فلیٹ مالک نے کسی اور کو کرائے پر دے دیا ہے۔ میں پھر سیف الدین صاحب کے گھر دو دن ٹھہری۔ اس

بیوی بڑی اچھی خاتون ہے۔ اُن کے دو بہت ہی پیارے بچے ہیں۔ میں
اُن بچوں کو دیکھ کر رشک کرنے لگی۔ احمد! اُن کا کتنا خوشحال کنبہ ہے۔ سیف
صاحب سے اور کوئی مزید انفارمیشن نہیں ملی۔ میں نے اپنے پروگرام کے
متعلق پھر اُن سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ میں کل مہاراج سے ملنے ریاست
جارہی ہوں۔ وہاں کی پروگریس آپ کو بعد میں تحریر کروں گی۔"

اچھا خدا حافظ

فقط۔ تمہاری حنا

جلدی ہی اُس کا دوسرا خط آیا۔

"میں ریاست پہنچی اور ڈرتے ڈرتے مہاراج کے محلات کی طرف گئی۔ سب لوگ میرے جاننے والے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب لوگوں نے میری بڑی پذیرائی کی۔ ایک پولیس آفیسر جو محلات کی گاردوں کا انچارج تھا۔ مجھے فوراً ہی ہز ہائی نیس کے سیکرٹری کے پاس لے گیا۔ سیکرٹری نے مجھے دیکھا تو فوراً ہی میکانکی انداز سے پذیرائی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "یور ہائی نیس خیریت سے ہیں۔"

شکریہ۔ اللہ کا فضل ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔

کیسے تشریف لائی ہیں۔ سیکرٹری نے پوچھا۔

مہاراج کو سلام کرنے آئی ہوں۔

اچھا! ۔ اور پھر اُس نے ٹیلی فون کے نمبر گھمانے شروع کر دیے۔ یکایک ان کی گفتگو شروع ہوگئی۔

یور ہائی نیس۔ میں سری واستو بول رہا ہوں۔ بمبئی سے رانی حنا صاحبہ آپ سے ملنے تشریف لائی ہیں۔

بہت اچھا یور ہائی نیس۔ میں ابھی بھیجتا ہوں اُن کو۔

اور پھر اس نے وردی میں ملبوس ایک چاک و چوبند سپاہی کو بلوایا۔ جس نے کمر میں تلوار لٹکا رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک نیزہ لیے ہوئے تھا۔

جی حضور۔ اس سپاہی نے سلام کرتے ہوئے کہا۔

رانی صاحبہ کو اندر مہاراج کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ سیکرٹری نے کہا۔

وہ سپاہی مجھے اندر لے گیا۔ میرے لیے وہ محلات، ان کے آداب کچھ نئے نہ تھے البتہ اندر جاکر میں نے جو نئی چیز دیکھی وہ یہ کہ مہاراج کے ڈرائنگ روم میں تین چار آدمی مہاراج کے قریب آہستہ آہستہ ان سے کوئی ضروری بات کر رہے تھے۔ تین چار حسین و جمیل عورتیں مورچھل لیے اپنے فرائض کی بجاآوری میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک دو مجھے جانتی تھیں۔ میں جب قریب گئی اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے زیر لب ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

احمد صاحب! وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کبھی یہی کنیزیں میری خدمت پر مامور تھیں۔ آج مجھ سے بات کرنے کی بھی روادار نہ تھیں۔

مہاراج ایک مرصع تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ اس عرصے میں وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ پہلی نظر میں میرے لیے ان کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ میں نے ان کے سامنے جاکر ہاتھ جوڑ کر آداب عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اپنے مصاحبین کو کہا "آپ لوگ اب آرام کریں۔" میں مہارانی صاحبہ سے باتیں کروں گا۔ میں اس پروٹوکول پہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ ان کے متعلق میرے جو خدشات تھے کہ کہیں وہ پھر سے مجھے اپنی ہوس رانی کا شکار نہ بنائیں ان سے ملنے کے بعد وہ خدشات دور ہو چکے تھے۔ مہاراج اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ کثرت سے جنسی بے اعتدالیوں کے باعث ایسے لوگوں کی زندگیاں کم ہو جاتی ہیں اور اگر زندہ بھی رہتے ہیں تو زندہ در گور"

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

جناآپ کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔

نہیں مہاراج۔ اور پھر میں نے ان کو ریاست چھوڑ کر جانے کے بعد سے لے کر اب تک کے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ تصویر حیرت بنے میری باتیں بڑے غور

سے سنتے رہے۔

مہارانی! یہ تو بہت بُرا ہوا ـــــ اچھا دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اور پھر انہوں نے اپنے سیکرٹری کو ٹیلی فون پر کہا۔ شری واستو جی ایک ارجنٹ کال گورنر بمبئی کے لیے بک کریں۔ جب وہ لائین پر آئیں تو مجھے بتائیں۔ ٭ بہت اچھا سرکار۔

اور پھر مہاراج نے ٹیلی فون رکھ دیا اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگ گئے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سیکرٹری نے بتایا کہ گورنر صاحب تو بمبئی میں نہیں ہیں۔ باہر دورے پر گئے ہوئے ہیں۔

ان سے پوچھا کہ کب واپس آئیں گے۔

سرکار دو دن کے بعد۔

اچھا ٹھیک ہے اور پھر مہاراج نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

مہارانی آپ محل میں ٹھہرنا پسند کریں گی یا سٹیٹ گیسٹ ہاؤس (STATE GUEST HOUSE) میں۔

مہاراج میں گیسٹ ہاؤس میں ٹھہر جاؤں گی۔ یہاں دوسری رانیوں اور مہارانی صاحبہ کو تکلیف ہوگی۔

قطعاً نہیں۔ اگر آپ ٹھہرنا چاہیں تو ٹھہر سکتی ہیں۔

شکریہ مہاراج! گیسٹ ہاؤس ہی ٹھیک ہے۔ وہاں میرے لگ کو بھی آسانی ہوگی۔

اچھا تمہاری مرضی۔ پھر مہاراج نے محلات کے ناظم کو بُلا کر سمجھایا۔ دیکھو شرما جی۔ مہارانی صاحبہ کی پہلے کی طرح خاطر مدارت کریں۔

مہاراج کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی اور سیس نوا کر واپس چلا گیا۔

میں تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھی اور پھر ان سے اجازت طلب کی اور پھر گیسٹ ہاؤس چلی گئی۔ میں دو دن تک وہاں رہی۔ سب رانیاں وہاں مجھ سے ملنے کے لیے آتی رہیں۔ البتہ ان دو دنوں میں مہاراج نے مجھے نہ بُلایا۔

کی تھی۔

شاید دوسری جانب سے اثبات میں جواب آیا چونکہ سیکرٹری خود بہ نفسِ نفیس مجھے لے کر گورنر صاحب کے پاس گیا۔ میں اندر گئی تو گورنر صاحب نے مجھے بڑی عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا۔ چائے پلائی اور پھر میری بات نہایت غور سے سنی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بات سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

بڑے ہی غمگین لہجے میں کہنے لگے۔

شریمتی جی اس بات سے مجھ بڑا دکھ ہوا ہے۔ اتنا بڑا واقعہ ہوا ہے اور آپ نے متعلقہ حکام کو اس سے پہلے موو (MOVE) نہیں کیا۔

سر میں خوف کے مارے بمبئی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اب آپ مجھے دو تین دن دیں۔ میں انسپکٹر جنرل پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) کے چیف سے بات کرتا ہوں۔ تاکہ وہ خفیہ ذرائع سے پہلے ان مچھیروں کی بستیوں کا سروے کریں اور آپ کی امی کا سراغ لگائیں۔

گورنر صاحب نے ان دونوں کو بلا کر ان کو ضروری ہدایات دیں اور مجھے تین دن بعد آنے کی ہدایت کی۔

میں تین دن کے بعد گئی تو گورنر صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کی امی زندہ ہے اور فی الواقعہ موجو جو بستی سنجام میں مچھیروں کا سردار ہے اس کے پاس ہے۔ آج رات پولیس بڑے پیمانے پر اپریشن کلین اپ (OPERATION CLEAN UP) کا آغاز کرے گی۔ آپ پولیس کے ہمراہ جائیں۔

شام کو اندھیرا ہوتے ہی پولیس کے تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے بمبئی سے دور ان جرائم پیشہ لوگوں کی بستیوں کا محاصرہ کر لیا۔ جوان مرد شام ہوتے ہی اپنی اپنی کشتیوں میں دور سمندر میں مچھلیاں پکڑنے چلے جاتے۔ پیچھے بوڑھے بچے اور صرف عورتیں ہی رہ جاتی ہیں۔ اس اپریشن کے دوران میں کسی نے پولیس کی مزاحمت نہ کی۔ گورنر صاحب کی خصوصی ہدایت پر مجھے ایک گاڑی میں جس میں وائرلیس سیٹ نصب تھا پولیس والے موقعہ پر

احمد صاحب یہ ہے میری روئداد آپ سے الگ ہو کر ریاست تک آنے اور مہاراج سے ملاقات تک کی۔ اب آگے جو پروگریس ہوگی آپ کو اگلے خط میں تحریر کروں گی۔ مجھے آپ کی صحت کے بارے میں تشویش ہے۔ ایک خط بمبئی میں سیف صاحب کی معرفت مجھے لکھ دینا۔ تاکہ تسلی ہو۔

اچھا خدا حافظ

فقط تمہاری حنا "

*-*

"میں نے اپنی پہلی فرصت میں حنا کو خط لکھا کہ میں مکمل طور پر تندرست ہو کر ہسپتال سے فارغ ہو گیا ہوں۔ اب اپنے میس (M.E.S) میں رہتا ہوں۔ کام کچھ نہیں کرتا۔ آرام کر رہا ہوں۔ دن بھر تمہارے متعلق مختلف قسم کے خدشات سے دوچار رہتا ہوں۔ اور تصور ہی تصور میں انہیں سلجھانے میں منہمک رہتا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے میری پوسٹنگ کسی دوسرے سٹیشن پر ہو جائے۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک تمہاری پریشانیاں دور فرمائے۔ آمین۔"

چار پانچ دن کے بعد حنا کا ایک مختصر سا خط ملا۔

"مہاراج نے گورنر بمبئی سے بات کی ہے۔ گورنر صاحب نے کہا ہے کہ شریمتی جی کو خط دے کر میرے پاس بھیج دیں۔ میں کل بمبئی واپس چلی جاؤں گی اور پھر ایک آدھ دن میں گورنر صاحب سے ملنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے بعد جو حالات ہوئے آپ کو لکھوں گی۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ میرے متعلق زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے کہ میری امی کو گورنر صاحب وہاں سے برآمد کروا لیں گے۔"

"اگلے خط میں حنا نے لکھا کہ میں گورنر صاحب سے ملی ہوں۔ مجھے ان سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان کے سیکرٹری کے پاس پہلے سے میرا نام نوٹ تھا۔ میں جونہی وہاں پہنچی تو سیکرٹری نے گورنر صاحب کو بتایا۔

"سر وہ لیڈی آگئی ہے جس کے متعلق ہز ہائی نیس مہاراج بہادر نے آپ سے بات

لے گئے۔ میری حفاظت کے لیے پولیس کی ایک گارد بھی ساتھ تھی۔ ہم لوگ بستی سے تھوڑا پیچھے ایک ریت کے ٹیلے کے عقب میں کھڑے رہے۔ کافی دیر تک ان مچھیروں کی بستیوں سے چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہیں۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد پولیس بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر کے لے آئی۔ ان گرفتار شدگان کے ساتھ پولیس نے ان بستیوں سے چالیس اغوا شدہ عورتیں بھی برآمد کیں۔ یہ بدنصیب عورتیں وہ تھیں جنہیں یہ لوگ فسادات میں مختلف جگہوں سے پکڑ کر لے آئے تھے اور اب ان بستیوں کے مچھیروں نے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے۔ جب وہ عورتیں ذرہ قریب آئیں تو میں نے اپنی ماں کو پہچان لیا۔ میں گاڑی سے اتر کر دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ بڑی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر روتی رہیں۔ میں نے اپنی ماں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا پولیس کچھ آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگا کر لے آئی۔

میں نے اپنی ماں سے کہا۔

اُمی مجھے خدا کے لیے وہ ننگ انسانیت موجود دکھادو۔

بیٹا اُسے دیکھ کر تم کیا کرو گی۔ یہ سب ہی موجود ہیں۔ صرف چہرے ان کے الگ الگ ہیں۔

٭ ـــ ٭

رات کو دو بجے ہم پولیس ہیڈکوارٹر میں واپس آئے۔ انچارج "اپریشن کلین اپ" نے انسپکٹر جنرل کو جملہ صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انچارج نے مجھ سے پوچھا۔

میڈم آپ کو کہاں چھوڑ کر آئیں۔

"تاج محل" کیا میری اُمی بھی میرے ساتھ جا سکیں گی۔

ابھی ہمیں تفتیش مکمل کرنی ہے۔ مجھے افسوس ہے یہ اس وقت آپ کے ساتھ نہ جا سکیں گی۔

میں ان کو کل صبح سویرے لے کر آؤں گی۔ اِن کو نہلا دُھلا کر یہ مچھیرنوں کے کپڑے اُتروا کر دوسرے کپڑے پہنوا کر لے آؤں گی۔ اور پھر وہ تھوڑے سے اصرار کے بعد

مان گیا۔

مَیں اور میری ماں تقریباً تین بجے صبح تاج محل پہنچ گئیں۔ تاج محل کا سیکورٹی گارڈ کا عملہ ایک مچھیرن کو اندر جانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ آخر کار ان کو صحیح صورتِ حال بتائی تو تب انہوں نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دی۔ مَیں اپنی ماں کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ میں نے آتے ہی اس کے کپڑے تبدیل کروائے۔ مچھیرنوں کے لباس کی جگہ میں نے اسے اپنے کپڑے دیے۔ اُسے نہلایا۔ خود شیمپو کیا اور پھر کلون کا سپرے کیا اور لباس تبدیل کروا کر اسے بستر پر سُلا دیا۔ وہ جلد ہی سو گئی۔ اور مَیں اپنی ماں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی اُسے دیکھتی رہی۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ نہ جانے یہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے۔ وہ گہری نیند سو گئی۔ وہ سوتے میں مسکرا دیتی۔ جیسے کوئی کم سن بچہ خواب میں مسکرا رہا ہو۔ میرا دل خوشی سے کھِل اُٹھتا۔ مَیں نے تھوڑی دیر صوفے پر لیٹ کر آرام کر لیا۔

روم سروِنٹ بیڈ۔ ٹی لے آیا تو میری آنکھ کھلی۔ مَیں نے اُمی کو جگایا۔ انہیں بیڈ۔ ٹی دی۔ وہ اُٹھیں تو انہوں نے مجھے بوسہ دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں اس جہنم سے چھٹکارا نصیب ہوا۔

ناشتہ کر کے ہم دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر چلی گئیں۔ پولیس نے اپنے ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور پھر ہمیں چھٹی دے دی۔ البتہ یہ ضرور بتایا کہ جب ضرورت ہو گی آپ کو بلا لیں گے۔ مَیں نے پولیس ہیڈ کوارٹر سے گورنر صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پہ بات کی اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی خصوصی توجہ اور مہربانی سے میری ماں مجھے ملی ہے۔ بلکہ اور بے شمار لوگوں کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ان کو مل گئی ہیں۔ گورنر صاحب نے فرمایا کہ اس کے بعد بھی اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو یا میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک میرے پاس تشریف لے آئیں۔ مَیں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں واپس تاج محل آ گئیں۔"

٭٭٭

مَیں نے حنا کا طویل اور مفصل خط پڑھا تو مجھے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔ اور خوشی بھی ہوئی کہ حنا جو اس دنیا میں بالکل اکیلی اور بے یار و مددگار تھی اب اس کی ماں کی بازیابی کے

بعد وہ کتنی خوش ہوگی۔ اب وہ اس بھری دنیا میں تنہا نہیں۔ اس کو چاہنے والی۔ اُس سے پیار کرنے والی اس کی ماں بھی ہے۔ اب اس کی تنہائی اور اُداسی میں کچھ تو کمی ہوگی۔

* — *

مَیں نے تاج محل بمبئی کے پتہ پر حنا کو خط لکھا۔

"گھبرا کر جلدی نہیں کرنا۔ بمبئی میں مقدمہ کے اختتام تک قیام کرنا۔ موجُود کیفرِ کردار کو پہنچ جائے تو تب بمبئی چھوڑنا۔ اگر کبھی کراچی بنک سے رقم نکلوانے کے لیے آؤ تو امی کو بھی ساتھ لانا اور مجھے بروقت اطلاع دینا تاکہ مَیں اُن سے ملنے کے لیے کراچی آسکوں۔

تمہارا

احمد

حنا کا خط آیا۔

"تمہارا خط ملا۔ میری اُمی پڑھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ مَیں نے اُن کو بتایا ہے کہ مَیں نے احمد کو آفر دی تھی کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ مَیں شادی شدہ آدمی ہوں میری دو بچیاں ہیں۔ اگر مَیں اس مرحلہ پر شادی کر لوں تو ان کے دل پہ کیا گزرے گی۔ میری ماں یہ سُن کر آب دیدہ ہوگئیں اور کہنے لگی۔ حنا ایسے آدمی دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ ورنہ ہر آدمی چڑھتے سورج کی پوجا کرتا ہے۔ مَیں نے اُمی کو تمہارے کردار کی بلندی کے بارے میں بتایا تو وہ بہت متاثر ہوئیں اور کہنے لگیں۔ حنا مَیں احمد سے ضرور ملوں گی۔"

تمہاری

حنا

یونہی شب و روز گذرتے رہے اور مَیں گو مگو کے عالم میں اس بھری دنیا میں ایک گوشۂ عزلت میں پڑا آنے والے حالات و واقعات سے قطعاً بے خبر بے کیف زندگی کے دن گذار رہا

تھا۔ جب کبھی حنا کا خط آتا تو لمحہ بھر کے لیے میری ویران زندگی میں بہار آ جاتی اور پھر وہی بے کیفی اور نامرادی۔ میں جب کبھی زیادہ اُداس ہوتا تو سی۔ ایم۔ ایچ کی طرف نکل جاتا اور وہ راہیں دیکھتا جن سے کبھی حنا گزر کر میرے پاس وارڈ میں آیا کرتی تھی اور ہم رات گئے تک باہر لان میں بیٹھ کر خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں اُداس و پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سپاہی پوسٹ مین کو لے کر میرے پاس آیا۔ فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور کہنے لگا۔

سر آپ کا منی آرڈر ہے۔ اس کے ساتھ ہی پوسٹ مین نے منی آرڈر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے منی آرڈر لے کر دیکھا۔ دو ہزار روپے کا منی آرڈر تھا۔ تاج محل کراچی سے حنا نے ارسال کیا تھا۔ کوپن پر لکھا تھا۔ مفصل خط پوسٹ کر رہی ہوں۔

اس زمانے میں دو ہزار ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ ہم فوجی لوگ اُسے ایک بریگیڈیئر کی ایک ماہ کی تنخواہ سمجھتے تھے۔ منی آرڈر میں نے وصول کر لیا۔ میں نے پانچ روپے بطور ٹپ (TIP) پوسٹ مین کو دیے۔ وہ بہت خوش ہوا اور سلام کر کے واپس چلا گیا۔ وہ فوجی سپاہی جو اُسے ساتھ لایا تھا۔ میں اسے ٹپ (TIP) تو نہ دے سکتا تھا چونکہ یہ فوجی قوانین اور آداب کے خلاف ہے۔ پھر بھی میں نے پُر تکلف چائے سے اس کی تواضع کی۔

حنا نے یہ رقم مجھے کراچی کی آمد و رفت کے اخراجات کے لیے ارسال کی تھی۔ میں نے کراچی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ چونکہ ہماری یونٹ پشاور میں تھی اس لیے چھٹی بھی سٹیشن ہیڈکوارٹر سے ملتی تھی۔ میں نے ایک درخواست لکھی کہ مجھے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہے اس لیے پندرہ دن کی ضروری چھٹی (CASUAL LEAVE) دی جائے۔ میں درخواست لے کر سٹیشن ہیڈکوارٹر گیا۔ ایس۔ ایس۔ او (S.S.O) کو جا کر درخواست دی۔ وہ صاحب میرے جاننے والے تھے۔ مجھ سے میری صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر میری پندرہ دن کی رخصت منظور کر دی۔ ہیڈ کلرک کو بلایا اور کہا کہ احمد صاحب کو کراچی کینٹ ریلوے سٹیشن کا ریلوے وارنٹ اور چھٹی کا سرٹیفکیٹ ابھی بنا دو۔

نہیں سر مجھے ریلوے وارنٹ نہیں چاہیے۔ مجھے جلدی ہے میں بذریعہ ہوائی جہاز کراچی جاؤں گا۔

ٹھیک ہے پھر چھٹی کا سرٹیفکیٹ ہی لے لیں۔

میں پندرہ دن کی چھٹی لے کر سٹیشن ہیڈکوارٹر سے بیس میں واپس پہنچا تو میرے نام کا ایک ایکسپریس لیٹر مجھے ملا۔ میں نے جلدی سے خط کھولا۔ بالکل وہی باتیں خط میں تحریر تھیں جن کا پہلے سے میں نے اندازہ لگایا تھا۔ میں نے اسی وقت لباس تبدیل کیا اور کراچی کے لیے چل پڑا۔ حسن اتفاق سے مجھے پہلی ہی فلیٹ میں سیٹ مل گئی اور میں شام کو کراچی پہنچ گیا۔ ہوائی اڈے سے ٹیکسی لی اور تاج محل ہوٹل جا پہنچا استقبالیہ میں گیا۔ انھوں نے حنا کے کمرے میں فون کیا اور مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ انچارج کہنے لگا۔

سر آپ تشریف رکھیں وہ خود آپ کو لینے کے لیے آ رہی ہیں۔

دو منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ حنا بہار کے ایک معطر جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ لوگوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اس نے مجھے گلے لگایا۔ میں شرم کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے میرا اٹیچی کیس اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ارضی جنت کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ لفٹ سے اتر کر چند گز کے فاصلے پر اس کا کمرہ تھا۔ اس نے بچوں کی سی گرمجوشی اور لاابالی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے زور سے دروازہ کھولا اور چلاتے ہوئے کہنے لگی۔

ممی۔ ہیر۔ از۔ احمد۔ دی۔ سویٹ لور آئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو سلام کیا۔ اگرچہ وہ کوئی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھی لیکن کافی حسین عورت تھی۔ میں اسے دیکھ کر سوچنے لگا۔ جوانی میں تو یہ حنا سے بھی زیادہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اسی لیے تو یہ نواب اور راجے مہاراجے ان پر مرتے ہیں۔ لیکن ان بے چاریوں کی کیا زندگی ہے۔ جب ان ہوس پرستوں کا دل بھر جاتا ہے تو وہ ان کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں اور پھر

یہ اس بھری دنیا میں سکون کے ایک لمحے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہیں اور وہ لمحہ ان کو کبھی میسر نہیں آتا۔

حنا کی امی ایک وقار اور تمکنت کے ساتھ صوفے سے اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت سے اٹھ کر کسی بے نوا فقیر کی جھولی میں کوئی سیخرات ڈالنے لگی ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لیا اور میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ مجھے اس رویئے میں ماما کا ایک واضح رنگ جھلکتا ہوا نظر آیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا اور میرے ساتھ باتیں کرنے میں منہمک ہو گئی۔

احمد صاحب میں بمبئی سے محض آپ کو ملنے کے لیے یہاں آئی ہوں میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ حنا کو بنک سے کچھ رقم نکلوانا تھی۔ یہ صبح آ کر شام کو واپس بھی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ پگلی لڑکی کہتی ہے۔ ممی میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میں پاکستان جاؤں اور احمد سے ملے بغیر واپس بمبئی چلی آؤں۔

حنا نے فون پر چائے کا آرڈر دیا۔ اور پھر میرے پاس آ کر صوفہ پر لیٹ گئی اور سر میرا گود میں رکھ دیا۔ اس کی ماں مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عورت میں مردوں کو مسحور کرنے کی حنا سے زیادہ طاقت ہے۔ نہ جانے وہ مجھے کیوں اپنا تختۂ مشق بنا رہی تھی۔ اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ان شیطانی قوتوں سے بچا کر اپنے حفظ و امان میں رکھا ہوا تھا۔ میں سوچتا ہوں جس اللہ نے فلیٹیز میں میری حفاظت کی تھی اور مجھے قعر مذلت میں گرنے سے بچایا تھا۔ وہی اللہ آئندہ کے لیے مجھے ان شیطانی ترغیبات سے بھی بچائے گا۔ چائے آگئی اور ہم تینوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے اور ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو بھی جاری رہی۔

احمد کتنی چھٹی لے کر آئے ہو۔ حنا نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

پندرہ روز کی۔

میرے کال پر بڑی جلدی آپ پہنچے ہیں۔

حنا میں بڑا اداس اور پریشان تھا۔ ہر وقت تم سے ملنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

لیکن ہمیں تو کل بمبئی واپس جانا ہے۔ امی کی پنشن کی بحالی کے لیے گورنر صاحب کو ملنا ہے۔

میں اُداس ہو گیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ حنا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ کہنے لگی۔

آپ اداس نہ ہوں جب تک آپ کہیں گے میں کراچی رہوں گی۔ مجھے تمہاری دلجوئی منظور ہے۔

حنا کی اُمی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ احمد صاحب آپ کے اور حنا کے یہ افیرز (AFFAIRS) کب تک یوں چلتے رہیں گے۔ آپ دونوں سمجھ سوچ کر آپس میں میرج کر لیں۔ حنا کے ساتھ میں بھی پاکستان آؤں گی۔ آرام سے گھر گرہستی کی زندگی گذاریئے حنا بمبئی میں۔ آپ پشاور میں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے الگ رہ کر خوش نہیں رہ سکتے۔ اس کا یہی موثر علاج ہے کہ آپ دونوں سلسلۂ ازدواج میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔

مجھ پر ایک بجلی سی گری۔ بات تو درست تھی لیکن تلخ تھی۔ میں نے جرأت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میڈم مجھے افسوس ہے میں ایسا نہ کر سکوں گا۔ حنا میرے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہم دونوں اسی حالت میں خوش ہیں۔ دو دوستوں کی طرح جب بھی ملتے ہیں بے انتہا پیار اور محبت سے ملتے ہیں اور حالات و واقعات سے مجبور ہو کر جب ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں تو پھر ایک نئی اُمید کے ساتھ آنے والے اچھے دنوں کے متعلق سوچنے لگ جاتے ہیں۔

یہ تو کوئی زندگی نہ ہوئی۔ اس عورت نے بڑے جچے تُلے انداز میں کہا۔

میڈم جب ہم دونوں کو یہ پسند ہے تو آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔

نہیں احمد میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ بے وقوف لڑکی اسی طرح اس ٹھنڈی اور میٹھی آگ میں جلتی رہی تو یہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کی رہے گی اور نہ گھاٹ کی۔ جب اس کی

جوانی ڈھل جائے گی تو پھر اس کو کون پوچھے گا۔ اس کے پاس مہاراج کی دی ہوئی جو کروڑوں روپے کی جیولری ہے اور جس طریقے سے یہ اُسے خرچ کر رہی ہے۔ وہ کب تک چلے گی ایک دن آئے گا تم ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد گاؤں اپنے بیوی بچوں کے پاس واپس چلے جاؤ گے۔ یہ اس وقت کیا کرے گی۔ تمہارے گھر یا کسی اور کے گھر میں ملازمہ بن کر رہے گی اور برتن مانجھے گی۔

ممی میں بمبئی سے کراچی آپ کو اس لیے تو نہیں لائی کہ آپ میری شادی کے لیے کوشاں ہوں۔ میں نے احمد کا ذکر آپ سے کیا۔ آپ نے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور میں آپ کو ساتھ لے آئی۔ یہ سب باتیں ہم دونوں کے درمیان بہت پہلے ہو چکی ہیں۔ میں نے احمد کو ہر طرح کی آفرز (OFFERS) دی ہیں۔ لیکن یہ اپنے نجی حالات سے مجبور ہیں اور شادی نہیں کر سکتے۔

تو پھر چھوڑو اس قضیے کو۔ تم دونوں کچھ عرصے کے بعد خود بخود ٹھیک ہو جاؤ گے اور پھر سے اپنی آنے والی زندگی کے متعلق سوچنے لگو گے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ تم دونوں کی جدائی کے گھاؤ وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود مندمل ہو جائیں گے۔

محترمہ! میں نے پشاور سے کراچی آنے کی غلطی کی ہے۔ مجھے افسوس ہے میرے رویے سے آپ کا دل دُکھا ہے۔ میری بیوی اور بچیوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ میں ایک لڑکی کا دل رکھنے کی خاطر تین معصوم روحوں کو کرب و اذیت کے جہنم میں نہیں جھونک سکتا۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق کل بمبئی واپس چلی جائیں۔ میں آج رات کی گاڑی سے پشاور واپس جاؤں گا۔

ڈونٹ۔ بی۔ سلی۔ (DONT BE SILLY) حنا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

نہیں حنا مجھے افسوس ہے۔ آپ کی ممی کے رویے سے میرے جذبات بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ کیا آپ لوگوں نے مجھے پشاور سے اسی لیے بلایا ہے۔ آپ کو میرے مزاج کا اچھی طرح سے علم ہے۔

دیکھو مسٹر تم میں کوئی سُرخاب کے پَر نہیں لگے ہوئے۔ واجبی سی شکل وصورت کے آدمی ہو۔ مجھے کوئی زیادہ پڑھے لکھے بھی نظر نہیں آتے۔ گاؤں کے کسی گنوار خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ اس پاگل لڑکی نے تم سے اگر شادی کر لی تو زندگی بھر کفِ افسوس ملتی رہے گی۔

محترمہ! آپ میری بے عزتی کر رہی ہیں کیا آپ نے مجھے اسی لیے بلایا تھا۔

اور میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا اٹیچی کیس اُٹھانے کے لیے بڑھا۔ حنا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر واپس صوفے پر بٹھا دیا۔

حنا امی سے کہنے لگی۔ ممی آپ اس لیے کراچی آئی ہیں۔ آپ نے احمد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

حنا تم بچی ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ کر اچھے بُرے کی تم تمیز نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری بہتری کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔

ممی اس کھوسٹ مہاراج سے آپ نے میری شادی کس مصلحت کے پیش نظر کی تھی۔

اس شادی سے تم کو کیا نقصان پہنچا ہے۔ جتنا عرصہ تم وہاں رہی ہو۔ مہارانی بن کر رہی ہو۔ اس نے تم کو اتنی جیولری دی ہے کہ تم فائیو سٹار ہوٹلوں میں رہ رہی ہو۔ اس آدمی سے آخر تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ یہ گاؤں کی ایک اُجڈ اور اَن پڑھ عورت کو تم پر ترجیح دیتا ہے۔

مجھے اُس کریہہ المنظر راجے کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ آپ ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھ سکیں۔ میں ایک مسلمان نواب کی بیٹی تھی۔ آپ نے مجھے ایک ہندو راجے کے سپرد کر دیا۔ میں نے آپ سے شرم کے مارے یہ باتیں کبھی نہیں کہیں۔ لیکن آج مجبور اً کرنی پڑ رہی ہیں۔ وہ بڈھا تماش بین۔ ٹیکوں، طلاؤں اور امساک کی گولیوں کا متواتر استعمال کرتا تھا۔ وہ شام سے صبح تک مجھے روئی کی طرح دھُن کر رکھ دیتا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے میرے بدن پر کسی نے دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیے ہیں۔ میں چیختی چلاتی لیکن اس سے وہ لطف اندوز ہوتا۔ اور زور زور سے قہقہے لگاتا۔ میں سمجھتی ہوں وہ ایک نفسیاتی مریض تھا اور میری بے چارگی اور بے بسی سے اس کو ایک گونہ تسکین ملتی تھی۔ یہ مجھے پتہ ہے کہ اس

جہنم میں مَیں نے چار سال کا طویل عرصہ کیسے کاٹا۔ میں جب اس سے الگ ہو کر بمبئی اور پھر کراچی آگئی تو میرے حسن سے بیسوں مرد مرعوب ہو کر میرے پیچھے دیوانہ وار پھرتے رہے۔ پھر مَیں پناہ لینے کے لیے کرنل سعید کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے مجھے ریپ (RAPE) کیا۔ مہاراج سے الگ ہو کر گذشتہ چار سالوں میں مَیں نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا کہ میرے اندر کی عورت مرچکی ہے۔ مجھ میں کوئی جنسی خواہش نہیں ہے۔

ممی مَیں احمد کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ ایک حادثہ کے نتیجے کے طور پر مجھے ملا اور پھر مَیں نے جلد اندازہ لگا لیا کہ یہ آدمی ہی وہ مسیحا ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ اس کے تھوڑے دن کی قربت سے میرے اندر کی عورت پھر سے زندہ ہو گئی اور مَیں اپنے آپ کو دنیا کی ایک جیتی جاگتی حسین عورت سمجھنے لگی۔ اگر میری جنسی خواہش کی تکمیل میں اس کے جذبات بھی اتنے ہی شوریدہ ہوتے جس قدر کہ میرے تھے تو شاید یہ کہانی کچھ ہی دنوں میں اپنے انجام کو پہنچ گئی ہوتی۔ ممی ہم دونوں اب جو ایک ٹھنڈی اور میٹھی آگ میں مسلسل سلگ رہے ہیں۔ مَیں سمجھتی ہوں اس نے ہی ہم دونوں کو یکجا کر رکھا ہے۔ ورنہ ہم کب کے الگ ہو گئے ہوتے۔

حنا ہوش کے ناخن لو۔ تم سے یہ شادی کر نہیں سکتا۔ تم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کے لیے جنسی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کیا۔ کیا تم دونوں اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یونہی سلگتے رہو گے۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا۔

ممی محبت کرنے والے انجام کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر اس کانٹوں بھری راہ کا سفر اختیار کرتے ہیں۔

تو پھر کیا پروگرام ہے تمہارا۔ حنا کی امی نے سرزنش کے انداز میں استفسار کیا۔

ممی احمد اتنی دور سے میری خاطر پندرہ دن کی چھٹی لے کر آیا ہے۔ مَیں اسے چھوڑ کر بمبئی نہیں جا سکتی۔

تو مَیں واپس چلی جاؤں۔

اگر آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔ مَیں آپ کو نہیں روکتی۔

تمہیں شرم آنی چاہیے ایک ٹکے کے آدمی کو تم مجھ پر ترجیح دے رہی ہو۔

ممی ٹھیک بی۔ ہیو (BEHAVE) کریں۔ یہ غیر شائستہ انداز گفتگو ہے۔

اور اس کی ماں نے اُٹھ کر ایک زوردار تھپڑ حنا کے منہ پر مارا۔ یہ مجال تمہاری۔ حنا کی ماں آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔

حنا روتے ہوئے اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ جیسے کوئی معصوم بچہ اپنے کسی بزرگ کی ذات میں پناہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔

مسٹر تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہاری وجہ سے ہم دونوں میں جدائی کی ایک واضح خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ اس پرابلم کا اگر اسی وقت سدباب نہ کیا گیا تو بعد میں اس خلیج کا پاٹنا مشکل ہو جائے گا۔

ممی احمد میرا مہمان ہے اسے پشاور سے میں نے بلایا ہے۔ یہ خود نہیں آیا۔ جب تک میں چاہوں گی یہ یہاں ٹھہرے گا۔ ممی آپ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز مجھ سے زیادہ دیکھے ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ہر آدمی کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے پتہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ لیکن دو اچھے دوستوں کی طرح اکٹھے تو رہ سکتے ہیں۔ ایسے ہی مل تو سکتے ہیں۔

تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم اس دو پیسے کے چھوکرے کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو۔

ممی میں نے آپ سے پہلے بھی گزارش کی ہے کہ آپ تہذیب کے دائرے میں رہ کر گفتگو کریں۔ آپ احمد کی نہیں بلکہ میری بے عزتی کر رہی ہیں۔ آپ بے شک بمبئی واپس چلی جائیں۔ میں پاکستان ہی میں رہوں گی۔ جس ملٹری سٹیشن پر احمد پوسٹ ہوگا میں وہاں ہی رہائش اختیار کروں گی۔ میرے اکاؤنٹس سب پاکستان میں ہیں۔ جیولری لاکرز میں محفوظ ہے۔ میں نے بمبئی جا کر کیا کرنا ہے۔

یہ ملازمت سے سبکدوش ہو جائے گا تو پھر تم کیا کرو گی۔ اس کے گاؤں جا کر اس کی خادمہ کے طور پر وہاں رہو گی۔

امی اگر ایسی نوبت بھی آئی تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔ لیکن میں ان سے دور نہیں رہ سکتی۔

ٹھیک ہے۔ میں آج ہی بمبئی واپس جاتی ہوں۔ اپنی پنشن کا کیس تیار کروانا ہے۔ پھر ذمہ داری کیس کے لیے پولیس والے بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔

* ــ *

اسی دن حنا کی اُمّی واپس بمبئی چلی گئی۔ حنا نے اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس نیک بخت خاتون کو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ حنا نے بتایا کہ ممی جب سے مُوجُو کے پاس قید میں رہی ہے اور جو کچھ اس سے وہاں سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ بہت چڑچڑی ہو گئی ہے۔

حنا مجھے آپ کی اُمّی سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ انھوں نے بغیر کسی وجہ کے ہم دونوں کی بے عزتی کی ہے۔

احمد سویٹ برائے معاف کر دو۔ میں زندگی بھر آپ کی ہو کر رہوں گی۔ آپ مجھے جس حال میں بھی رکھیں۔ میں بصد خوشی اُسے قبول کروں گی۔

حنا یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا۔ تم خوبصورت ہو۔ دولت مند ہو۔ جوان ہو۔ جذبات سے لبریز ہو۔ یہ کٹھن اور طویل زندگی کیسے کٹے گی۔

کوئی مشکل نہیں۔ آپ کے قدموں میں کٹ جائے گی۔

حنا آخر ہم انسان ہیں۔ دونوں جوان ہیں۔ ایک دوسرے کی قربت میں رہتے ہوئے اگر کبھی ہم دونوں سے کوئی لغزش ہو گئی تو یہ بات میرے لیے موت سے کم نہ ہو گی۔

خدا پر بھروسہ کرو۔ میں تمھیں اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ نہیں کروں گی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ تم خود اپنی جگہ پر ایک کوہ گراں ہو۔

میرے لیے تو آسان ہے۔ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ لیکن تم کب تک اپنے جذبات کا گلا گھونٹو گی۔

اس طرح کی جنسی گھٹن سے تو آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔

وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ اب خدا کے لیے تم مجھے بمبئی اُمّی کے پاس واپس جانے کا مشورہ نہ دینا ورنہ میں رو پڑوں گی۔ وہ صوفے پر آ کر میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے پیار

کی باتیں کرنے لگ گئی۔

ہم ہوٹل سے باہر بہت ہی کم نکلتے۔ صرف ایک دفعہ ایلفی اور ہاکس بے گئے ورنہ زیادہ وقت ہم اپنے کمرے ہی میں گذارتے۔ باتیں کرتے ہوئے جی ہی نہ بھرتا تھا۔ یوں لگتا جیسے ہم اب پہلی دفعہ ملے ہیں۔

حنا ارضی جنت اور سماوی جنت کا فرق دیکھا ہے۔ ارضی جنت میں حوروں کیساتھ اُن کی مائیں اُن کی گوشمالی کے لیے ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جبکہ سماوی جنت میں اس بات کا کوئی خدشہ نہ ہوگا۔ میری یہ بات سُن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اور فضا میں ہر سُو پھول ہی پھول بکھر گئے۔

اب احمد صاحب آپ کا کیا پروگرام ہے۔

حضور والا۔ پروگرام یہ ہے کہ پندرہ دن آپ کے قدموں میں گذاروں گا۔ اس کے بعد پشاور واپس چلا جاؤں گا۔ سوچتا ہوں کافی دن ہوئے ہیں بچوں کو نہیں دیکھا۔ ایک آدھ دن پہلے بذریعہ ٹرین چلا جاؤں اور سارے راستے میں دیکھتا جاؤں۔

اگر تم اجازت دو تو میں بھی تمہارے ساتھ آجاؤں۔ آپ کے بیوی بچوں سے میں بھی مل لوں گی۔

حنا مجھے شرم آتی ہے۔ میرے عزیز و اقارب ایک خوبصورت اور جوان عورت کو میرے ساتھ دیکھیں گے تو ان کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک جنم لیں گے۔ جس معاشرے سے میں آیا ہوں وہاں ایسا نہیں ہوتا۔ مفت میں میری بیوی اور بچوں کی دلشکنی ہوگی۔

چلیں ٹھیک ہے۔ میں نہیں آتی۔ بلکہ سیدھی پشاور چلی جاؤں گی۔ آپ گھر سے چکر لگا کر آجائیں۔

نہیں حنا تم تاج محل ہی میں رہو۔ میرا پوسٹنگ کسی پرمانینٹ سٹیشن پر ہو جائے تو پھر آپ وہاں شفٹ کر لیں۔ وہاں آپ مکان لے لیں۔ آرام سے وہاں رہیں۔ میں بھی وقتاً فوقتاً سلام کے لیے حاضر ہوتا رہوں گا۔

احمد! مَیں ان چند دنوں کی جُدائی بھی نہیں برداشت کر سکتی۔ مَیں ڈین ہوٹل میں رہ جاؤں گی۔ آپ بے شک اپنے میس (MESS) ہی میں رہیں۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ مَیں نے اس کی بات کی تصدیق کی۔

+ — +

پروگرام یہ بنا کہ میری چھٹی کے چار دن جب باقی ہوں تو کراچی سے چلا جائے۔ دو دن میانوالی تک لگیں گے۔ ایک دن مَیں گاؤں میں رہوں گا اور ایک دن پھر گاؤں سے پشاور تک لگے گا۔ حنا اس ریل کے سفر کا سُن کر بہت خوش ہوئی۔ ہم نے دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ پشاور کے لیے حاصل کیے۔ مقررہ دن پر ہم کراچی کینٹ ریلوے سٹیشن سے سوار ہوئے۔ ہمارے لیے دو برتھ ریزرو تھے۔ حنا نے اس سفر کو بڑا انجوائے (ENJOY) کیا۔ آخر تیسرے دن صبح سویرے گاڑی میانوالی ریلوے سٹیشن پر جا پہنچی مَیں نے مشرق کی طرف کوہ نمکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حنا کو بتایا۔

حنا اس پہاڑ کے دامن میں جانب شمال میرا گاؤں ہے۔

یہاں سے کتنا دور ہے۔

تیس میل۔

یہاں سے آپ گاؤں کیسے جائیں گے۔

بس سے جاؤں گا۔

کتنی دیر لگے گی۔

دو گھنٹے میں مَیں اپنے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

+ — +

گارڈ نے وسل دی۔ مَیں اپنا اٹیچی کیس اُٹھا کر نیچے آگیا۔ گاڑی چل پڑی۔ مَیں کافی دیر تک کھڑا حنا کو ویو (WAVE) کرتا رہا۔ وہ بہت دیر تک گاڑی کے دروازے میں کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ آخر کار گاڑی ایک سیاہ نکتہ بن کر دور اُفق میں کھو گئی اور مَیں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ریلوے سٹیشن سے باہر آگیا۔

فوراً ہی بس مل گئی اور میں تقریباً دو گھنٹے کے بعد گاؤں میں اپنے بچوں اور عزیز و اقارب میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دن میں نے بڑی خوشی اور مسرت سے اپنے بچوں میں گذارا۔ عزیز و اقارب سے ملا۔ اگلے دن بعد دوپہر میں بذریعہ بس میانوالی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اٹک جانے والی گاڑی شام کو سات بجے آتی تھی۔ اس لیے میں ویٹنگ رُوم میں آ کر سو گیا۔ چھ بجے کے قریب بیدار ہوا۔ نہایا اور پھر چائے منگوائی۔ چائے سے فراغت پا کر باہر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ میانوالی ریلوے سٹیشن پر شام کو بڑی رونق ہوتی ہے۔ شہر کے اکثر آدمی شام کو ریلوے سٹیشن پر ضرور چکر لگانے کے لیے آتے ہیں۔ آخر سات بجے ریل گاڑی آ گئی اور مجھے فسٹ کلاس میں آسانی سے سونے کی جگہ مل گئی۔ رات بڑے آرام سے کٹی۔ گاڑی صبح سات بجے اٹک پہنچ گئی۔ وہاں سے گاڑی تبدیل کی اور میں پنڈی سے پشاور جانے والی گاڑی پر سوار ہو کر تقریباً تین گھنٹے کے بعد پشاور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچا۔ وہاں حنا میرے استقبال کے لیے موجود تھی۔ مجھے خوش آمدید کہا اور میرا اٹیچی کیس اٹھا کر باہر آ گئی۔ اس نے ایک ٹیکسی منگوائی اور پھر ڈرائیور کو ڈین ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔ میں نے حنا کو بتایا کہ مجھے جلدی اپنی یونٹ میں پہنچایا جائے۔ کیونکہ آج میری چھٹی نہیں ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ آپ ناشتہ کر لیں پھر میں آپ کو وہاں چھوڑ آؤں گی۔ ناشتہ ختم ہوا تو اس نے سرونٹ کو کہا کہ ایک ٹیکسی ہمارے لیے منگواؤ۔ ٹیکسی آ گئی اور ہم خیبر بیرکس جا پہنچے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کہا کہ گیٹ پر ٹیکسی روک لو۔

احمد اسے اندر جانے دو۔ وہاں تک ہمیں چل کر جانا پڑے گا۔

نہیں حنا۔ فوجی قانون کے مطابق کوئی خاتون فوجی سپاہیوں کی بیرکس یا کیمپوں میں نہیں جا سکتی۔ یہ بات میں نے پہلے بھی جہلم کے قیام کے دوران میں آپ کو بتائی تھی۔

ساری احمد۔ یہ بات میرے ذہن سے اُتر گئی تھی۔

اور پھر حنا اسی ٹیکسی میں ڈین ہوٹل واپس چلی گئی۔ اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اللہ یار خان کمرے میں موجود تھا۔ اُس نے مجھے آتے ہی بتایا کہ ایس۔ ایس او صاحب (S.S.O) صبح سے دو مرتبہ ٹیلی فون کر چکے ہیں۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ احمد صاحب جب بھی آئیں ان کو کہیں کہ

وہ فوراً سٹیشن ہیڈ کوارٹر آئیں اور مجھے ملیں۔

میں ایس۔ایس۔او (ہ۔ی۔ی) کے پاس گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جہلم سے آپ کی یونٹ والوں نے دو دفعہ ٹیلی فون کیا ہے۔ آپ کے آفیسر کمانڈنگ مجھ پر بگڑ رہے تھے کہ میں نے آپ کو چھٹی کیوں دی ہے۔ بہر حال آپ آج کی گاڑی سے جہلم جانے کی تیاری کرلیں۔ آپ جائیں۔ تیاری کریں۔ موومنٹ آرڈر اور ریلوے وارنٹ آپ کو تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔

مجھ پر ایک بجلی سی گری۔ میں حواس باختہ ہو کر سٹیشن ہیڈ کوارٹر سے واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اللہ یار کو سب صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ تیاری کر لو شام کو گاڑی سے جہلم جائیں گے۔ اس کو بتا کر میں نے ایس۔ایس۔او کو ٹیلی فون کیا۔

سر میں احمد بول رہا ہوں۔ موومنٹ آرڈر میں میرے بیٹ مین (BATMAN) سگنل مین اللہ یار خان کا نام بھی شامل کریں۔ میں جہلم سے آتے وقت اُسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ایس۔ایس۔او نے کنفرم کیا کہ اس کا نام بھی شامل ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں نے ڈین ہوٹل میں حنا کو فون کیا اور اُسے نئے حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی یہ سن کر ششدر رہ گئی۔ حواس مجتمع کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

احمد صاحب سب پروگرام ہی اَپ سیٹ ہو گیا ہے۔ اس دفعہ میرا پروگرام سوات جانے اور خیبر پاس دیکھنے کا تھا۔ میں پچھلی دفعہ آئی تو آپ کی تیمارداری میں لگی رہی اور پھر مجھے اچانک واپس جانا پڑ گیا۔

یار زندہ صحبت باقی۔ اگر زندگی ہوئی تو پھر اور کئی مواقع میسر آئیں گے۔

احمد میں تمہارے لیے ٹیکسی بھیجتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے تم یہاں آجاؤ تا کہ نیا پروگرام بنائیں۔

بہت اچھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی نے ہمارے گیٹ پر آکر ہارن بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ میں اللہ یار خان کو بتا کر ڈین ہوٹل چلا گیا۔ دوپہر کا کھانا وہاں حنا کے ساتھ کھایا۔ آخر کار ہم دونوں کے درمیان یہی طے ہوا کہ حنا کا پشاور میں اکیلا رہنا ٹھیک نہیں

وہ بھی میرے ساتھ جہلم چلے گی۔ اسی وقت ہوٹل کے مینجر کو کہہ کر دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ منگوائے اور سیٹیں ریزرو کروائیں اور پھر میں واپس یونٹ میں آ گیا۔ واپسی پر اللہ یار نے مجھے موومنٹ آرڈر اور ریلوے وارنٹ دیا۔ شام کی گاڑی سے ہم تینوں جہلم کے لیے روانہ ہو گئے۔ اللہ یار خان نے حنا کو دیکھا تو مجھ سے کہنے لگا۔

سر یہ سوہنی کڑی ادھر بھی آپ کے پیچھے آ گئی ہے۔ یہ تو آپ کو تباہ کر کے چھوڑے گی
میں ہنس پڑا اور اللہ یار خاں جھینپ گیا۔

٭ ٭

آدھی رات کے لگ بھگ ہم جہلم پہنچ گئے۔ رات وہاں ہی ویٹنگ روم میں بسر کی۔ صبح وہاں ہی ناشتہ منگوایا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے یونٹ میں گاڑی بھیجنے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک فوجی گاڑی وہاں آ گئی۔ میں نے اپنا سامان اس گاڑی میں رکھوایا اور اللہ یار کو ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ اسے یونٹ میں لے جائے۔ میں تھوڑی دیر میں خود پہنچ جاؤں گا۔ اللہ یار کو میں نے ہدایت کی کہ وہ اس سوہنی کڑی کے متعلق کسی سے بات نہ کرے۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں حنا کو لے کر ایک ہوٹل میں آ گیا۔ اس کو وہاں کمرہ لے کر دیا۔ مینجر میرا جاننے والا تھا۔ میں نے اس کو ہدایت کی کہ بیگم صاحبہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کریں۔ میں بھی دن میں ایک دو چکر لگایا کروں گا۔

میں ٹانگے میں بیٹھ کر کیمپ میں آ گیا۔ آفیسر کمانڈنگ کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی میرے پہنچتے ہی سینئر سردار بھاگتا ہوا میرے ٹینٹ میں آ گیا

خوش آمدید۔ ملک صاحب۔ خیریت ہے۔ آپ کی صحت ٹھیک ہے۔

شکر ہے اللہ پاک کا اب ٹھیک ہوں۔

میجر صاحب نے کہا ہے کہ آپ وردی پہن کر جلدی ان کو رپورٹ کریں۔

خیریت تو ہے۔

خیریت ہی تو نہیں ہے جناب۔ میجر ملک صاحب پوسٹ ہو کر چلے گئے ہیں نئے آفیسر کمانڈنگ

آئے ہیں۔ ان کو کور ہیڈ کوارٹر کے افسروں نے آپ کے متعلق بہکایا ہے۔

کیوں۔ کور ہیڈ کوارٹر کے افسروں کو مجھ سے کیا ضرر پہنچا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ آپ کرنل سعید کی بیگم کو لے گئے ہیں۔

کرنل سعید صاحب نے کوئی رپورٹ کی ہے۔

جی نہیں۔

تو کرنل سعید کی بیگم ان کی کیا لگتی ہے۔ ان کو کیا دُکھ پہنچا ہے۔ اچھا صاحب آپ میجر صاحب بتا دیں کہ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں — اور پھر میں دفتر جانے کی تیاری کرنے لگ گیا۔ میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کر دفتر جا پہنچا۔

سینئر سردار نے آفیسر کمانڈنگ کو جا کر رپورٹ دی۔ انہوں نے مجھے اندر بلایا۔ میں نے میجر افضل کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ نچلے رینک سے میجر بنا تھا۔ اس لیے کافی ڈرپوک قسم کا آدمی تھا۔ اُوپر والوں سے بہت ڈرتا تھا۔ نیچے والوں کے لیے ٹیرر (T E R R O R) بنا ہوا تھا پہلے تو مجھے اُوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ پھر مختلف زاویوں سے میرے یونیفارم کی انسپیکشن کرتا رہا۔ پھر ایک معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اور مضحکہ خیز انداز میں "ہوں" کہا۔

اچھا تو آپ ہیں احمد صاحب۔ آپ کی بڑی شہرت سُنی ہے۔

کس بات کی شہرت سَر۔

اس نے سینئر سردار کو جانے کے لیے کہا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ان کے موڈ میں کچھ نرمی آ گئی۔

احمد صاحب۔ ہیڈ کوارٹر کے سب آفیسرز آپ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے جنرل صاحب کو بتایا ہے کہ آپ کرنل سعید صاحب کی بیگم کو لے گئے ہیں۔

کرنل سعید نے آپ کے پاس کوئی رپورٹ کی ہے یا کور ہیڈ کوارٹر میں کسی سے کی ہے۔

نہیں۔ اُس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

آپ نے کرنل سعید صاحب سے بات کی ہے۔

نہیں۔ میں نے بھی نہیں کی۔

سر۔ اگر ایسا قصہ ہوتا تو کرنل سعید سب سے پہلے میرے خلاف ہماری یونٹ میں رپورٹ کرتا۔ لیکن صاحب یہ طوسیلن کی بات ہے۔ کور ہیڈ کوارٹر کے سینئر افسروں نے خود بخود اس بات کا نوٹس لیا ہے۔

بیگم سعید کور ہیڈ کوارٹر کے افسروں کی کیا لگتی ہے۔ ان کو اتنا رنج کیوں پہنچا ہے۔ جبکہ کرنل سعید صاحب کو اس کا کوئی ملال نہیں ہے۔

میجر افضل کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ وہ غصے میں آکر مجھ سے کہنے لگا۔

صاحب۔ فضول قسم کی باتیں نہ کریں۔

سر۔ آپ ان کو بتا دیں کر وہ جے۔ سی۔ او آگیا ہے۔ جو ڈسپلنری ایکشن اس کے خلاف لینا ہو۔ لے لیں۔ اور یہ کہہ کر میں اس کی اجازت کے بغیر باہر نکل آیا۔

میجر صاحب مجھے بلاتا رہا۔ لیکن میں نے نتائج کی پرواہ کیے واپس اندر نہ گیا۔ میں اپنے دفتر میں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کور ہیڈ کوارٹر میں کسی سینئر افسر سے فون پر بات کر رہا تھا۔

سر۔ کون۔ اے۔ جی صاحب بول رہے ہیں۔ سر وہ جے۔ سی۔ او پشاور سے آگیا ہے اب اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ آپ کے پاس لے آؤں۔ اچھا سر ابھی لے کر آتا ہوں۔

اور پھر میجر افضل۔ اپنے دفتر سے نکل کر میرے دفتر کے ٹینٹ میں آگیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

صاحب آپ اچھی وردی پہن کر آئیں۔ آپ کو جنرل صاحب کے سامنے جانا ہے۔ (یعنی پیش ہونا ہے۔)

میرے پاس یہی سب سے اچھی وردی ہے۔ جو میں نے پہن رکھی ہے۔ میرا جواب سن کر میجر افضل شرمندہ ہو گیا۔ اس نے جیپ منگوائی اور مجھے اور سینئر سردار کو اس میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے میجر افضل سے پوچھا کہ سینئر سردار کا وہاں کیا کام ہے۔

یہ اسکورٹ (ESCORT) کے طور پر جا رہے ہیں۔

میری چارج شیٹ تو آپ نے فریم کی ہی نہیں۔ اسکورٹ کس بات کا۔

نہیں سر اس نے بھی نہیں کی۔

تو آپ کو خدائی فوجدار کس نے بنایا ہے کہ خواہ مخواہ ٹھوڑ لے کر اس بے چارے کے پیچھے پڑ گئے ہو۔

لیکن سر یہ تو ڈسپلن کی بات ہے۔

اس جے سی او کے ڈسپلن کا ذمہ داران کا آفیسر کمانڈنگ ہے۔ یا چیف سگنل آفیسر۔ آپ کا یہ کام نہیں ہے۔

جنرل صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب یہ قصہ کیا ہے۔"

سر میں آپ کو تنہائی میں تفصیل سے یہ قصہ عرض کروں گا

جنرل صاحب مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں واپس چلے گئے۔ انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے کرسی پر بٹھایا چائے پلائی اور پھر فرمانے لگے۔

صاحب کیا قصہ ہے مجھے ذرا تفصیل سے بتائیں۔

سر میری گذارش یہ ہے کہ وہ خاتون بھی ادھر آئی ہوئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو بھی لے آتا ہوں۔ ہم دونوں قرآن کریم پر حلف اٹھا کر آپ کے سامنے بیان دیں گے۔

کہاں ہے وہ خاتون۔ جنرل صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے معلوم کرنا چاہا۔

سر یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔

آپ کو کیسے پتہ چلا ہے

سر وہ کراچی سے پشاور میرے ساتھ آئی تھی۔ اس کا سوات جانے کا پروگرام تھا۔ چونکہ یونٹ والوں نے مجھے اچانک واپس بلا لیا۔ اس لیے وہ بھی میرے ساتھ جہلم آگئی ہیں۔

آپ کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔

سر وہ ایک بے آسرا خاتون ہے۔ میں از راہ انسانی ہمدردی اس کا ساتھ دے رہا ہوں۔ اُسے ان ہوس پرست بھیڑیوں سے بچانے کے لیے سینہ سپر ہوں۔ اس سٹیشن

کے بہت سے آفیسرز اس کو زیرِ دام لانے کی فکر میں ہیں ۔ میں چونکہ ان کی راہ میں حائل ہوں اس لیے وہ میرے جانی دشمن ہو گئے ہیں۔

اس سے زیادہ تو اور کچھ بات نہیں ۔ جنرل صاحب نے مسکراتے ہوئے از راہِ تفنن طبع پوچھا ۔

سر میں نے آپ کو پیش کش کی ہے کہ ہم دونوں قرآن کریم پر حلف اُٹھا کر جو بھی بات آپ پوچھیں گے اس کا جواب دیں گے ۔

اچھا تو آپ جائیں میری گاڑی لے جائیں اور اس خاتون کو ساتھ لے آئیں ۔

جنرل صاحب نے ڈرائیور کو بلا کر میرے ساتھ چلنے کی ہدایت کی ۔

٭ ـــ ٭

میں گاڑی لے کر ہوٹل میں گیا ۔ حنا نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے اخبار پڑھ رہی تھی ۔ اس نے مجھے دیکھا تو میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے سب صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ میرے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں چلے ۔ کیونکہ چند بدخواہوں نے جو سکینڈل بتایا ہے اس کے متعلق جنرل صاحب ہم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں ۔ میں نے جنرل صاحب کو پیش کش کی ہے کہ ہم دونوں قرآن کریم پر حلف اُٹھا کر پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں گے ۔ میں نے حنا کو کہا کہ آپ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں ۔

میں تیار ہوں آپ ٹیکسی یا تانگے کا کوئی انتظام کریں ۔

جنرل صاحب نے آپ کو لے آنے کے لیے اپنی گاڑی دی ہے ۔

ہم دونوں اس گاڑی میں بیٹھ کر کور ہیڈ کوارٹر آ گئے ۔ جونہی ہماری گاڑی رکی ۔ جنرل صاحب کو چھوڑ کر کور ہیڈ کوارٹر کے تمام افسر ہمیں دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے ۔ میں نے کسی سے کوئی بات نہ کی ۔ حنا کو لے کر سیدھا جنرل صاحب کے دفتر میں چلا گیا ۔ ہم دونوں نے جنرل صاحب کو سلام کیا ۔ انہوں نے کمال مہربانی سے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا ۔ ہم بیٹھ گئے ۔ فوراً ہی چائے آ گئی ۔ جنرل صاحب نے بھی ہمارے ساتھ چائے

پی۔ جنرل صاحب حنا سے کہنے لگے۔ بیٹی آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ کے اور احمد صاحب کے متعلق کور ہیڈ کوارٹر کے افسران نے ایک اچھا خاصا سکینڈل بنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق آپ وضاحت سے صحیح صورت حال سے مجھے آگاہ کریں۔

سَر احمد صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بیشتر اس کے کہ ہم دونوں آپ کی خدمت میں اپنی گذارشات پیش کریں۔ مَیں آپ کی خدمت میں التماس کرتی ہوں کہ آپ مہربانی سے کرنل سعید صاحب کو یہاں بلوائیں تاکہ مَیں جو کچھ عرض کروں، سب بات ان کے سامنے ہو۔ اگر اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے تو وہ میری باتوں کی تردید کرے۔ باقی ان لوگوں کا یہ کہنا کہ احمد صاحب نے کرنل سعید کی بیگم کو اغوا کر لیا ہے۔ سَر! یہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ حضور والا! مَیں کرنل سعید کی بیوی نہیں ہوں۔ احمد صاحب کا صرف یہ قصور ہے کہ انہوں نے مجھے سعید اور جیسے اور ہوس پرستوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچایا ہے۔ اس سٹیشن کے معدودے چند آرمی آفیسرز کو چھوڑ کر بیشتر نے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کئی بار کوششیں کیں۔ ان میں سر فہرست نام آپ کے ا۔ ع صاحب کا ہے۔

کیا آپ کرنل سعید کی بیوی نہیں ہیں۔ جنرل صاحب نے حیرت زدہ ہو کر حنا سے پوچھا۔

جی نہیں۔

تو آپ اس کے ساتھ کیسے رہ رہی تھیں۔

سَر یہی تو آپ کو بتانے والی بات ہے۔ اور پھر حنا نے جنرل صاحب کو پوری تفصیل سے، مہاراج کے حرم میں جانے اور وہاں سے واپس آنے اور سعید کے ساتھ اور میرے ساتھ مراسم کی استواری کی مکمل روئیداد سنائی۔

جنرل صاحب نے کرنل سعید کو ٹیلی فون کیا کہ آپ میرے دفتر میں فوراً آئیں۔ بڑی اہم باتیں آپ سے پوچھنی ہیں۔ اس دوران میں ہم دونوں جنرل صاحب کے پاس بیٹھے رہے تھوڑی ہی دیر میں کرنل سعید نے دروازہ ناک (KNOCK) کیا اور اجازت طلب کر کے اندر آ گیا۔ فوجی انداز میں سلیوٹ کیا۔ اس کی طرف ہم دونوں کی پیٹھ تھی۔ اس لیے اس نے نہیں

پہلی نظر میں نہ دیکھا۔

جنرل صاحب نے سعید کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

جب وہ بیٹھنے لگا تو اس نے ہماری طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

حنا تم یہاں۔

جی جناب۔ حنا نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

کرنل سعید آپ کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ ان دونوں کے متعلق آپ سے کچھ باتوں کی وضاحت طلب کر سکوں۔ جنرل صاحب نے سعید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

سر آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں۔ میں حاضر ہوں۔

یہ خاتون آپ کی بیوی ہے۔

جی نہیں۔

یہ آپ کے ساتھ مختلف سٹیشنوں پر آرمی اکاموڈیشن میں رہتی رہی ہیں۔

جی سر۔ رہتی رہی ہیں۔

کس حیثیت سے۔

ایک دوست کی حیثیت سے۔

یہ آپ کی کیپ (KEEP) ہے۔

جی نہیں۔

ایک جوان مرد اور ایک جوان اور خوبصورت عورت۔ آپ لوگ کس حیثیت سے یکجا رہتے رہے ہیں۔ کیا آپ کے آپس میں کچھ افیرز (AFFAIRS) تھے۔

نہیں سر۔

یہ بڑی حیران کن بات ہے۔ آپ اس جے۔ سی۔ او کو جانتے ہیں۔

جی ہاں۔ ان کو میں اور حنا ایک رات فٹ پاتھ سے اٹھا کر لائے تھے۔ پھر ان کی حنا کے ساتھ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

ان کے اور حنا کے آپس کے تعلقات کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

سر میں سمجھتا ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے تعلقات محض انسانی ہمدردی تک محدود ہیں۔ سر میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ میں پچھلے چار سال سے حنا کو جانتا ہوں۔ یہ جوان ہے۔ خوبصورت ہے۔ لیکن اس کے اندر کی عورت زندہ نہیں ہے۔ یہ کسی مرد سے بھی جنسی تعلقات استوار نہیں کر سکتی۔ یہ عورت کی شکل میں ایک مرد ہے۔ یہ جس سے بھی پیار کرتی ہے، لوٹ کر پیار کرتی ہے۔

آپ اس سے الگ ہو کر جب میس (۱۹۷۵ء) سے چلے گئے تو آپ نے اس بات کا کبھی کسی سے ذکر کیا۔

نہیں سر۔ میں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

آپ نے کبھی کورہیڈ کوارٹر میں سرکاری طور پر اس بات کی رپورٹ کی کہ یہ جے۔ سی۔ او حنا کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔

نہیں سر۔ اغوا تو تب ہوتا کہ ان کے درمیان کوئی جنسی تعلقات ہوتے یا کسی اور مقصد کے لیے اسے لے جاتا۔ یا اور کسی طرح کا مفاد حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتا۔

تو کور ہیڈ کوارٹر کے افسروں نے یہ سکینڈل کیوں کھڑا کر دیا ہے۔

سر سچ پوچھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ جب بھی حنا میرے ساتھ کلب آتی۔ یہ لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد منڈلانا شروع کر دیتے تھے۔ اور ہر آدمی اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتا۔ جب اُن میں سے یہ کسی کے قابو نہ آئی تو ان لوگوں نے انتقاماً یہ حربے استعمال کرنے شروع کر دیے۔

جب یہ خاتون آپ کے ساتھ رہ رہی تھی تو کبھی آپ نے اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا۔

سر مجھ سے ایک دن یہ غلطی ہوئی ہے۔ جس کے لیے عمر بھر میری ضمیر مجھے کوستی رہے گی۔

یہی بات تم دونوں میں جدائی کا باعث بنی۔

جی سر۔ میری اس نازیبا حرکت کی وجہ سے ہی حنا کو مجھ سے نفرت ہو گئی۔ اور میں بھی اس کو فیس (۱۹۷۴ء) نہ کر سکتا تھا۔

کرنل سعید آپ سچے آدمی ہیں۔ آپ نے اپنا جرم بھی قبول کر لیا ہے۔ اس لیے مَیں آپ کی ہر بات کو صحیح مانتا ہوں۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے ہی میں انسان کی عظمت ہے۔ بہت شکریہ آپ کا۔ آپ نے میری ایک بڑی اُلجھن کو سلجھا دیا۔ اگر ذرا سی بے احتیاطی ہو جاتی یہ بچے سی او بے چارے مارے جاتے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔

کرنل سعید وہاں سے چلا گیا۔ اس نے جاتے وقت ہم دونوں سے الگ سلام دعا کی۔ اس کے جانے کے بعد جنرل صاحب ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"بچو! مجھے افسوس ہے۔ چند ناعاقبت اندیش آدمیوں نے تم دونوں کو بہت بدنام کیا ہے۔ اس بات کا ازالہ تو اب نہیں ہو سکتا۔ بہر حال جن لوگوں نے اس قضیے میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ مَیں اُن سے نپٹ لوں گا۔ آپ دونوں بتائیں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

مَیں نے جنرل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان کی خدمت میں عرض کیا۔

"سر میں اب اس یونٹ میں اور اس سٹیشن پر نہیں رہنا چاہتا۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ از راہِ کرم مجھے کسی دوسرے سٹیشن پر پوسٹ کروا دیں۔ مَیں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

مَیں آپ کے چیف سگنل آفیسر صاحب کو بلاتا ہوں۔ ان سے کہتا ہوں۔ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں۔

جنرل صاحب نے خود ہی سی۔ ایس۔ او (سی۔ ایس۔ او) کو ٹیلی فون کیا۔ اور ان کو اپنے دفتر میں آنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ آ گئے۔ انہوں نے جنرل صاحب کو سیلوٹ کیا جنرل صاحب نے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ہمارے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے بڑھے تو ہم دونوں احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اس عزت افزائی کے لیے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جنرل صاحب نے ان کے لیے چائے منگوائی ہم دونوں سے بھی چائے کے لیے پوچھا۔ لیکن ہم نے معذرت کی۔

جنرل صاحب نے چیف سگنل آفیسر صاحب سے پوچھا۔ آپ اس صوبیدار صاحب

کو جانتے ہیں۔

سر بہت اچھی طرح سے۔

یہ کیسے آدمی ہیں، ان کی کور آف سگنل میں کیسی شہرت ہے۔

سر یہ ہماری کور کے چند اچھے جونیئر کمیشنڈ آفیسرز میں سے ہیں۔ یہ نہایت ہی شریف النفس اور اچھے خاندان کے فرد ہیں

اس خاتون کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں۔

سر میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ خاتون ایک بے آسرا خاتون ہے۔ بڑی امیر کبیر خاتون ہے جوان ہے۔ خوب صورت ہے۔ اس وجہ سے چند ہوس پرستوں نے اس کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ احمد صاحب ایک حادثے کے نتیجے میں اسی سے ملے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ اس خاتون کی ہر مرحلہ پر مدد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ ان کے تعلقات محض انسانی ہمدردی تک ہی محدود ہیں۔ صوبیدار صاحب ایک دیرینہ فوجی گھرانے کے فرد ہیں۔ ان لوگوں کی علاقائی اور خاندانی روایات کے مطابق اب یہ اس کش مکش سے پسپائی اختیار نہیں کر سکتے۔ پہلے ان کے آفیسر کمانڈنگ میجر ظہور الحق ملک تھے۔ انہوں نے مجھے سب صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ پوسٹنگ چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میجر افضل آئے ہیں۔ ان کے ا۔ ح ا اور دوسرے افسروں نے کان بھرے ہیں۔ ان کو اکسا کر صوبیدار صاحب کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ یہ بے چارے تو بیمار تھے۔ اور کافی دنوں تک سی۔ ایم۔ ایچ پشاور میں زیر علاج رہے۔

اچھا آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے یہ گتھی سلجھانے میں میری مدد کی۔ میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ صوبیدار صاحب نے عرض کی ہے کہ یہ اب اس یونٹ میں اور اس سٹیشن پر نہیں رہنا چاہتے۔ آپ مہربانی سے کمانڈنگ سگنل ٹریننگ سنٹر کو ٹیلی فون کریں اور ان سے کہیں کہ وہ احمد صاحب کو لاہور پوسٹ کر دیں۔ ان کا بیٹ مین (BATMAN) بھی ان کے ساتھ جائے گا۔ یہ آج ہی پشاور جائیں گے اور وہاں سے اپنا سامان لے کر اپنی نئی [illegible] کو چلے جائیں گے۔ ان کو دس دن کا جائننگ ٹائم

(JOINING TIME) بھی دیں۔ ان کی سالانہ رپورٹ (A.C.R) یا آپ لکھیں یا میجر ظہور الحق ملک سے لکھوائیں۔ یہ یقین کریں کہ ان کا موجودہ آفیسر کمانڈنگ ان کی رپورٹ نہ لکھے۔

بہت اچھا سر۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی — اور پھر سی۔ ایس۔ او (C.S.O) صاحب۔ میجر افضل۔ مجھے اور حنا کو اپنی سٹاف کار میں بٹھا کر اپنے دفتر میں لے آئے۔ وہ میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ ہم دونوں بہت عرصہ اکٹھے رہ چکے تھے۔ اس وقت سے میرے اُن کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے پہلے ہم تینوں کو چائے پلائی اور بعد میں میجر افضل کو جھاڑ پلائی۔

چیف صاحب نے میجر افضل سے پوچھا

افضل آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ سی۔ ایس۔ او (C.S.O) کے ماتحت ہیں یا کور کے ا۔G کے

سر سی ایس او (C.S.O) کے ماتحت ہوں۔

آپ نے ا۔G کے کہنے پر صوبیدار صاحب کو پشاور سے کیوں واپس بلایا۔ جبکہ بیمار تھے۔ اور پہلے کمانڈنگ آفیسر نے میری اجازت سے ان کو وہاں آرام کرنے کی خاطر بھیجا تھا۔

سر مجھ سے یہ غلطی ہوگئی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔

آپ پرانے آدمی ہیں۔ ہم دونوں سے آپ کی نوکری زیادہ ہے۔ آپ کو یہ پتہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ ہر معاملے میں سی ایس او (C.S.O) کے ماتحت ہیں۔ ا۔G کور سگنل کے آدمیوں کا ڈسپلن سدھارنے کا اختیار کس نے دیا ہے۔

میجر افضل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے رویے سے ندامت کا اظہار ہوتا تھا۔

٭٭

چیف صاحب نے ہمارے سا[illegible] کمانڈنٹ کو ٹیلی فون کیا۔ اور کور کمانڈر صاحب کے احکامات سے ان کو آگاہ کیا اور پھر میری فوری پوسٹنگ کے لیے کہا۔

کمانڈنٹ نے کہا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو پوسٹنگ آرڈر کا نمبر دیتا ہوں۔ آپ لاہور کے لیے صوبے دار صاحب اور ان کے بیٹ مین (BATMAN) کا موومنٹ آرڈر بے شک اسٹارٹ کروادیں۔

چیف صاحب نے حنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا! احمد صاحب سے یہ دوستی تو آپ کو بہت مہنگی پڑی ہے۔

سر مجھے افسوس ہے ایک بے گناہ آدمی کو میری وجہ سے بدنامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہ نیک بخت سادہ آدمی ہے۔ جو بات منہ سے نکال دیتا ہے پھر اگر اس کی جان بھی چلی جائے تو یہ پیچھے نہیں ہٹتا۔

سر میں ان کی محبت، جوانمردی اور خلوص کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ ان کی انہوں باتوں نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سنٹر کمانڈنٹ نے سی۔ ایس۔ او (C.S.O) کو پوسٹنگ آرڈر کا نمبر بتایا۔ مختصر سی رسمی گفتگو کے بعد ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ چیف صاحب نے میجر افضل کو کہا کہ ابھی آپ یونٹ میں جائیں اور ان کا موومنٹ آرڈر اشوع کریں۔ یہ یہاں سے پشاور جائیں گے اور وہاں سے اپنا سامان لے کر اپنی نئی یونٹ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ان کو دس دن کا جائننگ ٹائم بھی دینا ہے۔

بہت اچھا سر۔

اچھا اب آپ لوگ جائیں۔

احمد صاحب اگر آپ کو اس معاملے میں کوئی تکلیف ہو تو مجھے ڈائریکٹ فون کر کے آپ مطلع کریں۔

بہت اچھا سر۔

اور پھر ہم تینوں سی۔ ایس۔ او (C.S.O) کے دفتر سے اپنی یونٹ میں آگئے۔ بی۔ ایم۔ نے میجر افضل سے کہا کہ آپ میرا موومنٹ آرڈر اشوع کروائیں۔ میں حنا کے ساتھ اس

کے ہوٹل میں جاکر اس کے بلوں کی کلیرنس کرواتا ہوں۔
ٹھیک ہے صاحب اب آپ اپنا کام کریں۔ آپ کو سب کاغذات گھنٹے ڈیڑھ کے بعد مل جائیں گے۔ آپ پھر جب جانا چاہیں۔ یونٹ سے گاڑی لے جائیں۔
ٹھیک ہے سر۔

میں اور حنا دونوں دفتر سے نکل کر اپنے ٹینٹ کی طرف چل پڑے۔ جہاں جہاں سے بھی ہم گذرتے پوری یونٹ کے لوگ حنا کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے اور پھر دیکھتے ہی رہ جاتے۔ حنا ان کی بھوکی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے سر جھکائے میرے ساتھ چل رہی تھی۔ جب ہم اپنے ٹینٹ کے پاس پہنچے تو اللہ یار خان نے بڑھ کر ہم دونوں کو خوش آمدید کہا۔
لو بھئی اللہ یار خان آج اس سوہنی کڑی کو میں تمہارے پاس ہی لے آیا ہوں۔
اللہ یار خان شرما گیا۔
حنا مسکرا پڑی۔
میں اور حنا دونوں ٹینٹ کے اندر چلے گئے۔ حنا فوجی کیمپ کی لائف کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئی۔ وہ میرے بستر پر جاکر لیٹ گئی اور میں کپڑے تبدیل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں لباس تبدیل کر کے باہر دھوپ میں آبیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں کسی کام سے خیمے کے اندر گیا تو میں نے دیکھا کہ حنا سو چکی تھی۔ میں سوچنے لگا اس فوجی خیمے اور میرے اس کھردرے بستر کے بھی آج بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔ دنیا کی حسین ترین عورت نے اپنے قدموں سے اِن کی قسمت جگا دی ہے۔ ورنہ یہ فوجی بوٹوں کی بھاری ٹاپوں کے علاوہ آج تک کچھ نہیں سُن پائے۔
سر کھانے کا کیا ہو گا۔ اللہ یار خان نے مجھ سے پوچھا۔
حضور ہم دونوں آج آپ کے مہمان ہیں۔ آپ ہمارے کھانے کا مناسب انتظام فرمائیں۔

سر! بیگم صاحبہ بھی یہی کھانا کھائیں گی۔

اللہ یار خان ہم روز کھاتے ہیں۔ اس سوہنی کُڑی نے اگر ایک دن کھالیا تو کیا ہو گا۔

سر! میرا مطلب ہے یہ فوجی کھانا بیگم صاحب کیسے کھائیں گی۔

کھالیں گی اللہ یار خان، تم فکر مت کرو۔

اللہ یار خان پھر ہمارے لیے میس (MESS) سے کھانا لینے چلا گیا۔ وہ کھانا لے آیا۔ سبزی، دال، سلاد وغیرہ تھی۔ گوشت کا ناغہ تھا۔ اس لیے فرائی کی ہوئی مچھلی بھی تھی۔ اللہ یار نے اپنے طور پر کنٹین سے دہی، اچار اور فروٹ کا بھی انتظام کر لیا۔ میں نے اب اس کو کہا کہ تم اب سوہنی کُڑی کو بھی جگا دو۔ وہ ہنس پڑا اور شرما کر باہر نکل گیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ "سر آپ ہی ان کو جگائیں۔"

میں نے حنا کو جگایا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر میرے ساتھ کھانے کے لیے آ بیٹھی۔ اس نے بہت شوق سے یہ کھانا کھایا۔ کھانے کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

احمد صاحب یوں تو سب چیزیں بہت اچھی پکی ہوئی ہیں۔ لیکن اس ماش کی دال کا تو کوئی جواب نہیں۔

میں نے حنا کو بتایا کہ میرے ایک کرم فرما اور بزرگ دوست حضرت احسان دانش جو ہندو پاک کے ایک بڑے نامور شاعر ہیں جب کبھی میرے پاس تشریف لاتے ہیں تو مرغ کھانے کی بجائے لنگر کی دال کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں فوجی لنگر جیسی دال کہیں بھی نہیں پکتی۔

ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ حوالدار میجر میرا مودمنٹ آرڈر اور دوسرے کاغذات لے کر آ گیا۔ میں نے سب کاغذات چیک کیے اور حوالدار میجر کو رسید دے دی۔ وہ چلا گیا تو میں نے اللہ یار کو کہا کہ ایک ٹانگہ لے آؤ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹانگہ لے آیا۔ اور پھر میں اور حنا اس میں سوار ہو کر حنا کے ہوٹل میں چلے گئے۔ حنا نے اپنا کمرہ کھولا۔

مَیں نے مینجر کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ بل لا دے اور حنا کو سامان سنبھالنے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کا ایک ملازم بل لے آیا۔ مَیں نے بل کی ادائیگی کی اور پھر حنا کا اٹیچی کیس اٹھا کر ہم نیچے آ گئے۔ ٹانگے پر بیٹھ کر کیمپ واپس آ گئے۔

میری یونٹ اور کورسگنل کے میرے دوستوں کو جب میرے اچانک پوسٹنگ کی اطلاع ملی تو وہ جوق در جوق مجھے ملنے اور سوہنی کُڑی کو دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ شام کا کھانا کھا کر مَیں نے سرکاری گاڑی منگوائی۔ اللہ یار خان نے سامان اُٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ مَیں نے سب یونٹ کے لوگوں سے ملاقات کی اور پھر گاڑی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہمارے کیمپ سے ریلوے سٹیشن کوئی زیادہ دور نہ تھا گاڑی دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ اللہ یار نے سامان اُتار اور ویٹنگ روم میں جا کر رکھ دیا۔ مَیں نے حنا کو کہا۔

حضور آج آپ کو میرے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا ہو گا۔

وہ کیوں۔ حنا نے حیرت و استعجاب کے عالم میں پوچھا۔

حضور اس لیے کہ مجھے سرکاری طور پر سیکنڈ کلاس کا ریلوے وارنٹ ملتا ہے۔

جی نہیں۔ وہاں رش ہو گا۔ ہم اطمینان سے باتیں بھی نہ کر سکیں گے۔

اللہ یار کو حنا نے اپنے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کے لیے اور میرے ٹکٹ کے اضافی پیسے دے کر دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ منگوا لیے۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد ٹرین آ گئی۔ فرسٹ کلاس کا ایک چھوٹا ڈبہ ہمیں خالی مل گیا۔ ہم نے خوشی خوشی اس میں ڈیرا لگا لیا۔ مَیں نے متعلقہ اہل کار کو کہہ کر ریشاور کے لیے دو سیٹیں بک کروا لیں۔ اور اس طرح ہم بڑے آرام اور سکون سے بستر بچھا کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ ٹرین چل پڑی۔ ریل کے شور سے ایک دوسرے کی باتیں سمجھنے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ حنا اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ایک عجیب عادت تھی کہ جب بھی وہ میرے پاس صوفہ پر یا پلنگ پر آ کر بیٹھتی تو فوراً لیٹ جاتی اور سر میری گود میں رکھ کر پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگ

جاتی۔ شاید یہ اس کا کوئی کمپلیکس (COMPLEX) تھا اور اس طرح اسے نفسیاتی طور پر ایک گونہ راحت میسر آتی تھی۔

٭٭٭

ہم دوسری صبح پشاور جا پہنچے۔ میں نے مصلحتاً اُسے کہا کہ وہ ڈین ہوٹل میں قیام کرے آج ہی کا دن ہے کل تو چلے جائیں گے۔ ہم نے حنا کو ڈین ہوٹل میں ڈراپ کیا اور میں اور اللہ یار خاں خیبر بزکس چلے آئے۔ سامان اُتارا اور میں نے اللہ یار کو ہدایت کی کہ اپنا جو سامان سٹورز میں ہے وہ نکلوا لے۔ اور میں دوستوں سے ملنے شہر چلا گیا۔

اللہ یار خاں کو میں نے بتا دیا تھا کہ میں رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اور واپسی رات کو دس بجے کے بعد ہی ہوگی۔ میں پشاور صدر اور شہر میں دوستوں سے فرداً فرداً ملا۔ سب کو میرے جانے کا بڑا افسوس تھا۔ میں نو بجے رات حنا کے پاس ڈین ہوٹل آ گیا۔ کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ گپ شپ کی اور پھر میں نے حنا سے اجازت طلب کی۔

ابھی تو نو بجے ہیں۔ بیٹھو تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔

حنا محبت کرنے والوں کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ہم جب بھی ملتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے اب پہلی بار ملے ہیں۔

احمد تم یہ بتاؤ کہ میں اب کراچی واپس چلی جاؤں یا تمہارے ساتھ لاہور آؤں اور وہاں کچھ دن رہوں۔

حضور میں نے یہ دس دن کا جائننگ ٹائم اسی لیے لیا ہے کہ لاہور دس دن اکٹھے گذاریں گے۔

پھر اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے۔

حنا! میں سمجھتا ہوں کہ اب تم مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی ہو۔ میرے خیال میں اب تم اس قابل ہو کہ گھر گرہستی کی ذمہ داریاں اچھی طرح سے نبھا سکو۔ یہ ہوٹلوں کی کیا زندگی ہے چار دن ایک جگہ۔ دس دن دوسری جگہ۔ آخر یہ قارون کا خزانہ بھی تو ایک دن ختم ہو ہی جائے گا۔ اسی وقت تمہاری عمر ڈھل چکی ہوگی۔ پھر کوئی بھنورا نہیں منڈلائے گا۔ اس وقت

تمہیں یہ جوانی ضائع کرنے کا بے حد افسوس ہوگا۔
لیکن احمد میں تمہارے بغیر اور کسی مرد کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔
حنا اس گتھی کو تو اب سلجھانا ہی ہوگا۔ ایک معمولی سی بات کو زمانے والوں نے کتنا بڑا اسکینڈل بنادیا تھا۔ میرے خیال میں اب اس کا حل یہی ہے کہ آپ کسی موزوں آدمی کے ساتھ شادی کرلیں اور امن و سکون کی زندگی گذاریں۔
احمد اگرچہ پاکستان میں خوبصورت مردوں کی کوئی کمی نہیں لیکن جو سچ پوچھو تو مجھے ان سے نفرت ہوگئی ہے۔ یہ باہر سے کتنے اُجلے ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر ہوس اور شہوت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ ان کے اندر کا انسان کتنا کمینہ اور بزدل ہے مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔
لیکن حنا میں بھی تو پاکستانی ہوں۔
ٹھیک ہے۔ اگرچہ تم کوئی بہت زیادہ خوبصورت آدمی نہیں ہو۔ لیکن تمہارے اندر کا آدمی بہت خوبصورت اور پوجا کرنے کے قابل ہے۔ میں اس کی مورتی کو اپنے من مندر میں کب کی بسا چکی ہوں۔ اب کیسے اس مورتی کو نکال کر باہر پھینک دوں۔
حنا پھر تم نے بات الف۔ ب سے شروع کردی ہے۔ یہ اتنا عرصہ جو میں اپنا رونا تمہارے سامنے روتا رہا ہوں۔ وہ بے مقصد تو نہیں تھا۔ میرے حالات اگر مجھے اجازت دیتے تو میں تم سے کب کی شادی کر چکا ہوتا۔
تو پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ میں بمبئی واپس چلی جاؤں اور وہاں اپنی پسند کے کسی آدمی سے شادی کرلوں۔
میرا خیال ہے۔ یہی عقل مندی کی بات ہوگی۔
احمد اب اگر میں بمبئی واپس چلی بھی جاؤں تو میری ماں مجھے منہ نہیں لگائے گی۔
حنا تمہاری ماں کی مامتا اسے ایسا ہرگز نہ کرنے دے گی۔ تھوڑی دیر کے لیے ناراضگی کا اظہار ضرور کرے گی لیکن پھر ٹھیک ہو جائے گی۔
نہیں احمد تم میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے۔ جب بھی کسی بات

پراڑ جائے تو پیچھے نہیں ہٹتی۔

تم یہ کر کے تو دیکھو اگر حالات سازگار نہ ہوئے تو واپس چلی آنا۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تھوڑی سی رقم تمہارے بنک اکاؤنٹ میں منتقل کر دوں تاکہ تم جب بھی چاہو اپنے لیے ایک اچھا سا مکان بنوا سکو اور اپنے لیے ایک نئی شیورلیٹ گاڑی خرید سکو۔

نہیں جنا۔ بہت شکریہ آپ کا۔ مجھے اپنے موجودہ سٹیٹس (STATUS) کے مطابق ہی رہنا چاہیے۔ اگر میں نے فوج کی یہ نوکری کرنی ہے تو جس طرح پھٹیچر سی حالت میں اب رہ رہا ہوں۔ پھر بھی مجھے اسی حالت میں رہنا ہوگا۔ میں پاکستان آرمی کا ایک جے سی او ہوں اگر ایک اچھا کار رکھ لیتا ہوں تو سب آفیسرز میرے اسی طرح خلاف ہو جائیں گے جس طرح آپ کے ساتھ پاک صاف اور پاکیزہ تعلقات رکھتے ہوئے وہ میری جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

اگر میں انڈیا جا کر امی کی اجازت سے اپنے کسی پسند کے آدمی سے شادی کر لوں تو پاکستان آپ سے ملنے آیا کروں گی۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن تمہارے شوہر نامدار ضرور رقابت محسوس کریں گے۔

میں شادی سے پہلے اپنے اور تمہارے تعلقات کے متعلق اُسے وضاحت سے بتا دوں گی۔

نہیں جنا تم نہیں جانتی۔ مرد اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنے جان جوکھوں کے بعد تم شادی کرو اور پھر اس میں کسی خرابی کا احتمال ہو۔

* * *

اچانک میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے اجازت طلب کی تو جنا کہنے لگی۔ اب تو کوئی ٹیکسی بھی نہ مل سکے گی۔ میں نے اُسے بتایا میرا میس (MESS) قریب ہی ہے۔ دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے وہ ہوٹل کے

مین گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

دوسرے دن صبح ہمیں لاہور روانہ ہونا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو اللہ یار خان بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر اپنی بیرک میں چلا گیا اور میں جلد ہی سو گیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے اللہ یار خان نے مجھے آ کر جگایا۔ میں نہایا دھویا۔ نماز پڑھی۔ ناشتہ کیا اور پھر اللہ یار نے میرا سامان نیچے اُتارا۔ فوجی گاڑی آ گئی اور ہم اس میں سامان رکھ کر حنا کو لینے ڈین ہوٹل گئے۔ حنا پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ ہم جلد ہی ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ سامان لے کر اندر گئے۔ ہم سیٹیں تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے حنا ہم دونوں کے ریلوے وارنٹ لے کر کاؤنٹر پر گئی۔ اس نے میرا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر مزید رقم ادا کر کے اسے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ میں تبدیل کروایا اور اپنے لیے ایک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا۔

ہمیں سیٹیں آسانی سے مل گئیں۔ ہم دن بھر خوش گپیاں کرتے شام کو لاہور پہنچ گئے سٹیشن سے باہر آ کر چھاؤنی کے لیے ایک ٹیکسی لی۔ اللہ یار خان کو مع سامان کے میس میں چھوڑا۔ اور میں اپنا مختصر سا سامان لے کر حنا کے ساتھ اسی ٹیکسی میں فلیٹیز آ گیا۔ وہاں ایک ڈبل روم ہم نے حاصل کیا۔ ہم دونوں پورے دس دن ہوٹل سے باہر نہ نکلے۔ مجھے ہر وقت حنا پیاری پیاری باتیں سناتی رہتی اور میں حسن و رنگ کی اس دنیا میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کھویا رہا۔ ہم نے کسی انارکلی کی سیر نہ کی۔ کوئی جہانگیر کا مقبرہ نہ دیکھا ہم دونوں تصور ہی تصور میں اپنا تاج محل سجائے دس دن ایک نئی دنیا میں رہے۔ آخر جدائی کی گھڑی آ پہنچی۔ آج میری چھٹی کا آخری دن تھا۔ آج شام کو مجھے اپنی نئی یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی۔ میں نے حنا کو کہا کہ آپ شام کی فلائٹ سے کراچی واپس چلی جائیں۔ اگر آپ یہاں فلیٹیز میں ہی رہیں تو میں کیسے آرام و سکون سے اپنے میس (MESS) میں رہ سکوں گا۔

چنانچہ یہی طے ہوا کہ میں حنا کو کراچی کی فلائٹ میں بٹھا کر میس چلا جاؤں گا۔ حنا نے جاتے وقت یہ کہہ کر کہ نئی جگہ ہے تمہارے اخراجات زیادہ ہوں گے تھوڑے سے پیسے رکھ لو۔

میں انکار کرتا رہا لیکن اس نے میری جیب میں زبردستی ایک لفافہ ڈال دیا۔ وہ لفافہ میں نے اس کے چلے جانے کے بعد کھول کر دیکھا تو اُس میں ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔

وہ شمعِ فروزاں اپنے پیچھے اندھیروں کو چھوڑ کر سب اُجالے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں شکستہ دلی کے عالم میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ائرپورٹ سے باہر آگیا۔ ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنے میس ([illegible]) میں آگیا۔

اللہ یار خان نے صوبیدار میجر صاحب سے مل کر میرے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ اس کی صفائی کر کے اس میں میرا سب سامان قرینے سے لگا دیا تھا۔ بستر ایک پلنگ پر لگا ہوا تھا۔ ضرورت کا فرنیچر بھی اس نے حاصل کر لیا تھا۔ کمرے سے ملحق ایک الگ باتھ روم بھی تھا۔ اللہ یار خان کے رہنے کے لیے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بھی ساتھ تھی۔

میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور کھانا کھانے کے لیے میس میں چلا گیا۔ سب ممبران بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ نہ جانے اُن کو کیسے میرے اور حنا کے تعلقات کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ چونکہ ان میں سے ایک دو جو میرے دیرینہ واقف کار تھے، مجھ سے پوچھا۔

حضور کراچی والے مہمان چلے گئے ہیں۔

جی ہاں چلے گئے ہیں۔

٭٭٭

میں کھانا کھا کر تھوڑی دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ کچھ دوست تاش کھیل رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی کھیلنے کی دعوت دی۔ لیکن میں نے معذرت کر لی۔ میں خبریں سُن کر واپس اپنے کمرے میں آگیا اور جلد ہی سو گیا۔

دوسرے دن میں نے آفس میں رپورٹ کی۔ کمانڈنگ آفیسر سے انٹرویو ہوا۔ انھوں نے محنت سے کام کرنے کی تلقین کی۔ اور پھر میں انٹرویو کے بعد اپنے دفتر میں آکر بیٹھ گیا۔

میں ایک عرصے تک اس دفتر میں جھک مارتا رہا۔ کسی نے میرے دل کی ویرانی کا

سبب نہ پوچھا۔ ہر کوئی اپنی بنائی ہوئی خیالی دنیا میں گم۔ کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسروں کے غم میں شریک ہوتا۔

* * *

حنا نے کراچی پہنچ کر خط لکھا۔ خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔ ہوٹل سے باہر آنے کو جی نہیں چاہتا۔ تم پاس تھے تو فی الواقعہ یہ تاج محل جنت سے کم نہ تھا۔ اب تم نہیں ہو تو اس میں کوئی کشش نہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے ڈوب جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتی کہ میں کئی صدیوں سے ہوا میں معلق کھڑی ہوں۔ نہ جینے کا کوئی ڈھنگ نہ مرنے کی کوئی صورت نہ جانے میرا بمبئی جانے کو کیوں جی نہیں چاہتا۔ حالانکہ میری ماں وہاں رہتی ہے۔ اس ملک سے میرا ایک خاص رشتہ ہے۔ پاکستان میں مستقل نہ رہنے کی خواہش کے باوجود پھر اس ملک کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں رہ کر امید کا یہ رشتہ تو قائم رہتا ہے کہ میں جب چاہوں گی تم سے ملنے کے لیے لاہور جا سکتی ہوں یا تم مجھ سے ملنے کے لیے کراچی آ سکتے ہو۔ اگر بمبئی واپس چلی گئی تو یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ تم کہتے ہو میں کسی اچھے سے آدمی کے ساتھ ایک مستقل بندھن میں بندھ جاؤں۔ اگر ایسا کر لوں اور پھر جب کبھی میں تم سے ملنا چاہوں تو میری راہ میں اگر وہ حائل ہو گیا تو پھر کیا ہو گا۔ کیا ہو گا!

کیا یہ ہماری محبت کی موت نہ ہو گی۔ یہ نازک رشتہ یونہی ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹ جائے گا۔ اور میں پھر عقل کے صحراؤں میں یونہی بے مقصد بھٹکتی رہوں گی۔ ابھی تو یہ سب کچھ میرے بس میں ہے۔ میں کراچی میں۔ تم لاہور میں۔ میں جب چاہوں تم سے ملنے فوراً لاہور آ سکتی ہوں۔ اور اگر کل پرسوں یا کسی دن بمبئی واپس چلی گئی تو پھر کیا ہو گا۔ یونہی بے نام سی موت مر جاؤں گی۔

* * *

میں حنا کا خط پڑھ کر اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ کرنل صاحب میرے قریب کھڑے میری سراسیمگی اور افسردگی کا بغور مطالعہ

کر رہے تھے۔ مجھے قطعاً ان کی موجودگی کا کوئی احساس نہ ہوا۔ جب انہوں نے مجھے مخاطب کیا تو مَیں یکایک چونک پڑا اور پھر سے فوجی ماحول میں واپس آ گیا۔

کیوں صاحب۔ خیریت تو ہے۔ آپ خط پڑھتے پڑھتے بہت افسردہ ہو گئے ہیں۔

خیریت ہے سَر۔ ایک دوست کا خط ہے۔ بے چارے نے مجھ سے بچھڑنے کا رونا رویا ہے۔

آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ مجھے چیف سگنل آفیسر صاحب نے خاص طور پہ ہدایت دی ہے کہ مَیں آپ کی لُک آفٹر (LOOK AFTER) اچھی طرح سے کروں۔

شکریہ سَر۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اور پھر کرنل صاحب واپس اپنے دفتر میں چلے گئے۔

مَیں نے حنا کو کراچی کے پتہ پر خط لکھا اور اپنی افسردگی اور دکھوں بھری زندگی کا رونا رویا۔ محبت میں آخر اور کیا ہوتا ہے۔ آہیں۔ آنسو اور ہجر و فراق میں مسلسل جلنا۔ کرب و اذیت کا یہ عالم ہی محبت کرنے والوں کا مقدر ہوتا ہے۔ مَیں نے کافی دنوں تک حنا کے خط کا انتظار کیا۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اسے لاہور سے گئے ہوئے آج پورے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ مَیں سوچتا نہ جانے اس نے خط کیوں نہیں لکھا۔ اگر وہ بمبئی چلی گئی ہو تو بھی جاتے وقت اسے چاہیے تھا کہ مجھے ایک مختصر سا خط اطلاع کے لیے لکھ دیتی۔ مَیں کئی دنوں تک انتظار کی سولی پر مصلوب رہا۔

آخر کئی دنوں کے انتظار کے بعد بمبئی سے اس کا خط آیا۔

"مَیں تمہیں خط لکھنے کے دو دن بعد بمبئی آ گئی تھی۔ یہاں آ کر حالات بہت ہی خراب دیکھے۔ میں ایئرپورٹ سے سیدھی امی کے پاس ان کے فلیٹ پر گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سیخ پا ہو گئیں۔

کیوں آئی ہو میرے گھر۔ فوراً نکل جاؤ میاں سے۔ اس گھر میں تمہارے لیے

اب کوئی جگہ نہیں ہے۔

امی ناراض نہ ہوں۔ میں معافی مانگنے آئی ہوں۔

میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی۔ تم نے ایک بھُو کے کنگلے کو مجھ پر ترجیح دی ہے۔

نہیں امی یہ بات نہیں ہے۔ احمد میرا محسن ہے۔ اس کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔

وہ کنگلا تم کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکتا۔

امی اس نے مجھے وہ کچھ دیا ہے جو بادشاہوں کے خزانوں میں بھی نہیں۔ مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے مجھے ایک ولولہ اور حوصلہ بخشا ہے۔ جس کے سہارے مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ورنہ اس سے ملنے سے پہلے میں ایک پتھر کی سِل تھی۔ ایک بے جان لاشہ تھی جسے جینے کی کوئی آرزو نہ تھی۔

احمد صاحب! میں حیران ہوں۔ میں نے اپنی ماں میں بڑی عجیب و غریب تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ میں نے اپنی گذشتہ زندگی میں اُن کو کبھی ایسا نہ پایا جیسی کہ وہ اب ہیں۔ جب ہم لکھنؤ سے بمبئی آئی تھیں تو اس وقت میری امی بھرپور جوان تھیں۔ بلا کی حسین تھیں۔ لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی مرد سے ان کے کسی قسم کے قابلِ اعتراض تعلقات رہے ہوں۔ وہ اخلاق لحاظ سے نہایت صاف ستھری زندگی گذار رہی تھیں۔ لیکن اب میں ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ وہ سرِ شام ہی سے گھر سے چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی جلدی اور کبھی دیر سے لوٹتی ہیں۔ وہ ہر روز اپنے ساتھ کسی نہ کسی اجنبی مرد کو لے کر آتی ہیں۔ عام طور پر وہ بالکل ہی کم تر درجے کے مردوں کو ساتھ لاتی ہیں۔ وہ گندے، میلے کچیلے ہوتے ہیں لیکن ہوتے جوان ہیں۔ وہ ان کو فلیٹ میں لا کر نہلاتی دھلاتی ہے۔ ایک مردانہ کپڑوں کا اچھا سا جوڑا جو انہوں نے اسی غرض کے لیے رکھا ہوا ہے پہناتی ہیں۔ اور پھر اس کے جسم پر کلون کا سپرے کرتی ہیں۔ احمد صاحب! اب میرے رہنے کی وہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ امی نے مجھے ایک چھوٹے سے سٹور میں بستر

لگا دیا ہے۔ خود بڑے کمرے میں اُس اجنبی مرد کے ساتھ رات بسر کر لی تی ہے۔ میں ایک مستقل عذاب میں گرفتار ہوں۔ میں سوچتی ہوں میں نے بمبئی واپس آ کر بڑی غلطی کی ہے۔

میری ماں اُس ایک رات کے مہمان کو دوسری صبح ناشتہ کروا کر پانچ روپے دے کر فارغ کر دیتی ہے اور جاتے وقت اُس مرد سے وہ کپڑے اُتروا لیتی ہے۔ جو شام کو اُس کو پہنائے گئے تھے۔ میری ماں تمام دن سوئی رہتی ہے۔ شام کو اُٹھتی ہے۔ نہاتی دھوتی ہے اور پھر کھانا کھا کر رات کی تیاری میں لگ جاتی ہے۔ احمد! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری ماں ایک لا علاج قسم کی ذہنی مریضہ ہے۔ جو جنس کی بھٹی میں سُلگ رہی ہے۔ اس کی یہ جنسی بے راہروی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اب مجھے اپنی ماں سے خوف آنے لگا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں ان حالات سے کیسے سمجھوتا کر سکتی ہوں۔ اس سے الگ ہو کر کہیں اور رہنا بھی میرے لیے بڑا مشکل ہے۔ بمبئی انتہائی غیر محفوظ جگہ ہے یہاں پیرس کی طرح بے شمار جنسی جرائم کا ارتکاب ہر روز ہوتا ہے۔ میں سوچتی ہوں مہاراجے کے پاس واپس چلی جاؤں۔ پھر سوچتی ہوں اگر انہوں نے مجھے دھتکار دیا تو پھر کیا ہو گا۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔ کبھی خیال آتا ہے۔ واپس کراچی چلی جاؤں یا اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں لاہور بھی شفٹ ہو سکتی ہوں۔ میرا کوئی ڈاک کا پتہ نہیں۔ میں آپ کو کیا لکھوں۔ بہر حال کچھ روز کے بعد میں آپ کو پھر خط لکھ کر نئے حالات سے آگاہ کروں گی۔

میں اس کا یہ طویل خط پڑھ کر لرز اُٹھا۔ بے چاری ایک بے آسرا خاتون دن بدن کس طرح ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ امن اور سکون کی تلاش میں برصغیر میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ لیکن کہیں بے چاری کو عزت سے سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں آتی۔ میں سوچنا لگا اس کی تباہی میں میرا بھی تو ہاتھ ہے۔ یا تو میں شروع ہی سے اس سے تعلقات نہ بڑھاتا۔ اور جب تعلقات کسی نہ کسی وجہ سے استوار ہو گئے تھے تو اس بے چاری کو نامساعد حالات و واقعات کے منجدھار میں بے یار و مددگار

چھوڑ دینا کہاں کی شرافت ہے۔

مَیں فوجی روٹین کے مطابق دفتر میں قلم گھسیٹتا رہا اور کرنیلوں کے کال بیلوں (CALL BELLS) پر ناچتا رہا۔ مَیں کندھوں پر ایک بے جان لاشہ اُٹھائے پھر رہا تھا۔ ایک ایسا لاشہ جو خاکی یونیفارم زیب تن کرتا۔ فوجیوں کے ایک جم غفیر میں رہتا لیکن ذہنی طور پر ان سے اجنبی اور بے گانہ تھا۔ مجھے کسی آدمی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مَیں سمجھ رہا تھا میرا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے اس انبوہِ کثیر میں رہتے ہوئے بھی کسی کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا۔ لیکن اپنے آپ کو بمبئی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں پاتا۔ جس میں ایک ہی رہائشی کمرہ ہے۔ جس میں شام ہی سے حنا کی ماں ایک اجنبی مرد کے ساتھ مقفل ہو جاتی ہے۔ اور حنا سٹور کے ایک چھوٹے سے 6×8 افٹ کے کمرے میں اذیت ناک زندگی گذار رہی ہے۔ مَیں سوچتا ہوں انسان کی زندگی میں بھی عجیب عجیب مرحلے آتے ہیں۔ ایک کروڑ پتی خاتون جو کبھی ایک والیۂ ریاست کی مہارانی تھی۔ اس سے الگ ہوئی تو تاج محل، فلیٹیز، فلیش مین اور دکن ہوٹل میں قیام پذیر ہوتی ہے۔ اور آج اسے اپنے ہی گھر عزت سے ایک چارپائی بچھانے کی جگہ میسّر نہیں۔ مَیں جتنا اس معاملے کے متعلق سوچتا یہ اتنا ہی اُلجھتا جاتا۔ پھر کبھی مَیں سوچتا یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ اسے محض میری وجہ سے ان اذیت ناک لمحوں سے دوچار ہونا پڑا ہے

دفتر کا وقت ختم ہو گیا اور مَیں اٹھ کر میس (MESS) میں آ گیا۔ کھانا کھانے کو جی نہ کرتا تھا۔ یونیفارم اُتارا اور بستر پر لیٹ گیا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آتے اب مجھے حنا کو اپنا لینا چاہیئے۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ آنکھ لگ گئی اور مَیں سو گیا۔ اللہ یار خان میس سے شام کی چائے لے کر آیا تو اس نے مجھے جگایا۔

سَر طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔

ٹھیک ہوں اللہ یار خان۔

سَر میس (MESS) سرونٹس کہہ رہے ہیں کہ آپ نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔

ہاں بھوک نہیں تھی۔

میں نے چائے پی اور پھر پوینٹ گارڈن میں جاکر بیٹھ گیا۔ میں وہاں گھنٹوں اکیلا بیٹھا مستقبل کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ رات گئے تک وہاں بیٹھا رہتا اور پائپ پیتا رہتا۔ اکثر اللہ یار خان آکر مجھ کو واپس میس میں لے آتا۔ ایک دن وہ کہنے لگا۔

سر میں نہ کہتا تھا کہ یہ سوہنی کڑی آپ کو برباد کر کے چھوڑے گی۔

اللہ یار سوہنی کڑی تو بے چاری اپنی ماں کے پاس واپس بمبئی چلی گئی ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔

سر ابھی بھی آپ نہیں سمجھتے۔ یہ سب کیا دھرا اس سوہنی کڑی ہی کا ہے۔ کیا اس سے ملنے سے پہلے بھی آپ کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ پہلے تو آپ بڑے ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ راگ رنگ کے رسیا تھے۔ میلوں ٹھیلوں کے شوقین تھے۔

اللہ یار خان ان چیزوں کا تو اب بھی مجھے بڑا شوق ہے۔ تم زیادہ میری فکر نہ کیا کرو۔

* * *

دوسرے دن حنا کا ایک بڑا ہی طویل اور مفصل خط ملا۔ پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اجنبی سرزمین پر بیٹھا کوئی عجیب و غریب ناول پڑھ رہا ہوں۔ حنا نے اپنی ماں کے متعلق چونکا دینے والی باتیں لکھیں۔ ہم دونوں کو اب یقین ہو گیا تھا کہ ساحرہ (حنا کی ماں) موجو کی قید میں رہتے ہوئے ایک مستقل ذہنی مریضہ بن گئی ہے۔ جس کے باعث اس کی پرورژن (PERVERSION) یعنی جنسی بے راہروی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب اس کا اپنی حالت میں آنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ دن بدن ایک حسرتناک انجام کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جس کا منطقی نتیجہ مکمل تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حنا نے اپنے نئے خط میں لکھا تھا۔

احمد صاحب! میں نے آپ کو اپنے گذشتہ خط میں بتایا تھا کہ کس طرح میری ماں کے شب و روز جنسی بے راہروی کی نذر ہو رہے ہیں۔ میں نے آپ کو یہ بھی بتایا

تھا کہ وہ ہر روز ایک نئے آدمی کو رات بسر کرنے کے لیے لے کر آتی ہے۔ ایک دن مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ ہوا یوں کہ ایک دن شام کو میری ماں تسکین کی تلاش میں گھر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ ایک جوان سا آدمی جس کی عمر کوئی اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ جھومتا جھامتا ہمارے فلیٹ پر چڑھ آیا۔ وہ نشہ میں دُھت تھا۔ غالباً اُس نے تاڑی پی ہوئی تھی۔ دُور ہی سے اس کے منہ سے تاڑی کی بُو آ رہی تھی۔ وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔

او چھوکری وہ میم صاب کدھر ہے۔

کون میم صاب۔

وہ خوبصورت میم صاب جو یہاں رہتی ہے۔ جس کا یہ فلیٹ ہے۔

اس خوبصورت میم صاب سے تمہارا کیا تعلق ہے۔

وہ ہمارا بی بی ہے۔

تمہارا بی بی کیسے ہے اس کا شوہر تو لکھنؤ میں رہتا ہے۔

وہ اُدھر ہوگا۔ اِدھر ہم ہے۔

تم مفت میں اس کے شوہر بن بیٹھے ہو۔ اس کا تم سے کیا تعلق۔

تعلق یہ ہے کہ جب تم اِدھر نہیں تھا تو وہ ایک دن ہم کو ماہم سے لے آیا۔ ہمارے ساتھ اس نے شادی کر لی۔ اور بہیں بہت دن تک اپنے پاس رکھا۔ پھر جب اس کا دل بھر گیا تو ہم سے لڑ پڑی۔ اور ہم کو گھر سے نکال دیا۔ پر آج ہم فیصلہ (فیصلہ) کرنے آیا ہے کہ وہ ہمارا بی بی ہے یا نہیں۔ اگر بی بی ہے تو روز روز یہ نیا نیا آدمی کو اپنی مَن موج کے لیے ادھر نہ لایا کرے۔ ورنہ میں اسے اور اس کے ایک رات کے مہمان کو، دونوں کو قتل کر دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے ڈب سے ایک چھُرا نکال کر ہوا میں لہرانا شروع کر دیا۔ میرا ڈر کے مارے خون ہی خشک ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا

دادا آپ کا نام کیا ہے۔

سب لوگ ہم کو خوشیا بولتا ہے۔ ہمارا نام سننے سے بڑے بڑے دادا لوگوں

کی جان نکل جاتی ہے۔

اچھا خوشیا صاحب آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس خوب صورت عورت نے کیا آپ کے ساتھ شادی کر لی ہے۔

جی ہاں کر لی ہے۔ ہم کو جھوٹ بولنے کا کیا جرورت (ضرورت) ہے۔

کیا نکاح پڑھا گیا ہے۔

نکاح وکاح کوئی نہیں پڑھا گیا۔

تو پھر کیسے یہ شادی ہوئی۔ مسلمانوں میں نکاح کے بغیر تو شادی نہیں ہو سکتی۔

بات یہ ہے کہ ایک رات جب میم صاب ہمارے ساتھ سوئی ہوئی تھی تو کہنے لگی خوشی محمد میں تمہارے ساتھ شادی کرتی ہوں۔ میں نے کہا میم صاب کر لو اور پھر اس نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میرے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں ڈال کر کہا۔ خوشی محمد تم کو یہ شادی قبول ہے۔ میں نے کہا قبول ہے۔ تو وہ کہنے لگی۔ خوشی محمد تین دفعہ یہی بات کہو تب ہماری شادی پکی ہوگی۔ میں نے تین مرتبہ کہا۔ یہ شادی قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔ اور پھر وہ مجھ سے لپٹ کر مجھے کاٹنے لگی —— چھوٹی میم صاب یہ تمہاری ماں سالی کوئی عام عورت نہیں ہے۔ نہ جانے اس میں بلا کی گرمی کہاں سے آ گئی ہے۔ یہ مجھے رات بھر نوچتی۔ کاٹتی اور بھنبھوڑتی رہی۔ آخر میں تنگ آ کر اپنی کھولی میں واپس چلا گیا۔

تو پھر آج کیوں آئے ہو۔

آج رات کو میں اُس کے پاس رہوں گا اور صبح اس سے دارو (شراب) کے لیے کچھ رقم لے کر جاوے گا۔ کل سے پی نہیں ہے۔ سالا سارا بدن ایک دن ایک دم سے ٹوٹ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میری ماں ایک جوان سال لڑکے جس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہوگی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ اس نے خوشیا کو دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنے نئے مہمان کو اندر کمرے میں بٹھا کر باہر آئی تو خوشی محمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

داما! آج کیسے آئے ہو۔

میم صاب میں آج آپ کے پاس ٹھہروں گا۔

لیکن میں نے تمہیں بُلایا تو نہیں۔

ہم خود آ گیا ہے۔ تمہارا بلانے کا کیا جرورت ہے۔

لیکن خوشی محمد آج تو ہمارے ساتھ ایک مہمان آیا ہے۔ آج تو یہ ٹھہرے گا۔ تم کل آجانا۔

یہ سالا کیسے ٹھہرے گا۔ تم ہمارا بی بی ہے یا اس کا۔

زبان سنبھال کر بات کرو۔ اپنی حیثیت کو مت بھولو۔ تم لوگوں کی حیثیت گندی نالی کے ایک کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔

خوشیا نے اُٹھ کر میری ماں کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ اندر جو رات گذارنے کے لیے مہمان بیٹھا تھا اس نے باہر آ کر مداخلت کرنا چاہی۔ خوشیا نے اپنی ڈب سے ایک چھرا نکال لیا۔ وہ نوجوان ٹھٹھک کر رہ گیا۔ خوشیا نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر بھی ایک زوردار تھپڑ مارا۔ بے چارا کمزور سا لڑکا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو گیا

میری ماں نے زار و قطار روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر خوشیا سے کہا۔

خوشی محمد خدا کے لیے اتنا ظلم نہ کرو۔ اگر دارو کے لیے پیسے چاہئیں تو یہ لو دس روپے

خوشیا نے وہ دس روپے لے کر جیب میں رکھ لیے اور کہنے لگا۔

میم صاب تم ہمارا لُگائی (بیوی) ہے۔ ہم آج رات کو تمہارے پاس جرور ٹھہرے گا۔

خدا کے لیے خوشی محمد ایسا نہ کرو۔ میرا یہ مہمان کیا کہے گا۔ اس کے سامنے تم مجھے رسوا کر رہے ہو۔ میں اسے بڑی منت سماجت کے بعد لائی ہوں۔ یہ آتے ہوئے ڈرتا تھا۔

تم کل آجانا۔ میں کل تمہارا انتظار کروں گی۔ کسی اور کو ساتھ نہیں لاؤں گی۔

نہیں ہم آج جرور ٹھہرے گا۔ تم ہمارا بی بی ہے۔ سالا ہم کو کیسے انکار کر سکتا ہے۔

دیکھو خوشی محمد اگر تم نے ٹھہرنا ہی ہے تو تم میری اس بیٹی کے پاس ٹھہر جاؤ۔ یہ جوان بھی ہے اور مجھ سے زیادہ خوبصورت بھی۔

کیوں چھوکری ٹھیک ہے۔ اس نے میری طرف پلٹ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
خوشی محمد اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے اپنے ساتھ سٹور میں لے جاؤ۔ میری ماں نے اس سے کہا۔

خوشیا میرا بازو پکڑنے لگا تو میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے غصے میں آکر مجھے ایک زور کا تھپڑ مارا۔ اور پھر چھرا نکال کر مجھ پر حملہ کرنے لگا۔ میرا تو خون ہی خشک ہو گیا۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
خوشی محمد مجھے معاف کردو۔ دارو کے لیے جتنے پیسے چاہئیں مجھ سے لے جاؤ۔ لیکن وہ درندہ صفت انسان مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سٹور کے اندر لے گیا۔ اور زبردستی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے لاکھ اس کی منت سماجت کی۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس نے پھر چھرا نکال کر مجھے ڈرا دھمکا کر بے بس کر دیا اور میں نے بے بس ہو کر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔
احمد سچ پوچھتے ہو تو میں جتنا اس دلدل سے بچتی تھی۔ اتنی ہی آسانی سے خوشیا مجھے اس دلدل میں گھسیٹ کر لے آیا۔ مہاراج کی قربت کو میں ایک مستقل اذیت سمجھتی تھی۔ خوشیا کا یہ جرم مجھے زیادہ برا نہ لگا۔ اگرچہ اس نے اپنے شوریدہ جذبات کو سکون کی گود میں سلایا۔ لیکن مجھے ایک انجانے جذبے سے روشناس کرایا۔ میں سمجھتی ہوں ہمارے اس معاشرے میں ہر مرد سعید ہے۔ خوشیا ہے۔ جو عورت سے سب کچھ لے لینے کے بعد اُسے آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ خوشیا جانے لگا تو اس نے مجھ سے دس روپے دارو کے لیے طلب کیے جو میں نے اسے دے دیے۔
احمد صاحب۔ اتنا بڑا واقعہ ہمارے گھر میں وقوع پذیر ہوا۔ لیکن میری ماں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ حسب سابق اپنے نئے مہمان کے ساتھ اپنے کمرے میں مقفل ہو کر اس کی خاطر مدارت میں مشغول تھی۔ اب خوشیا کو یہ عادت پڑ گئی ہے۔ وہ میری ماں کی عدم موجودگی میں آتا ہے اور چھرا نکال کر مجھے ڈرا دھمکا کر اپنی مطلب براری کرتا ہے اور جاتے وقت مجھ سے دس روپے دارو کے لیے بھی لے جاتا ہے۔ اب وہ کھلے بندوں یہ کہتا ہے کہ چھوٹی

میم صاحب اب میں تمہاری ماں کی بجائے تمہارے ساتھ ہی شادی کروں گا۔
احمد صاحب! آپ ہی بتائیں یہ کوئی جینے کی باتیں ہیں۔ جب پہلے ہم یہاں رہتے تھے تو سب فلیٹوں والے ہماری بڑی عزت کرتے تھے۔ اب ہم سے بات کرنے کا بھی کوئی روادار نہیں۔ ان فلیٹوں کی خواتین بھی ہم سے بات کرتے ہوئے کتراتی ہیں لیکن میری ماں ہے کہ اُسے اپنے کام سے کام ہے۔ اُسے کسی کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ لوگوں کی باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے مہمانوں کی خاطر مدارت میں لگی رہتی ہے۔ میری تھوڑی سی پرابلم ہے۔ مجھے اپنی بی۔ ایس۔ سی (B.S.C) کی سند لینا ہے وہ لے لوں تو فوراً ہی کراچی آجاؤں گی۔ ورنہ یہاں رہتے ہوئے مجھے بھی خوشیا جیسے لوگوں کی میزبانی کے فرائض مجبوراً سر انجام دینے پڑیں گے۔ کالج میں اپنی سند لینے کے لیے جا نہیں سکی۔ دو ایک دن میں جا کر لے آؤں گی۔ اور پھر اس کے بعد بمبئی میں میرا اور کوئی کام نہیں ہے۔ اگلے ہفتے آپ کو پھر خط لکھوں گی۔

خدا حافظ

تمہاری حنا

٭ ــ ٭

میں حنا کا یہ طویل اور مفصل خط پڑھ کر لرز اُٹھا اور بے حد پریشان ہوا سوچتا یہ سب کچھ میری جھوٹی تسلیوں کی وجہ ہو رہا ہے۔ اگر میں حنا کو جھوٹا سہارا نہ دیتا تو وہ اس وقت سے لے کر اب تک کسی کنارے لگ چکی ہوتی۔ محض میری قربت کی وجہ سے وہ ایک خوفناک منجدھار میں پھنس کر زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

بمبئی تو مجرموں کی ایک جنت ہے۔ یہ دادا لوگ دن دھاڑے بڑے سے بڑا جرم کرتے ہیں۔ اور انسانوں کے اس وسیع و عریض سمندر میں ڈبکی لگا کر دور جا نکلتے ہیں ایسی کمزور اور بے آسرا خواتین کو یہاں قدم قدم پر خوشی محمد اور مُوجُو جیسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔ وہ اپنی عفت کو کیسے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ حنا اگر پاکستان آجائے تو یہاں بھی اسے

اس طرح کے حالات و واقعات کے پیش آجانے کا امکان ہے۔ یہاں بھی جوشیا جیسے لوگوں کی کمی نہیں۔ وہ اس کو بلیک میل کرنا شروع کر دیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں میں اب اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اگر میں نے اُسے شروع ہی میں اپنا لیا ہوتا تو اب بے چاری ایسے حالات سے دوچار نہ ہوتی۔ جس آبگینے کو وہ بچا بچا کر لوگوں کی بُری نظروں سے چھُپتی پھر رہی تھی وہ ماں کی موجودگی بلکہ اس کے ایما پر اسے ایک ہوس پرست نے چکنا چور کر دیا۔

٭٭٭

میں پہلے بھی چُپ چاپ دنیا کی گہما گہمی سے دور الگ تھلگ زندگی کے دن بسر کر رہا تھا۔ لیکن حِنا کے اس خط نے تو مجھ سے زندگی کی رہی سہی آس بھی چھین لی۔ میرے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو چکی تھی۔ اللہ یار خان مجھے اکثر نصیحتیں کرتا رہتا۔ وہ بس ایک ہی بات کہتا۔ "صاب گذری ہوئی باتوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" اب وہ سوہنی کُڑی واپس نہیں آئے گی۔ اور میں تھا کہ سوہنی کُڑی کی واپسی کے انتظار میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔

حِنا کا نیا خط آیا۔ اب اس کا جو بھی خط آتا۔ ہر خط میں نئے سے نئے حالات و واقعات کے لرزہ خیز انکشافات ہوتے۔ اب اس نے لکھا تھا۔

اب میں جوشی محمد جیسے لوگوں سے بچنے کی خاطر تاج محل میں شفٹ ہو گئی ہوں اب اپنے آپ کو کوستی ہوں کہ پہلے ایسا کیوں نہ کیا۔ سب کچھ لُٹ جانے کے بعد شفٹ ہونے سے کیا فائدہ۔ بہر حال یہاں ذہنی سکون ضرور ہے۔ آپ کو خط پوسٹ کرنے کے بعد دوسرے دن میری ماں کے مقدمہ کی تاریخ تھی۔ میں بھی اُمی کے ساتھ کورٹس (COURTS) میں گئی۔ وہ سب لوگ جو مُوجُو کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ بشمول مُوجُو سب کے سب ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ اس دن وہ ایک جتھے کی صورت میں پیشی کے لیے کورٹس میں آئے تھے۔ میں اور میری ماں جب کورٹس میں پہنچیں تو مُوجُو ہمیں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں کھڑا دکھائی دیا۔ میری ماں نے مُوجُو

کو بلایا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ اس کے ساتھی اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہ گئے۔ میں ماں کی اس غیر متوقع حرکت پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ وہ قریب آیا تو اُس نے سلام کیا۔ میری ماں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مالک یہ جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔

ساحرہ یہ سب کچھ تو تم ہی نے کروایا ہے۔ تمہاری اس چھوکری نے لاٹ صاحب بہادر سے مل کر یہ سب کچھ کروایا ہے۔ ہم اس لونڈیا سے بھی نپٹ لیں گے۔

نہیں مالک اس میں میری بیٹی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر میری طرف سے یا اس کی طرف سے کوئی کارروائی ہوتی تو یہ کارروائی ہم پہلے بھی کر سکتی تھیں۔ میری بیٹی بے قصور ہے۔

مجھے تو یہی بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس لونڈیا کا کیا دھرا ہے۔

نہیں مالک آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔

ساحرہ بتاؤ اب مجھے کیوں بلایا ہے۔

مالک تم میری بات مانو تو کہوں۔

ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گا۔

مالک جب مقدمہ چلے گا تو میں آپ کے خلاف شہادت نہیں دوں گی۔ بلکہ یہ کہوں گی کہ معظم علی (موجو) میرا شرعی خاوند ہے۔ میں نے آج سے چار سال پہلے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے اکٹھے رہتے چلے آ رہے ہیں۔" میں مالک تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" ماں کی یہ باتیں سُن کر حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

موجو کی خوشی کے مارے باچھیں کھل اُٹھیں۔ ساحرہ مقدمہ ختم ہو گیا اور اگر میں بَری ہو گیا تو تمہیں اپنے ساتھ بستی میں لے جاؤں گا۔

نہیں مالک اب آپ میرے ساتھ رہیں۔

ساحرہ ادھر رہ کر کھائیں گے کیا۔ مجھے دارو کیسے ملے گا۔

مالک سب بندوبست ہو جائے گا۔ میرے پاس پیسے بہت ہیں۔ آپ کسی چیز کی کمی محسوس نہ کریں گے۔

رہنے کی جگہ ہے یہاں۔

مالک میرے پاس ایک فلیٹ ہے۔ میں آپ کی ہر طرح سے خدمت کروں گی۔ میرے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔

دارو کا کیا بنے گا۔

دارو آپ کو بلا ناغہ باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

اچھا ساحرہ پیشی کے بعد تمہارے ساتھ چلا چلوں گا۔ میں ذرا ساتھ والے لونڈوں کو بتا دوں کہ وہ میری لُگائیوں (بیویوں) کو بتا دیں کہ میں کچھ دن ساحر کے پاس اس کے گھر میں رہوں گا۔

اور پھر مُوجُو اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ مُوجُو کالے سیاہ رنگ کا موٹا بھدا سا آدمی تھا۔ کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا۔ بڑے بڑے سفید اُلجھے ہوئے بال سفید خشخاسی ڈاڑھی۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ کسرتی جسم۔ پان کے مسلسل استعمال سے دانت مستقل طور پر میلے۔ کرتا اور لُنگی پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں پہلوانوں کی طرح کا ایک تعویذ۔ پان کی بہتی ہوئی پیک کی ایک پتلی سی لکیر سفید ڈاڑھی کو بھی آلودہ کر رہی تھی۔ بڑے ہی اکھڑ مزاج کا آدمی تھا۔

وہ چلا گیا تو میں نے اُمی سے کہا۔

یہ اُمی آپ نے کیا کیا۔ چار سال کا طویل عرصہ آپ نے کتنی مشکل سے اس شخص کی قید میں گذارا۔ رات بھر یہ بھوکے کتے کی طرح تمہاری ہڈیوں کو چچوڑتا رہتا تھا اور دن میں آپ کو ایک زنجیر سے ایک لکڑی کے ساتھ باندھ دیتا تھا۔ اب خدا خدا آپ کے وہ زخم جو زنجیروں کی وجہ سے بن گئے تھے۔ ٹھیک ہوئے ہیں۔ میں نے کتنی مشکل سے مہاراج سے کہہ کر گورنر صاحب کو ٹیلی فون کروایا اور انہوں نے پولیس کی ایک

کثیر نفری بھیج کر مچھیروں کی سب بستیوں کو گھیرے میں لے کر آپ کو برآمد کیا اور اب پھر آپ کو موجو کی محبت ستانے لگ گئی ہے۔

میری ماں نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور مجھ سے بڑے ہی ملتجیانہ انداز میں کہنے لگی۔

حنا میری بیٹی میں موجو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

کیوں ممی موجو میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں۔ نہ اس کی شکل نہ صورت اُجڈ۔ گنوار۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اونچی سوسائٹی کی ایک معزز خاتون آپ میں یہ یکایک کیوں تبدیلی آگئی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

حنا بات یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ جب میں نے نواب سعادت علی خان سے طلاق لی تو اس وقت میں بالکل جوان تھی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں کسی پڑھے لکھے شریف اور قبول صورت آدمی سے دوبارہ شادی کر لیتی۔ میں نے جھوٹی انا کی خاطر ایسا نہ کیا۔ طلاق لینے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اونچے سٹیٹس (STATUS) کی عورت ہی سمجھتی رہی۔ میں عام آدمیوں کو تو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اگر دوبارہ شادی کروں تو کسی والیٔ ریاست سے یا بہت بڑے افسر سے۔ لیکن کسی ایسے آدمی کی طرف سے مجھے شادی کی کوئی پروپوزل (PROPOSAL) نہ ملی اور میں اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر اپنی سطح سے نیچے نہ آنا چاہتی تھی۔ حنا سچ پوچھتی ہو تو میں نے عین شباب کے عالم میں اپنی جنسی خواہشات کا مستقل گلا گھونٹا اور وہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ میں نے اپنے اندر کی دنیا میں کسی کو جھانک کر دیکھنے کی اجازت نہ دی اور کوئی میرے غم کا مداوا نہ کر سکا۔ حنا بات یہ ہے کہ یہ جنسی آگ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ اگر اسے ذرا سی بے احتیاطی سے بھی ڈیل (DEAL) کیا جائے تو یہ آدمی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور اس کی شخصیت کتنی بھی قدآور کیوں نہ ہو، ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا موجو نے مجھے اس آگ سے روشناس کرایا۔ اس میں احتیاط اور اعتدال کا عنصر نہ تھا اس لیے میری شخصیت اس

آگ میں جل کر راکھ ہو گئی۔ اور اس راکھ کے ڈھیر سے ایک پرورٹ (PERVERT) عورت نے جنم لیا۔ جو جنسی سکون کی تلاش میں باؤلے کتے کی طرح روز چوراہوں پر کھڑی اپنی جنسی تسکین کی خاطر ہر روز نیا شکار تلاش کرتی ہے۔ وہ اپنے اسی سفلی جذبے کی تسکین کی خاطر اپنی جوان بیٹی کی عفت کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتی۔ دراصل میں نے ساری عمر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ میں ایک نارمل انسان کی طرح معاشرے میں لوگوں سے بی ہیو (BEHAVE) نہ کر سکی۔ معاشرہ ایسے فرد کو دھکیل کر گناہوں کی دلدل میں پھینک دیتا ہے۔ پھر اس کے لیے قعرِ مذلت سے باہر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میری بیٹی مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس آبگینے کو تو سچا کر یہاں لائی تھی۔ اسے ایک جنسی زدہ ماں نے اپنی تسکین کی خاطر خوشیا کے حوالے کر دیا۔ جانا تم ہی بتاؤ کوئی ماں ایسی حرکت کر سکتی ہے۔ جس ماں نے ایسا کیا ہے کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ ایک نارمل عورت ہے یقیناً تم نفی میں جواب دوگی۔ میں خود تسلیم کرتی ہوں کہ میں جنسی مریضہ ہوں۔ آپ مجھ سے نفرت نہ کریں۔ میں سمجھتی ہوں ایسے لوگ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر ان کا علاج ہونا چاہیے۔ جانا میں تمہیں بتاؤں یہ موجو بھی نارمل آدمی نہیں ہے۔ یہ بھی جنسی مریض ہے۔ اس نے اپنے گھر میں چار عورتوں کو ڈال رکھا ہے۔ سب کی سب خوب صورت اور جوان۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ میں سمجھتی ہوں یہ اذیت پسند ہے۔ یہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر ایک گونہ سکون حاصل کرتا ہے۔ سب کو زور زور سے کاٹتا ہے مارتا ہے۔ اپنے جنسی رویے میں شدت روا رکھتا ہے۔ اوروں کا تو مجھے پتہ نہیں۔ پر جانا سچ پوچھتی ہو تو اس کی یہ عادت مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ میں اسی ایک بات سے اس کی گرویدہ ہو گئی ہوں۔ تم کہو گی بڑھا ہے، بدصورت ہے، گنوار ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر درست۔ لیکن جب وہ مجھے بھنبھوڑتا ہے۔ مجھ پر سختی کرتا ہے تو مجھے ایک گونہ راحت نصیب ہوتی ہے۔ کوئی نارمل مرد ایسا سلوک روا نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی میری طرح کی پرورٹ (PERVERT) عورت ایسے نارمل مردوں سے نباہ کر سکتی ہے۔ تم نے کراچی کے قیام کے دوران میں نوٹ نہیں کیا۔ آپ کا دوست احمد ایک نارمل

مردو ہے۔ مَیں عام زندگی میں بھی اس کے رویّوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ یہ رویّے اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل تھے۔ مَیں نے اپنے جس انسٹنکٹ (INSTINCT) کو ایک عرصے تک دبا کر رکھا۔ اس نے اندر ہی اندر مجھے بھسم کر ڈالا۔ اور مَیں ایک مستقل جنسی مریضہ بن گئی اور اب میرے یہ شب و روز تمہارے سامنے ہیں۔

☆ — ☆

جس عدالت کے باہر ہم بنچوں پر بیٹھی تھیں۔ اس عدالت کے دروازے پر آ کر ایک آدمی نے بڑے مخصوص لہجے اور اونچی آواز سے پکارا

سٹیٹ بنام معظم علی عرف مَوجُو وغیرہ۔

مَوجُو اور اس کے ساتھی عدالت کے اندر چلے گئے۔ میری ماں باہر بنچ پر ہی بیٹھی رہی۔ وہ جلد ہی عدالت سے باہر نکل آئے۔ ایک پولیس والے نے میری ماں کو آ کر بتایا۔

بی بی اگلے مہینے کی دس تاریخ ہو گئی ہے۔ آپ کو بھی اس تاریخ پر آنا ہو گا۔ کیونکہ آپ کی شہادت ہو گی۔ آپ یہاں دستخط کر دیں۔

تاریخ ہو جانے کے بعد ہم کچہریوں سے باہر آ گئے۔ مَوجُو میاں بھی امی کے ساتھ تھے باہر آ کر ہم نے ٹیکسی لی پہلے انہوں نے مجھے تاج محل میں اُتارا اور پھر وہ دونوں ممی کے فلیٹ پر چلے گئے۔ مَیں تین چار دن کے بعد اُمی کو ملنے کے لیے ان کے فلیٹ پر چلی جاتی۔ مَوجُو وہاں ہی رہ رہا تھا۔ وہ ہر وقت دارو پی کر اپنی ہی ترنگ میں رہتا۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن اس نے کبھی مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھا نہ ہی کبھی مجھ سے کوئی بات ہی کی۔

مَوجُو کے گھر میں آ جانے سے مَیں نے اُمی میں ایک واضح تبدیلی دیکھی۔ اس سے پہلے وہ سرِ شام ہی اپنے کسی نئے مہمان کی تلاش میں چلی جاتی تھی۔ اب وہ باہر نہ جاتی تھی بلکہ مَوجُو کی خاطر مدارت میں لگی رہتی تھی۔ مَوجُو یہاں رہ کر بہت خوش تھا۔ مَوجُو کے یہاں مستقل رہائش پذیر ہونے سے میری اُمی بھی خوش تھی۔ اب ان میں ایک تبدیلی یہ

آگئی تھی کہ انہوں نے اپنا عام لباس ترک کر کے مچھیرنوں والا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ وہ اس لباس میں بہت بھلی لگتیں۔

٭-٭

مُوجُو کو میری امی کے پاس آئے ہوئے کوئی بیس دن ہو گئے تھے۔ شام کا وقت تھا میں وہاں موجود تھی۔ مُوجُو اندر کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ اچانک خوشیا آ گیا۔ وہ آتے ہی میری اُمی پر بگڑنے لگا۔

سالی تم بڑی جالم عورت ہے۔ خوشیا نے میری ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کیوں خوشی محمد کیا ہو گیا ہے۔ میری ماں نے بڑی نرمی سے بات کرتے ہوئے کہا۔

ہم جب بھی آتا ہے اِدہر ایک کالا موٹا سا آدمی دیکھتا ہے اور ہم پھر ایک دم واپس چلا جاتا ہے۔ کون ہے یہ سالا لوگ

تم کیوں پوچھتے ہو۔ میری ماں نے ذرا سختی سے کہا۔

تم ہمارا لُنگائی (بیوی) ہے اس لیے پوچھتا ہوں۔

جھوٹ موٹ کا بکواس مت بکو میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔

سالا تم نے خود ہمارے ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی میں اپنی انگلی ڈال کر کہا تھا کہ یہ پکا وعدہ ہے کہ ہم تمہارا ہی بی ہے۔

بکواس مت کرو۔ میری ماں نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

خوشیا نے آگے بڑھ کر میری ماں کو بالوں سے پکڑ کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ اور پھر چلاتے ہوئے کہنے لگ گیا۔ "سالا تم ہمارا بی بی ہے۔ دوسرے آدمی اپنے پاس مت آنے دیا کرو۔"

میری ماں روتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

مُوجُو اندر سویا تھا۔ شور سُن کر باہر نکل آیا۔ اُس نے اُمی کی یہ حالت دیکھی تو خوشیا سے کہنے لگا۔

سالی تم کون ہو۔

ہم اس بی بی کا مالک ہے۔ یہ ہمارا لگائی ہے۔ تم سالا اتنے دن سے ادھر کیوں پڑا ہوا ہے۔ اور اس نے آگے بڑھ کر موجو کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور پھر کہنے لگا۔ سالا دوسروں کے گھر میں آ کر دادا گیری کرتا ہے۔

موجو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً ہی اپنی ڈب سے ایک چھرا نکال کر خوشیا پر ایک بھرپور وار کیا۔ خوشیا لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ صحن کا سب فرش خون سے لت پت ہو گیا۔ خوشیا کی انتڑیاں باہر نکل آئیں اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ملحقہ فلیٹوں میں رہنے والوں نے جھانک کر جو یہ منظر دیکھا تو وہ بھی "خون ہو گیا۔ خون ہو گیا" کے آوازے لگانے لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کافی آدمی اکٹھے ہو گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پولیس بھی آ گئی۔ پولیس کے آنے تک خوشیا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

پولیس نے آ کر وقوعہ کی جملہ تفصیل معلوم کی۔ میری ماں نے یہ ابتدائی رپورٹ پولیس والوں کے پاس لکھوائی۔

یہ فلیٹ میرا ہے۔ میں اس میں کرایہ دار کے طور پر رہتی ہوں۔ میرے ساتھ میرا خاوند معظم علی عرف موجو بھی رہتا ہے۔ مقتول خوشیا اس علاقے کا نامور دادا تھا۔ وہ اکثر مجھے ڈرا دھمکا کر شراب اور تاڑی پینے کے لیے مجھ سے پیسے لے جاتا تھا۔ وہ ایک دو دفعہ زبردستی میری عزت بھی لوٹ چکا ہے۔ آج بھی حسب عادت وہ آیا تو واہی تباہی بکتا رہا۔ مجھے کہنے لگا۔ تم ہمارا بی بی ہے۔ اس دوسرے آدمی کو کیوں تم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس وقت میرا میاں کمرے کے اندر سویا ہوا تھا۔ خوشیا نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچ کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ میرے شور مچانے پر میرا میاں کمرے سے باہر آ گیا۔ ان دونوں کی آپس میں تکرار ہوئی۔ خوشیا نے میرے خاوند کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا اور پھر اپنی ڈب سے چھرا نکال کر میرے خاوند پر حملہ آور ہوا۔ اللہ نے میرے میاں کو بچایا۔ خوشیا کا وار خطا گیا اور پھر میرے میاں نے اس سے چھرا چھین کر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ خوشیا زمین پر گر پڑا اور اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

پولیس موجو کو گرفتار کر کے لے گئی۔ میری ماں کا بیان بھی قلم بند ہونا تھا۔ اس لیے پولیس نے ان کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں ڈر کے مارے ان کے ساتھ نہ گئی بلکہ سیدھی تاج محل آ گئی۔ اور اب آپ کو فوراً ہی یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اب احمد تم ہی بتاؤ ان حالات میں میں بمبئی میں کیسے رہ سکتی ہوں۔ اب میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوچ رہی کہ بمبئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں اور مستقل طور پر شفٹ کر کے پاکستان آ جاؤں۔ لیکن احمد سچ پوچھتے ہو تو مجھے پاکستان کے لوگوں سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ بمبئی کا تو ایک خاص چھوٹا طبقہ ہے جو داداگیری کرتا ہے لیکن پاکستان کا بڑے سے بڑا آدمی بھی نوجوان اور خوبصورت عورت کے معاملے میں جوشیا ہے۔ موجو ہے لیکن کچھ بھی ہو جائے میں اب بمبئی میں نہیں رہ سکتی۔ انشاء اللہ جلد ہی بمبئی چھوڑ دوں گی۔ سند ایک دو دن تک مل جائے گی۔ پھر میں فارغ ہوں۔ جب کراچی پہنچ گئی تو آپ کو مطلع کر دوں گی۔ آپ چار پانچ دن کے لیے ضرور آئیں۔ آپ سے بڑی ضروری باتیں کرنی ہیں۔

اب حنا کا جو بھی خط آتا میں اسے پڑھ کر ذہنی طور پر ڈسٹرب (DISTURBED) ہو جاتا۔ میں کولہو کے بیل کی طرح اپنے معمولات میں جتا ہوا تھا۔ لوگوں سے باتیں بھی کرتا تھا۔ ہنستا بھی تھا۔ لیکن اندر سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ میں سوچتا میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ میری وجہ سے ایک خاتون مستقبل کے گھور اندھیروں میں بکھرتی جا رہی ہے۔ جس دن میں تھوڑا سا اداس و پریشان ہوتا تو اللہ یار خان ہلکا سا مسکراتا اور مجھ سے کہتا۔

کیوں صاحب آج پھر سوہنی کڑی کا کوئی خط آیا ہے۔

میں ہنس پڑتا اور اللہ یار حقہ کی نے منہ میں رکھ کر حقہ پینا شروع کر دیتا۔ اللہ یار خان ایک وفادار اور بااعتماد ساتھی تھا۔ اس نے کبھی اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ حنا کی طرف سے کوئی خط نہ آیا۔ پوسٹ مین آتا تو میں اسے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتا۔ اگر میرا خط نہ ہوتا تو وہ سلام کر کے آگے گذر جاتا۔ آج پوسٹ مین میرے پاس آ کر رک گیا میری دھڑکن تیز ہو گئی۔

صاحب آپ کا منی آرڈر ہے اور پوسٹ مین نے منی آرڈر فارم نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ دو ہزار روپے کا منی آرڈر تھا۔ کراچی سے حنا نے بھیجا تھا۔

میں نے منی آرڈر وصول کیا۔ پوسٹ مین کو ٹپ دی۔ وہ خوش ہو کر سلام کر کے واپس چلا گیا۔ کوپن پر لکھا تھا۔ میں کل کراچی پہنچی ہوں۔ تم جلد آنے کی کوشش کرو۔ خط کا انتظار مت کرنا۔

حنا

تاج محل

جب بھی میرا منی آرڈر آتا۔ میرا ماتحت عملہ چائے اور سموسوں کی فرمائش ضرور کرتا۔ میں نے ان کے لیے چائے کا آرڈر خود ہی دے دیا اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگلے ہفتے تمام یونٹ جنگی مشقوں کے لیے باہر کیمپ پر جا رہی ہے۔ اس مرحلے پر چھٹی کی درخواست دینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں اس اُلجھن میں گرفتار تھا کہ کنٹین کا بیرا چائے اور گرم گرم سموسوں کا ایک بھرا ہوا ٹرے لے آیا۔ لڑکوں نے اسے دیکھا تو احمد صاحب زندہ باد کا ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔

ایڈجوٹنٹ یہ شور سن کر میرے دفتر میں آ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔

صاحب خیریت تو ہے۔ یہ لڑکے کیوں شور مچا رہے ہیں۔

خیریت ہے سر۔ انہوں نے مجھ سے چائے اور سموسوں کی فرمائش کی تھی۔ چنانچہ وہ کنٹین کا بیرا لے کر آیا ہے تو انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے نعرہ لگایا ہے۔

ایڈجوٹنٹ نے بھی ہمارے ساتھ چائے پی۔ میں نے ان پر اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ یونٹ باہر مشقوں کے لیے جا رہی ہے اور مجھے ایک نہایت ہی ضروری نجی کام سے کراچی جانا ہے۔ جس کے لیے مجھے دس دن کی چھٹی درکار ہو گی۔ نہ جانے کرنل صاحب چھٹی دیتے ہیں یا نہیں۔

میں کرنل صاحب سے بات کر کے تھوڑی دیر کے بعد آپ کو بتاؤں گا۔ کب جانا چاہتے ہیں۔

سر اگر چھٹی مل جائے تو میں آج ہی جانا چاہتا ہوں۔
اچھا میں تھوڑی دیر کے بعد آپ کو بتاؤں گا۔
کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ایڈجوٹنٹ نے مجھے آگر بتایا کہ کرنل صاحب نے آپ کی دس دن کی چھٹی منظور کر دی ہے۔ اب بے شک آپ آج ہی چلے جائیں۔ حوالدار عطا محمد کو سب کام سمجھا دیں۔ آپ کے پاس جو پینڈنگ (PENDING) کام پڑا ہوا ہے وہ آپ میرے حوالے کر دیں۔

☆ — ☆

اگرچہ حنا کا اتنی رقم بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ میں بذریعہ ہوائی جہاز کراچی آؤں۔ لیکن میں میل ٹرین سے کراچی روانہ ہوا۔ دوسرے دن صبح کراچی پہنچا۔ کینٹ ریلوے سٹیشن سے ایک ٹیکسی لی اور سیدھا تاج محل جا پہنچا۔ وہاں استقبالیہ والوں نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔
صاب جی۔ بیگم صاحبہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کبھی ٹیلی فون کرتی ہیں اور کبھی خود آتی ہیں۔ یہاں آکر آپ کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں۔ پھر مایوس ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔
وہاں موجود ملازمین، ایک کہے میں صاحب کو حنا صاحبہ کے کمرے میں چھوڑنے جاؤں گا۔ دوسرا کہے میں جاؤں گا۔ وہ انعام کے لالچ میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ ان کے انچارج نے ایک آدمی کو میرے ساتھ کر دیا کہ تم صاحب کو چھوڑ کر آؤ۔
اس آدمی نے میرا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔ ویسے تو میں تاج محل میں اتنی دفعہ آچکا تھا کہ مجھے تمام ہوٹل کی اچھی طرح سے واقفیت ہو گئی تھی۔
اس آدمی نے ایک کمرے کا دروازہ ناک (KNOCK) کیا۔ اندر سے کسی نے آواز دی۔ پلیز کم۔ ان (PLEASE COME IN)
وہ ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ حنا ایک صوفہ پر بیٹھی انگریزی کا اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور بے تحاشا چومنا

شروع کر دیا۔ اس نوکر کو حنا نے دس روپے کی ٹپ دی۔ اور وہ سلام کر کے خوشی خوشی واپس چلا گیا۔ حنا نے کہا کہ آپ غسل کر لیں۔ پھر چائے پئیں گے اور باتیں گے۔ اس نے میرا اٹیچی کیس کھول کر میرے لیے کپڑوں کا ایک صاف جوڑا اور گاؤن (GOWN) نکال لیا۔ میں باتھ روم میں تھا کہ حنا نے چائے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ میں نہا دھو کر تازہ دم ہو کر حنا کے پاس صوفہ پر بیٹھا تھا کہ ملازم چائے لے آیا۔ حنا نے چائے بنا کر مجھے دی اور خود اپنی پیالی لے کر میرے سامنے قالین پر بیٹھ گئی۔ چائے پیتے ہوئے کہنے لگی۔

احمد صاحب میں آپ سے الگ ہو کر بمبئی گئی تو وہاں مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی میں آپ کو اپنے حالات سے ساتھ ساتھ آگاہ کرتی رہی ہوں۔ میرا خیال ہے ان باتوں کو اب دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

حنا میں دس دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ کل پرسوں اس موضوع پر بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔ یہ خوشی کا موقع ہے۔ ان خوشی کے لمحات میں آپ رنج و محن کی باتیں سنا کر مجھے مغموم نہ کریں۔

بہت اچھا حضور۔ اور وہ اُٹھ کر میرے ساتھ صوفہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور پھر میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔

احمد صاحب لاہور میں تمہارے دن کیسے کٹ رہے ہیں۔

رو رو کے۔

کیوں رونے کی کیا وجہ ہے۔

وجہ مجھ سے پوچھتی ہو۔ تم وہاں ہو نہیں اور میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ ہر وقت غمگین اور اداس ہی رہتا ہوں۔

اللہ یار خان جو ہے۔

اللہ یار خان مجھ سے کہاں بات کرتا ہے۔ وہ تو سوہنی کڑی کو ہی یاد کرتا رہتا ہے۔

اچھا وہ بھی مجھے یاد کرتا ہے۔ بڑی مہربانی ہے اس کی۔

حضور آپ کا جادو اس پر بھی چل چکا ہے۔ اُسے بھی اب آپ اپنے عاشقوں کی فہرست میں شامل کر لیں۔

ٹھیک ہی میں اللہ یار خان ہی سے شادی کر لیتی ہوں

بے چارہ بڑھا آدمی ہے تمہارا رگڑا کہاں جھیل سکتا ہے۔

کیوں میں کوئی آدم خور ہوں۔

آدم خور تو نہیں ہو پر اچھے اچھوں کو ناکوں چنے چبواتی ہو۔

آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے۔

حضور میں تو کبھی آپ کے مقابلے میں لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اُترا ہی نہیں جو اترے ہیں انہیں چاروں شانے چت کیا ہے آپ نے۔

کس کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

کرنل سعید کو اور کس کو۔

ہاں یہ تو فروعی باتیں تھیں جو محض مذاق میں کر رہے تھے۔ آپ نے کرنل سعید کا نام لیا تو میں اس سلسلے میں آپ سے سنجیدگی سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔

حضور والا بصد خوشی۔ یہ خادم لاہور سے آپ کے ارشادات سننے اور ان کی تعمیل کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوا ہے۔

احمد تم اسے مذاق نہ سمجھو۔

نہیں حنا میں مذاق نہیں کر رہا بلکہ سیریس (SERIOUS) ہوں۔

احمد بات یہ ہے کہ بمبئی جا کر جن حالات و واقعات سے مجھے دو چار ہونا پڑا۔ ان سب سے میں نے آپ کو تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوا ہے۔ اگرچہ خوشیا نے متعدد بار مجھ سے زیادتی کی ہے لیکن اگر سچ پوچھیں تو میں یہ عرض کروں گی کہ اس نے میرے بہت سے سوئے جذبوں کو بھی جگایا ہے۔ ان جذبوں کے زندہ ہونے کے بعد اب میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرتی ہوں۔ اور اب میں سمجھتی ہوں کہ

ان جذبوں کی شوریدہ سری کو میں اب پہلے کی طرح نظرانداز نہ کر سکوں گی۔ میرے اندر کی جو عورت مر گئی تھی۔ وہ تمہاری قربت سے زندہ ہوئی لیکن آخر دم تک جذبات سے عاری رہی۔ خوشیا کی پیہم زیادتیوں سے وہ جذبات برانگیختہ ہو کر سامنے آ گئے۔ اور اب میں ان کو دبا نہیں سکتی اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر ان کو دبایا گیا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ان سب باتوں کے متعلق میں نے اچھی طرح سے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ اور اب میں چاہتی ہوں کہ آپ کرنل سعید کے ساتھ میری شادی کروا دیں۔

لیکن تم تو کرنل سعید کو بہت برا کہتی تھیں اور تمہیں اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ تھی۔

یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن سعید نے اس دن جنرل صاحب کے سامنے جو باتیں کی ہیں تو ان سے میرا دل صاف ہو گیا ہے اور اب میں اپنے دل میں اس کے خلاف کوئی کدورت نہیں رکھتی۔

کرنل سعید نے اگر شادی کر لی ہوئی تو پھر کیا ہو گا۔

یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے آپ اس سے مل کر اس بات کا پتہ تو کریں کہ کیا اس نے شادی کر لی ہوئی ہے یا نہیں۔

بہت اچھا حضور۔ حکم کی تعمیل ہو گی۔ لیکن سعید کے علاوہ کوئی متبادل بھی سوچیے اپنے اس غلام کے بارے میں ملکہ عالیہ کا کیا خیال ہے۔

احمد میں سنجیدہ ہوں۔ تم اس مسئلے کو مذاق میں ٹال رہے ہو۔

نہیں جانا میں سیریس ہو کر یہ سب باتیں کر رہا ہوں۔ اگر سعید نے شادی کر لی ہوئی تو پھر۔

پھر تم نے مجھے جس آدمی کے ساتھ کہا۔ میں اس کے ساتھ ہی شادی کر لوں گی۔ مناسب آدمی تلاش کرنا تمہارا درد سر ہے۔ میرا نہیں۔

میرا اور ولی اللہ یار خان ٹھیک ہے۔

خدا کی قسم اگر تم نے سنجیدگی سے کہا تو میں اس سے بھی شادی کر لوں گی۔

کتنے دن تم یہاں ٹھہرو گی۔

کیوں۔

تاکہ میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ سکوں۔

نہیں آپ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتی۔ سعید دیکھا بھالا ہوا آدمی ہے میں ایک عرصے سے اسے جانتی ہوں۔ اگر اس سے کسی وجہ سے شادی نہ ہو سکی تو پھر آپ کو کوئی موزوں رشتہ تلاش کرنا پڑے گا۔

اچھا تم ایسا کرو کل میرے ساتھ نیول ہیڈ کوارٹر کے ہسپتال "الشفا" چلنا۔ وہاں کے کمانڈنگ آفیسر سے سعید کا موجودہ ایڈریس معلوم ہو جائے گا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔

٭ ٭

دوسرے دن میں اور حنا نیوی کے ہسپتال "P.N.S. SHAFA" گئے۔ وہاں سے ہمیں پتہ چلا کہ کرنل سعید پنڈی فوجی ہسپتال میں ہے۔ ہم واپس تاج محل آگئے۔ وہاں سے واپس آکر میں نے کرنل سعید کے لیے ایک ذاتی کال بک کروایا۔ اتفاق سے وہ جلدی مل گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

سر میرا نام احمد ہے۔ جہلم میں آپ سے اور حنا صاحبہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ کیا آپ نے مجھے پہچانا ہے۔

احمد صاحب میں آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ فرمائیے کیا حکم ہے۔

سر میں تاج محل کراچی سے بول رہا ہوں۔ میرا آج کل پوسٹنگ لاہور میں ہے۔ حنا شفٹ ہو کر بمبئی چلی گئی تھی۔ لیکن اس کا وہاں دل نہیں لگا اور اب وہ مستقل طور پر سیٹل ہونے کے لیے واپس پاکستان آگئی ہے۔ مجھے اس نے اطلاع کی تھی۔ اس لیے میں کل کراچی اس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ اب حنا نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں آپ کو لوکیٹ (LOCATE) کروں۔ وہ کہتی ہے کہ کہتی ہے کہ میں سعید صاحب اور ان

کی بیگم کو وہ جہاں بھی ہوں ملنے کے لیے جاؤں گی۔

احمد صاحب میں نے تو ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔ چار سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں حنا میرے ساتھ رہائش پذیر رہی۔ اس عرصے میں مجھ سے ایک لغزش ہوئی ہے جس کی میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ لیکن احمد صاحب حنا تو میرا نام بھی سننا پسند نہ کرتی تھی۔ اب اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔

سر بات یہ ہے کہ جہلم میں اس دن آپ نے جنرل صاحب کے سامنے میرے اور حنا کے متعلق جو سچی باتیں کہیں تو اس دن سے حنا کا دل پسیج گیا ہے۔ اب وہ آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ اکثر کہتی ہے کہ میں نے سعید صاحب کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ حالانکہ ہم چار سال تک اکٹھے ایک جگہ رہتے رہے ہیں۔

احمد صاحب میرا تو اس کے معاملے میں دل بالکل صاف ہے۔ وہ اب بھی اگر چاہے تو میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔

سر آپ کی بڑی مہربانی مجھے ایک کوشش کر لینے دیں۔ اگر وہ میری بات مان جائے تو آپ کے ساتھ وہ باقاعدگی سے شرعی اور قانونی طور پر شادی ہی کرے۔ تاکہ اس درد بھری کہانی کا انجام بخیر ہو۔

نہیں احمد صاحب شادی تو آپ سے کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے نہیں کرے گی میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔

سر اگر میں نے شادی کرنا ہوتی تو آج سے ایک سال پہلے ہی کر لیتا۔ میرے گھریلو حالات ایسے ہیں کہ میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اچھا تو سر میں آپ سے پھر رابطہ قائم کروں گا۔

حنا صاحبہ منہ میٹھا کرائیے۔ اب انشاءاللہ تعالیٰ آپ کی مراد جلد بر آئے گی۔
تم مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تب مٹھائی کھلاؤں گی۔

میں نے حنا کو تفصیل سے سب بات بتائی۔ وہ یہ سن کر بے حد خوش ہوئی۔ میں نے بھی اُسے یہی مشورہ دیا کہ اب تم بغیر کسی مزید تاخیر کے فوراً ہی سعید کے ساتھ شادی

کرلو۔

کیا سعید سے تم نے کوئی کمیشن لینا ہے۔ اس کی بڑی طرف داری کر رہے ہو۔ حنا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

حنا میں سنجیدہ ہوں۔ اب اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔

ہم کافی دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ تفصیلات بھی طے کرتے رہے۔ آخر ہم دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ حنا لاہور شفٹ کر آئے۔ سعید کو اور مجھے بھی آسانی ہوگی۔ اس کے بنک اکاؤنٹس فی الحال کراچی ہی میں رہیں۔ اس کی جیولری بھی یہاں ہی لاکرز میں پڑی رہے۔ اس دوران میں جس قدر رقم کی ضرورت ہو سکتی ہے اتنی رقم وہ ساتھ لے آئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ حسب سابق اس دفعہ بھی فلیٹیز ہی میں قیام کرے۔

٭—٭

ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں نے حنا کو چائے منگوانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ اور ہم چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ رات گئے تک ہم اپنے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کسی نے ہمارا دروازہ ناک (KNOCK) کیا۔ پلیز۔ کم۔ ان (PLEASE COME IN) حنا نے کہا۔

استقبالیہ کا ایک ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس کے پیچھے داخل ہونے والا آدمی کرنل سعید تھا جو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد حنا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ اُسے بے تحاشا چومنے لگ گئی اور ساتھ ہی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ حوصلہ کرو حنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں آگیا ہوں انشاء اللہ تعالےٰ اب میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ سعید نے حنا کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ حنا نے روتے ہوئے سعید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بچوں کی طرح اسے چومنا شروع کر دیا۔ سعید کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ عجیب منظر تھا۔ میں فرموں

کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑا ان کو غور سے دیکھتا رہا۔ حنا کی کچھ دھیر بندھی تو وہ کافی دیر تک سعید کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہو۔ سعید نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ صوفہ پر بٹھا لیا۔ میں نے چائے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ جلد ہی چائے آ گئی۔ میں نے سعید سے پوچھا۔

بھائی جان آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں آپ پنڈی سے کراچی پہنچ گئے ہیں

بس کراچی آنے والی فلائیٹ میں اتفاق سے جگہ مل گئی۔

سعید صاحب ہم پروگرام بنا رہے تھے کہ ہم ایک دو دن میں لاہور شفٹ ہو جائیں۔

ٹھیک ہے احمد صاحب۔ پروگرام مکمل طور پہ طے ہو جائے تو بے شک آپ لاہور شفٹ ہو جائیں۔ کراچی میں رہنے کا اب کوئی تک ہی نہیں ہے۔

٭ ـــ ٭

کھانا کھانے کے بعد ہم تینوں تھوڑی دیر تک گھومنے کے لیے چلے گئے۔ واپسی پر سب پروگرام طے کرنا تھا۔ سعید کے لیے ابھی کمرہ بھی لینا تھا۔ واپس کمرے میں آئے تو حنا نے مینیجر کو فون کیا کہ ہمیں ایک سنگل کمرہ اور چاہیئے۔ ہمارے کمرے کے قریب ہی ہمیں کمرہ مل گیا۔ میں نے حنا کو کہا کہ میں اس کمرے میں شفٹ ہو جاتا ہوں۔ آپ دونوں اب راز و نیاز کی باتیں کریں۔ شکایات کے دفتر کھولیں۔ وہ شرما گئی۔ حواس مجتمع کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

نہیں احمد صاحب۔ جب تک ممکن ہو ا میں تم سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔

میں نے کہا۔ وہ تو ٹھیک ہے سوہنی صاحبہ۔ لیکن اب آپ کا مہینوال آ گیا ہے۔ وہ کیسے برداشت کرے گا کہ وہ تو الگ کمرے میں رہے اور ایک غیر آدمی اس کی ہونے والی بیوی کے ساتھ رات بھر ایک الگ کمرے میں رہے۔

احمد کیا کہا۔ ایک غیر آدمی؟۔ تم میرے لیے غیر آدمی ہو۔ تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ اور پھر جب سعید کو یہ یقین ہے کہ تم کسی قیمت پر بھی کسی غیر عورت سے جنسی

تعلقات نہیں بڑھا سکتے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس بات کو محسوس ہی نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسے میرے مزاج کا بھی اچھی طرح سے علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جو کچھ کہتی ہوں دل کی گہرائیوں سے اور سنجیدگی سے کہتی ہوں۔

ہم تینوں وہ نیا کمرہ دیکھ کر آئے۔ سعید نے خود ہی کہہ دیا کہ میں اس کمرے میں رہوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ اب آپ حنا کے پاس ہی رہیں۔ کافی عرصے کے بعد ملے ہیں۔ جی بھر کر باتیں کریں۔ ایک دوسرے سے شکوے شکایات کریں لیکن وہ نہ مانا وہ اپنا اٹیچی اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ کر اسے لاک کر کے آ گیا۔ ہم تینوں نے چائے پی اور بڑی دیر تک جہلم کی باتیں اور میری ہوش وخرد سے بے گانگی کی باتیں کرتے رہے سعید نے حنا کو بتایا کہ تمہارے جہلم سے چلے آنے کے بعد کیسے احمد صاحب ہماری کوٹھی کے سامنے پل پر بیٹھ کر دیران اور مقفل کوٹھی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے سڑک سے گذرنے والے لوگ انہیں سودائی سمجھتے تھے۔ میں ان کو اکثر اوقات کار کے بعد اس پل پر بیٹھے ہوئے اداس و پریشان دیکھتا تھا۔ اور دل میں افسوس کرتا تھا کہ کتنا خوبصورت آدمی ہے لیکن حنا کی محبت میں بالکل سودائی ہو گیا ہے۔ ایک دن میں نے ان کے پاس گاڑی روکی اور ان کو کہا۔

میاں اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس ویران کوٹھی کو کیا دیکھتے ہو۔ اس کے مکین جا چکے ہیں تو یہ مجھ سے کہنے لگے۔

کرنل صاحب اس کوٹھی کی مکین تو حنا تھی۔ وہ تو اب بھی یہاں ہے۔ اس کوٹھی سے میرے خانۂ دل میں منتقل ہو گئی ہے۔ میں نے تو اسے چلتا پھرتا دیکھتا ہوں۔ ہم دونوں گھنٹوں آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو حنا نظر نہیں آتی۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ نے کبھی اسے دل کی آنکھ سے دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ آپ اس طرح کی باتیں نہ کرتے اور میں سمجھ گیا کہ یہ بے چارا جس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اس کا اب وہاں سے واپس آنا بہت مشکل ہے۔ لیکن حنا میں سمجھتا ہوں کہ دل والوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک الگ اور مکمل سائنس ہے جو ہم دنیا والے نہیں جانتے۔ حنا تم تو نی الواقعہ اس

کے دل کے نہاں خانوں میں بسی ہوئی تھی۔ یہ جب چاہتا ہے تمہیں بلا لیتا ہے۔ تم سے باتیں کرتا ہے۔ سعید نے بات ختم کی تو میں نے کہا۔

سعید صاحب یہ باتیں تو اب ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اب ماضی کی تلخیوں کو بھول کر مستقبل کی خوشگوار راہیں تلاش کریں۔ سعید صاحب آپ اور حِنا صاحبہ دونوں ماضی میں ایک مستقل عذاب میں مبتلا رہے ہیں اس لیے میں اب آپ دونوں سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ آپ اب ایک ابدی رشتے میں منسلک ہو جائیں۔

مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ میں تو آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اس سلسلے میں ہماری مدد کی ہے۔ اور میری راہ سے سب کانٹے صاف کر دیے ہیں۔

سعید صاحب یہ میرا فرض تھا آپ میرے بڑے بھائی ہیں — کہو حِنا اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے حِنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

آپ کو میری طرف سے پورا اختیار ہے۔ آپ جو چاہیں کریں۔

میں اور سعید دونوں رات گئے دیر تک شادی کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ باہمی رضامندی سے یہ طے ہوا کہ حِنا میرے ساتھ لاہور شفٹ ہو جائے گی۔

سعید نے کہا کہ میں آپ کے کرنل صاحب کو کہہ کر آپ کو اجازت لے دوں گا تاکہ آپ اوقاتِ کار کے بعد حِنا کے پاس فلیٹیز میں آجایا کریں۔ آپ کے آنے جانے کا انتظام حِنا کر دے گی۔ حِنا میری گود میں سر رکھے یہ سب باتیں بہت ہی دلچسپی سے سنتی رہی۔ سعید کی موجودگی میں اس کا یوں میری گود میں سر رکھ کر لیٹنا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ میں اس سے ذہنی طور پر اپ سیٹ (UP SET) ہو رہا تھا۔ سعید میری اس کیفیت کو بھانپ گیا اور کہنے لگا مجھے آپ دونوں پر پورا بھروسہ ہے۔ حِنا بخوشی اسی حالت میں لیٹی رہی میں ہرگز محسوس نہیں کرتا۔ حِنا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

آپ لوگ مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دیں گے۔

سعید نے کہا۔ فرمائیے جناب۔ کچھ ایمان کی شرطیں پیش کرنے لگی ہیں۔

اتنی سخت اور بے جا نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔

ارشاد۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر آپ کے ارشادات سننے کے لیے تیار ہوں۔ سعید نے کہا۔

سعید صاحب پہلی بات یہ ہے۔ میں اور احمد ہم دونوں قرآن کریم پر حلف اٹھا کر یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہمارے آپس میں کسی قسم کے کوئی قابل اعتراض تعلقات نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ ان ہی کے کہنے پر میں آپ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوئی ہوں۔ شادی کے بعد ان کا مجھ سے ملنا جلنا آپ بند نہ کریں گے۔ یہ میں بتا دینا مناسب سمجھتی ہوں کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم دونوں کے ازدواجی تعلقات اس سے بے حد متاثر ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے پاس جو جیولری ہے وہ آپ ڈیمانڈ نہ کریں گے۔

شادی کے بعد آپ اس جیولری کو کس مصرف میں لائیں گی۔ سعید نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔

جناب بمبئی میں میری ماں آج کل سوشل ورک (SOCIAL WORK) کر رہی ہے۔ انھوں نے بمبئی پراپر (PROPER) کی سکونت ترک کر کے وہاں سے پندرہ بیس میل دور ساحل سمندر پر مچھیروں کی بستیوں میں ایک سکول ایک میٹرنٹی ہوم (MATERNITY HOME) اور ایک ہسپتال بنانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ ان کے پاس اپنا سرمایہ بھی ہے لیکن میں بھی ان کی بھرپور مدد کرنا چاہتی ہوں۔ دوسرا پروجیکٹ میرا، احمد صاحب کے لیے ایک کوٹھی بنانا ہے۔ یہ لاہور، پنڈی پشاور یا جس اور سٹیشن پر کہیں میں ان کو وہاں پر بنا کر دوں گی۔ چونکہ ان کی اپنی تنخواہ بہت ہی قلیل ہے اور یہ خود نہیں بنا سکیں گے۔ اور میرا تیسرا پروجیکٹ یہ ہے۔ احمد صاحب کی دو بیٹیاں ہیں۔ جو اب دس اور آٹھ سال کی ہیں۔ میں وقت آنے پر ان کی شادی کے تمام اخراجات برداشت کروں گی۔ سعید تم یقین کرو کہ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی ہمارے لیے اور ہمارے بچوں کے لیے بہت کچھ بچ رہے گا۔

جناب مجھے ان سب اخراجات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ آپ میری

خصوصی التجا پر احمد صاحب کو ایک نئی کار بھی خرید کر دیں۔ سعید نے بڑی سنجیدگی سے یہ بات کی۔

مَیں اُن کی یہ باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ مَیں نے ان سے عرض کی۔

آپ دونوں کا بے حد شکریہ۔ مَیں دیہاتی آدمی ہوں۔ ملازمت کے بعد واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں میرے باپ دادا کا ایک کچا مکان میرے لیے ہے باقی رہا مسئلہ میری بچیوں کی شادی کا سو عرض ہے کہ وہ ہمارے رسم و رواج کے مطابق ہو ہی جائیں گی۔ ہمارے زیادہ قیمتی جہیز اور جیولری دینے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ جو کچھ میسر ہوا میں بچیوں کو دے کر ان کی شادی کر دوں گا۔

باقی رہ گئی کار۔ تو حضور والا۔ مَیں ایک عام سا چھوٹے رینک کا فوجی ہوں۔ میں فوجی ڈسپلن اور ٹریڈیشن (TRADITIONS) کے خلاف ہے۔ آپ دونوں کا بے حد شکریہ۔ مَیں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ مَیں اتنا عرض کروں گا کہ آپ دونوں مجھے اپنے نیازمندوں میں رہنے دیں۔ اتنا چاہتا ہوں کہ جب چاہوں حنا سے مل سکوں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ حنا مجھے آنے جانے کے اخراجات کے لیے پیسے دیتی ہیں میں وہ پیسے بھی آئندہ ان سے نہ لیا کروں گا۔ ہوائی جہاز کی بجائے تھرڈ کلاس میں سفر کر لیا کروں گا۔ لیکن حنا سے پیسے ہرگز نہ لوں گا۔

حنا کے آنسو نکل آئے اور روتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

احمد صاحب اتنی اجنبیت تو نہ پیدا کیجیے۔

نہیں حنا ایسا کبھی نہ ہو گا۔

***

دوسرے دن شام کی فلائٹ سے سعید واپس پنڈی چلا گیا۔ دو دن کے بعد پروگرام کے مطابق ہمیں بھی لاہور شفٹ ہونا تھا۔ مَیں نے حنا سے کہا کہ تمام اخراجات کے لیے تم ابھی سے پیسے نکلوا لو۔ تم تو دلہن بن جاؤ گی تو پھر تمہارا آنا جانا کم ہو جائے گا۔

ہاں ٹھیک کہا آپ نے۔ کتنی رقم نکلواؤں۔ ایک لاکھ سے کام چل جائے گا

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ اپنے اخراجات کا آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔

احمد ہماری طرف سے بڑا خرچہ فلیٹیز میں بارات کو کھانا دینا ہوگا۔ کتنے آدمیوں کا انتظام کرنا پڑے گا۔

یہ بات ہم بعد میں سعید سے پوچھ لیں گے۔ آپ ایسا کریں کہ لاہور جاکر آپ کسی بنک میں اپنا اکاؤنٹ کھول لیں۔ بعد میں اگر کراچی سے مزید رقم منگوانے کی ضرورت پیش آئی تو لاہور کے بنک کے نام چیک جاری کر دینا۔ وہ خود منگواتے رہیں گے۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔

دوسرے دن میں اور حنا لاہور شفٹ کر کے آگئے۔ لاہور ایئرپورٹ پر میں نے حنا کو کہا کہ میں اب واپس اپنی یونٹ میں جاتا ہوں۔ چھ دن میری چھٹی کے باقی ہیں وہ میں منسوخ کروا دوں گا تاکہ پھر شادی کے موقعہ چھٹی لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ لیکن وہ نہ مانی اور مجھے فلیٹیز میں لے گئی۔ میں نے حنا سے کہا۔

حنا میں چاہتا ہوں کہ ان چھ دنوں کے اندر تمہاری رخصتی ہوجائے تاکہ میں اطمینان سے اپنی یونٹ میں واپس جاکر دلجمعی سے اپنا کام کرسکوں۔

کیا میری موجودگی سے آپ کو کوئی پریشانی ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں جلد سے جلد تم سے الگ ہوکر سعید کے پاس چلی جاؤں۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں حنا! میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اس اہم ذمہ داری سے جلد سے جلد فارغ ہوجاؤں۔

شام کو میں نے ٹیلی فون پر سعید کے ساتھ بات کی۔

بھائی جان آپ آٹھ تاریخ کو بارات لے کر فلیٹیز پہنچ جائیں۔ تاکہ اس دن رسم نکاح بھی ادا ہوجائے اور آپ دلہن کو بھی لے جاسکیں۔ ساتھ ہی آپ ہمیں یہ بھی بتائیں کہ آپ کے ساتھ کتنے آدمی آئیں گے تاکہ میں ہوٹل والوں کو کھانے کا آرڈر دے سکوں۔ ساتھ ہی آپ مینو (۵۸۷۳م) بھی بتادیں تو اچھا ہوگا۔

میں زیادہ آدمیوں کو ساتھ نہیں لاؤں گا۔ تقریباً بیس آدمی ہوں گے۔ دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے کا آپ انتظام کر دیں۔ مینو (MENU) جو آپ چاہیں بنالیں۔

کرنل صاحب بہادر آپ لوگوں کے سٹینڈرڈ اور میرے سٹینڈرڈ میں بڑا فرق ہے میں دال روٹی کھانے والا ایک معمولی فوجی سپاہی ہوں۔ مجھے بڑے لوگوں کے لوازمات کا کچھ علم نہیں۔ آپ جس طرح کا کھانا مہمانوں کے لیے کہیں گے۔ میں اس طرح کا انتظام کر لوں گا۔

احمد صاحب یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ آپ ہوٹل کے مینجر کو کہہ دیں کہ تقریباً بیس مہمانوں کے لیے اچھے سے اچھے کھانا کا انتظام کر دیں۔

٭—٭

آج سات تاریخ ہے۔ کل پنڈی سے برات نے آنا ہے۔ حنا آج صبح ہی سے بہت ڈسٹرب (DISTURB) ہے کھڑکی کے سامنے بیٹھی دور خلاؤں میں گھور رہی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ اور وہ آنسو پی جانے کی ایک ناکام کوشش میں پھر خلاؤں میں بے مقصد نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگ جاتی۔

کیوں حنا خیریت تو ہے آج تم مجھے بڑی اپ سیٹ نظر آ رہی ہو۔

ہاں احمد میں سوچ رہی ہوں کہ آج تمہارے ساتھ میرا یہ آخری دن ہے۔ پھر شاید زندگی میں ہم اس قدر آزادی سے نہ مل سکیں۔ میں سوچتی ہوں دنیا میں اللہ میاں نے بھی کیسے کیسے آدمی بھیجے ہیں۔ ایسے آدمی بھی ہیں جو اپنی متاعِ حیات کو دوسروں کی خوشی کے لیے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور پھر خود زندگی بھر جدائی کی آگ میں جلتے رہتے ہیں

حنا یہ سب شاعرانہ باتیں ہیں۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ جدائی کے یہ گھاؤ آہستہ آہستہ بھر جائیں گے۔ اور آنے والا وقت ہمیں حالات کے دھارے پہ بہا کر ایک دوسرے سے بہت ہی دور لے جائے گا۔ اور اگر کبھی ہم پلٹ کر گذشتہ زندگی پہ نظر

دو رہا ہیں گے تو محبت کا ایک ننھا سا دیا دُور اُفق پر ہمیں جھلملا ہوا نظر آئے گا۔

حِنا رو پڑی اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر مجھ سے کہنے لگی۔ احمد تم سعید کو ابھی ٹیلی فون کر دو۔ وہ کل برات لے کر نہ آئے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بعد میں سوچ کر اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گی۔

حِنا تم پاگل تو نہیں ہو گئی۔ کتنی مشکلوں کے بعد یہ معاملہ طے کیا ہے اور اب تم پہلو تہی کی کوشش کر رہی ہو۔

نہیں احمد یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

تم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ ٹھیک ہے میں اب سعید سے شادی کروں گی۔

ٹھیک ہے کہا تھا لیکن احمد۔ میں اب آنے والے حالات و واقعات کو فیس (FACE) نہ کر سکوں گی۔

حِنا حوصلہ کرو۔ اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تمہاری بہتری کے لیے ہی کر رہا ہوں۔ یہ بچوں کا کھیل اب زیادہ دن تک نہ چل سکے۔ ایک نہ ایک دن ہمیں زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا۔ اس کی ڈھیر بندھائی۔ اُسے پکڑ کر بستر میں لٹا دیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرو۔ وہ بستر میں آرام سے لیٹ گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سو گئی۔

میں نے دوپہر کے کھانے پر اُسے اُٹھایا۔ ہم کھانا کھانے ڈائننگ ہال میں نہیں گئے بلکہ کمرے ہی میں کھانا منگوایا۔ کھانا کھا کر وہ پھر سو گئی اور پھر شام تک سوتی رہی۔ اس نے رات کا کھانا نہ کھایا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے بے مقصد نظروں سے چھت کو دیکھنے لگ جاتی۔ اُداسی اور غم کی ملی جلی کیفیت اس پر طاری رہی۔

حنا تمہارے ذہن پر یہ کیوں بوجھ ہے۔ کوئی مجبوری ہے۔ میں نے اس سے التجا بھرے انداز میں پوچھا۔

احمد مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا ہے۔ میں نواب سعادت علی خان کی بیٹی آج پردیس میں یوں بے یار و مددگار اور تنہا۔ اس بے کسی کے عالم میں میری شادی ہو رہی ہے کہ

کوئی عزیز و اقارب اس موقعہ پر موجود نہیں۔ مجھے اپنی قسمت پر رونا آرہا ہے۔ آج میری سکھیاں ہوتیں۔ مہندی لگائی جاتی۔ شادی کے گیت گائے جاتے۔ مجھے دُلہن بنا کر بٹھایا جاتا۔ میرے ماں باپ مجھے رُخصت کرتے۔ احمد میں سوچتی ہوں یہ کیسی شادی ہے۔ میں اپنے ماں باپ سے ہزاروں میل دور ان دیکھے جذبوں اور دبی دبی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہوں۔ جب نکاح ہوگا تو نکاح خواں دلہن اور دولہا کے وکیلوں کے دستخط لے گا۔ میں سوچتی ہوں۔ میرا کون وارث ہوگا۔ میرا وکیل بن کر کون دستخط کرے گا۔ مجھے اپنی اس بے بسی پر رونا آتا ہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ وہ میرے ساتھ بچوں کی طرح چمٹ گئی۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت وہ اپنے آپ کو عورت نہیں بلکہ ایک کم سن بچہ سمجھ رہی تھی جو کسی تکلیف یا مصیبت کے وقت کسی بزرگ کی ذات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ حِنا بھی اسی طرح مجھے گلے لگا کر کم سن بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی اور میں اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا جی کچھ ہلکا ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگی۔

احمد! شکر ہے اللہ کا کہ اس موقعہ پر کم از کم تم تو میرے پاس ہو۔

حِنا میں پھر بھی ادھر ہی ہوں۔ تمہیں کسی مرحلے پر کوئی تکلیف ہو تو تم مجھے فوراً بلا لینا۔ میں بغیر کسی تاخیر کے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

احمد! آج مجھے بڑی شدت سے یہ احساس ہوا ہے کہ "کاش تم میرے خاوند ہوتے" اور اگر خاوند نہ ہوتے تو بھائی ضرور ہوتے۔ یہ دو ایسے رشتے ہیں۔ جن کی ذات میں عورت پناہ تلاش کرتی ہے۔

حِنا تمہیں میری مجبوریوں کا علم ہے۔ پھر بھی ہر مشکل وقت میں میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔

☆

تمام رات میں اور حِنا باتیں کرتے رہے۔ باتوں سے دل ہی نہ بھرتا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ احمد محبت کرنے کے لیے یہ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ محبت کرنے والوں کی تو ابدی زندگی

ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ جی بھر کے آپس میں پیار کرسکیں۔ پیار و محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کرسکیں وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگی کاش اس رات کی سحر نہ ہو اور ہم یونہی ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ابد تک یونہی باتیں کرتے رہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے اس یادگار رات کی طلسماتی فضا کو خیرباد کہنے کے لیے آہستہ سے کہا۔

حنا حسن کے سوداگر اب پنڈی سے چلنے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ بس یہ چند لمحے میری زندگی کا ماحصل ہیں۔ اس کے بعد میں عقل کے صحراؤں میں سچ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہوں گا اور پھر ایک دن تھک ہار کر قبر میں اُتر جاؤں گا۔ اور نرم و نازک سی بھربھری مٹی اپنے ارد گرد لپیٹ کر سو جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی۔ کہ الف لیلیٰ کی داستان کا وہ پُراسرار جادوگر، جو سب کے لیے اجنبی تھا اور جو دماغ کے صحراؤں میں اکیلا گھومتا رہتا تھا اور جسے عالمگیر صداقت کی تلاش تھی وہ اس صداقت کو نہ پا سکا۔ اور ہم سے جُدا ہو کر خلا کی پنہائیوں میں کہیں کھو گیا ہے۔ لیکن حنا زمانے والوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ دردمندوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھیں اور انسان کے دُکھ درد کا مداوا کریں۔

حنا نے اُٹھ کر میز کا دراز کھولا اور اس سے مجھے ایک چیک بک اور پاس بک نکال کر دی۔

یہ کیا ہے حنا۔ میں نے استفسار بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

میں نے تمہارے نام ایک چھوٹا سا اکاؤنٹ کھولا ہے تاکہ میرے چلے جانے کے بعد تم ہوٹل کے بل اور دوسرے متفرق اخراجات پورے کرسکو۔

صرف کل کا دن ہے۔ تم پنڈی چلی جاؤ گی اور میں اپنی پرانی میس (MESS) میں شفٹ ہو جاؤں گا۔ کل جانے سے پہلے ہوٹل کے بل سب کلیر کر دیں گے۔

نقد پیسے آپکے پاس ہیں۔ چیک شاید ہوٹل والے ویسے بھی قبول نہ کریں۔

ہاں احمد تمہاری یہ بات ٹھیک ہے۔ صبح سویرے ہی مینیجر سے مل کر یہ بات صاف

کر لینا۔

بہت اچھا۔

٭ ٭ ٭

آٹھ تاریخ کا سورج طلوع ہوا۔ حنا آج کل سے بھی زیادہ اُداس اور مغموم تھی۔ دس بجے کے قریب سعید بارات لے کر ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے مینیجر اور اس کے سٹاف نے ان کو خوش آمدید کہا۔ سعید سمیت کل بیس آدمی بارات میں تھے۔ ان میں صرف ایک خاتون تھی۔ مرد حضرات سب مین ہال چلے گئے۔ جہاں ان کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس خاتون کو میں اور سعید حنا کے کمرے میں لے گئے۔ خاتون کوئی سچالیس کے پیٹے میں ہو گی۔ اچھی شکل وصورت، پڑھی لکھی اور ماڈرن خاتون تھی۔ وہ اندر آئی تو حنا اُٹھ کر اسے گلے ملی۔ میں اور سعید اسے چھوڑ کر واپس آگئے۔ میں نے ان کے لیے چائے بھجوائی۔ مہمان چائے پی چکے تو میں نے نکاح خوان کو بلایا اور اسے نکاح پڑھنے کے لیے کہا۔ نکاح پڑھا گیا۔ ایجاب وقبول ہوا۔ رجسٹر میں حنا کے وکیل کے طور پر میں نے دستخط کیے اور یہ مرحلہ بخیروخوبی انجام پذیر ہوا۔

تھوڑی دیر وہاں بیٹھے حاضرین ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ سعید کے چند دوست اسے تنگ کر رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب مینیجر نے آکر بتایا کہ ڈائننگ ہال میں کھانا لگا دیا گیا ہے۔ سب لوگوں نے کھانا کھایا اور دو بجے باراتی پنڈی واپس چلنے کی تیاریوں میں لگ گئے۔

میں نے ہوٹل کے مینیجر کو کہا کہ وہ مجھے مکمل بل لا کر دے جس میں میرے اور حنا کے گذشتہ چار دن کا قیام وطعام کا بل بھی شامل ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھے نو ہزار کا بل لا کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

کیا پے منٹ بذریعہ چیک بھی کی جا سکتی ہے

نہیں صاحب معافی چاہتا ہوں۔ چیک صرف مستقل رہنے والے لوگ اشوع کرتے ہیں۔ دوسرے حضرات نقد ادائیگی کرتے ہیں۔

مَیں نے حنا کو جا کر بتایا کہ ہوٹل والے چیک قبول نہیں کرتے۔
کتنا بل بنا ہے۔ حنا نے مجھ سے پوچھا۔
نو ہزار روپے آج کا اور پچھلے چار دنوں کا ملا کر بنا ہے۔
اتنے پیسے تو میرے پاس ہوں گے۔ اور حنا نے یہ رقم مجھے دے دی۔
مَیں نے نو ہزار کا بل مینجر کو ادا کر کے اس سے رسید لی اور وہ رسید پھر مَیں نے حنا کو لا کر دے دی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔
احمد مَیں اس رسید کو کیا کروں گی۔ تم اپنے پاس رکھو۔
مَیں نے رسید جیب میں رکھ لی —— حنا وہ میرے نام کا آپ نے جو اکاؤنٹ کھولا ہے۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ مَیں چیک بک آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ لیتی جائیں۔
رکھو تم اپنے پاس۔
نہیں حنا مجھے ضرورت نہیں ہے۔
اچھا بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی رکھو تم۔

٭—٭

تین بج گئے۔ سب باراتی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ سب سے آگے دولہا اور دُلہن کی گاڑی تھی جو خاص طور پر اس مقصد کے لیے سجائی گئی تھی۔ حنا اور وہ مہمان خاتون ابھی تک کمرے میں تھیں۔ مَیں ان کو لینے کے لیے گیا۔ حنا نے لال رنگ کا قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ جو خاص طور پر دلہنیں شادی کے موقعے پر زیب تن کرتی ہیں مَیں حنا کو اس کے کمرے سے نیچے گاڑی تک لے آیا۔ مَیں نے اسے اپنے بازو کا سہارا دے رکھا تھا۔ وہ خاتون پیچھے پیچھے حنا کا مختصر سا سامان اُٹھا کر چلی آ رہی تھی۔ گاڑی میں جب حنا بیٹھنے لگی تو مَیں نے اس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔ وہ مشرقی روایتی عورتوں کی طرح اس وقت رو رہی تھی۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک بوسہ دیا اور پھر میرے ہاتھ چوم کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس خاتون کے ساتھ بیٹھ گئی۔ تین بجکر کچھ منٹوں پر

بارات واپس پنڈی کے لیے روانہ ہوگئی۔ جس گاڑی میں حنا بیٹھی تھی اسے سعید میلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس خاتون کا خاوند کرنل بخاری بیٹھا تھا۔ بارات کی روانگی سے پہلے میں نے سب باراتیوں سے مصافحہ کیا۔ سعید گاڑی سے باہر نکل کر مجھے گلے ملا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور بارات روانہ ہوگئی۔

٭ ــ ٭

وہ صبح کی ایک سحر طراز کرن، سرو قد حسینہ میری زندگی کی سب روشنیوں اور خوشیوں کو لے کر ایک نئی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ اور اپنے پیچھے تاریکیوں اور اُداسیوں کو چھوڑ گئی۔

پروگرام کے مطابق مجھے شام کو اپنے بیس واپس چلا جانا تھا۔ لیکن جاتے وقت حنا مجھ سے کہہ گئی۔

احمد تم آج کی رات اسی کمرے میں رہنا۔

کیوں کوئی خاص بات ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں اب اس ویران اور سنسان کمرے میں رہ کر کیا کروں گا۔ سوائے اس کے کہ تمہاری یاد میں ٹھنڈی آہیں بھرتا رہوں اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا رہوں۔

میں تقریباً نو بجے رات تم سے ٹیلی فون پر بات کروں گی۔

ہوٹل کا مینیجر مجھے ڈائننگ روم میں ملا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

سر آپ پنڈی نہیں گئے۔

نہیں مینیجر صاحب۔

آپ کچھ دن اور یہاں قیام فرمائیں گی۔

نہیں میں کل صبح چلا جاؤں گا۔ اگر آپ کا آج کا بل ہو تو صبح ناشتے کے بعد آپ لے لیں۔

سر آج کمرے کا کرایہ بل میں شامل کر دیا ہوا ہے۔ البتہ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کا بل ہوگا۔ وہ میں آپ کو صبح بھجوا دوں گا۔

ٹھیک ہے کل جانے سے پہلے میں یہ بل ادا کر دوں گا

مَیں فوراً ہی کھانا کھا کر کمرے میں واپس آگیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جو آج صبح تک رنگ و نور اور خوشبوؤں کا مسکن تھا۔ جو حِنا کے چلے جانے کے بعد بالکل ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا جو میری کسمپرسی اور بے بسی کا نوحہ بیان کر رہا تھا۔ ساری رونقیں اور رنگینیاں حِنا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کمرے میں اُداسی کا راج تھا۔ مَیں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ یہ چند منٹ بھی میرے لیے چند صدیوں سے کم نہ تھے۔ حِنا تو وہاں چہل پہل اور رنگینیوں میں کھوئی ہوئی ہو گی۔ اسے کیا خبر کہ ایک غریب الدیار شخص ایک اُجڑے ہوئے ویران کمرے میں بیٹھا ہر سانس کے ساتھ اسے یاد کر رہا ہے۔

مَیں اپنے خیالات کے اسی تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون بالکل حِنا کے پلنگ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ مَیں اپنے بستر سے اُٹھ کر حِنا کے بستر پر آگیا۔ رسیور اُٹھا کر ٹیلیفون اٹینڈ کیا۔

مَیں پنڈی سے زاہدہ سعید بول رہی ہوں۔ احمد صاحب کیسے ہیں آپ۔

زاہدہ سعید کا نام سُن کر میرے اندر کا مردِ جو رقابت کی ایک مسلسل آگ میں جل رہا تھا۔ اپنے ہوش حواس قائم نہ رکھ سکا۔ معاف فرمائیں محترمہ۔ مَیں کسی زاہدہ سعید کو نہیں جانتا۔ ساری رانگ نمبر۔ اور مَیں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر گھنٹی بجی۔ مَیں نے ٹیلی فون اُٹھایا۔

مَیں پنڈی سے زاہدہ سعید بول رہی ہوں۔ احمد صاحب سے بات کرنا ہے۔

محترمہ مَیں نے آپ کو پہلے بتا دیا ہے کہ مَیں کسی زاہدہ سعید کو نہیں جانتا۔

آپ کسی لڑکی زاہدہ حِنا کو جانتے ہیں۔

جانتا تھا۔

احمد۔ یہ کیا تم آنکھ مچولی کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ سیدھی طرح سے بات کرو کیوں موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ احمد مَیں حِنا بول رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں حِنا کو۔

ہاں حنا ایک لڑکی تھی جس نے میرے دل کے ویران کاشانے کو آباد کر رکھا تھا پر اب نہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہے۔

احمد تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ یہ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔

محترمہ میں نے آپ کو کہہ دیا ہے کہ میں کسی زاہدہ سعید سے بات نہیں کرنا چاہتا ہاں حنا نام کی لڑکی تمہارے ہاں ہے تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔

احمد خدا کے لیے تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں حنا ہی بول رہی ہوں تمہارے ماضی کی حنا۔ احمد مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو ابھی تو مجھے تم سے الگ ہوئے صرف چھ ہی گھنٹے ہوئے ہیں۔

حنا اس عرصے کو تم چھ گھنٹے کہہ رہی ہو۔ یہاں مجھ پر تو چھ صدیاں بیت گئی ہیں۔ میں تو روز ازل ہی سے ناکام و نامراد خلا کی وسعتوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔

احمد یقیناً تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں سعید کو بتا کر ابھی بائی ایر (BY AIR) واپس آرہی ہوں۔

حنا اب تم وہ پہلے والی حنا نہیں ہو۔ اب تم بڑے ہی کٹھن بندھنوں میں جکڑی جا چکی ہو۔ اب تم آزاد فضاؤں میں اڑنے والی پنچھی نہیں کہ کبھی پشاور تو کبھی لاہور کبھی کراچی تو کبھی بمبئی۔ اب تم ایک شخص کی منکوحہ بیوی ہو اب جو کچھ سعید کہے گا۔ تمہیں وہی کرنا پڑے گا۔

احمد صاحب ان خدشات کا اظہار آپ نے پہلے نہیں کیا۔

اس لیے نہیں کیا کہ اب تم اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ سعید کیساتھ تمہاری شادی ہو جائے۔

نہیں احمد کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ میں تمہیں ترجیح دیتی تھی لیکن تم خود ہی پہلو تہی کرتے چلے آئے ہو۔ خدا کی قسم میں اس بندھن کو اسی مرحلے پر بھی توڑ سکتی ہوں ابھی تو سعید نے مجھے ہاتھ تک بھی نہیں لگایا۔ میں سمجھتی ہوں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری وحشت بھی بڑھتی جائے گی اور کہیں تم اپنے آپ کو بھی بھول کر اس

رقابت کی آگ میں جل کر راکھ نہ ہو جاؤ۔ پھر تمہاری بچیوں کا کیا ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تم اپنے حالات سے مجبور ہو کر مجھے نہیں اپنا سکے۔ لیکن یہ اس سے بھی بڑی حقیقت ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر مجھ سے الگ بھی نہیں رہ سکتے۔ اور مجھے اب ڈر لگ رہا ہے کہ تمہاری اس آگ میں تمہارے اہلِ خانہ بھی نہ جل مریں۔ مجھے تم جیسے کہتے ہو میں ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ عزیز اور کوئی چیز نہیں۔ تم خوش ہو تو میں خوش ہوں۔ اب تم مجھے اپنے دل کی بات بتا دو۔ اگر تم کہتے ہو تو میں ابھی روانہ ہو سکتی ہوں۔

نہیں حنا میں ٹھیک ہوں۔ تم کوئی ایسی غلطی نہ کرنا کہ جس سے تمہارا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریک ہو جائے۔

نہیں احمد مجھے اپنے مستقبل کی اتنی زیادہ فکر نہیں ہے جتنی تمہاری ہے۔

حنا تم میری فکر نہ کرو۔ میں وقت کے جھوکوں کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہوتا جاؤں گا۔

اچھا چھوڑو اس فلسفیانہ بحث کو۔ کہو کیا حال ہے۔

حضور میں نے آپ کو پہلے بھی عرض کی ہے کہ ٹھیک ہوں۔ آپ کے ٹیلی فون کے انتظار میں اب تک زندہ ہوں۔ اچھا چھوڑیئے اسے یہ بتائیے آپ پنڈی کب پہنچے —

سات بجے پہنچ گئے تھے۔ جو لوگ بارات میں لاہور گئے تھے۔ ان کا آج سات کا کھانا ہمارے ہاں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں کھانا لگ جائے گا۔ پھر فارغ ہو کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ اچھا تم یہ بتاؤ۔ تمہاری ابھی تین دن کی چھٹی باقی ہے نا۔

جی ہاں۔ لیکن میں بارات کے رخصت ہونے کے بعد ہی اپنی یونٹ میں چلا جاتا لیکن تمہارے ٹیلی فون کے لیے رُک گیا ہوں۔

احمد ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مزید تین دن فلیٹیز میں اسی کمرے ہی میں رہو اور میرے

بستر پر سوؤ اور صبح و شام ٹیلی فون پر میرے ساتھ بات چیت کرو۔

نہیں حنا میں سویرے چلا جاؤں گا۔ اب یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ اس ویران اور سنسان کمرے میں آکر میں اور بھی زیادہ اُداس اور مغموم ہو جاتا ہوں۔

کیا میں دن میں دفتری اوقات میں تمہارے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کر سکتی ہوں؟

نہیں حنا۔ دفتر میں میرے پاس بہت آدمی ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری باتیں کوئی اور آدمی نہ سُنے۔

تم اگر کہتے ہو تو میں تمہارے کمرے میں ٹیلی فون لگوا دیتی ہوں۔

نہیں حنا ایسا فوجی قانون کے تحت ممکن نہیں ہے۔

تو پھر کوئی اور تجویز ہی بتاؤ۔

تم ایسا کرو تم رات کو نو بجے میرے دفتر کے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کر لیا کرو۔ میں اس وقت وہاں تمہارے فون کا انتظار کیا کروں گا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔

صبح تم کس وقت واپس یونٹ میں جاؤ گے۔

آٹھ بجے کے بعد ہی جاؤں گا۔

اچھا میں صبح پھر تم سے بات کروں گی۔

تم صبح آٹھ بجے کہاں اُٹھو گی۔ رات کی ایکزرشن (EXERTION) سے تھک ہار کر تم اتنے سویرے کہاں اُٹھ سکو گی۔

یو۔ ناٹی۔ لوائے۔ بڑوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اگر تم اس وقت میرے پاس ہوتے تو تمہارے کان ضرور کھینچتی۔

ابھی میری تین دن کی چھٹی باقی ہے۔ اگر تم کہو تو میں ادھر ہی سے سید حا پنڈی آجاتا ہوں تاکہ تم آسانی سے میرے کان کھینچ سکو۔

خدا کی قسم بڑا مزہ آئے گا۔ کہو تم کب تک آرہے ہو۔

بابا اس فوجی کرنیل سے مجھے کیوں پٹواتی ہو۔

نہیں، احمد۔ سعید تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔

آج کے بعد اگر تعریف کی تو پھر دیکھیں گے۔ تمہیں حاصل کرنے تک تو اُسے حریفیں کرنا ہی تھیں۔

خیر یہ بعد کی بات ہے۔ احمد معاف کرنا۔ مہمان آگئے ہیں اور مجھے سعید بلانے کے لیے آیا ہے۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ویسے تم کل صبح ٹیلی فون نہ کرنا۔ میں صبح سویرے ہی واپس چلا جاؤں گا۔

احمد۔ سویٹ ڈریمز۔ خدا حافظ۔

خدا حافظ۔

میں اُدھر ہی حنا کے بستر پر سو گیا۔ تمام رات مجھے بڑے ہی ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ صبح سویرے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک سات بجا رہا تھا۔ میں نے مینجر کو فون کیا کہ میرا ناشتہ میرے کمرے ہی میں بھیج دیں اور ساتھ ہی مہربانی سے بل بھی ارسال فرمائیں۔ میں اُٹھا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا۔ ناشتہ کیا اور سرونٹ کو بلایا۔ بل کی پے منٹ کی اور اسے دس روپے ٹپ کے طور پر دیے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوراً میرے لیے ٹیکسی لے آؤ۔ میں جانے کے لیے تیار بیٹھا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ٹیکسی نے میرے کمرے کے سامنے آ کر ہارن بجایا اور اپنی آمد کا اعلان کیا۔ میں اپنا اٹیچی کیس اُٹھا کر کمرے سے نکلنے لگا تو دروازے پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیا خلفشار تھا۔ میں پلٹ کر کمرے کے اندر سے دیکھے جا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سینما کی متحرک تصویروں کی طرح گذشتہ تین دن کا قیام آ گیا۔ یہاں میرے ساتھ حنا تھی۔ ہم دونوں کے سوا اور یہاں کوئی نہ تھا۔ حنا پر کسی کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ سب لوگوں سے زیادہ مجھے چاہتی تھی۔ لیکن میں اس کی چاہت کی قدر نہ کر سکا اور آج اس نے ایک ایسے آدمی کی ذات میں پناہ لی ہے۔ جس سے اسے سخت نفرت تھی۔ میں آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے تھکے ہارے مسافر کی

طرح سر جھکائے چلتا ہوا ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مینجر سے رسید لے لوں۔ اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تو خود رسید لے کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ میں رسید لے کر واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔

صاحب کہاں جانا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

بھئی چھاؤنی چلو۔

صاحب چھاؤنی کس جگہ۔

میڈیکل سٹور کے پاس سگنل کا میس ہے۔

٭—٭

میں تھوڑی دیر میں اپنی یونٹ میں پہنچ گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ ہمارے میس میں سوائے ملازمین اور اردلیوں کے اور کوئی نہ تھا۔ اللہ یار خان میرے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

میں جب ٹیکسی سے اُترا تو اللہ یار خان دوڑ کر آیا اور اس نے میرا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور میں اس کے ساتھ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اللہ یار خان سے پوچھا۔

اللہ یار خان یونٹ سکیم (جنگی مشق) سے واپس آ گئی ہے یا نہیں۔

سر رات ہی کو آئے ہیں۔ اب اپنا اپنا سامان سٹوروں میں ٹھیک کر رہے ہیں۔

لیکن سر ابھی تو آپ کی تین دن چھٹی کے باقی ہیں۔ آپ پہلے کیوں آ گئے ہیں۔

اللہ یار میں گاؤں نہیں گیا تھا۔ کراچی گیا تھا۔ کام ہو گیا ہے تو واپس آ گیا ہوں۔

صاحب اس سوہنی کڑی سے لڑائی تو نہیں ہو گئی کہ آپ پہلے واپس آ گئے ہیں۔

نہیں اللہ یار وہ تو پنڈی ہوتی ہے۔ اس نے جہلم والے کرنل سعید سے شادی کر لی ہوئی ہے۔ میں تو کراچی ایک دوسرے کام سے گیا تھا۔

صاحب وہ جان تو آپ پر دیتی تھی، شادی اس کرنیل سے کر لی ہے۔

اللہ یار خان اس نے یہ شادی میرے کہنے پر ہی کرنل سعید کے ساتھ کی ہے۔ جب میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا تو کہیں تو اس نے کرنا ہی تھی۔

تو اس کرنل کی بجائے اس کی شادی کسی اور موزوں سے آدمی سے کروا دیتے۔

اللہ یار میں نے تو اس سوہنی کُڑی کو کہا تھا کہ اللہ یار خان کے ساتھ شادی کر لو۔ تو وہ کہنے لگی کہ اگر احمد تم سنجیدگی سے یہ چاہتے ہو تو میں ایسا بھی کر لوں گی۔

چھوڑو صاحب۔ اور وہ شرما کر اور اپنا حقہ اٹھا کر باہر برآمدے میں جا بیٹھا۔

میں اپنا اٹیچی کیس کھول کر سامان ٹھیک کرنے لگا تو چیک بک اور پاس بک پر میری نظر پڑی مجھے فوراً یاد آ گیا کہ حنا نے میرے نام ایک اکاؤنٹ کھولا تھا۔ میں نے جلدی سے پاس بک نکال اور اس میں رقم دیکھی۔ حنا نے میرے نام بیس ہزار روپے جمع کرائے تھے۔ میں پہلے ہی بڑا زیرِ بار تھا۔ اس کی مجھ پر بے شمار نوازشات تھیں۔ میں سوچنے لگا اگر میں نے یہ رقم رکھ لی تو یہ میری طرف سے بہت زیادتی ہو گی۔ میں تو چیک بک اور پاس بک ہی قبول نہ کرتا تھا۔ لیکن حنا نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اب بھی یہ یقین تھا کہ اگر میں یہ رقم اب اس کو لوٹاؤں تو وہ ہرگز نہ لے گی۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں خود بنک گیا اور وہاں چیک دے کر کرنل سعید کے نام بیس ہزار روپے کا بنک ڈرافٹ بنوا کر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ سعید کو ارسال کر دیا۔ اس فرض سے سبکدوش ہو کر میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ رجسٹری کرنے کے بعد میں میس میں واپس آیا، کھانا کھایا اور سو رہا۔

دوسرے دن میں نے ڈیوٹی جائن (JOIN) کر لی۔ کرنل صاحب اور ایڈجوٹنٹ نے مجھ سے پوچھا کہ میں پہلے کیوں واپس آ گیا ہوں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں جس کام کے لیے گیا تھا وہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔ اس لیے واپس آ گیا ہوں۔ میرے اس جذبے سے وہ دونوں خوش ہوئے۔

دفتر کے اوقات کے بعد میں میس میں آیا۔ کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر آرام کرنے کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ اور حنا کے متعلق سوچتے سوچتے میٹھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں اپنے دل کی ویرانی اور حسین سپنوں کی موت پر مستقل طور پر رنجیدہ رہنے لگا۔ میں اکثر سوچا کرتا۔ ہماری خوشیاں اور ہمارے رنج کتنے عارضی ہوتے ہیں۔ ہر رنج اور خوشی کتنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ دنیا کے ہنگاموں میں گم ہو جاتے ہیں۔

حنا سے الگ ہو کر میں اب ایک بے نام سی افسردگی محسوس کرتا۔ میں سمجھتا جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز شے تھی جو مجھ سے چھین لی گئی ہے اور میں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انجانے جرم کی پاداش میں مسرت اور خوشی کے پر رونق ایوان سے نکال دیا گیا ہوں۔ ایک حزن، ایک الم ناکی کا سیاہ بادل تھا جو میری زندگی کے افق کو لمحہ بہ لمحہ محیط کیے جا رہا تھا۔

اب مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں خلا میں ہوں۔ جہاں زندگی کو حرکت نہیں۔ جہاں ہر شے پر سکوت طاری ہے۔ جمود ہے اور میں پتھر کا ایک بت ہوں اور اس خلائی کائنات کو بے مقصد نظروں سے دیکھے جا رہا ہوں اور چپ ہوں۔

٭ ٭ ٭

دریا تھا وہ تو موج کی صورت گذر گیا
میں عمر بھر کی پیاس لیے دیکھتا رہا

بسمل

خلش ہمدانی

۱۵۵۰ - پریم نگر
اٹک شہر
۲۹ ر اکتوبر ۱۹۹۰ء



خلش ہمدانی

# اک آبلہ پا تنہا

ایک ایسی کتاب جو بیک وقت
سوانح حیات، ملٹری ہسٹری،
وار ہسٹری اور مصنّف کے آبائی علاقے
کی معاشرتی تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک
نہایت دلچسپ اور مکمّل ناول بھی ہے
انداز بیان اتنا دلچسپ اور دلنشیں ہے
کہ کسی لمحے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی
قاری پوری کتاب یک نشست میں ختم
کرنے کی کوشش میں سب کچھ بھول کر
کتاب کے زندہ کرداروں میں گھل مل جاتا
ہے۔ مصنّف نے آپ بیتی صاف گوئی
اور دیانتداری سے کام لیتے ہوئے تحریر
کی ہے جسے قدم قدم محسوس کیا جاسکتا ہے

آغا امیر حسین

ISBN 969 - 28 - 0038 - 5